
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
دسمبر 2015
نگران اعلیٰ
معراج رسول



جلد45 • شمارہ12 دسمبر 2015 • زرسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر215 کراچی74200 • فون:35895313(021) فیکس35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

کہیں کا نہیں

جون ایلیا

میں ''کرومیگنی انسان'' میں لاکھوں برس پہلے سے لے کر اس پل تک کا انسان بہت دکھیا ہوں۔ دکھ ہے دکھ ہے اور دکھ ہے۔ ''دشمم دشمم دشمم'' قرآن میں آیا ہے ''تموتو قبل ان تموتو'' یعنی مرنے سے پہلے مر جاؤ۔ سو میں مرنے سے پہلے مر چکا ہوں اور واویلا صد واویلا کہ جو مرنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں وہ بد بخت کبھی نہیں مرتے۔ ان کا تن تو مر جاتا ہے پر ان کا نام جیتا رہتا ہے اور نشیان، کیا تم جانتے ہو کہ ان کا نام کتنے دکھ بھوگتا ہے، کتنے دکھ۔ اور صدی صدی بھوگتا رہتا ہے۔ کل انگلستان میں رہنے والے ایک پڑھے لکھے آدمی نے مجھ سے بات چیت کی۔ وہ آدمی ملکوں اور قوموں کے بارے میں لوگوں کی رائے اور ان کی سوچ جاننے اور ان کو برطانوی نشرگاہ کے ذریعے کروڑوں لوگوں تک پہنچانے کا کام کرتا ہے۔

اس بھلے مانس نے مجھ سے کہا کہ آپ ایک شاعر ہو اور ہندوستان کے وزیراعظم اٹل بہاری باجپائی بھی شعروشاعری سے گہرا سمبندھ رکھتے ہیں۔ انہوں نے جوہری بموں کے بدترین دھماکے کرائے ہیں۔

نشیان! میں نے اس بھلے مانس کی بات سنی اور کچھ لمحوں تک خاموش رہا۔ پھر میں نے کہا کہ بھائی جی! اٹل بہاری باجپائی شعروشاعری سے گہرا سمبندھ ہی نہیں رکھتے، وہ تو شاعر ہیں، سچ مچ کے شاعر۔ وہ جب سیاست کی بولی بولتے ہیں تو کوئی اور بولی بولتے ہیں اور جب اپنی بولی بولتے ہیں تو وہ بولی بولتے ہیں جو امیر خسرو، قلی قطب شاہ اور میرا بائی سے شروع ہوئی اور ولی دکنی اور میر تقی میر تک پہنچ کر جنبش لب کا معجزہ بن گئی ہے یوں کہ وہ ایک سیاست داں ہیں اور سیاست داں دہرے یا دوغلے آدمی ہوتے ہیں۔ اٹل بہاری باجپائی اردو قوم اور اردو تہذیب کے پیمبر، طوطی ہند امیر خسرو کے چیلے اور ان کے دوہوں کے نابینا حافظ نہیں ''بینا حافظ'' ہیں۔ وہ اردو آدمی ہیں اور اردو شمالی برصغیر کی سب سے چہیتی زبان ہے۔ چاہے وہ دیوناگری میں لکھی جائے یا عربی کے نستعلیق رسم خط میں۔ لندن سے آنے والے بھلے مانس! تم نے سوال تو کچھ اور کیا تھا اور میں جواب کچھ اور دے رہا ہوں اور اس ''کچھ اور جواب'' کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ یہاں تمہیں ایک بات یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخ اور تہذیب کے بارے میں ایک سوال، دو سوال یا تین سوال کر کے پورا جواب پانے کی ہوس وہی رکھ سکتا ہے، جس کی مسیں نہ بھیگی ہوں۔

ہاں تو اس ''کچھ اور جواب'' کا جاری سلسلہ یہ ہے کہ اردو کا نام ''اردو'' سرے سے غلط ہے۔ میری اور میرے کم سے کم ساڑھے پانچ سو یا چھ سو برس پہلے کے پرکھوں کی زبان کو آغاز سے لے کر پنجاب اور دوآبے میں انیسویں صدی کے شروع تک تین ناموں سے یاد کیا گیا یعنی ''ہندوئی، ہندوی اور ہندی''۔

مجھے ابھی ایک بات یاد آئی ہے اور اس کے یاد آنے سے میری ذات بہت شرمائی ہے اور وہ بات یہ ہے کہ امروہے کے پرانے تھانے کے سامنے کی حویلی میں رہنے والا ایک شیخ، مسمّی غلام ہمدانی شاید وہ پہلا آدمی تھا جس نے شمالی برصغیر کے ہزاریوں اور بزاریوں کی مہربان، ترجمان، خاکسار اور کرشمہ کار زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان کو غیر عربی، غیر ایرانی اور مسلمان زبان کو پہلی بار ''اردو'' کہا۔

یہ تہذیب کی جنتری کا وہ جرم ہے وہ جنایت ہے، جس کی عقوبت میں مسمّی غلام ہمدانی المعروف بہ مصحفی کے نام ہی کو نہیں، پورے امروہے کو تاریخ کی سولی پر چڑھا دیا جانا چاہیے۔

بھلے مانس! تم نے بھارت کی نوخیز اور بدترین سرکار کی جہنمی بدکاری کے بارے میں مجھ سے اختصار کے ساتھ کچھ پوچھنا چاہا تھا مگر میاں! میں بری طرح پھیل گیا۔ ایسا پھیلا کہ اگر کھلو باولی بھی سنے تو ہنستے ہنستے ضعیف ہو جائے۔ میری بات شاید تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی پر بات یہ ہے کہ بات تو بات ہوتی ہے چاہے وہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے، سنو اور سمجھو! بھارت نے بم کے جو غیرانسانی، غیرشریفانہ، دھماکے کیے ہیں ان کا ایک سلسلہ ہے، جس کے سرے کو انگلستان کے گوروں نے جنبش دی تھی جسے فورٹ ولیم کالج نے اور تیز کر دیا۔ ایک زبان کو دو زبانوں میں بانٹ دیا۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ بھارت نے جوہری بم کے جو دوزخی دھماکے کیے ہیں ان کا فورٹ ولیم کالج سے کیا تعلق ہے؟

میں تمہاری اس سوچ کے دکھ کو پوری طرح سمجھتا ہوں اور وہ یوں کہ خود میں بھی بہت دکھ میں ہوں۔ میں پلاسی کی جنگ سے لے کر اس مہینے کے، اور اس مہینے کے اس دن کی اس شام کے اس لمحے تک بہت بڑے دکھ جھیلتا رہا ہوں۔ بھلے مانس! تم شاید صرف میرا نام جانتے ہو۔ مجھے نہیں جانتے۔ میں نہ بھارت کا آدمی ہوں اور نہ پاکستان کا۔ ایک زمانہ تھا جب میں ہندوستان کا آدمی تھا یعنی برصغیر کا آدمی۔ اس کے بعد میں نے ازخود ساری دنیا کی قومیت اختیار کی اور پھر میں کہیں کا نہیں رہا۔

عزیزانِ من!
السلام علیکم!

دسمبر 2015ء کا شمارہ جہاں ایک سال کے بچھڑ جانے کی خبر دے رہا ہے، وہیں نئے سال کی طرف گامزن ہونے کی نوید بھی سنا رہا ہے لیکن کچھ کر دکھانے کا جو ولولہ سال کے آغاز میں ہوتا ہے...... اختتام آنے تک وہ حالات کی گرد میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔ اگر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو احساس ہوگا کہ یہ سال بھی کم خوشی گر غموں کی بھرمار دے کر گزر گیا۔ اگر چہ کراچی میں امن و امان کی صورتِ حال میں ایک خوشگوار تبدیلی تو آئی ہے مگر کئی خونیں واقعات و حادثات دل پر گہرے نشان بھی چھوڑ گئے ہیں جن میں رمضان المبارک میں شدید گرمی کے عالم میں عوام کی بے بسی، بجلی کی لوڈشیڈنگ اور اربابِ اختیار کی بے حسی، حج کے دوران بھگدڑ میں شہادت...... محرم الحرام میں دہشت گردی کا دل دوز واقعہ...... اور اب 26 اکتوبر کو پشاور زلزلے کا ہولناک سانحہ جو 2005ء کے تباہ کن زلزلے کی یاد تازہ کر گیا جس کے متاثرین آج بھی حکومتی امداد کے منتظر اور اپنی تباہی پر نوحہ کناں ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ سیکڑوں قومیں ان قدرتی آفات کے ہاتھوں مٹ گئیں۔ قرآن و احادیث میں قدرتی آفات کو انسانی اعمال کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ اس روشنی میں ہمیں توبہ استغفار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ترقی کے نام پر جتنی تیزی سے پہاڑوں کو توڑا جا رہا ہے اور درختوں کا خاتمہ کیا جا رہا ہے، دنیا بھر کے ماہرین خبردار کر رہے ہیں کہ اگر پہاڑوں کی توڑ پھوڑ اور جنگلات کی بے دریغ کٹائی کا سلسلہ نہیں روکا گیا تو انسان اپنے ہاتھوں یونہی تباہی لاتا رہے گا...... ہمارے یہاں ان آفات سے بچاؤ کے لیے احتیاطی تدابیر پر غور کرنے کا رواج ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ جاپان میں دیگر تدابیر کے ساتھ ساتھ زلزلہ پروف عمارتیں بنائی جاتی ہیں جبکہ یہ بھی معلوم ہے کہ ماحولیاتی تبدیلیوں سے متاثر ہونے والے ممالک میں پاکستان دسویں نمبر پر ہے اور یہاں متاثرہ افراد کو ریسکیو کرنے کے لیے جدید مشینری اور آلات کا فقدان ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان فطرت کے آگے بے بس ہے مگر بروقت منصوبہ بندی اور حسنِ تدبیر سے آفات کی تباہ کاریوں کی شدتوں سے بچا تو جا سکتا ہے لیکن ہمارے یہاں سیاسی بازار کی سرگرمیوں سے فرصت ملے تو کوئی اس طرف بھی توجہ دے...... ویسے آج کل بلدیاتی الیکشن کی برکت سے بااثر شخصیات کو اپنے حلقے کے بھولے بسرے عوام کی یاد آ ہی گئی۔ اس بلدیاتی الیکشن کے دنگل میں عوام کی خوشنودی اور ووٹ حاصل کرنے کے لیے نہ صرف وعدے وعید کیے جا رہے ہیں بلکہ علاقوں میں ترقیاتی کاموں کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ ذرا سوچیے اگر انتخابات کا یہ خوب صورت میلا پانچ پانچ سال بعد کے بجائے سال کے سال لگے تو یقین مانیے شہروں، گلی کوچوں کی قسمت ہی بدل جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اس بار بہتری کی صورت دیکھ کر قائد کا یومِ پیدائش دہری خوشی کے ساتھ منایا جائے...... اور قائد کا خواب پورا ہو جائے۔ دیکھیے جناب، اس الیکشن دنگل میں کون فتح پاتا ہے اور کسے شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بہر حال اچھے کی امید تو ہر موسم میں رکھنی چاہیے اور آج کل موسم تو ہماری محفل کا بھی جوبن پر ہے...... تو چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب۔

✠ **ایم عمران جونانی**، رانچھوڑ لائن، کراچی سے محفل کی زینت بنے ہیں ''عجیب اتفاق ہے سال کا آخری مہینا ہے اور میرا آپ کی محفل میں پہلا خط۔ (خوش آمدید) سسپنس کی چاٹ پرانے شماروں کے ذریعے منہ کو لگی اور اب اس کا بھی ہر ماہ انتظار رہنے لگا ہے۔ اس کے پڑھنے والوں کا آپس میں میل جول، پُرخلوص خطوط، نوک جھوک نے مجھے بھی قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا حالانکہ اس قدر مصروف زندگی میں صرف پڑھنے کا موقع مل جائے وہ بھی غنیمت ہے (یہ تو آپ نے درست کہا...... نوازش ہے آپ کی) اس پر طرہ کہ نانا ابو کی طبیعت بہت خراب ہے، کافی ٹائم سے اسپتال میں داخل ہیں۔ (اللہ جلد صحتِ کاملہ عطا کرے) ابھی پرسوں رات میری وہیں ڈیوٹی تھی۔ وقت گزاری کے لیے ڈائجسٹ لے گیا اور اسی فیصد حصہ وہیں ختم کیا۔ (کیا بات ہے جناب کی!) خطوط کی محفل میں صدارت ظفر وڑائچ کے حصے میں آئی جنہوں نے سیدھے سادے انداز میں دل کا حال بیان کیا۔ پہلے خط کی ایسی پذیرائی بہت مبارک۔ اس کے علاوہ فلک شیر ملک، محمد صفدر معاویہ، عبادت کاظمی، روبی انصاری، احمد خان توحیدی، نادر سیال، قدرت اللہ نیازی اور حنا عروج کے تبصرے بہت پسند آئے۔ (بہت شکریہ) بھائی عبدالجبار آپ کے شہر لاہور سے تو ہمارا دل کا تعلق ہے، اے احمد اور عطاالحق قاسمی کی تحریروں میں اس الف لیلوی شہر کی داستانیں خوب پڑھی ہیں۔ بڑی خواہش تھی آپ کا شہر تفصیل سے دیکھنے کی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ بہن کا رشتہ وہیں طے ہو گیا اور جولائی میں وہ بیاہ کر چلی گئی۔ اس بہانے مجھے اگست میں لاہور پانچ دن کے لیے آنے کا موقع ملا۔ دل خوش ہو گیا۔ رضوان احمد آپ تو ہمارے معاشی پڑوسی ہیں۔ تلاشِ روزگار کے سلسلے میں ہم روز صبح سے شام تک کورنگی میں ہی ہوتے ہیں۔ زریان سلطان آپ اردو بازار میں ہوتے ہیں، ہمارے گھر سے واکنگ ڈسٹنس ہے۔ احمد خان توحیدی تو سرگزشت میں بھی مستقل ہمارے ساتھ ہوتے ہیں لیکن یہ طاہرہ گلزار اور رضوان سلطان کہاں رہ گئے۔ چھوٹا منہ بڑی بات اتنے تجربہ کار تبصرہ نگاروں کے بیچ کچھ لکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی لیکن پھر بھی ہمت کرتے ہیں۔ خدنگ عثمانی کی بات کی جائے تو کہنا پڑے گا کہ منظر نگاری خوب ہے، بندہ خود کو اسی ماحول میں محسوس کرتا ہے لیکن اب طوالت کی بنا پر دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے، تین حصے بہت ہوتے ہیں۔ مریم کے خان کا مس

پہلے سے فین ہوں۔ تازہ تحریر پر کاری بھی بہت پسند آئی۔ یقیناً میری ناتجربہ کاری ہے کہ میرا اشک کافی دیر تک سوچے سمجھے قتل کی طرف نہیں گیا۔ شیش محل کی تیسری قسط کی شاندار اٹھان نے دل جیت لیا اب کہانی کا ٹیمپو اونچا ہو گیا ہے۔ کرداروں کی پرتیں اٹھتی جا رہی ہیں۔ کہیں کہیں کردار اچھی اردو بولنے لگتے ہیں۔ امجد رئیس کی سریلا پیغام متاثر نہ کر سکی۔ بے بنیاد میں امجد بیگ صاحب اپنے مخصوص انداز میں نئے کیس کی گتھیاں سلجھاتے نظر آئے۔ حسام بٹ کی تحریر اپنے آپ میں جکڑنے کا فن جانتی ہے۔ طاہر جاوید مغل کی کرشمہ میں ماں کی ممتا نے دل گرما دیا۔ بعض اوقات انسان وقتی فائدہ دیکھتے ہوئے فیصلے کرتا ہے جن کے اثرات ساری حیاتی پر مرتب ہوتے ہیں۔ محفل شعر و سخن کے انتخاب کا معیار اونچا ہے لیکن اگر شاعر کا نام ساتھ لکھنے کی روایت ہو تو فنکار کا حق ادا ہوتا ہے۔ ضیا تسنیم بلگرامی نے ایک مرتبہ پھر ایمان تازہ کر دیا۔ یقیناً اللہ والے وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ یاد آ جائے۔ کاشف زبیر کی تحریر کا ایک ایک لفظ جھنجوڑ رہا ہے کہ یہ ایک دن ایک لمحہ ہمارے او پر بھی آنے والا ہے، جب ساری زندگی ایک تیز رفتار فلم کی صورت ہمارے سامنے گھوم جائے گی اور مہلت ایک لمحے کی نہیں ہوگی۔ اگلے شمارے کا اور زیادہ بے چینی سے انتظار رہے گا۔'' (اتنا جامع تبصرہ کرنے کا شکریہ)

✠ **محمد صفدر معاویہ،** ضلع خانیوال سے محفل میں شریک ہو رہے ہیں ''14 کی شام کو ہمیں سرد رمیں کراچی میں سسپنس کا خوب صورت شمارہ مل گیا۔ سرورق کو بہت خوب صورت ماڈل کے سوئے ہوئے بے مثال حسن اور ساتھ میں لگتا ہے کسی کا دل کسی کے پیار میں جکڑا گیا۔ جون ایلیا محترم کسی طرح بھی، اپنے آپ سے باہر نکلنا چاہیے مشکل انداز مگر بہت اعلیٰ طریقے سے انسان کو اس کی حقیقت بتاتے نظر آئے۔ آپ کا اداریہ پڑھا آپ کافی دکھی نظر آئے۔ خصوصاً حجاج کرام کے بارے میں، اللہ پاک امتِ مسلمہ کو ایسی آفات سے بچائے۔ آپ اس بات پر بھی زور دیتے نظر آئے طالبِ علم تعلیم علم کے لیے نہیں ڈگری کے لیے حاصل کرتے ہیں تو اساتذہ بھی صرف پیسے کمانے کی مشین بنے ہوئے ہیں۔ (یہ بات بھی درست ہے) غریب کا بھی کوئی پرسانِ حال نہیں۔ آخر میں علامہ محمد اقبال کا یوم ولادت 9 نومبر کو احترام و عقیدت سے منایا جائے گا۔ کیا ہم ان کی شاعری سے کچھ فائدہ اٹھا رہے ہیں؟ ہر گز نہیں، یہ نوجوان نسل بالکل دور ہے۔ انہیں بس موبائل انٹرنیٹ وغیرہ کا شوق رہ گیا ہے۔ اگر زندگی رہ گئی تو میں 10 نومبر کو اپنی 27 ویں سالگرہ مناؤں گا (ہماری جانب سے سالگرہ مبارک ہو) اپنی محفل میں آئے تو پڑوسی شہر کے ظفر اللہ وڑائچ کو کرسیِ صدارت پر بہت عمدہ اور اعلیٰ تبصرہ کرتے پایا۔ مبارک ہو۔ دیکھو ہمیں خوش قسمت کہا اور تمہاری بھی قسمت کھل گئی وہ بھی پہلی کوشش میں ونڈر فل۔ فلک شیر ملک بھی عمدہ تبصرہ کرتے نظر آئے۔ ملک صاحب اپنی غلطی دور کر لیں۔ میں تو کبھی جیل نہیں گیا اور اللہ پاک کی ذات سے دعا ہے کہ تمام اسیران کو جلد سے جلد رہائی عطا فرمائے۔ احمد خان توحیدی بھی چٹکلے مارتے ہوئے تو نادر سیال بھی اچھا تبصرہ کرتے ہوئے۔ علی اصغر بھی اچھی باتیں کرتے ہوئے نیازی بھائی بھی عمدہ تبصرے کے ساتھ مرزا طاہر الدین، رضوان احمد بھی اچھا تبصرہ کرتے محفل میں موجود، زریاب سلطان شکوہ کناں نظر آئے۔ اطہر حسین بھی بہترین تبصرہ کرتے ہوئے۔ حنا عروج بھی شکوہ کرتی ہوئی اپنے دوستوں سے تبصرہ بھی اچھا لکھا۔ کہانیوں میں شیش محل سے شروع کیا۔ جولیٹ کی روح تک کو زخمی کر دیا۔ ساتھ میں ماں کی المناک موت اور عارف کی بے رخی کا صدمہ بھی ابھی جھیلنا ہے۔ دوسری طرف فاروق کو بہت مارا گیا۔ آخر میں سنسنی پھیلا دی۔ اس کے بعد ماردی پڑھی۔ کیا محبت کرنے والے اس طرح کرتے ہیں جس طرح سے مراد نے ماروی کے ساتھ کیا۔ طلاق دے دی، دل بہت افسردہ ہوا۔ بہر حال یہ قسط کچھ بہتر رہی پچھلی قسط کی نسبت۔ خدنگ عثمانی پڑھی جہاں کبھی ذکریا قید تو کبھی باہر۔ وہیں فوج کے دل میں بادشاہ کے خلاف بغاوت جاگ اٹھی۔ کئی لوگوں کے سر قلم ہوئے۔ استاد ارسلان کو قسمت نے بچا لیا۔ اس کے بعد مریم کے خان کی پر کاری پڑھی۔ این نے پتا نہیں کس مقصد کی خاطر کیٹ سے جان کو موت کے گھاٹ اتروا دیا شاید ڈاکٹر کیون پیکارڈ کو پھنسانے کے لیے لیکن ڈاکٹر نے دماغ سے کام لے کر خود کو اور اپنے گھر کو بچایا بلکہ اصل مجرموں کو بے نقاب کیا۔ منظر امام کی دشمن بکرا پڑھی۔ اگر نعیم لاکھ روپے پر گزارہ کر لیتا تو فائدے میں رہتا۔ امجد رئیس کی سریلا پیغام میں مگی اور جبر اللہ نے پیاتو پیغام کے ذریعے ان بدمعاشوں کو بروقت پولیس بلوا کر گرفتار کروا دیا۔ مرزا امجد بیگ کے کیسوں سے ایک عمدہ کیس بے بنیاد جس میں عارف ٹیپو کو پھنسایا گیا بہت برے طریقے سے لیکن ٹیپو کو پھنسایا لیکن بیگ صاحب نے اپنے موکل کو نہ صرف رہا کروایا بلکہ اصل ملزم تک پولیس کو پہنچوایا اور ساتھ میں مدعی کی جانب سے عارف کی مدد، بہت عمدہ رہی یہ تحریر۔ طاہر جاوید مغل کرشمہ لے کر آئے جس میں شائستہ خالہ نے دونوں خاندانوں کے بچے بے شک تبدیل کر دیے لیکن ان کو خوشی بھی بے انتہا دی۔ محفل شعر و سخن بھی عمدہ رہی۔ ثمر عباس کی اعتراف بھی عمدہ رہی جس میں میری نے اسٹیفن کے جرم کا پردہ کیا مگر محبت کرنے کے باوجود اسے حالِ دل نہ کہہ سکی۔ سلیم انور کی راہ مسدود بھی عمدہ رہی۔ آصف ملک کی قربانی مسکراہٹ بکھیرتی رہی۔ آخر میں ظلِ الٰہی کی قربانی ہو گئی۔ غریب الوطن مرشد کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا کہ کتنے دکھوں مصیبتوں کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کا در نہیں چھوڑتے۔ تنویر ریاض کی انوکھا کھیل میں ایڈورڈ کو لینے کے دینے پڑ گئے جہاں سابقہ بھابی نے اچھا کھیل کھیلا۔ آخری صفحات پر اسٹوری آف دی منتھ نمائندہ خاص کاشف زبیر کے قلم سے بہت ہی عمدہ اور بہترین تحریر۔ ریحانہ کو آخر میں اپنے اچھے اعمال نظر آ رہے تھے تو بوڑھے کو اس کے بد عمل..... مثال کہ دنیا میں جیسا کرو گے ویسا ہی آگے آئے گا شمارہ بیسٹ رہا۔'' (آپ نے اتنی توجہ سے سسپنس پڑھا۔ بہت شکریہ)

✠ **فیض الحسن،** کوٹ ادو سے چلے آ رہے ہیں ''مجھے آپ سے ایک زبردست شکایت ہے۔ آپ اپنی محفل '' آپ کے خط'' میں مختصر خطوط کو جگہ نہیں دیتے آخر ایسا کیوں؟ کیا مختصر خطوط لکھنے والے آپ کے قارئین نہیں؟ جواب ضرور دیں (صرف نام پتا لکھنے کا فائدہ..... اگر کوئی قابلِ ذکر بات ہو تو محفل میں شامل کیا جاتا ہے لیکن آپ کے خطوط ضرور پڑھے جاتے ہیں) اس دفعہ رسالہ دیر سے ملا۔ سرورق اچھا لگا اور یوں لگا کہ رسالہ چمک دار ہو۔

ویسے راز کی بات ہے کہ رسالہ واقعی چمکتا دمکتا ہے کیونکہ نوجوان نسل کی ذہنی اصلاح وتعمیری سرگرمیوں میں نہایت موثر انداز میں اپنا کردار ادا کررہا ہے۔ ثمر عباس، تنویر ریاض، سلیم انور کی کہانیاں پسند آئیں۔ شعروسخن میں اشعار کافی معیاری تھے۔'' (اب تو کوئی شکوہ نہیں رہا؟)

✠ **انجینئر سعید اقبال بھٹی**، گلبرگ، لاہور سے تشریف لائے ہیں'' میں نے آپ کا ماہنامہ نومبر 2015، بغور پڑھا۔ اس میں مندرجہ ذیل مضامین بہت اچھے لکھے گئے۔ ان میں بے شمار معلومات فراہم کی گئیں۔ ایسے مضامین اپنے ماہنامہ میں لکھتے رہیں۔ ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔ بے بنیاد، مرزا امجد بیگ۔ خدنگ عثمانی، الیاس سیتاپوری۔ محفل شعروسخن، قارئین۔ ماروی، محی الدین نواب۔ قربانی، آصف ملک۔ غریب الوطن مرشد، ضیا تسنیم بلگرامی۔ نمائندۂ خاص، کاشف زبیر۔'' (کمال کا اندازِ تحریر ہے، اچھا لگا)

✠ **نعیم اللہ**، ہڈالی سے محفل میں شرکت کررہے ہیں'' ماہنامہ سسپنس کا نومبر کا شمارہ اچھا لگا۔ امید کرتا ہوں کہ ماہنامہ سسپنس کے اسٹاف، قارئین اور رائٹر خیریت سے ہوں گے۔ شیش محل (اسماء قادری) بہت ہی ٹاپ پر تھا۔ تمام کہانیاں اچھی لگیں۔ اللہ تعالیٰ ماہنامہ سسپنس کو مزید ترقی دے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔'' (آمین۔ محترم دو چار لائنیں اور لکھ دیتے تو اچھا تھا)

✠ **مرحا گل**، دراہن کلاں سے چلی آرہی ہیں'' سرورق پر جھکی پلکوں والی حسینہ اچھی لگی۔ یہ ہمارا سسپنس میں دوسرا خط ہے۔ سب سے پہلے دوستوں کی محفل میں انٹری دی جہاں ظفر اللہ وڑائچ ٹاپ آف دی لسٹ رہے۔ تبصرہ بے حد شاندار تھا۔ عبادت کاظمی کا شاعرانہ اور مناسا تبصرہ پسند آیا۔ باقی سب کے تبصرے پسند آئے۔ شیش محل نے سحر طاری کردیا۔ ونڈر فل اسماء جی۔ گرداب ابھی تک نہیں بھولے اور...... فاروق کا کردار موسٹ فیورٹ ہے۔ اس کے بعد اپنی پیاری راج دلاری رائٹر مریم کے خان کے پاس جا پہنچے۔ پرکاری نہایت زبردست تحریر تھی۔ اپنے محبوب مصنف طاہر مغل جی کی کرشمہ تو کرشمہ دکھا گئی۔ بے حد شاندار تحریر تھی۔ سلیم انور کی مختصر تحریر مزہ دے گئی۔ بڑھیا چالاک نکلی۔ ماروی کا پلیز دی اینڈ کردیں۔ میرا پسندیدہ زندہ دل کردار مرینہ ہے اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ ماروی کو محبوب کے ساتھ فنا کردیں، کتنی بنی پہلے مراد کی مشکلات تھوڑی تھیں جواب..... بشریٰ کو دفع کردیں اسٹوری سے۔ آخر میں نمائندۂ خاص کچھ خاص نہیں لگی۔ شعروسخن میں عبادت کاظمی کا انتخاب پسند آیا، اینڈ محمد رشید سیال رعنا رضوی کے بھی زبردست تھے۔ امید ہے کہ گئے سال کے آخری مہینے میں کوئی اچھی تحریر آخری صفحات پر جلوہ گر ہوگی۔'' (آپ کا ساتھ رہا تو سسپنس کے صفحات اپنی رونق پھیلاتے رہیں گے)

✠ **محمد خواجہ**، کورنگی، کراچی سے محفل کی رونق بنے ہیں''...... نومبر کا سسپنس اس دفعہ مقررہ وقت سے 2 دن پہلے ہی مل گیا۔ سرورق پر خاتون کا اداس، دل شکستہ چہرہ اور ساتھ ہی زنجیر میں پیوست زخمی دل بڑی مماثلت ہے جو اپنی کہانی خود ہی کہہ گیا۔ انشائیہ ہمیشہ کی طرح بہت ہی بامقصد اور حساس دلوں کو چھو لینے والا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ کیا کیا گل کھلائے جارہے ہیں نہ جانے اس کا انجام کیا نکلے گا یا قوم کا دم ہی نکل جائے گا۔ دوستوں کے خطوط کی خوب صورت اور مزے دار محفل کی طرف ظفر اللہ وڑائچ صاحب کو کرسیِ صدارت مبارک۔ لگتا ہے ہم سب کے دل ساتھ ساتھ دھڑکتے ہیں۔ ذہن ذہن کو پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ فلک شیر ملک، محمد صفدر معاویہ، عبدالجبار رومی انصاری اور باقی تمام کے خطوط بڑی توجہ سے پڑھتا ہوں اس کا اپنا ہی ایک مزہ ہے۔ عبدالجبار رومی بھائی آپ کی نصیحت سر آنکھوں پر۔ ہماری روح، ذہن اور دل مختلف مسائل میں الجھے ہی رہتے ہیں۔ سب سے بڑا عذاب بجلی ہے۔ ذہنی سکون کے لیے اندھیرا ہونے پر باہر نکل کر کسی کے ساتھ بیٹھو تو لگتا ہے ہر آدمی کے اندر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ بہرحال زندہ ہیں یہی بڑی بات ہے پیارے۔ الیاس سیتاپوری کی خدنگ عثمانی ابھی جاری ہے۔ بہت دلچسپ سلسلہ چل رہا ہے۔ پرکاری، بہت نفسیاتی الجھنوں کی کہانی۔ کیٹ کی اداکاری، عیاری غضب کی تھی لیکن انجام بالکل ہی اچھا نکلا، پکڑی گئی۔ شیش محل، بہت تیز اور ایکشن سے بھرپور کہانی ایک طرف داداگیروں کا ٹکراؤ اور اچھے اچھے شرفاؤں سے زیادہ محبت اور اپنا پن، ہر آبادی میں ایسے لوگ ہوں تو زندگی کا احساس اور تحفظ کتنا سکون بخش ہے۔ دشمن بکرا، منظر امام نے بقرہ عید کو سامنے رکھ کر ایک چھوٹی سی کہانی تحریر کی۔ مزاح بھی پیدا کیا مگر پڑھ کر کچھ مزہ نہ آیا۔ سریلا پیغام، بڑی ہی مختصر۔ میوزک کی آواز سے کتنے کام لیے اور کیا خوب صورتی سے مجرموں کو گرفت میں لے لیا۔ بے بنیاد، بہت عمدہ کہانی، لوگوں کے لیے ایک عمدہ سبق احتیاط کے لیے۔ مجرم کون تھا اور پھنسایا کس کو گیا۔ لیکن امجد بیگ جیسے قابل وکیل نے مجرم کو بے نقاب کیا اور بے گناہ بچ گیا۔ کرشمہ، طاہر جاوید مغل کی خوب صورت کہانی۔ کتنا پرانا اور نازک معاملہ جب کھلا تو دل کے پار گیا۔ اعتراف، ایک خوب صورت اور دلکش کہانی۔ معصومیت اور انتقام کا ملاپ۔ راہ مسدود، ایک انتہائی چالاک بوڑھی عورت نے نہ صرف اپنا لوٹا ہوا سامان واپس لیا اور مجرم کو کس قدر گھیر کر رکھا۔ واہ اس کو کہتے ہیں پرانا چاول۔ قربانی، ایک بے مزہ کہانی جس میں نئے اور قدیم مطلب پرست حاکموں کا احوال، بیربل، ملا دو پیازہ، بادشاہ اور بکرے شاید عوام۔ ماروی اب کافی طوالت کی طرف چلی گئی۔ اشعار کی محفل حسب معمول بڑی چنیدہ اور ذوق کے تسکین کا ذریعہ۔ کترنیں بہت لاجواب۔ اگر کترنیں اور حکایات نہ ہوں تو عطر کی بھینی بھینی خوشبو ہی غائب ہوجائے۔ (پسندیدگی کا شکریہ) مرسلہ اطہر حسین، کراچی بہت ہی عمدہ لگا۔ غریب الوطن مرشد، پاکستان کے ایک علاقے سے نکلنے والے عظیم اور اعلیٰ پائے کے بزرگانِ دین، کتنی پُرمشقت اور ایمان افروز کہانی۔ سبحان اللہ، آخری دو کہانیاں ابھی پڑھ نہیں پایا۔''

✠ **سید عبادت کاظمی**، ڈیرہ اسماعیل خان سے محفل میں شرکت کررہے ہیں'' 17 اکتوبر کو کالج کی طرف جاتے ہوئے بے دھیانی میں اسٹال کی طرف دیکھا تو سسپنس آچکا تھا۔ فوراً خرید لیا اور کالج تک پہنچتے پہنچتے سرورق اور فہرست کا معائنہ کرلیا تھا۔ سرورق اس مرتبہ دل کی خواہش

کے عین مطابق تھا۔ حسینہ ماہ جبینہ میں ہمیں ہماری اس کی جھلک محسوس ہوئی کہ وہ بھی آنکھیں بند کر کے ہماری سوچ رکھتی ہوں گی۔ جون ایلیا کی کڑوی باتیں حقیقت کے قریب تر تھیں۔ ویسے اپنی ذات کا بند خول بندہ نہ اتارے تو اچھا ہے۔ ظفر اللہ وڑائچ کرسی صدارت کے عہدے پر فائز تھے، ہماری طرف سے مبارک باد قبول کریں۔ عبدالجبار رومی بھائی مجھے تو لفظ کسک پڑھ کر بھی دل میں اداسی محسوس ہوتی ہے۔ اپنا تبصرہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اپنے پیارے دوستوں قاسم رحمان اور رضوان سلطان تنولی کی بہت کمی محسوس ہوئی۔ نادر سیال زریان سلطان اور رضوان احمد کے تبصرے اچھے لگے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل سے آغاز کیا، یہ کیا جولیٹ کی عزت داغدار ہوگئی۔ بہت افسوس ہوا لڑکی کی عزت تو کانچ کے مانند ہوتی ہے جو ایک دفعہ ٹوٹ جائے پھر نہیں جڑتی۔ فاروق کو پتا چلے گا تو...... اور یہ ثنا جب پہلے پتا تھا تو دوست کو بچایا کیوں نہیں۔ لگتا ہے اب چاند بانو فاروق کی ہیروئن ہوگی۔ گولو آگے چل کر زبردست کردار ثابت ہوگا۔ ویلڈن اماجی۔ اس کے بعد ماروی پڑھی اس دفعہ تو صحیح معنوں میں جھٹکا لگا۔ مراد اور ماروی کی طلاق اونو۔ مرینہ تو مر جائے اچھا ہے اور یہ نوری کے ساتھ تو اچھا ہوا مراد نکاح کرنے سے پھر بچ گیا۔ کاشف زبیر کے تو کیا کہنے نمائندۂ خاص لے کر آئے اور چھا گئے۔ ریحانہ جیسے لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں جو غلطی کر کے غلطی کی تلافی کریں۔ ریحانہ کی موت کا افسوس ہوا۔ ریحانہ نے شہباز کو غزالہ کی زندگی میں شامل کر کے خود کو اعلیٰ ظرف ثابت کر دیا۔ ٹریجک اینڈ تھا اداس کر گیا۔ تاریخی کہانی خدنگ عثمانی تیسری قسط بھی زبردست رہی۔ مجھے تاریخی ناول پسند ہیں اس کے اینڈ پر تبصرہ کروں گا۔ مرزا امجد بیگ بے بنیاد لے کر آئے، اچھی رہی۔ پیسے کی لالچ انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ نجمہ کا لالچ اسے لے ڈوبا۔ انسان کو اپنے سائے پر بھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ طاہر جاوید مغل کی کہانی اچھی لگی۔ شائستہ کے ایک جھوٹ نے دو خاندانوں کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ چھوٹی کہانیوں میں دشمن بکرا اچھی لگی۔ آج کل مہنگائی کے دور میں قربانی کرنا کتنا مشکل ہوگیا ہے۔ محفل شعر و سخن میں محسن اعجاز کا انتخاب دل کو چھو گیا۔'' (اتنا تفصیلی تبصرہ لکھا۔ بہت شکریہ)

☩ **فلک شیر ملک**، شاہ گڑھ سے تبصرہ کر رہے ہیں'' ماشاء اللہ نومبر کا ڈائجسٹ ہر لحاظ سے بہتر تھا۔ سرورق کے بعد انشائیہ بڑی مشکل سے سمجھ میں آیا۔ جون ایلیا کی روح ملکی حالات، حکومتی قیادت اور انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والوں پر بہت خفا نظر آئی۔ پھر مدیر اعلیٰ نے لکھا کہ وہ کون ہے جو دلوں کا بوجھ ہلکا کر سکے...؟ جواب میں یہی کہوں گا کہ اطاعت خداوندی اور پیروی رسولؐ میں سب مسئلوں کا حل موجود ہے مگر کوئی ان راہوں پر چل کر تو دیکھے (بے شک آپ کی بات بالکل درست ہے)۔ تمام تحریریں اچھی لکھی گئی تھیں مگر جو زیادہ پسند آئیں ان میں دشمن بکرا، بے بنیاد، شیش محل، غریب الوطن مرشد اور قربانی تھیں اور سپر ہٹ تحریر نمائندۂ خاص تھی۔ کاشف زبیر نے خوب صورت انداز میں جتلا دیا کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے جو یہاں اچھا کرے گا اسے آخرت میں رزلٹ بھی اچھا ہی ملے گا۔ تبصروں میں احمد خان توحیدی کا تبصرہ پسند آیا۔ شعروں کی محفل میں مہوش ادریس کا شعر خوب تھا۔ انجم کمال کراچی کا شعر بھی سپر تھا۔ مراسلوں میں رانا سجاد اختر ملتان جیل کی چند باتیں واقعی سچ پر مبنی ہیں۔ ریاض بٹ حسن ابدال نے جو سچے موتی بکھیرے ہیں انہیں چن لینا بہت ضروری ہے۔'' (آپ نے وقت نکالا۔ مہربانی)

☩ ادریس احمد خان، ناظم آباد کراچی سے محفل کی رونق بن رہے ہیں'' رب کائنات سے دعا ہے کہ وہ آپ اور آپ کے تمام رفقاء کار کو

برسوں کا ساتھ

☩ مسز صدیقی گلشن اقبال، کراچی سے رقم طراز ہیں'' میں برسوں سے آپ کے جاسوسی اور سسپنس ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ اس وقت سے جب میری گود میں ایک دو سال کا بیٹا اور ایک پانچ سال کا بیٹا تھا۔ ماشاء اللہ سے اب وہ دونوں بہت عرصے سے امریکا میں نیو جرسی میں ہوتے ہیں۔ بتانے کا مقصد یہ تھا کہ اس وقت آپ کا پرچہ 75 پیسے کا ملتا تھا۔ میں اتنی خوشی محسوس کرتی تھی ان رسالوں کو پڑھ کر کہ بتانا مشکل ہے۔ ماشاء اللہ اکیلے سارے گھر کے کام کاج کرنا پھر سب کاموں سے نمٹ کر جاسوسی اور سسپنس پڑھ کر میری ساری تھکن ختم ہو جاتی تھی۔ اس وقت میں پاکیزہ بھی لینے لگی تھی۔ وقتی طور پر دیگر دوسرے ادارے کے پرچے بھی پڑھے مگر آپ کے ادارے کے سارے پرچے میں آج تک پڑھ رہی ہوں جبکہ یہ اب 60 روپے کا ملتا ہے اور جب میں بچوں کے پاس امریکا جاتی ہوں تو لے کر جاتی ہوں ماشاء اللہ اتنے شاندار لکھاری ہیں آپ کے پاس جو آپ لوگوں کی دن رات کی محنت کے ساتھ سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ میں دل کی گہرائیوں سے عذرا بہن اور تمام لکھاریوں اور ادارے کے تمام لوگوں کو مبارکباد دیتی ہوں۔ کیونکہ بیک وقت سب کا معیار برقرار رکھتے ہوئے انہیں چلانا، کراچی کیا پورے پاکستان کے خراب حالات میں بہت بڑی بات ہے۔ میرے خیال سے ذیشان آپ دونوں کے پیارے بیٹے ہیں۔ (جی بالکل۔ ماشاء اللہ بہت فرماں بردار اور قابل ہیں) مجھے سسپنس کی آخری کہانی بہت اچھی لگتی ہے۔ اس بار کاشف زبیر کی نمائندۂ خاص نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ ماشاء اللہ کیا لاجواب کہانی ہے۔ دل خوش ہو گیا پڑھ کر، دھیمی دھیمی خوشبو کی طرح آگے سے آگے خوب صورت سے خوب صورت۔ بہت عمدہ، مزہ آگیا۔ اس پر پہلا انعام ملنا چاہیے (آپ کی قدر افزائی سے بڑا انعام ایک مصنف کے لیے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا) اگر موت اتنی خوب صورتی سے آئے تو کوئی موت سے نہ ڈرے۔ میری جانب سے کاشف صاحب کو بہت مبارکباد۔ سرگزشت میں سچی کہانیاں بہت پسند ہیں۔ اس کے علاوہ آپ لوگ اس میں بڑی بڑی شخصیات کے بارے میں آگاہی دیتے ہیں۔ سسپنس میں ولیوں کے سچے واقعات بہت متاثر کرتے ہیں۔ ایک بار آپ نے حضرت رابعہ بصریؒ کا واقعہ بھی دیا تھا، بہت شاندار۔ خدا آپ کو اور آپ کی ٹیم کو عمر خضر عطا کرے۔ آمین'' (بہن مسز صدیقی برسوں سے آپ نے سسپنس اور تمام پرچوں سے تعلق جوڑا ہوا ہے۔ ہم اتنی محبت اور حوصلہ افزائی کا دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ویسے اس بہانے آپ کو ماضی کی بہت سی باتیں یاد آ گئی ہوں گی۔ ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا اور کبھی کبھی اسی طرح خط لکھتی رہیے گا۔ خدا آپ کو بھی عمر خضر عطا فرمائے۔ آمین)

صحت و تندرستی دے اور زیادہ سے زیادہ آپ کے ادارے کے لیے جذبہ خلوص تاکہ ادارہ اور زیادہ ترقی و کامرانی سے سرفراز ہو آمین۔ سسپنس کا دیدار ہوا اللہ خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہے۔ سرورق بھی اپنی مثال آپ ہے۔ پیچھے زنجیر میں پرو دیا ہوا دل اور نائس گرل آنکھوں میں ایک عالم سمائے خراب دیدہ کمال ذاکر بہت خوب۔ اندر صفحات پر جون ایلیا کا خود احتسابی کا انداز انسان پہلے خود اپنا احتساب کرے جو بہت مشکل ہے کیونکہ سچ کڑوا ہوتا ہے۔ اداریہ میں بھی کوئی خوش کن خبر نہیں مگر پھر بھی زندگی جاری و ساری ہے کیونکہ یہی زندگی کا محور ہے۔ ہر حال میں انسان کو اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ پچھلے شمارے میں حاضری نہ دے سکے جس کا سبب شدید طبیعت کا خراب ہونا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے طبیعت میں افاقہ کیا (شکر الحمد اللہ) ناموں کی محفل میں داخل ہوئے تو سرفہرست ظفر اللہ وڑائچ تھے، مبارکباد۔ فلک شیر، عبدالجبار رومی، احمد خان آ، حیدری تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ آپ لوگ خود بھی اچھا لکھتے ہو۔ الیاس سیتاپوری کی خدنگ عثمانی ایک بے مثل تحریر ہے۔ پرکاری میں جان کی بیوی نے منصوبہ خوب بنایا مگر مجرم کی چھوٹی سی غلطی بھی پھانسی کا پھندا بن جاتی ہے۔ اس کے بعد اسماء قادری کی شیش محل پڑھی۔ بہترین کہانی جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ دلچسپ اور مکمل ایسی کہانی ہے جو قاری کو کسی اور طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ یہی کسی تحریر کی کامیابی ہے خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔ منظر امام کی دشمن نگر امزاح کی چاشنی لیے اچھی کہانی تھی۔ کہانی میں کوئی سبق بھی ہوتا ہے جو منظر امام کا خاصہ ہے۔ سریلا پیغام میں میاں بیوی میں مزاج کی ہم آہنگی نے مجرموں کو پکڑوا دیا۔ صحیح معنوں میں میاں بیوی کو مزاج آشنا ہونا چاہیے زندگی سکون سے گزرے گی۔ بے بنیاد، کرشمہ بھی اچھی لگیں۔ معیاری اشعار نے بھی لطف دیا۔ کترنیں بھی اچھی لگیں جن سے معلومات میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اعتراف نے بھی اچھا تاثر دیا۔ راہ مسدود، میں ایک بڑھیا نے بڑے حوصلے اور جرأت مندی سے چور کو پکڑوا دیا۔ آصف ملک کی قربانی بھی اچھی تھی۔ غریب الوطن مرشد نے بہت متاثر کیا۔ واقعی جو اللہ والے ہوتے ہیں ان کے لیے دنیا کی کوئی تکلیف تکلیف نہیں ہوتی۔ وہ اللہ کی محبت میں ایسے سرشار ہوتے ہیں۔ اندھا کھیل بھی اچھی تھی مگر کاشف زبیر کی نمائندۂ خاص بہت اچھی لگی۔"

✠ عبدالغفار فردوس، نواں شہر ایبٹ آباد سے دستک دے رہے ہیں "صبح کی روپہلی کرنیں دھیرے دھیرے سے پھیلتی جا رہی ہیں۔ بارشوں کے کارن سردی میں اضافہ ہو گیا ہے اور میرا جاب پر جانے کا سمے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ الفت ادب میں ہم بھی اپنے پسندیدہ شمارے میں حاضر ہونے کی جسارت کر رہے ہیں۔ سب محبان کرام سے آشا ہے کہ بلیک لسٹ نہیں کیا جائے گا۔ ایف ایس سی کا گزٹ آیا۔ امتیازی نمبر ہونے کے باوجود آگے پڑھنے کا سپنا ادھورا رہ گیا۔ گھر کے حالات ہی اس ڈگر پر آ گئے تھے کہ مجھے تعلیم ادھوری چھوڑ کر جاب کرنی پڑی اور یوں میرے تعلیمی سفر کا اختتام ہوا۔ غریب کریں بھی تو کیا۔ مملکت پاکستان میں مہنگائی، بیروزگاری، حادثات کا عفریت پھیلا ہے۔ کس، کس کا مقابلہ کریں؟ (معلوم نہیں گورنمنٹ کب اس مشکل کا حل نکالے گی) کہانیوں میں سب سے پہلے اسما قادری کی نئی قسط وار کہانی پڑھی۔ بہت بہترین لگی پر ابھی تو شروعات ہیں، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟ انکل اب کوئی ایسی قسط وار کہانی لکھوائیں جو ایکشن، پر اسراریت اور سسپنس سے بھرپور ہو۔ باقی کہانیوں میں نمائندۂ خاص، پرکاری، دشمن نگر اور کرشمہ زبردست تحریریں تھیں۔"

✠ ایچ بیبر کس، مردان سے شامل محفل ہیں "یہ 17 اکتوبر کی ایک معتدل شام تھی جب چند دوستوں کے ساتھ واہ کینٹ کی سڑکیں ناپتا ہوا اسلم مارکیٹ پہنچا کہ سامنے اک بک اسٹال پر سسپنس کا شمارہ جگمگاتا نظر آیا۔ ارے خوشی کے دل اچھلا۔ اگلے ہی لمحے سسپنس میرے ہاتھوں میں تھا۔ سرورق نے اس بار دل جیت لیا۔ نازک سی لمبی اور مخروطی انگلیاں اور صراحی گردن واضح تھیں۔ اس پر یاقوتی لبوں اور جھکی نگاہوں نے اس حسن کو کامل کر دیا۔ جون ایلیا مرحوم سے معذرت کے ساتھ کہ ان کی تحریروں سے مجھے الجھن ہوتی ہے۔ اداریہ دور حاضر کے دگرگوں حالات و واقعات پر نوحہ کناں ہے۔ میرے خدا رحم فرما۔ اس پیاری دھرتی کو غموں اور مصیبتوں سے نجات دلا اور اسے امن کا گہوارہ بنا میرے مولا۔ ہمارے حکمرانوں سے تو یہ ممکن نہیں...... رحم کر میرے خدا رحم کر گو کہ ہمارے اعمال اس قابل نہیں۔ بلقیس خان آف واہ کینٹ کو دعا سلام دو۔ جناب ظفر اللہ صاحب ایک جامع اور مفصل تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر بڑے عجز و انکساری سے براجمان رہے۔ مبارک باد قبول ہو۔ فلک شیر بھائی نے دنیا کی بے ثباتی پر خوب لکھا۔ خدا اس وعظ و نصیحت کا آپ کو اجر عظیم دے اور حضرت انسان کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اپنے صفدر معاویہ بھائی کا نام مجھے بہت پسند ہے۔ ادارے سے پہلے بھی اقلیم علیم صاحب کے متعلق ذکر کیا تھا کہ وہ کوئی کہانی لکھیں۔ خیر ہے سلسلہ وار نہ ہو لیکن کم از کم آخری یا ابتدائی صفحات کے لیے تو ہو۔ ایک بار پھر ایک چھوٹی سی ریکوئسٹ ہے پلیز۔ (آپ کی درخواست پہنچا دی گئی ہے) علی عمران برادر ویلکم راغلے...... سید عبادت کاظمی! طاہر گلزار پہلے کہاں تھی جو اسے یہاں دیکھ کر آپ کو خوشی ہوئی۔ بابا تو حیدری کے تبصرے نے ہنسا ہنسا کے لوٹ پوٹ کر دیا۔ نادر سیال! خدا آپ کے والد محترم کو جنت میں اعلیٰ درجہ دے۔ حنا عروج جی! نام سے تو آپ پندرہ بیس سے زیادہ نہیں لگتیں۔ بہرحال ویلکم۔ باقی تمام نئے تبصرہ نگاروں کو ڈھیروں مبارکی اور پرانے اور سینئر تبصرہ نگاروں سے درخواست ہے کہ وہ حاضری دے کر محفل کو مزید رونق بخش دیں۔ سب سے پہلے پسندیدہ سلسلے شیش محل پر جا لگے۔ کیا دلچسپ پلاٹ ہے اور کیا انداز بیاں...... یہ قسط بھی بہت شاندار رہی پر صفحات بہت کم ہوتے ہیں۔ جوزف اور جوزفین کے ساتھ ہماری سنگت شاید یہیں تک محدود تھی۔ خاص کر مجھے ان لوگوں کے گھر کا مانوس ماحول اور انگلش لب و لہجہ بہت بھایا۔ جولی برباد ہو گئی اور آغا نے یقیناً بھیڑیوں کے بھٹ میں ہاتھ رکھا۔ فاروق ہنوز بے خبر اور عارف محض ایک تماشائی۔ عین آخری وقت ڈاکٹر کون سی بری خبر سنا رہے ہیں؟ خدا خیر کرے فاروق اور جولی خیریت سے ہوں۔ نواب صاحب نے پہلی بار بے تحاشا ہرٹ کیا۔ مراد نے اپنی اوقات دکھا کر ماروی کو طلاق بھیج دی۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ دوسرے محبوب بھی ہاتھ منہ دھو کے اور اپنی نیک سیرت بیوی کو چھوڑ کے ماروی کے پیچھے ہے۔ امجد رئیس صاحب کی مختصر سریلا پیغام نے بہت مزہ دیا۔ پیانو پلیئر خیر اللہ کی مہارت کے ساتھ ساتھ مسکی نے بڑی آسانی سے لٹیروں کو قانون کے ہاتھوں پکڑوا دیا۔ مغل صاحب کی کرشمہ بھی خوب رہی۔ دلی ممتا کے ہاتھوں بے قرار آئی صفیہ

اپنی بیٹی کنول کے فراق کو نہ سہہ سکی۔ بے شک ماں واحد ایسی ہستی ہے جس میں کوئی ملاوٹ نہیں۔ یہ خالص رشتہ ہوتا ہے۔ بیگ صاحب کی بے بنیاد بہت دلچسپ رہی۔ آخری وقت تک مجھے جعفر علی پر شک ہو رہا تھا مگر بیگ صاحب کی سوئی نجمہ بی بی پر رکی۔ نجمہ بی بی کی دنیا و آخرت دونوں غرق۔ خدا حضرتِ انسان کو ہدایت دے۔ مریم کے خان کی پرکاری اسٹوری آف دی منتھ رہی۔ مغرب کی عکاسی خوب صورت لفظوں کی خوب صورت کہانی۔ کیٹ کی اداکاری کی داد دینی پڑی اور خاص کر این فرانز کی چال۔ آخری وقت ڈاکٹر بڑی عمدہ چال چلا۔ درمیان میں ڈاکٹر کو پیچ گنی کا ناچ نچایا۔ زینی کے ساتھ نوک جھونک اور گھر یلو لڑائی نے بہت مزہ دیا۔ ویلڈن مریم کے خان۔ پسندیدہ رائٹر مرحوم الیاس سیتاپوری کی خدنگ عثمانی جاری۔۔۔۔۔ اف سلطنت عثمانیہ کے سلطان سلیم کی دہشت اور جبریت۔۔۔۔۔ سلطان کشور کشائی کے نشے میں چور اور اس کی فوج مسلسل جنگ و جدل اور بھاگ دوڑ کی وجہ سے بلنے سے معذور۔ زکریا اور استاد ارسلان سیاحوں کے بھیس میں سلطان کے لیے مخبری کرنے لگے۔ آخری لمحات میں استاد ارسلان کو رابعہ کی صورت میں ایک بڑی خوب صورت الجھن سے واسطہ پڑ گیا جبکہ زکریا کی تو دلی مراد پوری ہوگئی۔ ان سب باتوں کے علاوہ مصنف کا مخصوص تاریخی، افسانوی اور ظریفانہ انداز بیاں اور خاص کر مصنف کی کرداروں کی نوک جھونک۔۔۔۔ واہ واہ۔ محفل شعر و سخن میں مرزا طاہر الدین بیگ، منور حسن اور کہکشاں پرویز کے انتخاب اعلیٰ رہے۔'' (تبصرہ کرنے کا بہت شکریہ جناب)

✠ **چودھری محمد یعقوب**، کبیر نگر، خانیوال سے حاضر ہیں'' میں عرصہ دراز سے ان شماروں کا مستقل قاری ہوں۔ 2011ء میں پروموشن حاصل کر کے گورنمنٹ ماڈل ہائی اسکول خانیوال تعینات ہوا تو وہاں ان شماروں کے مستقل قاری اور تبصرہ نگار سے ملاقات ہوئی۔ میری مراد حکیم ٹاؤن کے رہائشی محمد قدرت اللہ نیازی سے ہے۔ عمروں کے فرق کے باوجود ان شماروں سے قربت نے ہمیں بہت جلد بے تکلف کر دیا۔ طویل عرصہ خاموش قاری رہنے کے بعد آپ کی محفل میں شرکت کی جسارت کر رہا ہوں اور اس کی وجہ ہے اسما قادری کا نیا سلسلہ شیش محل۔ کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری سب بے حد متاثر کن ہے۔ ان سطور کے ذریعے میری ستائش اسما صاحبہ تک ضرور پہنچائی جائے۔ (آپ کی قدر افزائی مصنفہ تک پہنچ گئی ہے) اس کے علاوہ ان کے لیے ایک تجویز ہے کہ بعض اوقات بات کی وضاحت اس قدر زیادہ کرتی ہیں کہ بوریت پیدا ہو جاتی ہے اس سے گریز کیا کریں۔ اس کے علاوہ نواب صاحب پر قارئین بہت زیادہ تنقید کرتے نظر آتے ہیں اس لیے ان کو اب نئے دور کی ضرورتوں کے مطابق اپنے انداز میں تبدیلی پیدا کر لینی چاہیے۔ کاشف زبیر، طاہر جاوید مغل، ساجد امجد بھی اچھا لکھتے ہیں۔ کاشف زبیر نئی نسل کے نمائندہ رائٹر ہیں۔ ان کی آنکھ کے آپریشن کا پتا چلا، اللہ انہیں صحت دے۔ محفل شعر و سخن میں اکثر شعر ایسے ہوتے ہیں جو اپنی اصلی حالت میں نہیں ہوتے۔ شعر بھیجنے والوں سے گزارش ہے کہ تھوڑی محنت کر کے اچھے اور درست شعر بھیجا کریں۔ صرف نام شامل کروانے کے لیے جلدی نہ کیا کریں۔'' (ہم آپ کی بات سے سو فیصد متفق ہیں۔ قارئین سے کتنی ہی بار یہ بات کی جا چکی ہے کہ برائے کرم اشعار کے انتخاب میں توجہ دیا کریں)

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے خوبصورت تبصرہ کر رہے ہیں'' سرورق پر حسینہ خواب خرگوش کے مزے لیتی نظر آئی۔ پس منظر میں زخمی قلب زنجیروں میں الٹا لٹکا توبہ توبہ کر رہا تھا۔ سرورق سے چھلانگ لگائی اور سیدھا شیش محل پر جا پڑے جہاں ربن دادا، فاروق کی رہائی میں سرگرداں نظر آئے۔ فاروق کے ساتھ ساتھ جولیٹ کی ناؤ بھی بھنور میں پھنسی نظر آئی اور حسب توقع اور انسانی عمومی رویے کی تائید میں عارف اس ڈوبتی ناؤ سے پیچھا چھڑانے میں سب سے آگے رہا۔ ماروی میں مراد نے آخر کار ماروی سے جان چھڑا ہی لی۔ مراد کے غبارے تو ماروی تک نہ پہنچ سکے تاہم امید ہے کہ دشمن کے غبارے مراد کا پیغام ضرور پہنچا دیں گے۔ آخری صفحات پر کاشف زبیر کی نمائندہ خاص پر اثر تحریر ثابت ہوئی۔ ریحانہ کا کردار متاثر کن رہا۔ اس کی نیک فطرت کہ ذرا ذرا سی غلطیوں پر بھی وہ شرمندہ رہی اور حتی المقدور اس کے ازالے کی کوشش بھی کی۔ یہ تحریر بلاشبہ قارئین کے لیے آئینہ ثابت ہوئی جس کے تناظر میں ہم اپنی زندگی کا منظر بخوبی دیکھ سکتے ہیں اور کوئی کی کوتاہی ہو تو اس کو دور کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ منظر امام کی دشمن بکر الطیف پیرائے میں ایک چٹپٹی تحریر تھی جو مزاح کے عنصر کے علاوہ سبق آموز بھی تھی۔ مریم کے خان کی تحریر پرکاری بے حد پسند آئی۔ ایک طویل عرصے سے سسپنس کی تحاریر پڑھنے کی وجہ سے ابتدا میں آغاز سے انداز ہو جاتا ہے لیکن پرکاری ایک ایسی تحریر ثابت ہوئی جس کے بارے میں اختتام تک کوئی حتمی اندازہ قائم کرنے میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس طرح آخر تک دلچسپی برقرار رہی اور کافی عرصے بعد ایسا ہوا۔ طاہر جاوید مغل کرشمہ کے ساتھ موجود تھے۔ ہمیشہ کی طرح انسانی جذبات و احساسات کی عکاسی کرتے نظر آئے۔ شائستہ کا ایک سمجھ دار خاتون ہوتے ہوئے بھی کنول کو اس کے ماضی کے بارے میں ایسی خبر دینا جس کا فائدہ کسی کو نہیں ہوا لیکن کنول اپنی ذات میں بکھر گئی، کچھ جچا نہیں۔ خدنگ عثمانی میں زکریا کے لیے یہ فقرہ موزوں لگا'' جا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سو جا'' تاہم آخر میں والی حران کی طرف سے رابعہ کا تحفہ نا امید سے محرومی کا کچھ مداوا ضرور کر گیا۔ اب کچھ ذکر ہو جائے اپنی محفل کا۔ کرسی صدارت پر پڑوسی ضلع وہاڑی کے ظفر اللہ وڑائچ براجمان نظر آئے۔ موصوف اپنے طویل و پرتکلف تبصرے کی بنیاد پر پہلی بار ہی صدارت کے حقدار بن گئے۔ مبارکاں اور جی آیاں نوں، یادِ ماضی کو بیان کرتے ہوئے مختلف ہستیوں کو آواز دیتے نظر آئے موصوف فلک شیر ملک! آپ کی تمام باتیں درست اور برجستہ ہیں البتہ

تصحیح

اکتوبر 2015ء کے شمارے میں ''بہار سے پہلے'' نامی کہانی سندھی کہانی کار غلام علی کی ہے جس کا ترجمہ نوشابہ صدیقی نے کیا۔ مصنف کا نام سہواً غلط شائع ہو گیا تھا۔

آپ ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ صفدر معاویہ کو جیل سے رہائی کی مبارکباد دے رہے ہیں حالانکہ موصوف جیل میں نہیں پاک آرمی میں ہیں۔ شعر کی پسندیدگی کا شکریہ۔ علی عمران اور حکیم اور جولیٹ نے فاروق کو جھڑکا تھا، آپ کو تو نہیں کہ غصہ کر گئے آپ۔ محمد صفدر معاویہ! ماروی کی فکر نہ کریں۔ محبوب کو اس کے ساتھ بھیجا ہے لندن۔ عبدالجبار رومی انصاری مصری شاہی! آپ نے شاید شیش محل غور سے نہیں پڑھی۔ جولیٹ آغا کی قید سے بھاگ کر آگئی ہے۔ آپ اسے فاروق کا انتظار نہ کروائیں۔ احمد خان توحیدی بھائی پورے 20 ووٹ ہیں آپ کے اور سیزن بھی الیکشن کا چل رہا ہے۔ آپ تو کافی دولت مند ہو گئے ہیں پھر تو... اور ماروی کو مراد نے طلاق دے دی ہے۔ اطہر حسین آپ کی خواہش اس بار پوری ہو چکی ہے۔ طاہر انکل مختصر تحریر کے ساتھ موجود ہیں۔ ثاقب کمال! کمال ہے آپ گم ہوئے تو ملے کیسے؟ کیا غباروں پر پیغام باندھ کر بھیجا تھا آپ نے بھی؟ حنا عروج! ہم سب کی دلی آرزو ہے کہ آپ مکمل صحت یاب ہوں اور سسپنس کی محفل آپ کے نام سے سجتی رہے آمین۔“ (آپ کی شمولیت پر شکر گزار ہیں۔ حنا عروج تمام قارئین کے ساتھ ساتھ ہم سب آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہیں)

✠ **غلام یاسین نوناری**، چوک سرور شہید سے چلے آرہے ہیں ”رات کے دس بجے کا عمل تھا جب رضوان سلطان تنولی کی کال موصول ہوئی۔ انہوں نے سسپنس کی آمد کی خبر دی تو دل مسرت سے بھر گیا۔ دوسرے دن صبح سویرے الانعام نیوز ایجنسی پر پہنچا تو اپنے پیارے رنتیق سسپنس ڈائجسٹ کو سامنے پایا تو بے تابی سے ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا۔ سرورق پر نظر پڑی تو ہٹانا بھول گیا۔ نیم خوابیدہ انداز میں گال پہ ہاتھ رکھے خوب صورت ماہ جبینہ بے حد پیاری لگی۔ گھر آتے ہی سب سے پہلے کاشف زبیر کی تحریر نمائندۂ خاص پر نظر پڑھی، پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ کاشف بھائی نے کمال طریقے سے آخری وقت کے لمحات کا عکس کہانی کی صورت بیان کر دیا۔ ایسی کہانی کاشف صاحب ہی لکھ سکتے ہیں۔ ماما اور ظہیر الدین کا منفی کردار، شہباز کا خوب صورت کردار، عامر اور ریحانہ کے سبق آموز کردار بے حد پسند آئے۔ ماروی میں اب یہ کیا بات ہوئی کہ کبھی کسی کو طلاق کروا دی کسی سے شادی۔ بہر حال اس کے اینڈ کا انتظار رہے گا۔ آصف ملک کی تحریر قربانی نے قہقہے بکھیر دیے ہیں۔ دیر تک اس کہانی کے شگفتہ جملوں کے حصار سے نہیں نکل پایا۔ کافی عرصے بعد طاہر جاوید مغل کی مختصر تحریر پڑھنے کو ملی۔ بے حد خوشی ہوئی۔ شیش محل میں فاروق کا کردار اچھا لگا۔ محفل اشعار میں امتیاز علی، علی عمران، ظفر اللہ وزانچ اور احمد جہانزیب کا انتخاب معیاری تھا۔“

✠ **عادل خان**، چارسدہ سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ”ہر دفعہ کی طرح اس بار بھی سسپنس ڈائجسٹ معطر ہوا کے جھونکوں کی طرح ڈاک سے واپسی پر خوشگواری صبح کو بھائی جان کے ہاتھ سے موصول ہوا۔ سرورق نے لے کر پس ورق تک نہایت دیدہ زیب اور دل فریب سے مسحور کن احساس بنے مسحور رکھا۔ سرورق سے لطف اندوز ہونے کے بعد اشتہارات کو رد کرتے ہوئے فہرست کا جائزہ لیا جہاں ہمارے پسندیدہ رائٹر طمطراق سے موجود تھے۔ فہرست سے سیدھے محفل کا رخ کیا جہاں صدارت کی کرسی ظفر اللہ وزانچ نے سنبھالی تھی۔ تبصرہ شاندار تھا، پڑھ کے مزا آ گیا، بادشاہو! پرانے تبصرہ نگار دوست، قیصر اقبال لالہ، اعجاز راحیل لالہ، حکیم محمد سید رضا شاہ نقوی صاحب، گل مروت، ابرار وارث، سید اکبر شاہ، رضوان تنولی صاحب جیسے کئی دوست کئی ماہ سے غیر حاضر ہیں لہٰذا فوراً حاضر ہو جائیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل پڑھی۔ کہانی ایک ہی نشست میں ختم کی۔ پتا ہی نہیں چلا، آخر میں دل دھڑک اٹھا۔ کہیں فاروق کو کچھ ہو نہ جائے۔ جولیٹ کے ساتھ بھی بڑا سانحہ گزرا۔ ماروی میں مراد کے ساتھ کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔ ماروی محبوب علی کی منکوحہ بنی۔ سریلا پیغام پڑھ کے مزہ آ گیا، سروں میں دل کا حال پہنچانے والے کچھ لوگ بڑے اداکار ہوتے ہیں۔ نمائندۂ خاص بہت حیرت انگیز اور دلچسپ داستان تھی جس نے آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ نمائندۂ خاص یقیناً اللہ عزوجل کی طرف سے بھیجا جانے والا موت کا فرشتہ تھا۔ یقیناً ہم سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اس داستان میں ایک گہرا سبق پوشیدہ تھا۔ اے پروردگار ہم سب کو نیک اور پرہیزگار بنا دے۔“

✠ **معراج محبوب عباسی**، ہری پور، ہزارہ سے تشریف لائے ہیں ”سسپنس میں یہ میری پہلی کاوش ہے۔ امید تو ہے کہ جگہ بھی مل جائے گی (خوش آمدید) ظفر اللہ وزانچ کا خط اول پہ تھا جبکہ رومی انصاری یہاں بھی دھوم مچا رہے تھے۔ بہرحال جس نے بھی جیسا بھی لکھا، اس کے مطابق اسے اتنی ہی مبارکباد۔ کہانیوں میں پہلے نمائندۂ خاص پڑھی کیونکہ کاشف زبیر کے ٹریڈ مارک کے ساتھ آئی تھی۔ زندگی کا کیا بھروسا ایک بلبلے کے مانند ہی تو ہے، نہ جانے کب بلاوا آ جائے اور ہمیں دنیا چھوڑنی پڑے۔ دشمن بکرا میں موصوف فہیم صاحب کو دولت کا اس قدر خمار چڑھا کہ اڑتی پکڑنے کے چکر میں پگڑی بھی اڑا بیٹھا اور جب جناب کو صورتِ حال کا ادراک ہوا تو پھر تو ہاتھوں کے طوطے بھی اڑ گئے اور سب کچھ اڑانے کے بعد تین ہزار کو ہی بھاگتے چور کی لنگوٹی سمجھ کر قبول کرنا پڑا۔ کرشمہ طاہر جاوید مغل کی حساس اور دل کو چھو لینے والی تحریر ثابت ہوئی۔ بعض باتیں پردے میں ہوں تو اچھا ہوتا ہے۔ اگر ظاہر ہو جائیں تو انسان کو بے چین کر دیتی ہیں۔ اس لیے عقل مند وہی ہیں جو قبل از وقت ہی اس ابدی سفر کی تیاری کر لیتے ہیں کیونکہ ہماری آئندہ زندگی کا فیصلہ ہمارے اعمال پہ ہونا ہے۔ راہ مسدود میں بڑھیا نے چور کو عجب چالاکی سے قابو کیا۔ یعنی ”آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا“۔ سریلا پیغام میں جیرالڈ اور سیگی کی زبردست ذہنی ہم آہنگی نے ایک بڑی واردات کو بڑے احسن طریقے سے ناکام بنا دیا۔ بے بنیاد میں بیگ صاحب نے اپنی ذہنی فراست اور دانش مندی سے نہ صرف اپنے مؤکل کو بچایا بلکہ اور بجنل قاتل کو بھی منظرِ عام پر لے آئے۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔“

✠ **عبدالجبار رومی انصاری**، چوہنگ لاہور سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں

”دل جکڑا ہے میرا محبت کی زنجیر سے
اپنی مجبوریوں کی پتا کہوں کس دلگیر سے

زنجیر میں جکڑا دل کچھ اسی شعر کی عکاسی کر رہا تھا اور دلکش گیسو پھیلائے پلکیں جھکائے گہری سوچوں میں گم پر پلی نظر کے لباس میں خوب صورت نازنین ٹائٹل کو جاذبِ نظر بنا رہی تھی۔ 26 اکتوبر کو 8.1 کی شدت کے زلزلے سے زمین جھول گئی سب سے زیادہ نقصان خیبر پختونخوا میں ہوا۔ سیکڑوں لوگ اموات کا شکار ہوگئے۔ 10 سال قبل 8 اکتوبر کے زلزلے کی یاد تازہ کردی۔ اس مشکل گھڑی میں ہم اپنے اہلِ وطن کے ساتھ ہیں۔ جون ایلیا کی مکالمہ نویسی زبردست رہی، بالکل کسی طرح تو اپنے آپ سے باہر نکلنا چاہیے۔ کنویں کے مینڈک کی طرح مختصر سی جگہ کو ہی کل کائنات نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ ہر شخص کے لیے الگ نمائندۂ خاص ہوتا ہے اور کسی چیز کی اصل اہمیت اسی وقت واضح ہوتی ہے جب وہ آپ سے چھننے والی ہو اور آخری وقت میں ریحانہ کو بھی اپنی اہمیت اور شخصیت کا اندازہ ہوگیا تھا اسی لیے اسے دنیا کے چھن جانے کا ذرا بھی پچھتاوا نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نمائندۂ خاص کے ساتھ جاتے ہوئے بہت خوش اور مطمئن تھی۔ اس دفعہ نمائندۂ خاص سسپنس کی بہترین کہانی رہی جس سے عبرت انگیز اور اپنی زندگی سنوارنے کا اچھا تاثر ملتا ہے۔ کاشف زبیر صاحب داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ شیش محل نے اس دفعہ بہت غمزدہ کیا جولیٹ اور فاروق پر تو جیسے دکھوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ایسے میں رحمن دادا نے اپنی جواں مردی اور ہمت سے سب کو سنبھالے رکھا۔ شیش محل کے کردار آگے چل کے دیکھیں کیا رخ اختیار کرتے ہیں بھرپور تجسس باقی ہے۔ چالاک بڑھیا نے رنگ بکھیر کر سنگی کی راہ مسدود کردی۔ واقعی چوروں کو پڑ گئے مور سلیم انور نے ہنسی بکھیر دی۔ I Love you بولتے سروں نے لٹیروں کو ہتھکڑی لگوا دی۔ باتوں کو موسیقی کا دلچسپ انداز دینے اور سمجھنے والے میاں بیوی دلچسپی کا حامل تھے۔ امجد رئیس کی سریلا پیغام دلچسپ رہی۔ الیاس سیتاپوری نے خدنگ عثمانی کے تیسرے حصے میں مسرور کردیا۔ ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ ضرورت کے تحت مراد کی مرینہ سے شادی ہوگئی لیکن مراد کی ماردی میں کسک ختم نہ ہوسکی۔ غریب الوطن مرشد حضرت حافظ محمود کے احوالِ زندگی پڑھ کے بزرگوں کی روحانی کشش کا اندازہ ہوتا ہے۔ خطوط کی محفل بھی اپنے ترش و شیریں الفاظ سے مزین سسپنس کی رونق بڑھا رہی تھی۔ ظفر اللہ وڑائچ پہلی دفعہ آئے اور چھائے اور بالکل انسان فانی ہے اور آخرت کے لیے زادِ راہ ساتھ رکھے تاکہ اللہ کی بارگاہ میں سرخرو ہوسکے۔ فلک شیر آپ کا تبصرہ پسند آیا۔ نادر سیال ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ حنا عروج اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے، آپ کا شکوہ بجا۔ اس حالت میں بھی ٹائم نکال کے تبصرہ لکھا، بہت اچھا لگا۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی زبردست رہے اور طاہرہ گلزار، زوبیا اعجاز، شاداب اینڈ ماہتاب، حاجرہ ہاشمی جیبس سسٹرز، ہارون ہیرس، سانول یوسف، حبیب الرحمن آپ سب بھی تشریف لا کے اپنی تبصرہ نگاری سے محفل کو رونق بخشیں۔ محفلِ شعر و سخن میں بلقیس بانو، عالیہ رحیم اور زرمین کے اشعار بہت اچھے لگے۔

✠ **مرزا طاہر الدین بیگ**، میر پور خاص سے چلے آرہے ہیں ''وطنِ عزیز پر زلزلے کی صورت میں جو سانحہ گزرا وہ ہم سب کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ اتنا زبردست زلزلہ اللہ تعالیٰ پاکستان کو اپنی امان میں رکھے، آمین اور آنے والی آفات سے بچائے، آمین۔ لکھنے کو تو بہت کچھ ہے مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ اللہ سب کو جو زلزلے کی لپیٹ سے متاثر ہیں ہمت، استقلال اور صبرِ جمیل کی توفیق عطا کرے، آمین۔ ان دو صاحبان کے لیے جن کے خط پہلی بار شاملِ اشاعت ہوئے، دعا اللہ تعالیٰ ان کو صحت اور خوشحالی عطا کرے کہ وہ اسی طرح سسپنس کے صفحات پر اپنی تحریروں کے رنگ بکھیرتے رہیں، آمین۔ اتنا شدید حادثہ ہے کہ دل خون کے آنسو روتا ہے کچھ لکھنے اور پڑھنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔ لب پر دعا ہے کہ یا اللہ ہم سب بہت گناہ گار اور خطاکار بندے ہیں تو رحیم اور کریم ہے۔ نبی کریم ﷺ کے صدقے میں ہماری خطاؤں کو معاف فرما۔ معاف فرما اور ہم کو اور ہمارے حکمرانوں کو سیدھا اور سچا راستہ دکھا۔ وہ راستہ جس پر تیرا کرم اور فضل ہو، آمین۔ پاکستان کے وزیرِ اعظم خان لیاقت علی خان کے آخری الفاظ اللہ پاکستان کی حفاظت کرے، آمین۔''

✠ **رانا حبیب الرحمن**، سینٹرل جیل لاہور سے پچھلے شمارے پر تبصرہ کرتے ہوئے ''سرورق پر مرد حسین دوشیزہ کے لیے تارے توڑ کر لانے کے بجائے چاند کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا شاید کہ اسے پتا ہو کہ عیدالاضحیٰ کا چاند ہے۔ انشائیہ میں جون ایلیا اپنا مژدہ سنا رہے تھے لیکن کس کو؟ اداریہ بہترین تھا صفدر معاویہ جناب مبارکاں اور بھائی ایم ایم عالم کی طرح کا آدھی صدی گزر جانے کے بعد تک کون شیر دل پیدا ہوا پاکستان میں ہمیں بھی پتا چلے، دعاؤں میں یاد رکھنے کے لیے شکریہ۔ بہن بھائیوں کی دعاؤں کے طفیل اچانک میں رہا ہو کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ روشنی رشید دھمیال کیمپ راولپنڈی، شبانہ حسن سمیت تمام پرانے دوستوں کی محفل میں کمی محسوس ہو رہی ہے۔ التماس ہے کہ فوراً سے پہلے حاضری لگوائیں ورنہ...... شبانہ حسن لاہور آپ کہاں گم ہیں۔ آپ اور ناز پری فوراً محفل میں آئیں اور ساتھ ہی رضوان تنولی کو لیتی آئیں۔ جیل والے دوست ولدیت بھی لکھیں۔ خدنگ عثمانی کی دوسری قسط بہترین رہی۔ معلوم ہوتا ہے بادشاہ سلامت ناہید کوزکریا کے حوالے انعام کے طور پر سپرد کردیں گے۔ شیش محل کی دوسری قسط بھی بہترین بلکہ ڈبل بہترین تھی۔ ماروی کی قسط بے حد بور تھی، پسند نہیں آئی۔ کم گشتہ بھی اچھی کہانی ثابت ہوئی جو حقیقت سے نزدیک ہی گھومتی تھی۔ شعر و سخن میں انجم کمال، ریاض بٹ، ماہین فاطمہ، شازیہ اور ہادیہ وغیرہ کے اشعار بہترین تھے۔ شبانہ حسن بھی بہترین شعر کے ساتھ حاضر تھیں۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔
قیصر اقبال گجہ، ککول، ضلع جھکڑ۔ ابرار وارث، ستد علیا نوالی۔ ناصر محمود خان، میر پور خاص۔ سید محی الدین اشفاق، فتح پور۔ اعجاز احمد راحیل، ساہیوال۔ مہتاب احمد شیروانی، حیدرآباد۔ ثاقب کمال، کراچی۔ ناہید اختر، اسلام آباد۔ قاسم کمال، ملتان۔ راجہ امین، لاہور۔ رضوان احمد، کورنگی کراچی۔ حنا عروج، کراچی۔

خنجر

خانی

ایم اے راحت

چوتھا و آخری حصہ

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے عجیب مزاج کے لوگ پیدا کیے... جنہوں نے آگے چل کر کسی نہ کسی حوالے سے اپنی ذات کو ایک شناخت دی، جو فنا کے مرحلے سے گزرنے کے بعد بھی باقی رہ جاتی ہے... یہی حال اس کا بھی تھا جس کی زندگی میں عجیب و غریب موڑ آئے اور اس نے اپنے طریقے سے ان کا سامنا کیا... ماضی ایک ایسا قیدخانہ ہے جسے وہ اپنے حصار میں قید کرلے اس کا ذکر آنے والے دنوں میں کسی نہ کسی حوالے سے ضرور دہرایا جاتا ہے... تاریخ کا یہی اصول ہے، دن پر دن تو گزرتے جاتے ہیں مگر ان داستانوں پر وقت کی گرد نہیں جمتی... وہ بھی کسی سرزمین کا بادشاہ نہ تھا اس کے باوجود اس کے حالات کا تغیر، واقعات کا تسلسل اور جذبات کا طوفان اس کی شخصیت کو ایک الگ ہی رنگ دے گیا۔ جسے بولنے کی جسارت نہ تھی، چلنے کا سلیقہ اور جینے کا حوصلہ نہ تھا... راتوں کی تنہائیوں میں ڈر جانے والی ذات جب ایک نئے ولولے سے زندگی کا ہنر سیکھ لے تو دنیا واقعی حیران رہ جاتی ہے... اور یہی کارنامہ اس نے بھی انجام دے کر کتنی ہی زبانوں کو گنگ کردیا... اور یہ سب مقدر کی مہربانیوں سے ہی ممکن ہوتا ہے کہ کوئی تاریخ کے ایک اہم کردار اور دلچسپ داستان میں ڈھل جائے۔

ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

استاد ارسلان ابھی تک اپنے منصوبے میں پوری طرح کامیاب تھا لیکن اب ربابہ کی موجودگی نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ والیِ حران کی اس غیر معمولی سخاوت نے اس کو ایک ایسی فکر سے دوچار کردیا تھا جو اس کی توجہ اور انہماک کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا سبب بن گئی تھی۔ سلطانی مقصد اور اس مقصد کو ربابہ سے چھپائے رکھنا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سلطان کو ربابہ کا ان دونوں کے ساتھ رہنا بالکل پسند نہ آئے گا۔ اس کے خیال میں ربابہ ایک مصیبت تھی جو اس کے گلے میں ڈال دی گئی تھی۔ اسے زکریا پر بڑا غصہ آرہا تھا جو عشق کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ قافلہ حلب کی طرف بڑھا چلا جارہا تھا۔ اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں اور مویشیوں کی بھاگ دوڑ سے بلند ہونے والے گرد و غبار نے فضا کو آلودہ کردیا تھا۔

زکریا ہر بات سے بے نیاز ربابہ کے آس پاس چل رہا تھا۔ اس کی نظریں بار بار ربابہ کی طرف اٹھ جاتیں۔ ربابہ بھی اپنی نقاب کو دونوں آنکھوں سے ہٹائے سراپا شوق بن



گئی تھی۔ دونوں کے گھوڑوں نے کئی بار ٹھوکریں بھی کھائیں اور وہ گرتے گرتے بچے۔ استاد ارسلان کو ان دونوں پر غصہ آرہا تھا۔ وہ انہیں ڈانٹنا چاہتا تھا مگر کچھ سوچ کر رک جاتا تھا۔ آخر حلب سے چند میل پہلے ہی قافلے نے پڑاؤ کیا۔ زکریا رابعہ کی دید میں اتنا منہمک تھا کہ اس کے گھوڑے نے ایک بڑے پتھر سے ٹھوکر کھائی اور زکریا کو لے کر گر گیا لیکن زکریا نے گرنے سے پہلے ہی چھلانگ لگادی اور پتھریلی زمین پر گر کر لہولہان ہوگیا، رابعہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ استاد ارسلان فوری طور پر کچھ بھی نہ سمجھ سکا لیکن جب زکریا کو ایک طرف لہولہان پڑا دیکھا تو اس کے قریب پہنچ گیا اور پھرتی سے کود کر زکریا کو اٹھالیا، پوچھا۔ ”زکریا! یہ ہوا کیا؟ تو گرا کیونکر؟“

زکریا نے شرمندگی سے جواب دیا۔ ”گھوڑے نے پتھر سے ٹھوکر کھائی اور میں اس کے پیٹ تلے دبنے سے بچنے کے لیے بے اختیار کود پڑا اور سنگریزوں نے مجھے زخمی کردیا۔“

استاد ارسلان نے اپنے عمامے کو پھاڑ کر زکریا کے زخموں سے بہتے ہوئے خون کو پونچھا اور سہارا دے کر اپنے گھوڑے کی طرف لے چلا۔ قافلہ پڑاؤ کررہا تھا اور چاروں طرف سے ٹھک ٹھک کی آوازیں آرہی تھیں۔ قافلے والے بڑی مستعدی سے میخیں ٹھونک رہے تھے اور ان سے خیموں کی ڈوریاں باندھ کر اپنے اپنے خیمے کھڑے کررہے تھے۔ قریب کے کئی آدمی زکریا اور استاد ارسلان کے پاس آئے اور ان سے اظہارِ ہمدردی کیا۔ رابعہ بھی اپنے گھوڑے سے اتر کر ان دونوں کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ وہ بہت بے چین تھی اور یہ جاننا چاہتی تھی کہ زکریا کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔

چند ہمدردوں کی مدد سے استاد ارسلان نے اپنا اور زکریا کا خیمہ کھڑا کیا۔ رابعہ کے لیے ایک الگ خیمہ نصب ہوا۔ رابعہ نے خیمے کے اندر زکریا کے زخمی حصوں کو دھویا اور ان کی مرہم پٹی کردی۔ استاد ارسلان ان دونوں سے ذرا دور چٹائی پر بیٹھا انہیں غضبناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جب مرہم پٹی ہوگئی تو ارسلان نے رابعہ سے کہا۔ ”رابعہ! اب تو اپنے خیمے میں جا اور کچھ دیر آرام کرلے کیونکہ تو بہت زیادہ تھکی تھکی نظر آرہی ہے۔“

رابعہ نے جواب دیا۔ ”میں ذرا بھی نہیں تھکی۔ ایسی بھی کیا جلدی...... آرام بھی کرلوں گی۔“

زکریا نے درخواست کی۔ ”بس ذرا دیر اور پھر رابعہ اپنے خیمے میں چلی جائے گی۔“

استاد ارسلان نے سختی سے کہا۔ ”زکریا اور رابعہ! تم دونوں سن لو، میں کون ہوں اور میرا حکم کیا معنی رکھتا ہے۔ یہ بات تمہیں ہر وقت ذہن نشین رکھنی ہوگی۔“

اس کے بعد استاد ارسلان خود ہی باہر چلا گیا۔ زکریا اور رابعہ نے ایک دوسرے کو تشویشناک اور سوالیہ نظروں سے دیکھا اور بجھی بجھی مسکراہٹ سے اپنی نظریں جھکالیں۔ زکریا نے کہا۔ ”ہمیں پدر محترم کو ناراض نہیں کرنا چاہیے۔“

رابعہ نے جواب دیا۔ ”انہیں ناراض کس نے کیا؟ وہ تو خود ہی ناراض ہوکر چلے گئے۔“

زکریا اٹھا اور کچھ کہے سنے بغیر باہر نکل گیا۔ وہ ادھر ادھر استاد ارسلان کو تلاش کرنے لگا۔ رابعہ خیمے کے در پر آڑ سے زکریا کو جاتے دیکھتی رہی۔ استاد ارسلان قافلے کے بیچوں بیچ زیتون کے سائے تلے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں۔ زکریا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ استاد ارسلان نے ذرا سی آہٹ جو محسوس کی تو آنکھیں کھول دیں اور زکریا کو اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر سرد مہری سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

زکریا نے کہا۔ ”استادِ محترم! کیا آپ ناراض ہیں مجھ سے؟“

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ”اگر میں ناراض ہوں تو تم سوال کیے بغیر ہی اس سے واقف ہو۔“

زکریا استاد کے روبرو دوزانو بیٹھ گیا، پوچھا۔ ”پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟“

استاد ارسلان گویا پھٹ پڑا۔ ”تجھے میں کیا حکم دوں گا؟ تو اپنی مرضی اور خواہش کا غلام ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ ہم دونوں یہ دھکے کیوں کھا رہے ہیں؟“

زکریا نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! والیِ حران نے از خود بطور تحفہ رابعہ میرے حوالے کردی۔ اب اس میں میں کس حد تک قصوروار ہوں، از روئے انصاف آپ خود بتادیں۔“

استاد ارسلان نے جھنجلائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بالکل غلط! پہلے تو نے رابعہ میں غیر معمولی دلچسپی لی، اس کے بعد والیِ حران نے اس لالچ میں کہ میں اس کی اس دریا دلی کا ذکر اپنے سفرنامے میں نہایت شاندار طور پر کروں گا، رابعہ بطور تحفہ بخش دی۔ اب تو ہی بتا کہ میں اس مصیبت کو کہاں کہاں لیے پھروں گا......؟“

زکریا نے آزردگی سے پوچھا۔ ”استاد محترم! رابعہ مصیبت ہے؟“

ارسلان نے جواب دیا۔ ”ہاں! وہ مصیبت ہے،

بہت بڑی مصیبت۔ اس مصیبت کا صحیح اندازہ تجھے اس وقت ہوگا جب تو سلطان کی خدمت میں حاضری دے گا۔''

زکریا نے دل برداشتہ ہوکر کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں اپنی راہ بدل دوں گا اور رباب کو ساتھ لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گوشۂ گمنامی میں چلا جاؤں گا۔ میں سلطان کے پاس نہیں جاؤں گا۔''

استاد ارسلان تڑپ کر کھڑا ہوگیا۔ ''ایسا نہیں ہوسکتا۔ تو میرے ساتھ آیا ہے، میرے ساتھ رہے گا اور تجھ کو میرے ساتھ ہی سلطان کی بارگاہ میں حاضری دینا ہوگی۔''

زکریا ابھی سرکشی پر مائل تھا۔ بولا۔ ''ناہید کے بعد کوئی دوسری بڑی غلطی میں ہرگز نہیں کروں گا۔''

استاد ارسلان نے متنبہ کیا۔ ''تو یقیناً اپنی زندگی کا دشمن ہے اور اگر زندہ رہ گیا تو تیرا مستقبل بہت تاریک ہے۔ جب رباب کو تیری اصل حیثیت کا علم ہوجائے گا تو وہ تیری وفادار نہیں رہے گی۔ اس وقت تو کہیں کا بھی نہیں رہے گا۔''

زکریا کے دل و دماغ میں جنگ چھڑ گئی۔ استاد ارسلان کی باتوں میں وزن تھا۔ اس نے یہ حقیقت فوراً ہی تسلیم کرلی کہ وہ سلطان اور استاد ارسلان کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے، اسے اپنی بے بسی پر رونا آرہا تھا۔ اس نے فوراً ہی ہتھیار ڈال دیے، بڑی معصومیت سے...... استاد ارسلان کی طرف دیکھا۔ ''استاد محترم! پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''جو میں کروں وہی تو کر! تو میری اتباع کرتا رہ......''

زکریا نے کہا۔ ''لیکن استاد محترم! یہ بات تو طے شدہ ہے کہ رباب مجھے بخشی گئی ہے، اس میں کسی اور کا کوئی حصہ نہیں۔''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''بے شک وہ تجھے دی گئی ہے لیکن وہ سلطان کی امانت ہے۔ سلطان کی مرضی کے خلاف تو اس پر اپنی ملک ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اگر تو میرے ساتھ نہ ہوتا، تو اس گراں بہا عطیے سے محروم رہتا۔''

زکریا نے اپنا سر پکڑ لیا۔ بولا۔ ''لیکن میں کروں کیا؟ میری تو کچھ سمجھ میں آنہیں رہا۔''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''تو رباب سے.... بے تعلق اور دور رہ...... اس وقت تک اس سے دور دور رہ، جب تک تجھے سلطان کی طرف سے ساتھ رہنے کی اجازت نہ مل جائے۔''

زکریا پھر بھڑکنے لگا۔ تندوتیز لہجے میں بولا۔ ''استاد محترم! ہم آپ سلطان کے کارکن یا خدمت گار کے علاوہ بھی تو کچھ ہیں۔ ہم انسان بھی تو ہیں۔ آپ ہمیشہ اور ہر مرحلے پر سلطان ہی کے مفاد میں کیوں سوچتے ہیں، میرے مفاد اور میرے ذوق وشوق کو کیوں بھلادیتے ہیں؟''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''میں تیرے مفاد میں زیادہ سوچ رہا ہوں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں تیرے ہی مفاد میں سوچتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تو کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جس سے تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔''

وہ دونوں انہی باتوں میں دیر تک الجھے رہے۔ استاد ارسلان زکریا کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا اور زکریا اپنی بات پر اڑا رہا۔ استاد ارسلان کی ہر دلیل کے جواب میں وہ یہی کہتا تھا کہ اس کو یا اس جیسے دوسرے نوجوانوں کو عشق کرنے کی اجازت تو ہونی ہی چاہیے کیونکہ عشق اور محبت خالص ذاتی اور انفرادی مسئلہ ہے۔ آخر میں جب یہ دونوں اپنے خیمے میں واپس پہنچے تو رباب انہیں فکر وتشویش سے دیکھنے لگی۔ زکریا سخت دباؤ میں تھا، ایک طرف کیف آور جذبات تھے اور دوسری طرف احتیاط، سلطان کا خوف۔

رباب زکریا کو اپنے خیمے میں لے گئی۔ استاد ارسلان نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ بس دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

رباب خیمے میں بچھے ہوئے قالین پر بیٹھ گئی اور زکریا سے درخواست کی کہ وہ اس کے پاس ہی بیٹھ جائے لیکن زکریا نہیں بیٹھا، تصویر حیرت بنا کھڑا رہا۔

رباب نے پوچھا۔ ''آخر تم میرے پاس بیٹھتے کیوں نہیں؟''

زکریا کے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں تھا، غیرارادی طور پر زبان سے نکل گیا۔ ''رباب! افسوس کہ مجھے منع کیا گیا ہے مگر میں تم سے خلاملا نہیں رکھ سکتا۔''

رباب نے پوچھا۔ ''کس نے منع کیا ہے؟ کیا تمہارے...... باپ نے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''ہاں، تم یہی سمجھ لو۔''

رباب کے سینے میں سمندر امڈنے لگا۔ بڑے کرب سے پوچھا۔ ''یہ کیوں؟ کیا یہ شخص تمہارا باپ نہیں ہے؟''

زکریا کانپ گیا۔ وہ ڈر گیا کہ کہیں رباب کو سب کچھ معلوم تو نہیں ہوگیا، جواب دیا۔ ''وہ میرا باپ ہی تو ہے، وہ مجھ سے کہتا ہے کہ اگر میں ابھی سے ان چکروں میں پڑ گیا تو دنیا کی سیاحت کس طرح کروں گا اور وہ جو کچھ بھی کہتا ہے، میری فلاح، میری بہبود میں کہتا ہے۔ مجھ کو اپنے باپ کی نصیحتوں پر کسی حد تک تو عمل کرنا ہی پڑے گا۔''

رباب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے تمہارا خیال درست ہو، ورنہ اگر تم مجھ سے پوچھو تو میں یہی کہوں گی کہ مجھے تمہارے باپ کی نیت پر شبہ ہوتا ہے۔ کہیں یہ پدر

بزرگوار خود ہی مجھ سے محبت تو نہیں کرنے لگے۔ ورنہ یہ ناممکن ہے کہ ایک باپ اپنی نوجوان اولاد کو اس طرح حاسدانہ انداز میں رد کرے۔''

زکریا نے چونک کر ربابہ کی طرف دیکھا، بولا۔''تم میرے باپ پر شرمناک الزام لگا رہی ہو۔''

ربابہ نے ٹھنڈے دل سے جواب دیا۔''میرے شبہے کے جواب میں اس وقت تم جو کچھ بھی کہو گے، وہ قبل از وقت ہوگا۔ میں نے جو کچھ کہا ہے، اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرو اور اس وقت کا انتظار کرو جب میرے شبہے کی سچائی یا جھوٹ تم پر ثابت ہو جائے۔''

زکریا یوں تو ربابہ کو جھٹلاتا ہی رہا مگر شبہے کی ہلکی سی رمق اس کے دل میں بھی جگہ کر چکی تھی۔ اس نے سوچا، ہوسکتا ہے ربابہ سچ ہی کہہ رہی ہو۔ اس نے کہا۔''ربابہ! بفرضِ محال اگر تمہارا شبہ درست ہی ہو تو......''

ربابہ نے جواب دیا۔''تو پھر کیا، یہ فیصلہ تو تمہیں کرنا پڑے گا کہ کیا کرنا ہے۔''

زکریا ربابہ کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ دونوں نے فرطِ جذبات میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ زکریا ربابہ کی مخروطی خوبصورت انگلیوں کو آہستہ آہستہ مسلنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے سے نظریں ملاتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ دونوں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور دونوں ہی کے پاس اس وقت نہ زبان تھی، نہ آنکھ نہ طاقت......

جب یہ لوگ حلب میں داخل ہوئے تو قافلے نے حلب کی جامع مسجد کے چاروں طرف اپنا پڑاؤ کیا۔ کچھ کا سفر حلب میں ختم ہو چکا تھا اور کچھ ایسے تھے جنہیں آگے چلا جانا تھا۔ استاد ارسلان نے اپنا خیمہ جامع مسجد کے داہنی طرف نصب کرایا۔ بیچوں بیچ شہر میں ایک نیم مدور پہاڑی کسی مقبرے کے قبے کی طرح اوپر تک چلی گئی تھی۔ اس پہاڑی پر قلعہ تھا اور اس قلعے میں سلطان قانصوہ کا قیام تھا۔

زکریا اور استاد ارسلان نے تقریباً ایک ہی وقت میں الگ الگ مگر ایک ہی بات کی۔ استاد ارسلان نے کہا۔''میرے بیٹے! دو چار دن میں ہم لوگ سلطان کی خدمت میں پہنچ چکے ہوں گے۔''

زکریا نے کہا۔''ہاں، شاید کل یا پرسوں تک ایسا ہو جائے۔''

حلب کے بازاروں میں زیادہ وسعت نہیں تھی۔ جامع مسجد کے چاروں طرف اس کے دروازوں کے سامنے دورویہ دکانوں کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں اور درمیانی سڑکوں پر چوبی چھتیں تھیں جس سے دن میں سورج کی تمازت سے لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی تھی۔ استاد ارسلان اور زکریا نے حلب والوں کو نرم اور رنگین لباسوں میں گھومتے پھرتے دیکھا۔

ظہر کی نماز جامع مسجد میں ادا کی۔ استاد ارسلان تو نماز پڑھ کر مسجد سے نکل آیا اور چوبی چھتوں کے نیچے گھوم پھر کر دکانوں میں بھری ہوئی ان اشیا کو دیکھتا رہا جو ایشیائے کوچک، ایران اور بغداد وغیرہ سے منگوا کر سجائی گئی تھیں۔ یہاں کپڑے کی دکانیں بھی تھیں اور برتنوں کی بھی۔ جہاں اناج کی دکانیں تھیں وہاں دکانوں کے سامنے پختہ فرش پر مختلف اجناس کے ڈھیر لگا دیے گئے تھے۔ کہیں صرف اسلحہ بک رہا تھا، تلواریں، ڈھالیں تیر کمان، تیروں سے بھرے ہوئے خوبصورت ترکش، خنجر، بغدے، شمشیریں، خود، زنجیریں اور زرہ بکتر۔ اس نوع کی دوسری بہت سی چیزیں۔ استاد ارسلان کو حلب کے بازار بہت اچھے لگے۔

زکریا ظہر کی نماز پڑھ چکنے کے بعد بھی مسجد ہی میں موجود رہا۔ پریشانی میں اس کو خدا کی یاد بڑی تقویت پہنچا رہی تھی۔ اس نے سجدے میں گر کر رو رو کر دعا مانگی کہ اس کو سلطان کی غلامی سے نجات دلائی جائے۔ وہ ربابہ کو اپنے رب سے اختیار اور آزادی کے ساتھ مانگ رہا تھا۔

جب وہ سجدے میں گڑگڑا رہا تھا تو اس نے اپنے قریب ہی بیٹھے ہوئے چند آدمیوں کی دلچسپ باتیں سنیں۔ ان میں کوئی بوڑھا کہہ رہا تھا۔''شاہِ ایران کا سلطان قانصوہ کی خدمت میں جو وفد آیا ہے، کچھ پتا ہے کہ اس کی سلطان سے کب ملاقات ہوگی؟''

کسی نے جواب دیا۔''جب سلطان قانصوہ اس کو باریابی کی اجازت دیں گے اسی دن وہ سلطان سے ملاقات کرلے گا۔''

بوڑھے نے پوچھا۔''لیکن یہ وفد آیا کیوں؟''

کسی نے پھر جواب دیا۔''یہ وفد اس ناچیز کی رائے میں اس لیے آیا ہے کہ ہمارے سلطان سے کچھ مفاہمانہ گفتگو کرے۔ ان دنوں شاہ ایران ترکی کے سلطان سلیم کے ہاتھوں آوارہ و سرگرداں پھر رہا ہے۔ ممکن ہے شاہ ایران خود میں جنگ کی سکت نہ پا کر ہمارے سلطان کو سلطان سلیم کے مدمقابل کھڑا کر دینا چاہتا ہو۔''

کئی آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔''بے شک، بے شک ایسا ہوسکتا ہے، یہ کچھ مشکل نہیں۔''

زکریا نے سوچا، یہ خبر بہر طور استاد ارسلان تک پہنچنا

چاہیے پھر وہ... ڈر گیا اگر استاد ارسلان نے صبر و شکر سے کام نہ لیا اور گھبرا کر کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھے تو اس کا کیا ہوگا؟

جب وہ مسجد سے باہر آرہا تھا تو اس کی نظر اچانک منبر کے اس مسدود حصے پر پڑ گئی جہاں ہاتھی دانت اور آبنوس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے کام لے کر بڑی شاندار سجاوٹ کی گئی تھی۔ زکریا کچھ دیر تو اس کی دلکشی اور حسن میں کھویا رہا لیکن پھر جیسے ہی یہ یاد آیا کہ وہ کسی خاص کام سے یہاں آیا ہے تو اس نے استاد ارسلان کی تلاش شروع کر دی۔ جب وہ مسجد میں نہیں ملا تو وہ باہر نکلا اور مسقف چوبی شاہراہوں پر استاد ارسلان کو تلاش کرتا رہا۔ آخر کار وہ ایک ٹھٹھیرے کی دکان پر مل گیا۔ وہ استاد ارسلان کے سامنے یوں کھڑا ہو گیا گویا وہ دنیا کا سب سے بڑا مسکین اور مظلوم انسان ہے۔

استاد ارسلان نے اس کو اپنے پاس بلا کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے صاحبزادے..... خیریت تو ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''آپ نے کیا وقت بتایا ہے؟ بتائیے تو سہی، پھر میں آپ سے انتہائی پوشیدہ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

استاد ارسلان کو غصہ آرہا تھا لیکن غصے کو پی لیا۔ اس نے ذرا سختی سے کہا۔ ''صاحبزادے! یا تو تم پاگل ہو گئے ہو یا پھر میں؟''

زکریا نے اپنے استاد کی گراں بار بات کو خندہ پیشانی سے سہہ لیا۔ مسکرا کر جواب دیا۔ ''ہمیں اپنے سفرنامے میں چند خاص باتیں لکھنا ہیں، آپ میرے ساتھ چلیے اور سفرنامے میں کچھ لکھ کر جو چاہے، کرتے رہیے۔''

استاد ارسلان دکان سے اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیا، راستے میں اس نے ساری بات بتا دی۔ استاد ارسلان نے آہستہ سے کہا۔ ''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہمیں شاہ ایران کے وفد سے پہلے سلطان سے مل لینا چاہیے۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''میرا اپنا بھی یہی خیال ہے لیکن میں بہت خوف زدہ ہوں۔''

استاد ارسلان نے پوچھا۔ ''خوف زدہ کیوں؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''شاہ ایران کے وفد میں وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جنہیں میں یا جو مجھے پہلے ہی سے جانتے ہوں کیونکہ چالاک دشمن کے ہر وار سے ہوشیار اور خبردار رہنا چاہیے۔''

استاد ارسلان نے بے نیازی سے کہا۔ ''تم اس کی فکر نہ کرو..... اگر ایسا ہوا تو میں تمہیں ان سے دور رکھوں گا۔''

جب یہ دونوں اپنے خیمے میں پہنچے تو انہیں دونوں تاجر انتظار کرتے ہوئے ملے۔ وہ تاجر، جو والیٔ حران کے محل میں مل چکے تھے دونوں نے مسکراتے ہوئے استاد ارسلان کو سلام کیا اور ادب سے کھڑے ہو گئے۔ استاد ارسلان ان دونوں کی بے موقع آمد سے پریشان ہو گیا۔ وہ ان دونوں کو ٹال دینا چاہتا تھا۔ بے مروتی سے پوچھا۔ ''تم دونوں کا مجھ سے کوئی خاص کام؟''

ایک نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''جناب والا! آپ دونوں سیاح ہیں اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ سلطان قانصوہ کو شرفِ میزبانی بخشنے والے ہیں۔ کیا سلطان کے دربار میں ہمارے جیسی چھوٹی مچھلیوں کے لیے بھی گنجائش نکل سکتی ہے؟''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

تاجر نے جواب دیا۔ ''صرف یہ کہ آپ کے توسط سے سلطان سے ملاقات...... اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''افسوس کہ ابھی تک ہم خود سلطان سے ملاقات نہیں کر سکے ہیں، دو چار دن بعد پھر ملنا..... ممکن ہے تمہارا کام بھی ہو جائے۔''

زکریا ان کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا تھا، ایک تاجر نے زکریا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا یہ آپ کا خدمت گار ہے؟''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''خدمت گار نہیں، میرا بیٹا ہے۔ خبردار جو آئندہ ایسی زبان استعمال کی میرے بیٹے کے خلاف۔''

تاجر معذرت کرنے لگا، دوسرے تاجر نے پانی کی خواہش کی۔ زکریا اس کے لیے پانی لینے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی معذرت خواہ تاجر نے استاد ارسلان کی طرف کاغذ کا ایک پرچہ بڑھا دیا۔ اس نے بڑی بے تابی سے اس کو پڑھا۔ اس میں چند سطریں لکھی تھیں۔

''استاد ارسلان! اپنی معلومات ان دونوں میں سے کسی کو بھی دے سکتے ہیں، مجھے مل جائیں گی...... سنان پاشا۔''

استاد ارسلان نے پرزے کو چھپا لیا اور ان دونوں کو بڑے غور سے دیکھا۔ وہ دونوں نظریں نیچی کیے مسکرا رہے تھے۔ ایک نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ کی خدمت کے لیے ہم دونوں کے علاوہ بھی موجود ہیں، جو اس طرح ملتے رہیں گے۔''

زکریا پانی لے کر آیا۔ ایک نے پیا تو دوسرے نے مطالبہ کر دیا۔

کچھ دیر بعد استاد ارسلان نے بڑی نرمی سے کہا۔ ''پہلے ہم دونوں سلطان قانصوہ سے مل لیں، اس کے بعد تم دونوں کو بھی ملوا دیں گے۔''

زکریا حیران تھا کہ کچھ دیر پہلے تو استاد ارسلان ان دونوں سے ناراض تھے اور اب اتنے مہربان ہیں کہ سلطان قانصوہ سے ملاقات کرا دینے کا وعدہ کر رہے ہیں۔

استاد ارسلان نے ان دونوں سے پوچھا۔ ''تمہارا قیام کہاں ہے؟''

تاجر نے جواب دیا۔ ''کپڑا بازار کے عقب میں۔''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''اگر میں تم سے ملنا چاہوں تو؟''

تاجر نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''آپ کہاں زحمت کریں گے، ہم خود ہی تلاش کرلیں گے آپ کو۔''

استاد ارسلان نے ان دونوں کو شام کا کھانا اپنے ساتھ کھلایا۔ زکریا اپنے استاد کے اس رویے کو شک و شبے کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ کھانے کے بعد دونوں تاجر چلے گئے۔ شام گئی تو اس کی جگہ رات نے لے لی۔ قمری مہینے کی آخری تاریخیں تھیں بغیر چاند کا آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا۔ تاروں کی مدھم روشنی میں گم کردہ راہ اپنی راہیں تلاش کر رہے تھے۔

رات کو عشا کی نماز کے بعد مشعل بردار دس گیارہ سپاہی استاد ارسلان کو تلاش کرتے ہوئے آئے۔ ارسلان اور زکریا مشعل بردار نوواردوں کو شک و شبے اور خوف کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص مؤدبانہ قطار سے نکلا اور استاد ارسلان سے کہنے لگا۔ ''کیا آپ دونوں ہی ایشیائے کوچک سے تعلق رکھتے ہیں اور سیاح ہیں؟''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''ہم محض سیاح ہیں اور کچھ نہیں، تمہیں ہمارے پاس کس نے بھیجا ہے؟''

ایک نے کہا۔ ''ہمیں سلطان نے بھیجا ہے۔ سلطانِ مصر نے...... کیونکہ سلطان کو کسی نے مطلع کیا ہے کہ حلب میں دو سیاح آئے ہوئے ہیں اور وہ سلطان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔''

استاد ارسلان نے ہنس کر جواب دیا۔ ''لوگو! خوش قسمتی سمجھ لیجیے یا بدقسمتی کہ وہ سیاح ہم دونوں ہیں اور سلطان کی زیارت کی امید میں یہاں پڑے ہیں۔''

مشعل بردار نے کہا۔ ''سلطان آپ دونوں کے منتظر ہیں، اسی وقت تشریف لے چلیں۔''

استاد ارسلان نے زکریا کو تو یہیں چھوڑ دیا اور تنہا سلطان قانصوہ سے ملنے چلا گیا۔ لیکن جانے سے پہلے اس نے زکریا کو سمجھایا۔ ''زکریا! خبردار جو تنہائی اور اختیار سے کوئی فائدہ اٹھایا۔ میں بہت جلد تم دونوں کو بھی قلعے ہی میں بلوا لوں گا۔''

جانے سے پہلے وہ ربابہ کے پاس بھی گیا، اس سے کہا۔ ''ربابہ! میں سلطان قانصوہ سے ملاقات کو جا رہا ہوں۔ تو اس خیمے میں زکریا کی امانت ہے لیکن یہ امانت اس وقت تک اپنے تقدس کو برقرار اور محفوظ رکھے گی جب تک کہ میں تم دونوں کو باقاعدہ ایک دوسرے سے وابستہ نہ کردوں۔''

ربابہ نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش کھڑی رہی، بس ایک آدھ بار زکریا کو معنی خیز نظروں سے ضرور دیکھ لیا۔

استاد ارسلان سلطان کے آدمیوں کے ساتھ قلعے کی طرف روانہ ہوگیا۔ قطبین میں رہنے والوں کے مکانوں کی طرح، کچھوے کی پشت جیسا پہاڑی سلسلہ شہر کے بیچ میں واقع تھا۔ اس نیم مدور پہاڑی پر الشہبہ نامی قلعہ تھا اور اس قلعے میں مصر کا سلطان قانصوہ قیام پذیر تھا۔

قلعے کے چاروں طرف گہری خندقیں تھیں اور ان میں پانی بھرا ہوا تھا۔ قلعے میں داخلے کے لیے ایک پھاٹک تھا۔ پھاٹک کے سامنے کی خندق پر آنے جانے کے لیے عارضی طور پر بڑے بڑے تختوں کا ایک پل بچھا دیا جاتا تھا جس کو کام نکل جانے کے بعد قلعے میں گھسیٹ لیا جاتا تھا۔ استاد ارسلان، سلطان قانصوہ کے سواروں کے ساتھ قلعے میں داخل ہوا تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ خود سلطان قانصوہ بھی اپنے محل کے دروازے تک پیدل چل کر آیا اور استاد ارسلان کو سینے سے لگالیا۔

استاد ارسلان نے اس چوہتر پچھتر سالہ سلطان کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ اس نے پہلی نظر میں ہی یہ اندازہ لگالیا کہ یہ بوڑھا سلطان اس کے آقا اور مالک سلطان سلیم کو شکست نہیں دے سکتا۔

اس رات سلطان قانصوہ نے استاد ارسلان کو دیر تک اپنے پاس ہی روکے رکھا۔ اس موقع پر استاد ارسلان نے حران کے قاضی اور اس کے والی کے دونوں خط سلطان کی خدمت میں پیش کردیے۔ سلطان نے انہیں پڑھا اور بہت خوش ہوا۔ بولا۔ ''سیاح ارسلان! تم چاہو تو اپنے ملنے والوں کو اپنے سفرنامے میں بری طرح پیش کرکے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بلکہ قیامت تک کے لیے قعرِ مذلت میں دھکیل دو اور اگر چاہو تو شہرت اور فضیلت کے ساتویں آسمان پر پہنچا دو۔ میں نہیں جانتا کہ تم میرے لیے کیا اور کیسا لکھو گے لیکن میں

یہ ضرور جانتا ہوں کہ اگر میرے اخلاق اور میری خاطر مدارات میں کوئی جان ہوگی تو تم میری تعریف وتوصیف پر مجبور ہو جاؤ گے۔''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔''سلطان معظم! قبل از وقت شکوک وشبہات میں نہ پڑیئے۔ اللہ جو کچھ کرے گا، اپنے نیک بندوں کے لیے بہتر ہی کرے گا اور آپ ان نیک بندوں میں شامل ہیں۔''

سلطان نے اس رات کو استاد ارسلان کی اتنی خاطریں کیں کہ وہ شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ انواع واقسام کے کھانوں نے کام ودہن کو لذت بخشی اور سلطان کے شیریں بیان داستان سراؤں نے سلطان کے حکم پر ایسی مزے مزے کی حکایتیں سنائیں کہ مزہ آ گیا۔ سلطان کی تیز نظریں بار بار استاد ارسلان کی اندرونی کیفیات کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ داستان سرائی کے بعد سلطان نے پوچھا۔''سیاح ارسلان! بس یا کچھ اور.....؟''

ارسلان نے جواب دیا۔''سلطان معظم! یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے، میں آپ کی رضا کا پابند ہوں۔''

سلطان نے کہا۔''میرا خیال ہے آج اتنا ہی کافی ہے۔''

ارسلان نے جماہی لی، اسے نیند آ رہی تھی۔ سلطان نے کہا۔

''سیاح ارسلان! تجھے نیند آ رہی ہے کیونکہ تیرے سامنے کوئی مہم نہیں ہے۔ تو سیاح ہے میری طرح حکمران نہیں۔ اگر تو حکمران ہوتا تو اس وقت ان حالات میں تجھے نیند نہ آتی۔''

ارسلان نے اپنے خمار کو چھپانے کی کوشش کی، بولا۔ ''حضور والا! راتیں آرام کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں، بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ ہم قناعت پسند سیاح کسی چیز کی ہوس نہیں رکھتے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ قناعت میں راحت ہے۔''

سلطان نے ناگواری سے کہا۔''میں بھی قناعت پسند انسان ہوں۔ خدا شاہد ہے کہ میں کسی مسلم حکومت کو للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھتا لیکن ترکی کا سلطان سلیم، اس کے حریص دانت ایران کا مزہ چکھ کے حلب پر لگے ہوئے ہیں۔ وہ شاہ ایران کو دربدر کر کے مجھ سے پنجہ لڑانا چاہتا ہے لیکن وہ بہت جلد جان لے گا کہ اب اس کا مقابلہ ایک ایسے شخص سے ہوگا جو تاتاری ہے اور جس کے ایک شخص نے منگولوں کے زعم کو خاک میں ملا دیا تھا۔ مصر کا رکن الدین بیبرس آخر ہماری ہی نسل کا تو سلطان تھا جس نے ہلاکو خان کے نامور سردار قط بوغا کو عبرتناک شکست دی تھی۔ یہ وہی قط بوغا تھا جس نے ماضی میں سینتیس شاندار فتوحات حاصل کی تھیں اور جس کے لیے یہ مشہور تھا کہ اس نے کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا تھا۔''

سلطان بہت جذباتی ہو چکا تھا۔ استاد ارسلان کو شبہ گزرا، شاید سلطان قانصوہ کو اس کی حقیقت کا علم ہو چکا ہے کیونکہ اچانک سلطان سلیم کے ذکر کا نکل آنا معنی خیز تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔''سلطان عالی شان! میں صرف ایک سیاح ہوں اس لیے رموزِ مملکت پر میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا یہ سچ ہے کہ ترکی کا سلطان سلیم واقعی حلب پر حملہ آور ہونے والا ہے؟''

سلطان نے جواب دیا۔''اس میں شک وشبے کی کوئی بات نہیں بھولے بھالے سیاح۔ اس نے دیارِ بکر پر پہلے ہی قبضہ کر لیا ہے، اب اس کا دوسرا قدم حلب پر پڑے گا۔ میں نے دیدبانوں کا ایک جال سا پھیلا دیا ہے۔ میری چوکنا سپاہ ان دیدبانوں میں بیٹھی مشرق، شمال مشرق، شمال اور شمال مغرب کے وسیع وعریض میدانوں کا جائزہ لیتی رہتی ہے۔ وہ جیسے ہی اپنے سامنے گردوغبار کے بگولے دیکھے گی، نقاروں پر چوٹ لگا کر دوسرے دیدبانوں کو ہوشیار کر دے گی اور پھر یہ دوسرے دیدبان انہیں خبردار کر دیں گے جو ان کے نقاروں کی آوازوں کے پہلے ہی منتظر ہوں گے۔ اس طرح یہ خبر حلب تک آ جائے گی اور میں اپنی چاق وچوبند اور مستعد سپاہ کو لے کر ان کے استقبال کو آگے بڑھوں گا۔''

ارسلان نے پوچھا۔''سلطان معظم! یہ آپ کو کس نے بتایا کہ سلطان سلیم حلب پر حملہ کرنے والا ہے؟''

سلطان قانصوہ نے استاد ارسلان کو بڑے غور سے دیکھا۔''مجھے یہ کس نے بتایا؟ بالکل مہمل سوال ہے تیرا۔ مجھے یہ کون بتائے گا۔ کیا شاہ ایران کو تبریز سے نکال باہر کرنے والا اور دیارِ بکر کو اپنی چھاؤنی بنا لینے والا بس اتنے ہی پر اکتفا کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! سلطان سلیم نے شاہ سے بہت برا سلوک کیا ہے۔ اس نے شاہ کی بیوی اپنے ایک سپاہی کے حوالے کر دی۔ شاہ ایران میری مدد کا طالب ہے میں اس کی مدد کروں گا اور ضرور کروں گا اور سلطان سلیم کے نشۂ فتح مندی کو خاک میں ملا دوں گا۔''

استاد ارسلان نے کہا۔''لیکن میں نے تو یہ سنا ہے کہ شاہ ایران نے سلطان سلیم کے دشمنوں کو پناہ دے رکھی تھی اور سلطان سلیم نے جب انہیں طلب کیا تو اس کو بہت برا جواب دیا گیا۔ سلطان نے غصے میں آ کر جو کچھ کیا، وہ سب کے سامنے ہے۔''

سلطان قانصوہ نے کہا۔ ''سیاح! تو سلطان سلیم کی طرف داری ہرگز نہ کر کیونکہ یہ سراسر ناانصافی اور زیادتی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح تو نے مجھ سے ملاقات کی ہے، اسی طرح سلطان سلیم سے بھی مل اور پھر ہم دونوں کا موازنہ کرکے جو بڑا ہو، اس کو قدآور کردیا جائے۔''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''میں یہاں سے سلطان سلیم ہی کے پاس جاؤں گا اور سلطان کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔''

سلطان قانصوہ نے اسے منع کردیا۔ ''نہیں، ایسا ہرگز نہ کرنا... کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ ہم دونوں میں جنگ نہ ہو، میری خواہش ہے کہ سلطان سلیم ایران میں داخل ہوجائے۔ وہ ایران کے مشرقی حصوں میں گھسے گا تو میں دیارِ بکر اور قیساریہ کی طرف سے اس کے ملک میں گھس جاؤں گا اور پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ایسی مشکل میں پھنس جائے گا کہ شاید دوبارہ اپنے ملک کی صورت تک نہ دیکھ سکے۔''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''لیکن میں نے یہ سنا ہے کہ سلطان سلیم کے اہل حرفہ نے بندوق نامی آتشیں اسلحہ بنالیا ہے جو بارود کے زور سے چلتا ہے اور تیر سے زیادہ خطرناک ہتھیار ہے۔''

سلطان قانصوہ نے حقارت سے کہا۔ ''ہاں، یہ بات میں نے بھی سنی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اس ہتھیار کو میرے پاس بھی ہونا چاہیے، میری سپاہ کو بھی اس ہتھیار کے استعمال کا ہنر آنا چاہیے۔''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''لیکن میں اس معاملے میں آپ سے اتفاق نہیں کروں گا۔ میں سیاح ہوں اور میں اپنے سفرنامے میں انہی لوگوں کا شاندار لفظوں میں ذکر کروں گا جو بہادر ہوں گے اور جو اپنی روایات پر قائم رہیں گے۔ میں سلطان سلیم کا ذکر ہجویہ انداز میں کروں گا۔ میں اس کا مذاق اڑاؤں گا کیونکہ بندوق نامی ہتھیار کو استعمال کرنے والا نہ تو بہادر ہوسکتا ہے نہ روایت پسند۔ میں بہادر اس شخص کو سمجھتا ہوں جو تلوار سے جنگ کرے، تیروں سے مقابلہ کرے اور اپنی روایات کو زندہ رکھے۔''

استاد ارسلان کی باتوں نے سلطان قانصوہ کو بہت متاثر کیا۔ لیکن اس کے ایک مصاحب نے استاد ارسلان کو بہت برا بھلا کہا اور سلطان سے کہا۔ ''سلطانِ والا شان! آپ کو اگر سلطان سلیم سے لڑنا ہے تو آپ کے پاس بھی وہی ہتھیار ہونا چاہئیں جو ترک فرماں روا کے پاس ہیں، ورنہ میری یہ بات یاد رکھیے گا کہ آج آپ بندوق نامی جس ہتھیار کی مذمت کررہے ہیں ترک فرماں روا اسی کی مدد سے کئی ملکوں کو بہ آسانی زیر کرلے گا، روایت پسندی اپنی جگہ لیکن نئی روایات کی طرح ڈالنے میں کوئی عیب نہیں۔''

استاد ارسلان نے محسوس کیا کہ مصاحب کی باتوں نے سلطان کو بہت زیادہ متاثر کرلیا ہے۔ اس لیے فوراً ہی بولا۔ ''اپنا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ ورنہ بہادری اس میں ہے کہ آدمی تیر اور تلوار سے جنگ کرے۔''

سلطان نے اپنے مصاحب کو اسی وقت بھگا دیا اور ارسلان سے کہا۔ ''ارسلان سیاح! تو صحیح کہتا ہے۔ بہادری آمنے سامنے کے مقابلوں میں ہے اور روایات سے گریز کا یہ مطلب ہوگا کہ انسان نے اپنے آباؤاجداد کی روحوں کو شرمندہ کردیا۔''

استاد ارسلان نے اپنے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ اگر سلطان قانصوہ بھی بندوقوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں اترتا تو فیصلہ بہت مشکل ہوجاتا۔

سلطان نے ارسلان سے کہا۔ ''سیاح ارسلان! تو اپنے سفرنامے میں میرا ذکر بطورِ خاص کرے گا اور ترک فرماں روا کا تو جس قدر مذاق اڑائے گا، مجھ سے انعام واکرام پانے کا مستحق ٹھہرے گا۔''

استاد ارسلان نے عرض کیا۔ ''سلطان میرے ممدوح ہیں..... میں سلطان کی جتنی بھی تعریف کروں گا، کم ہوگی۔''

اب سلطان بھی استاد ارسلان کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ارسلان کو سونے کی اجازت دے دی اور خود بھی اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

استاد ارسلان کو ایک خدمت گار اس کی خواب گاہ کی طرف لے چلا۔ سلطان کے حکم سے نکالا جانے والا مصاحب راہ میں کھڑا اس کا انتظار کررہا تھا۔ جیسے ہی ارسلان اس کے پاس سے گزرا، مصاحب نے اسے پکڑ لیا اور اس کو سخت سست کہنے لگا، بولا۔ ''او مکار سیاح! تو نے سلطان کو کتنا احمقانہ مشورہ دے دیا۔ تو، تو مجھے سلطان کا بدخواہ معلوم ہوتا ہے۔''

استاد ارسلان نے مصاحب کو دھکیل دیا، وہ گرتے گرتے بچا۔ اس نے مصاحب کو نرمی سے سمجھایا۔ ''او بدخواہ اور اے بداندیش! جا اور رات کے سناٹے میں اس پر غور کرتا رہ کہ میں جو مشورے دے رہا ہوں، وہ درست ہیں یا وہ مشورے، جو تو دے رہا تھا۔''

استاد ارسلان اپنی خواب گاہ میں دیر تک جاگتا رہا

کیونکہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو چکا تھا کہ سلطان قانصوہ کا ماحول خطرے سے خالی نہیں تھا، کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

سلطان قانصوہ کو اپنی شجاعت پر بڑا ناز تھا۔ اس نے ارسلان کو جیسی عزت دی تھی، وہ اس کے دوسرے سرداروں میں حسد کا سبب بن گئی تھی۔ استاد ارسلان نے دوسرے دن سلطان کی اجازت سے زکریا اور ربابہ کو بھی قلعے ہی میں بلوالیا۔ پچھتر سالہ سلطان نے استاد ارسلان کو قلعے کی تاریخی جگہوں کی سیر کرائی تا کہ وہ اپنے سفرنامے میں ان مقامات کا ذکر کر کے مستقبل کی نسلوں سے دادِ تحسین حاصل کرے۔

سلطان بہت خوش تھا۔ وہ قلعے کے بالائی حصے میں ارسلان کو لے گیا۔ اس وقت سلطان کے آس پاس اس کے محافظ سپاہی بھی تھے۔ سلطان نے ارسلان کو دو گرجوں کی سیر کرائی جو زمانہ قدیم سے موجود تھے۔ ان میں سے ایک گرجا کی قربان گاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سلطان نے پوچھا۔ ''سیاح ارسلان! اس سنگی چبوترے کو ذرا غور سے دیکھ، یہ بڑی مشہور قربان گاہ ہے مگر یہ کیوں مشہور ہے، تجھے یہ بات نہیں معلوم ہوگی۔''

ارسلان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس چبوترے کو دیکھتا رہا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیوں مشہور ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''سلطان معظم! کیا میں اس کی شہرت کا سبب معلوم کرسکتا ہوں؟''

سلطان نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں! یہ ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربان گاہ ہے۔ یہاں آپ قربانی دیا کرتے تھے۔''

ارسلان فرطِ عقیدت سے قربان گاہ کے پاس بیٹھ گیا اور اس پر آہستہ آہستہ اپنے دونوں ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''آہ! وہ کتنے مبارک لمحات ہوں گے جب آپؑ یہاں قربانی دیا کرتے ہوں گے اور کتنے خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جنہیں آپؑ کی صحبت اور دیدار کا شرف حاصل رہتا ہوگا۔''

سلطان قانصوہ نے کہا۔ ''سیاح! اب اٹھ بھی جا، مزید رونے کے لیے اور وقت مل جائے گا۔ میرے ساتھ جلدی جلدی چل تا کہ میں دوسری متبرک جگہیں بھی دکھادوں۔''

ارسلان کھڑا ہو گیا، سلطان اس کو لیے ہوئے قلعے کے زیریں حصے میں پہنچا۔ یہاں ایک غار بنا ہوا تھا۔ سلطان نے غار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس غار کو بھی غور سے دیکھ لے۔ یہ بھی بڑی متبرک اور تاریخی جگہ ہے۔''

ارسلان نے پوچھا۔ ''میرے محسن، فضیلت مآب سلطان! اس غار سے کون سی تقدیس وابستہ ہے؟''

سلطان نے جواب دیا۔ ''یہاں نبیوں کے باپ حضرت ابراہیمؑ اپنے ریوڑ بند کیا کرتے تھے، یہاں دودھ دینے والے مویشی رہتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہر روز علی الصباح ان کا دودھ دو۔ کر لوگوں میں مفت تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ غار کے باہر مفت خوروں کا جم غفیر لگ جاتا تھا اور وہ چیخ چیخ کر پوچھتا رہتا تھا۔ یاابراہیمؑ! حلب یالا؟ (اے ابراہیمؑ! دودھ نکلا یا نہیں؟) اندر سے جواب ملتا۔ ''حلب'' (دودھ نکلا) چنانچہ وہیں سے اس شہر کا نام حلب پڑ گیا۔''

ارسلان فرطِ عقیدت میں غار کے اندر چلا گیا اور کچھ دیر روحانی حظ وانبساط حاصل کرتا رہا۔ آخر سلطان نے اسے ایک بار پھر متنبہ کیا۔ ''جذباتی سیاح! پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ ہزاروں سال سے یہیں موجود ہے اور ہمیشہ یہیں موجود رہے گا۔ اس لیے یہاں آنسو بہانے کے لیے بڑا وقت پڑا ہے پھر کسی وقت آکر رو دھولینا۔''

ارسلان غار سے نکل آیا۔ سلطان نے اسے چند جگہیں اور بھی دکھائیں۔ اس کے بعد اپنے محل میں واپس چلا گیا۔ اس نے مطمئن لہجے میں ارسلان سے کہا۔ ''تو نے ان مقدس اور اہم جگہ کی سیر کر لی، میری پشت پر ان متبرک مقامات کا ہاتھ ہے۔ اب تو ہی بتا..... کیا ترکی کا فرماں روا سلیم مجھے شکست دے سکتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''سلطان معظم! میں اس جگہ سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ اب یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔''

سلطان مسکرانے لگا۔ بولا۔ ''مگر تو ٹھہرا سیاح اور سیاح لوگ کسی جگہ ٹک کر نہیں رہتے۔ ایک دن تو بھی یہاں سے چلا جائے گا۔'' پھر اچانک سوال کیا۔ ''سیاح ارسلان! ذرا ایک بات تو بتا؟''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''پوچھیے ضرور بتاؤں گا۔''

سلطان نے پوچھا۔ ''تو ان مقدس مقامات کا ذکر کن لفظوں میں کرے گا جنہیں میرے توسط سے دیکھا ہے؟''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''نہایت شاندار اور جذباتی انداز میں..... شاید میں اپنا دل نکال کر صفحۂ قرطاس پر رکھ

دوں گا۔''

سلطان نے پوچھا۔''اور اس شخص کا ذکر کن لفظوں میں کرے گا جس کے طفیل تو نے انہیں دیکھا اور ان کے بارے میں آگہی حاصل کی؟''

ارسلان نے جواب دیا۔''اسی جوش اور جذبے سے جس کا میں نے ذکر کیا۔''

سلطان نے کہا۔''ہاں! میں یہی چاہتا ہوں کہ پچھتر سالہ بوڑھا جس نے اپنی زندگی میں کوئی بڑا کارنامہ نہیں انجام دیا، شاید اپنے اسی کارنامے سے ایک سیاح کے طفیل شہرتِ دوام اور تاریخ میں ایک مستقل مقام حاصل کر لے۔ تم فنکار اور خامہ پیشہ لوگ جس کو چاہو مار دو اور جس کو چاہو زندہ رکھو۔''

دوپہر کا کھانا ارسلان نے سلطان کے ساتھ کھایا اور سلطان نے ارسلان کو بتایا کہ میں نے اپنا ایک قاصد سلطان سلیم کے پاس روانہ کیا تھا جس میں میں نے سلطان کو یہ پیش کش کی تھی کہ اگر وہ پسند کرے تو میں شاہ ایران سے صلح کرا دوں۔ میں ثالثی کا منصب بشوق قبول کرنے کو تیار ہوں لیکن اس وقت، جب ترک فرماں روا بھی اسے پسند کرے۔

ارسلان نے پوچھا۔''کیا اس سلسلے میں سلطان کی مرضی بھی معلوم کر لی گئی ہے؟''

سلطان قانصوہ نے جواب دیا۔''میں نے ابھی ابھی بتایا نہیں کیا کہ میرا قاصد سلیم کے پاس گیا ہوا ہے، میں اپنے خط کے جواب کا انتظار کر رہا ہوں جو یقیناً مثبت جواب ہوگا۔''

ارسلان نے کہا۔''خدا کرے آپ کی بات درست ہو ورنہ کچھ پتا نہیں جب آپ کا خط پہنچے، سلطان خوش و خرم ہو یا کبیدہ و رنجیدہ۔''

سلطان نے ہنس کر جواب دیا۔''وہ خوش و خرم ہو یا کبیدہ و رنجیدہ...... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر اس نے مجھ سے مقابلہ کیا تو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ کس شیر سے پنجہ لڑایا ہے۔''

ارسلان نے سلطان قانصوہ کو خوش کرنے کے لیے بڑی باتیں کیں۔ سلطان نے اس سے پوچھا۔''تیرا بیٹا زکریا کہاں ہے؟ جبکہ مجھے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ بھی تیرے ساتھ ہے۔''

ارسلان نے جواب دیا۔''کل اسے بھی حضورِ والا کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔''

سلطان نے کہا۔''ہاں، میں اس سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔ کل شاہ ایران کا ایک وفد میرے پاس آئے گا۔ میں چاہتا ہوں اس کی موجودگی میں تم دونوں بھی موجود ہو۔''

ارسلان نے ہامی بھر لی اور سلطان سے جدا ہو کر زکریا اور ربابہ کے پاس پہنچا۔ اس وقت وہ دونوں بہت خوش تھے۔ ربابہ کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔ ارسلان کو کل کی فکر لاحق تھی۔ ایرانی وفد کی موجودگی میں زکریا کا سلطان کے سامنے موجود رہنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس نے فکر مندی سے ان دونوں کی طرف دیکھا اور ایک طرف جا کر لیٹ گیا۔ زکریا اور ربابہ نے صاف محسوس کر لیا کہ استاد ارسلان کے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ گیا ہے، تبھی وہ منہ چھپائے پڑے ہوئے ہیں۔ ربابہ نے زکریا کو کہنی ماری اور آہستہ سے کہا۔''جاؤ اور پدر بزرگوار سے ان کی پریشانی اور اداسی کا سبب معلوم کرو۔''

زکریا نے متذبذب لہجے میں جواب دیا۔''میں پوچھوں گا تو ضرور مگر امید نہیں کہ وہ بتا بھی دیں۔''

وہ ڈرتے ڈرتے استاد ارسلان کے سرہانے جا کھڑا ہوا۔ ارسلان کو اس کی آمد کا پتا نہیں چل سکا۔ کچھ دیر کھڑے رہ کر زکریا نے استاد ارسلان کو آہستہ سے مخاطب کیا۔''پدر محترم! میں زکریا تنہائی میں مخل ہونے کی اجازت کا طالب ہوں۔''

ارسلان نے سر اٹھایا اور زکریا کو سرسری نظر سے دیکھ کر آہستہ سے جواب دیا۔''زکریا! سلطان نے کل شاہ ایران کے وفد کی موجودگی میں تجھ کو بھی طلب کیا ہے۔ میں سوچ سوچ کر خوفزدہ ہو رہا ہوں کہ اگر اس وفد کے ایک آدمی نے بھی تجھے پہچان لیا تو ہمارا حشر کیا ہوگا؟'' اس کے بعد اچانک ربابہ کی موجودگی کے احساس نے ارسلان کو اور زیادہ سہما دیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔''ربابہ کہاں ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔''وہ یہاں نہیں ہے اور نہ ہی یہاں آئے گی۔ آپ نے جو بات بھی کرنا ہے، صاف صاف کہیے۔''

ارسلان نے کہا۔''میرا خیال ہے کہ تو میرے ساتھ نہ رہ، یہ کام میں اکیلا ہی زیادہ بہتر انجام دے لوں گا۔ میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔''

زکریا نے کہا۔''بہر حال میں آپ کے اس فیصلے سے اتفاق نہیں کروں گا۔''

ارسلان نے اس کو سمجھایا۔''بیٹے زکریا! میں نے جو

کچھ کہا اس پر سنجیدگی سے غور کرتا رہ۔ اللہ نے چاہا تو ہر شخص تجھ سے یہی کہے گا، جو میں کہہ رہا ہوں۔"

زکریا نے کہا۔" یہاں ہر شخص سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اور یہ کہ اس کام کو آپ اکیلے ہی کس طرح انجام دے سکتے ہیں؟"

ارسلان نے جواب دیا۔" زکریا! یہاں تیری موجودگی خطرناک ہے۔ تو سنان پاشا کے پاس چلا جا جو دیار بکر یا اس کے آس پاس کہیں موجود ہوگا اور سنان پاشا کو بتادے کہ سلطان قانصوہ کے ارادے نیک نہیں ہیں اور قرائن سے ایسا لگتا ہے جیسے وہ کسی بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر ایشیائے کوچک میں داخل ہونے کی کوشش کرے گا۔"

زکریا نے پوچھا۔" اگر میں یہاں سے واپس چلا جاؤں تو ربابہ کا کیا ہوگا؟ کیا یہ بھی میرے ساتھ جائے گی؟"

ارسلان نے جواب دیا۔" زکریا! ربابہ کو مسئلہ نہ بنا اور اس کو میرے پاس رہنے دے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر ربابہ تیرے ساتھ چلی بھی گئی تو وہاں تجھ سے چھن جائے گی، اس لیے اس کو میرے ہی ساتھ رہنے دے۔"

زکریا نے بیزاری سے کہا" میں سلطان کے حکم پر آپ کے ساتھ آیا ہوں، اب سلطان ہی کے حکم پر میں یہاں سے واپس جاؤں گا۔ آپ میرے استاد ہیں لیکن میں آپ کا یہ حکم نہیں مانوں گا۔"

ارسلان نے سختی سے کہا۔" تجھے میرا یہ حکم ماننا پڑے گا۔ اگر اس سلسلے میں سلطان کا حکم حاصل کیا جاسکتا تو میں وہ بھی حاصل کرلیتا۔"

زکریا نے جواب دیا۔" استاد محترم! میں نہیں جانتا کہ آپ جو کچھ چاہتے ہیں، وہ کیوں چاہتے ہیں مگر میں نے یہ اٹل فیصلہ کرلیا ہے کہ میں سلطان کے حکم کے بغیر آپ سے جدا نہیں ہوں گا۔"

ارسلان نے غصے میں منہ پھیر لیا بولا۔" تب پھر ہم دونوں کسی ایسی مصیبت میں پڑ جائیں گے جس میں ہم دونوں کی ہلاکت تک نوبت آسکتی ہے۔"

زکریا ارسلان کو اس کے حال پر چھوڑ کر ربابہ کے پاس چلا گیا۔ اس نے ربابہ کو بھاگتے ہوئے دیکھا کیونکہ وہ دونوں تقریباً ایک ساتھ اس کمرے میں پہنچے جہاں وہ ربابہ کو چھوڑ کر استاد ارسلان کے پاس گیا تھا اس نے شک وشبہے سے پوچھا۔" ربابہ! کیا تم ہماری باتیں سن رہی تھیں؟"

ربابہ نے جواب دیا۔" نہیں، نہیں..... میں تمہیں دیکھنے گئی تھی کہ تمہیں اپنے باپ کے کمرے سے نکلتے دیکھا۔"

لیکن زکریا نے محسوس کرلیا کہ وہ سچ نہیں بول رہی کیونکہ وہ جواب دیتے ہوئے زکریا سے آنکھیں نہیں ملا رہی تھی۔ زکریا نے کہا۔" خیر اگر تم نے میری باتیں سن بھی لی ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں ساری باتیں یوں بھی تمہیں بتا دیتا۔"

ربابہ نے پوچھا۔" کون سی باتیں؟ کیسی باتیں؟"

زکریا نے ربابہ کو بڑے غور سے دیکھا۔" کیا تم نے ہماری باتیں نہیں سنیں؟"

ربابہ نے بے نیازی سے جواب دیا۔" میں اسی وقت وہاں پہنچی تھی جب تم وہاں سے نکل رہے تھے۔"

زکریا بیٹھ گیا اور ربابہ کو ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس ہی بٹھالیا۔ پھر اس کا چہرہ اپنے منہ کے قریب کرلیا۔ کچھ دیر اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا مگر ربابہ نے اپنی دونوں آنکھیں بند کرلی تھیں۔ زکریا نے کہا۔" ربابہ! آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھو..... آنکھیں ملا کر بات کرو۔"

ربابہ نے سرشاری میں جواب دیا۔" زکریا! مجھ پر.... بلاوجہ شک نہ کرو، میں باپ بیٹے کی باتیں سن کر کیا کروں گی۔"

زکریا کو کسی حد تک یقین آگیا کہ ربابہ جھوٹ نہیں بول رہی۔ اس نے ربابہ کی آنکھوں کو بوسہ دیا اور کان سے منہ ملا کر کہا۔" ربابہ! میرا باپ کہتا ہے کہ تو واپس چلا جا اور ربابہ کو میرے پاس چھوڑ جا۔"

ربابہ نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، وحشت سے زکریا کی طرف دیکھا۔" یہ کیوں؟ کیا تمہارا باپ سیاحت میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا اور وہ مجھ کو کس حیثیت سے اپنے ساتھ لیے پھرتا رہے گا؟"

زکریا نے شوخی سے کہا۔" جانتی ہو، میں نے باپ کو کیا جواب دیا؟"

ربابہ نے پوچھا۔" کیا جواب دیا؟"

زکریا نے اک شانِ بے نیازی سے کہا۔" میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ پدر بزرگوار! اگر مجھ سے الگ رہ کر سیاحت کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن میں ربابہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

ربابہ سوچ میں پڑ گئی۔ زکریا اس کا دل بہلانے کے لیے مزے مزے کی باتیں کرنے لگا لیکن ربابہ کی فکرمندی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ خاموش رہی اور اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کرلیں۔

استاد ارسلان نے بڑے کرب میں رات گزاری۔ وہ صبح اٹھ کر زکریا کی طرف گیا۔ اس کو اپنے نوجوان شاگرد

پر بڑا دکھ ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا زکریا کی آنکھیں بھی سوجی ہوئی ہیں، ربابہ سو رہی تھی۔ ارسلان زکریا کو باہر لے گیا اور اس کو ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ ''زکریا! رات میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اگر تو واپس نہیں جاتا تو میں واپس چلا جاؤں گا کیونکہ میں تیری موجودگی میں موت کو اپنے آس پاس منڈلاتے ہوئے محسوس کررہا ہوں۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''استادِ محترم! کل رات کو آپ سے باتیں کرکے میں نے یہی سوچا تھا کہ آپ کو تنہا چھوڑ کر میں واپس نہیں جاؤں گا مگر آپ سے جدا ہو کر جب میں بستر پر گیا اور تنہائی اور شب کے سناٹے میں جب میں نے اپنی بات کے نتائج پر غور کیا تو میری نیند اڑ گئی اور خوف اور دہشت کی ایک لہر پورے جسم میں دوڑنے لگی۔''

استاد ارسلان کی حالت ہی بگڑ گئی، بے چینی سے سوال کیا۔ ''پھر..... پھر کیا فیصلہ کیا تم نے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''پھر میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور واپسی پر آمادہ ہوگیا۔''

ارسلان نے بے اختیار کہا۔ ''سبحان اللہ! بخدا یہ تیری عقلِ سلیم کا فیصلہ ہے۔''

زکریا نے کہا۔ ''میں واپس چلا جاؤں گا مگر ربابہ میرے ساتھ جائے گی۔''

ارسلان پھر چڑ گیا، بولا۔ ''ابھی تیرے فیصلے میں کجی موجود ہے اگر تو ربابہ کو اپنے ساتھ لے بھی گیا تو سنان پاشا اس کو تجھ سے چھین کر سلطان کی خدمت میں روانہ کردے گا۔''

زکریا نے بے بسی سے کہا۔ ''میں پوری رات اپنی بے بسی پر روتا رہا ہوں۔ میں ربابہ کو پسند کرتا ہوں اور سلطان اس بات کو بالکل ناپسند کرتا ہے۔ استادِ محترم! آپ ہی بتائیں۔ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''میں اکثر تیری جگہ رہ چکا ہوں مگر میں نے ہمیشہ وہی کیا جو آج تجھے مشورہ دے رہا ہوں۔ تو عجیب ہرجائی خصلت رکھتا ہے۔ کل ناہید کو پسند کرتا تھا، آج ربابہ سے عشق کررہا ہے، آخر یہ معاملہ کیا ہے؟''

زکریا نے کہا۔ ''اگر میں ناہید کی طرف سے بالکل مایوس نہ ہوگیا ہوتا تو ربابہ پر ہرگز مائل نہ ہوتا۔ اگر میں ہرجائی ہوتا تو بیک وقت کئی سے محبت کررہا ہوتا۔''

ارسلان نے ایک بار پھر نرمی سے سمجھایا۔ ''بہرحال میرا مشورہ یہ ہے کہ تو ربابہ کو میرے پاس چھوڑ کر سنان پاشا کے پاس چلا جا۔ ربابہ تیری امانت ہے، بالآخر تیرے حوالے کردی جائے گی۔''

یہ دونوں باہر باتیں کررہے تھے اور ربابہ دروازے پر کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ ارسلان نے اچانک اس کو دیکھ لیا اور زکریا سے آہستہ سے کہا۔ ''زکریا! مجھے تو یہ لڑکی اچھی نہیں لگ رہی۔ اللہ ہم دونوں پر رحم کرے۔''

یہ دونوں گھر واپس چلے گئے۔ ربابہ ان دونوں کے چہروں سے کچھ سمجھنے کی کوشش کررہی تھی۔

سہ پہر کو سلطان قانصوہ کے ہرکارے ارسلان کے پاس پہنچے اور اس کو بتایا کہ سلطان نے اسے اسی وقت فوراً یاد فرمایا ہے۔

ارسلان نے زکریا کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تو کیا کہتا ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں۔''

ارسلان نے کہا۔ ''چل، میرے ساتھ چل۔ ایک خطرہ منڈلا رہا ہے اگر اس سے ہمیں کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے تو پھر دیکھا جائے گا اور اگر یہ محض وسوسہ اور اندیشہ ہے تو کوئی پروا نہیں۔''

ان دونوں نے سلطان کے پاس جانے کی تیاری کی اور پھر روانہ ہوگئے۔ سلطان قانصوہ اپنے محل کے دیوانِ عام میں فوجی سرداروں میں گھرا بیٹھا تھا اس کے جملہ سردار تاتاری تھے جو اپنے چوڑے جبڑے اور کھنچی کھنچی آنکھوں اور ڈاڑھی مونچھوں کی خاص وضع سے پہچانے جارہے تھے۔

سلطان نے زکریا کو بڑے غور سے دیکھا اور پھر ارسلان سے کہا۔ ''ادھر میرے داہنی طرف اپنے بیٹے کے ساتھ کھڑا ہوجا اور میں جو کچھ دکھانا چاہتا ہوں، اس کو غور سے دیکھ۔''

یہ دونوں سلطان کے دائیں طرف کھڑے ہوگئے۔ سلطان نے تالی بجائی اور جب تالی کی آواز پر کئی خدمت گاروں نے حاضری دی تو سلطان نے کسی خاص شخص کا نام لیے بغیر حکم دیا۔ ''میرے ایلچی کو، جس حالت میں آیا ہے، اسی حالت میں حاضر کردیا جائے۔''

خدمت گار چلے گئے اور کچھ دیر بعد ایک ڈاڑھی مونچھ صاف، صفاچٹ میدان شخص کو اس کے لنگڑے گھوڑے پر سوار لے کر حاضر ہوگئے۔ لنگڑا گھوڑا اپنے سوار کو لیے خراماں خراماں چل رہا تھا، لنگڑاتا جھٹکے کھاتا۔

گھڑسوار نے اپنے دونوں طرف لوگوں کو دیکھا تو بہت ملول ہوا۔ اس کو شرم کھائے جارہی تھی۔ سلطان قانصوہ کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جارہا تھا۔ اس نے

بطورِ خاص ارسلان کو مخاطب کیا۔

''سیاح ارسلان! یہ میرا قاصد ہے جس کو میں نے سلطان سلیم کی خدمت میں جذبۂ خیر سگالی کے ایک خط کے ساتھ بھیجا تھا۔ جانتے ہو سلطان نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟''

ارسلان نے اپنی زبان سے تو کچھ بھی نہ کہا، بس سوالیہ نظروں سے ایک آدھ بار سلطان قانصوہ کی طرف دیکھ لیا۔

سلطان ایک دم برس پڑا۔ ''ترکی کے مغرور اور کم عقل سلطان نے اس کی ڈاڑھی منڈوا دی اور ایک لنگڑے گھوڑے پر بٹھا کر واپس کر دیا۔ کم عقل سلطان نے اپنے خط میں جو کچھ لکھا ہے، وہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ اس نے مجھ کو لکھا ہے کہ میں بلاچون وچرا اس کی اطاعت قبول کرلوں اور سالانہ خراج ادا کرتا رہوں اس طرح وہ مجھے معاف کر کے اپنی وفادار رعایا میں شامل کرلے گا۔'' پھر پوچھا۔ ''جانتے ہو میں نے اس کا کیا جواب دیا؟''

ارسلان نے کہا۔ ''حضورِ والا ہی کچھ بتائیں گے تو معلوم ہوگا۔''

سلطان نے جواب دیا۔ ''پریشان خاطری نے ترک فرماں روا کو اتنا تنگ کیا کہ اس نے اپنا ایک وفد میرے پاس بھیجا، اس وفد کے سربراہ کے پاس میرے نام کا ایک پیغام تھا۔ وہی پیغام جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا تھا۔ میری اطاعت قبول کر کے میرے باج گزاروں میں داخل ہوجاؤ ورنہ میدانِ جنگ میں میرا انتظار کرو، میں عنقریب تیرے سر پر پہنچتا ہوں۔''

سلطان یہ کہتے کہتے غصے سے کپکپانے لگا، پھر چیخ چیخ کر بولا۔ ''واللہ شاہِ ایران کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئی ہیں، اس کا بدلہ میں لوں گا۔ ترکی کے اس خبطی اور نیم پاگل سلطان کو میں سبق دوں گا۔''

ارسلان نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''ترک وفد کے لوگ کہاں ہیں؟''

سلطان نے جواب دیا۔ ''قید خانے میں۔ میں نے ان سب کو قید خانے میں ڈال دیا۔''

ارسلان نے پوچھا۔ ''کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟''

سلطان نے جواب دیا۔ ''نہیں، بالکل نہیں۔ میں ان سے کسی کو بھی نہیں ملواؤں گا۔'' وہ ایک بار پھر مغلوب الغضب ہوگیا آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔ ''ابھی تک تو میں نے یہ بات راز میں رکھی تھی کہ میں شاہِ ایران کے ایک وفادار حلیف کی حیثیت رکھتا ہوں، اب میں شاہ سے اپنی دوستی کا اعلان کرتا ہوں۔ میں شاہ کو اس کے چھن جانے والے علاقے دوبارہ واپس دلوادوں گا اور میں اس کے جارحانہ اٹھتے ہوئے قدموں کو حلب ہی میں توڑ دوں گا۔'' اس کے بعد ارسلان سے درخواست کی۔ ''سیاح ارسلان! تو دیکھ رہا ہے کہ میں کتنا کشادہ قلب اور فراخ حوصلہ انسان ہوں۔ میں اپنی ذات سے ایک مسلم فرماں روا کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا لیکن اب میں ہر حربہ استعمال کروں گا۔ تو اپنے سفرنامے میں ان ساری باتوں کا ذکر کرے گا کیونکہ صدیوں بعد جب مستقبل کی نسلیں ان واقعات کو ایک غیر جانبدار اور ایماندار سیاح کے سفرنامے میں بالتفصیل پڑھیں گی تو یہ بات ان کے علم میں آجائے گی کہ حق پر کون تھا اور ناحق پر کون؟''

ارسلان نے کہا۔ ''اور مجھ کو اپنے سفرنامے میں یہ بھی لکھنا پڑے گا کہ مصر کے سلطان نے ترک فرماں روا کے وفد کو جوابی کارروائی کے طور پر قید خانے میں ڈال دیا تھا۔''

سلطان نے بے ساختہ کہا۔ ''ہاں، بے شک تو یہ سب کچھ لکھ سکتا ہے۔ میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں تو وہ سب اپنے سفرنامے میں لکھے گا۔''

اس کے بعد سلطان نے سلطان سلیم کے پاس سے آئے ہوئے معتوب قاصد سے کہا۔ ''اب تو اتنے عرصے تک اپنے گھر میں بیٹھ سکتا ہے جب تک تیری ڈاڑھی دوبارہ نہ نکل آئے۔''

جب ڈاڑھی منڈا قاصد لنگڑے گھوڑے کو لے کر وہاں سے چلا گیا اس کے جاتے ہی شاہِ ایران کا وفد آگیا۔ یہ طویل القامت، سرخ رنگت کے لوگ اپنے چہروں کو سیاہ عماموں میں چھپائے سلطان قانصوہ کے روبرو پہنچا دیے گئے۔ ارسلان کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ زکریا نے ایرانی وفد کے ایک ایک شخص کو انتہائی غور سے دیکھا مگر ان میں ایک بھی ایسی شکل نہیں تھی جس کو اس نے پہلے کبھی کہیں دیکھا ہو۔

وفد کے سربراہ نے شاہِ ایران کی طرف سے سلطان قانصوہ کے روبرو ایک پُراثر تقریر کی۔ اس نے سلطان کو یہ نکتہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اب وہ دن زیادہ دور نہیں جب ترکی کا فرماں روا سلیم ملک گیری کی ہوس میں مصر کی طرف بڑھے گا۔ اس لیے وقت آگیا ہے کہ ایران اور مصر کے اس مشترک دشمن کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے اور اس کو اس کی اپنی حدودِ مملکت میں قید کر دیا جائے۔ وفد کے سربراہ نے سلطان کو ایک ایسے اژدہے سے تشبیہ دی جو اپنے

آتشیں عملِ تنفس سے اپنے آس پاس کی چیزیں یا تو جلائے دے رہا ہے یا پھر اپنے پیٹ میں اتارے لے رہا ہے۔

جواب میں سلطان قانصوہ نے شاہ ایران کو یہ پیغام دیا کہ ترکی فتنے کو اس کی اپنی حدود میں واپس کر دیا جائے گا اور وہ کوشش کرے گا کہ شاہ ایران کا کھویا ہوا علاقہ اس کو واپس دلا دیا جائے۔

سلطان قانصوہ نے ارسلان کو حکم دیا کہ اس کارروائی کو اس کی جزئیات سمیت اپنے سفرنامے میں محفوظ کر دے تاکہ آنے والی نسلوں کو سلطان کے صحیح اور بروقت مبنی بر عقل فیصلوں کا علم حاصل ہو جائے۔

شاہ کے وفد کے جملہ ارکان نے ارسلان اور زکریا کو فکر اور تشویش کی نظر سے دیکھا۔ وہ ان دونوں سیاحوں کی بابت تفصیل سے کچھ جاننا چاہتے تھے۔ سلطان نے وفد کو بتایا کہ یہ دونوں سیاح ابن بطوطہ اور محمد ابن جبیر کی طرح سیاحت پر نکلے ہیں اور یہ اپنے عہد کی تاریخ کے ان گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے جو عموماً مورخوں کی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔

وفد کے ارکان نے ارسلان اور زکریا سے ملاقات کی اور ان سے پرُلطف باتیں کیں۔ وفد کے ہر رکن کی یہ دلی خواہش تھی کہ ارسلان اپنے سفرنامے میں کسی نہ کسی طور ان کا ذکر بھی کر دے۔

کچھ دیر بعد وفد کو دربار سے رخصت کر دیا گیا اور اسے سلطانی مہمان خانے میں ٹھہرا دیا گیا۔ سلطان کے تاتاری سردار ہنس ہنس کے سلطان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ترکان عثمان کچھ بھی نہیں کیونکہ بہادری میں وہ تاتاریوں کے ہم پلہ نہیں ہیں۔ انہیں یہ دعویٰ بھی تھا کہ ترک اتنا بڑا خطرہ ہرگز نہیں ہیں، جتنا انہیں سمجھ لیا گیا ہے۔

ارسلان ان باتوں کو لکھتا رہا کیونکہ سلطان نے خواہش کی تھی کہ وہ یہاں کی بابت جو کچھ بھی لکھے، اس کو دکھا دے۔ ارسلان نے اس چشم دید کارروائی کو بڑے اثر انگیز پیرائے میں لکھا اور آخر میں اپنی رائے اور تبصرہ بھی لکھ دیا۔ ارسلان نے ان واقعات پر جو تبصرہ کیا تھا، وہ بظاہر غیر جانبدارانہ تھا مگر در پردہ سلطان سلیم کو یہ بتانے کی کوشش کی گئی تھی کہ سلطان قانصوہ یہ جو کچھ کر رہا ہے، شاہ ایران کے اکسانے اور ورغلانے پر کر رہا ہے۔ ارسلان نے لکھا تھا۔

''افسوس کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اس کا براہ راست اثر اسلام کے پھیلاؤ پر پڑے گا۔ اے کاش ترک فرماں روا کو حکمتِ عملی سے مسلم ممالک پر حملہ کرنے سے روکا جا سکتا اور اس کی سیل ہمہ گیر قوت کو مغربی ممالک کی طرف موڑ دیا جاتا۔ مسلمانوں کا مسلمانوں سے لڑنا افسوسناک ہے۔ اے کاش دونوں طرف ایسے لوگ موجود ہوتے جو اپنے اپنے سلطان کو یہ بتا دیتے کہ وہ کسی کے آلۂ کار نہ بنیں اور آپس ہی میں برسرِ پیکار نہ ہوں۔ مجھے ذاتی طور پر اس چپقلش میں شاہ ایران کی سازش کارفرما نظر آتی ہے۔ وہ اپنے کھوئے ہوئے علاقے کو ترکوں اور مصریوں کو لڑا کر حاصل کرنا چاہتا ہے جبکہ میں...... سلطان مصر کو بہت قریب سے دیکھ اور سمجھ رہا ہوں۔ یہ ایک مسلمان اور سچا اسلامی جذبہ رکھنے والا فرماں روا ہے۔''

سلطان قانصوہ نے یہ تبصرہ پڑھا تو اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں، پوچھا۔ ''سیاح ارسلان! یہ سب کچھ تو نے کیوں لکھا ہے؟''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''سلطان معظم! میں نہیں چاہتا کہ مستقبل میں آپ کے جذبۂ ملی اور آپ کی ملکی سیاست پر شک وشبہ کیا جائے۔ آپ ہی بتائیں کہ یہ بہتر ہے کہ دو مسلم قوتیں آپس ہی میں لڑ بھڑ کر کمزور ہو جائیں یا یہ بہتر ہے کہ دونوں متحد ہو کر نصاریٰ کے ملکوں پر یلغار کریں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ناموں کو پوری روئے زمین میں پھیلا دیں۔''

سلطان نے کہا۔ ''لیکن تو نے ترک سلطان کی بابت کچھ بھی نہیں لکھا۔''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''محض اس لیے کہ میں اس ماحول سے واقف نہیں ہوں، اگر میں اس کے دربار میں رسائی حاصل کر سکا تو پھر اسی طرح صاف صاف اس کی بابت بھی لکھ دوں گا۔''

شاید سلطان ارسلان کی دلیلوں سے مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے گفتگو کا موضوع ہی بدل دیا، پوچھا۔ ''مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تم دونوں کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔ کیا تیرا بیٹا اس سے متمتع ہوتا ہے؟ اور تو اپنی تشنگی کیسے بجھاتا ہے؟''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''حضور والا! ربابہ کو میری مرضی کے خلاف ہمارے حوالے کر دیا گیا ہے۔ رہا اس سے متمتع ہونے کا سوال...... تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ خود میں تشنہ رہتا ہوں کیونکہ دورانِ سیاحت اس بات کی گنجائش ہی نہیں کہ میں بیوی رکھوں اور سیاحوں کو اپنی بیٹیاں دینا کون گوارا کرے گا؟''

سلطان نے کہا۔ ''میں تیرا یہ مسئلہ بھی حل کر دوں گا تو

فکر نہ کر... مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ تو ترک فرماں روا پر بھی کوئی تبصرہ کرے۔ سلطان سلیم کو یہ زیب نہیں دیتا تھا کہ وہ میرے قاصد کی ڈاڑھی منڈوا کر لنگڑے گھوڑے پر اسے واپس کرے۔''

ارسلان نے جواب دیا۔''سلطان کی خواہش کا احترام اور اس کی تعمیل میرا فرض ہے لیکن قاصد کے بیان میں کچھ باتیں محلِ نظر ہیں، جب تک ان کی تصدیق نہ ہو جائے، میں اس پر کچھ بھی نہیں لکھ سکتا۔''

سلطان نے پوچھا۔''محلِ نظر؟ کون سی باتیں محلِ نظر ہیں؟''

ارسلان نے جواب دیا۔''حضور والا کا قاصد ترکی فرماں روا سے قسطنطنیہ میں ملا ہوگا اور وہیں اس کی ڈاڑھی منڈی ہوگی۔ اب ذرا اس فاصلے پر تو غور فرمائیے جو قسطنطنیہ اور حلب کے درمیان پایا جاتا ہے۔ قاصد نے مہینوں کا سفر کیا مگر اس کی منڈی ہوئی ڈاڑھی کے بال پھر بھی نہ نکل سکے۔ آپ اپنے قاصد سے یہ دلچسپ سوال کر سکتے ہیں کہ کیا ترک فرماں روا نے اس کی ڈاڑھی حلب کے دروازے پر منڈوائی تھی؟''

سلطان قانصوہ حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ معمولی سی بات اس کی سمجھ ہی میں نہ آئی تھی، پوچھا۔''سیاح ارسلان! واقعی یہ بات تو ہے۔ قاصد سے یہ سوال کیا تو جا سکتا ہے۔''

ارسلان نے عرض کیا۔''اگر آپ یہ سوال اپنے قاصد سے نہ بھی کریں، تب بھی میں اس کا جواب دے سکتا ہوں کیونکہ مجھے ایک نکتہ چیں اور نکتہ بیں سیاح کی بصیرت ملی ہے۔''

سلطان نے اشتیاق سے پوچھا۔''اس کا کیا جواب ہے...... تیرے پاس......؟''

ارسلان نے تاتاری سرداروں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔''اس سوال کا جواب میں کسی اور وقت پر اٹھا رکھتا ہوں۔''

لیکن سلطان کی بے چینی اسے کسی اور وقت پر نہیں ٹال سکتی تھی۔ اس نے تاتاری سرداروں کو اسی وقت رخصت کر دیا اور تخلیہ میں ارسلان سے پوچھا۔''ہاں...... تو اب بتا، قاصد سے متعلقہ اغراض کا کیا جواب ہے تیرے پاس؟''

ارسلان نے جواب دیا۔''سلطانِ عالی! فرماں روائے ترک آپ کے درمیان عناد اور کشمکش حقیقی نہیں مصنوعی ہے اور اس میں بھی شاہ ایران کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔''

سلطان نے کسی قدر فکر مندی سے پوچھا۔''ان حالات میں، میں سلطان سلیم کے آدمیوں کو چھوڑ دوں یا قید رکھوں؟''

ارسلان نے جواب دیا۔''میرے خیال میں انہیں چھوڑ دیجیے۔''

سلطان نے متذبذب لہجے میں کہا۔''ہاں، مجھے انہیں چھوڑ دینا چاہیے مگر شاید نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگر میں انہیں چھوڑ دوں گا تو ترک فرماں روا یہ سمجھے گا کہ میں اس سے ڈر گیا ہوں، اس لیے میں انہیں نہیں چھوڑ سکتا۔''

ارسلان نے مایوسی سے کہا۔''افسوس کہ میں سلطان کو اس سے بہتر مشورہ نہیں دے سکتا تھا۔''

سلطان نے انتہائی متکبرانہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا اور کہنا شروع کیا۔''میں بادشاہ ہوں اور خلافتِ عباسیہ میرے پاس مہمان کی طرح رہ رہی ہے۔ امیر المومنین میرے ساتھ ہیں۔ ان کی وجہ سے پورا عالمِ اسلام میری عزت کرتا ہے پھر میں ترک فرماں روا سے کیوں ڈروں۔ میں اس سے جنگ کروں گا اور جب وہ شکست سے دوچار ہو جائے گا۔ اس وقت میں اس کو بتاؤں گا کہ خدائی کا نشہ کتنا برا ہوتا ہے۔ میں سلطان سلیم کو کم از کم ایک بار سبق ضرور دوں گا۔''

ارسلان، سلطان سلیم کے خلاف کچھ بھی نہیں سننا چاہتا تھا، اس نے جانے کی اجازت طلب کی تو سلطان قانصوہ نے اس کو روکنا مناسب نہیں سمجھا اور اس کو جانے دیا۔

ارسلان اور زکریا، دونوں ہی اداس اور فکر مند اپنی قیام گاہ پر واپس پہنچے۔ ربابہ دونوں کے لیے چشم براہ تھی۔ ارسلان نے ازراہِ مذاق کہا۔''ربابہ! مجھے بھی تیرا بڑا خیال رہتا ہے مگر تو اس کا اندازہ نہیں لگا سکتی۔''

ربابہ نے پوچھا۔''کیوں، میں اندازہ کیوں نہیں لگا سکتی؟''

ارسلان نے جواب دیا۔''آج سلطان نے تیرا ذکر کیا تھا اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ تو زکریا کے حصے میں جا چکی ہے تو انہوں نے میرے لیے کسی دوسری عورت کی فکر کی لیکن میں نے سوچا کہ جس گھر میں تو موجود ہے، مجھے کسی اور عورت کو اس گھر میں نہیں لانا چاہیے۔''

ربابہ چونک پڑی، زکریا بھی ارسلان کی صورت دیکھنے لگا۔ دونوں کو حیرت تھی کہ ارسلان یہ کیا کہہ رہا ہے؟ اس کی ان باتوں کا مطلب کیا تھا؟ زکریا کو تو یہ بات اتنی بری لگی کہ وہ ربابہ کو دوسرے کمرے میں لے گیا اور کہا۔''شاید پدر بزرگوار کا دماغ چل گیا ہے۔ یہ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ آخر مطلب کیا ہے ان باتوں کا......؟''

ربابہ بھی بہت افسردہ ہو گئی تھی، بولی۔''پتا نہیں یہ چاہتے کیا ہیں؟''

ارسلان تنہا رہ گیا، وہ سلطان سلیم کے لیے ساری روداد لکھنے لگا۔ سنان پاشا کے دونوں آدمی تاجر کے روپ میں حلب میں موجود تھے۔ زکریا سے اس کو بھی ایک ہی فائدہ حاصل تھا، یہ کہ ارسلان خود کو تنہا نہیں محسوس کرتا تھا لیکن جہاں تک زکریا کا تعلق تھا، وہ ربابہ کے چکر میں نکما اور بے کار ہوتا جارہا تھا۔ ارسلان کا خیال تھا اگر اسے دونوں میں سے کوئی ایک بھی تاجر نہ ملے تو یہ زکریا کا فرض تھا کہ یہاں کی ساری خبریں اور اطلاعات سلطان سلیم یا سنان پاشا تک پہنچا دے لیکن زکریا ربابہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔

رات کو عشا کے بعد سلطان قانصوہ کا ایک ہرکارہ ارسلان کے پاس آیا اور کہا۔ ''شاہ ایران کے وفد کے کچھ لوگ آپ دونوں سے ملنا چاہتے ہیں، کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ آپ کے سفرنامے میں کسی نہ کسی طرح ان کا ذکر بھی آجائے۔''

ارسلان کا ماتھا ٹھنکا، اس نے اپنی تشویش کو چھپانے کی کوشش کی۔ ''بہت خوب! میں بھی ان لوگوں سے الگ مل کر خوشی محسوس کروں گا مگر اب یہ ملاقات صبح ہوسکے گی۔''

ہرکارے نے پوچھا۔ ''اس وقت کیوں نہیں؟ وہ آپ دونوں سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہیں۔''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''ایسی بھی کیا بے چینی، میں مصر کے سلطان کا مہمان ہوں اس لیے سلطان کی اجازت کے بغیر میں کسی سے بھی نہیں مل سکتا۔''

ہرکارہ مسکرایا، بولا۔ ''جناب سیاح صاحب! مجھ کو سلطان ہی نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ شاہ ایران کے وفد کے وہ چند شوقین ملاقات یہیں باہر موجود ہیں۔ آپ کو ان سے ملنے کے لیے کہیں اور نہیں جانا پڑے گا۔''

ارسلان اور زیادہ گھبرایا، ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تو وہ لوگ یہیں میرے پاس آچکے ہیں یعنی خود مجھے کہیں بھی نہیں جانا پڑے گا..... مگر بہتر طریقہ یہی تھا کہ میں ان لوگوں سے ملنے سے پہلے سلطان سے اجازت حاصل کرلیتا۔''

سلطانی ہرکارے نے ذرا بیزاری سے کہا۔ ''جناب والا! میں سلطانی ہرکارہ ہوں اور میری یہاں موجودگی کا مطلب ہی یہ ہے کہ یہ ملاقات سلطان کی مرضی اور اجازت سے ہورہی ہے۔ مجھ کو آپ کے پاس سلطان ہی نے بھیجا ہے۔''

اب ارسلان کے پاس ایسا کوئی عذر بھی نہیں رہ گیا تھا جس کے بہانے وہ مشتبہ ایرانیوں سے ملاقات سے بچ جاتا۔ اس نے اپنی بیرونی بیٹھک میں سلطانی ہرکارے کو بٹھادیا اور کہا۔ ''شاہ کے آدمیوں کو بھی یہیں بلالے، میں ابھی آتا ہوں اندر سے۔''

سلطانی ہرکارے نے ارسلان کو روکتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں، جب آیئے گا تو اپنے ساتھ اپنے بیٹے کو بھی لیتے آیئے گا کیونکہ یہ لوگ آپ دونوں ہی سے ملنا چاہتے ہیں۔''

ارسلان کی وحشت میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا۔ وہ اندر چلا گیا۔ وہ سیدھا زکریا کے پاس پہنچا۔ زکریا اور ربابہ کسی بات پر بے تحاشا ہنس رہے تھے۔ ارسلان نے دبی دبی آواز میں دونوں کو ڈانٹا۔ ''بند کرو یہ ہنسی مذاق کی باتیں۔ جس بات کا خطرہ تھا وہ یہاں تک آچکی ہے۔ میں پریشان ہوں کہ اب کیا ہوگا؟''

ربابہ نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

زکریا بھونچکا، بس ارسلان کی صورت دیکھتا رہا۔ مجسم سوال بن گیا، گویا پوچھ رہا ہو۔ ''کیا ہوا؟ آخر بات کیا ہے؟''

ارسلان نے ربابہ سے کہا۔ ''ربابہ! تو یہاں سے چلی جا مجھے زکریا سے چند خاص باتیں کرنا ہیں۔''

ربابہ وہاں سے ہٹ تو گئی مگر اس طرح گویا بادلِ ناخواستہ جارہی ہو۔

ارسلان نے سرگوشی میں کہا۔ ''زکریا! شاہ ایران کے وفد میں جو لوگ شامل ہیں، مجھ کو تو معلوم نہیں کیوں، یہ شبہ کھائے جارہا ہے کہ کم از کم زکریا کو یعنی تجھ کو ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور پہچان لے گا۔ چنانچہ یہ چند لوگ جو بظاہر سیاحوں سے ملنے آئے ہیں، کسی اور ہی غرض سے حاضر ہوئے ہیں۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''استاد محترم! آپ تو شکی ہوگئے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ جو کچھ سوچ رہے ہیں، درست ہی ہو......''

ارسلان کو غصہ آرہا تھا، جھنجلا کر بولا۔ ''تب پھر آجا میرے ساتھ۔ اس میں ڈر کس بات کا؟''

زکریا بڑے اعتماد اور یقین سے ایرانی وفد کے ارکان کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے زکریا کو بڑے غور سے دیکھا، اور ان میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو زکریا کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ گویا پہچاننے کی کوشش کررہا ہو۔ آخر جب اس سے نہیں رہا گیا تو اس شخص نے زکریا سے پوچھا۔ ''آپ لوگ کہاں سے سفر کرکے یہاں تک پہنچے ہیں؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''بصرے سے..... کیوں؟''

اس شخص نے پھر سوال کیا۔ ''صاحبزادے! میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔''

زکریا نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''دیکھا ہوگا لیکن

میں نے آپ کو آج سے پہلے نہیں دیکھا۔''
وہ شخص اب بھی مطمئن نہیں تھا، غیر یقینی لہجے میں بولا۔ ''تم کبھی جھیل وان کے کنارے بھی رہے ہو؟''
زکریا نے دوٹوک جواب دیا۔ ''نہیں، کبھی نہیں۔''
ارسلان اور ایرانی وفد کے دوسرے لوگ ان دونوں کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔
ایرانی نے اصرار کیا۔ ''لیکن میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں تمہیں جھیل وان کے کنارے دیکھ چکا ہوں۔ اس وقت تم سلطان سلیم کے آدمی تھے اور اگر میں دھوکا نہیں کھا رہا تو یہی کہوں گا کہ اس وقت بھی تم سیاح نہیں، ترکی کے سلطان کے لیے کوئی اہم خدمت انجام دے رہے ہو۔''
اب ارسلان کو مداخلت کرنا پڑی بولا۔ ''جناب والا! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ آخر اس الزام تراشی کا مقصد؟''
ایرانی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''افسوس کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں غلط فہمی کا شکار ہو چکا ہوں لیکن اندر سے دل بار بار یہی کہہ رہا ہے کہ یہ نوجوان وہی ہے جس نے صفی الدین کے ساتھ فریب کیا تھا۔''
ارسلان نے ناک بھوں چڑھائی اور پیشانی پر گہری سلوٹیں پڑ گئیں۔ اس نے زکریا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا بولا۔ ''بیٹے زکریا! چل گھر واپس چلیں یہاں تو اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں گی۔''
زکریا اور ارسلان، ایرانیوں کو چھوڑ کر اندر چلے گئے۔ دروازے اندر سے بند کر لیے، زکریا سے کہا۔ ''کیا سمجھا؟ کچھ سمجھ میں آیا تیری؟''
زکریا نے آہستہ سے کہا۔ ''ہاں، وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں اور کسی حد تک پہچان بھی گئے ہیں۔ اس کا صحیح علم تو بس خدا کو ہوگا۔''
ارسلان نے کہا۔ ''زکریا! میری مرضی تو یہ تھی کہ تو یہاں سے چلا جاتا مگر تو نہیں مانا۔ اب خطرے کی تلوار ہمارے سروں پر لٹک چکی ہے پتا نہیں کب کس پر یا دونوں پر چل جائے۔''
زکریا نے مایوسی سے کہا۔ ''استادِ محترم! آپ کا ارشاد بجا، میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔ اب کیا کیا جائے؟''
ارسلان کچھ سوچتا رہا لیکن اس سوچ میں حکمت اور بردباری چھائی رہی۔ بولا۔ ''اگر تو اپنی غلطی پر نادم ہے تو یہی بہت ہے بقیہ جو انجام بھی ہوگا، دیکھا جائے گا۔''
ارسلان نے ساری معلومات ایک کاغذ پر لکھ رکھی تھیں۔ انہیں جلدی جلدی ایک چھاگل میں بند کر دیا اور پھر اس چھاگل کو لے کر حلب چلا گیا۔ وہاں بمشکل دونوں تاجروں کو پا لیا اور انہیں اپنا خط دے کر درخواست کی کہ اسے فوراً سنان پاشا کو پہنچا دیا جائے۔
ایک تاجر حلب ہی میں رہ گیا اور دوسرا دیار بکر روانہ ہو گیا۔ ارسلان ادھر سے فارغ ہو کر قلعے میں پہنچ گیا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو یہ منظر دیکھ کر اور زیادہ پریشان ہو گیا کہ سلطان قانصوہ نے ارسلان کے پاس ایک عورت بھیج دی تھی۔ نازک خدوخال اور سرخ و سفید رنگت والی اٹھائیس تیس سالہ خاتون۔ سلطان قانصوہ کے وہ آدمی جو اس خاتون کو لے کر آئے تھے، اس وقت بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے ارسلان سے گزارش کی۔ ''سلطانِ عالی مقام نے فرمایا ہے کہ یہ ناچیز نذرانہ قبول فرمائیں اور اس کے علاوہ بھی جس چیز کی ضرورت ہو بلا تکلف یاد فرمائیں۔''
ارسلان نے جواب دیا۔ ''مجھے دورانِ سیاحت عورت کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن اگر سلطان یہ محسوس فرماتے ہیں کہ مجھ کو عورت کی ضرورت ہے تو میں اس سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔''
زکریا خوش تھا کہ استاد ارسلان شاید اب ربابہ کے سلسلے میں خاموشی اختیار کر لیں گے۔ سلطان کے آدمی واپس چلے گئے۔ ارسلان نے عورت کو ربابہ کے پاس چھوڑا اور خود زکریا کو الگ لے جا کر مشورہ کرنے لگا۔ ارسلان کہہ رہا تھا۔ ''زکریا! میرا خیال ہے اب ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے کیونکہ ان دونوں عورتوں کی موجودگی میں ہمارے راز، راز نہیں رہیں گے۔''
زکریا نے پوچھا۔ ''اگر ہم حلب کو چھوڑ بھی دیں تو اب کہاں جائیں گے؟''
ارسلان نے جواب دیا۔ ''بظاہر ہمارا کام ختم ہو چکا ہے۔ ہمارا سلطان جو کچھ جاننا چاہتا تھا، وہ معلوم ہو چکا ہے۔ مصر کا سلطان ترکوں کے لیے خیر سگالی کے جذبات نہیں رکھتا۔ یہ شاہ ایران کی سازشوں کا شکار ہو چکا ہے اور اس کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔ اب جنگ ناگزیر ہو چکی ہے سلطان قانصوہ کے دیدبان شب و روز ترکوں کی نگرانی میں مشغول ہیں۔''
زکریا نے فکر و تشویش ظاہر کی۔ ''اگر ہم دیار بکر یا قسطنطنیہ واپس جائیں تو ربابہ اور اس دوسری عورت کا کیا کریں گے؟''
ارسلان نے جواب دیا۔ ''ان دونوں کو اپنے ساتھ

لے جائیں گے اور انہیں سلطان کے حوالے کردیں گے۔''

زکریا نے صاف انکار کردیا۔''لیکن مجھے آپ کے فیصلے سے اختلاف ہے۔''

ارسلان نے زکریا کو سمجھانے کی کوشش کی۔''زکریا! میں تجھ سے زیادہ تجربہ رکھتا ہوں۔ اگر ہم نے کوئی ایسا قدم اٹھایا جس میں سرکشی اور سلطان کی حکم عدولی پائی گئی تو ہم دنیا میں کہیں بھی پناہ نہیں حاصل کرسکیں گے۔''

زکریا نے جواب دیا۔''استاد محترم! آپ بہت زیادہ وہمی اور کمزور دل انسان ہیں۔ آپ سلطان سلیم کو جتنا بہادر اور رسا سمجھ رہے ہیں، مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میں نے سلطان سلیم کو بھی دیکھا ہے اور سلطان قانصوہ کو بھی۔ سلطان قانصوہ کسی طرح بھی ترک فرماں روا سے کم نہیں ہے اور میری ذاتی رائے میں سلطان مصر اور ترک فرماں روا کی باہمی آویزش اور جنگ ترکوں کے سیل کا خاتمہ کردے گی۔ میں ربابہ کو لے کر مصر چلا جاؤں گا اور ترک فرماں روا وہاں میرا پیچھا نہیں کرسکے گا۔''

ارسلان کا چہرہ فق ہوگیا۔''زکریا! تو پچھتائے گا، ترک فرماں روا ناقابلِ شکست ہے۔''

زکریا نے جواب دیا۔''لیکن میں اب قسطنطنیہ واپس نہیں جاؤں گا۔''

ارسلان نے سر جھکالیا، کچھ دیر سوچتا رہا۔ زکریا اسے سوچتا چھوڑ کر جانے لگا۔ ارسلان نے چونک کر جاتے ہوئے زکریا کو دیکھا اور ذرا اونچی آواز میں کہا۔''زکریا! تو جہاں چاہے جاسکتا ہے۔ میں تجھ کو اپنے فیصلے پر نہیں چلا سکتا لیکن خود میں نکل یہاں سے چلا جاؤں گا، تنہا اکیلا ہی اور سلطان سلیم کو تیری بابت سب کچھ بتادوں گا۔''

زکریا نے جواب دینا تو درکنار، مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

ارسلان اپنے بستر پر گیا تو رات گراں گزرنے لگی۔ وہ بڑی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند کا کوسوں پتا نہ تھا۔ زکریا اپنے استاد کی پریشانی پر خوش تھا۔ وہ ارسلان کو بزدل اور کم ہمت سمجھ رہا تھا۔ جب وہ ربابہ کے پاس گیا تو وہاں اس عورت کو بھی دیکھا جو سلطان قانصوہ کی طرف سے ارسلان کی نذر کی گئی تھی۔ زکریا نے اس حسین عورت کو دیکھا تو دل ہی دل میں استاد ارسلان کی بدقسمتی پر افسوس کرنے لگا۔ اس کو دکھ تھا کہ استاد ارسلان ترک فرماں روا کے خوف کی وجہ سے ایک حسین عورت سے محروم ہوجائیں گے۔

عورت ربابہ کو چھوڑ کر ارسلان کے پاس چلی گئی۔

ارسلان نے عورت کی آہٹ محسوس کی تو اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ وہ اس عورت کو یہ تاثر دے رہا تھا گویا وہ سوچکا ہے۔ عورت، ارسلان کے پاس کھڑی ہوگئی اور شمع کی روشنی میں ارسلان کی آنکھوں پر نظریں جما کر کچھ جاننے کی کوشش کرنے لگی۔ ارسلان نے بے اختیار اپنے پپوٹوں کو ہلکی سی حرکت دی جس سے اس کی پلکیں لرزش میں آگئیں۔ عورت نے ہلتے ہوئے پپوٹوں پر اپنی انگلیاں رکھ دیں اور انہیں کھولنے کی کوشش کی، بولی۔''بس جناب! اب جاگ جایئے اور آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھیے۔''

ارسلان نے سوئے ہوئے بنے رہنے کی کوشش کی مگر عورت کو دھوکا دینے میں ناکام رہا۔ عورت نے کہا۔''استاد ارسلان! اب زیادہ بننے کی کوشش نہ کریں۔ ہمیں آپ دونوں کی بابت سب کچھ معلوم ہوچکا ہے۔ میں بھی جانتی ہوں اور ربابہ بھی...... شاید کچھ دیر بعد سلطانِ مصر کے آدمی آپ دونوں کو گرفتار کرلیں گے۔''

اب استاد ارسلان کے لیے پڑے رہنا ناممکن ہوگیا تھا۔ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا اور خوف اور حیرت کی ملی جلی کیفیت سے عورت کو دیکھنے لگا، پوچھا۔''استاد ارسلان؟ تو کیا کہہ رہی ہے...... میں تیری بات نہیں سمجھا۔''

عورت نے جواب دیا۔''میری بات آپ کی سمجھ میں

آئے یا نہ آئے مگر آپ دونوں کی باتیں ہماری سمجھ میں بالکل آچکی ہیں۔ آپ استاد ارسلان ہیں، نئی چرنی تنظیم کے ایک لائق فائق استاد۔ زکریا آپ کا شاگرد ہے، بس اس سے زیادہ جاننا ہمارے لیے ضروری بھی نہیں۔"

استاد ارسلان نے کمزور لہجے میں کہا۔"میں وہ نہیں ہوں جو تو سمجھ رہی ہے۔ ضرور کسی نہ کسی نے تجھ کو ورغلا دیا ہے۔"

عورت نے جواب دیا۔"ویسے رباب اور میں دونوں ہی یہ نہیں چاہتے کہ تم دونوں کسی مصیبت میں پھنس جاؤ مگر جس طرح تم دونوں اپنے سلطان کے نمک خوار ہو، اسی طرح رباب اور میں دونوں ہی اپنے سلطان کے وفادار اور نمک خوار ہیں۔ تم دونوں ہمیں پہچان نہیں سکے جبکہ ہم نے تمہیں خوب پہچان لیا ہے۔"

اب استاد ارسلان کا تجاہلِ عارفانہ سے کام لینا ناممکن ہو چکا تھا۔ وہ سلطان قانصوہ کے پھندے میں پھنس چکا تھا۔ وہ حیرت زدہ تھا کہ رباب کس طرح سلطانِ مصر کی مخبرہ ہو سکتی تھی۔ اسے تو والیِ حران نے از راہِ کرم بطور انعام زکریا کے حوالے کر دیا تھا۔

لیکن پھر اس کے شعور اور علم نے اسے مطلع کر دیا کہ والیِ حران نے رباب کو مخبری کے لیے ان دونوں کے حوالے کر دیا ہوگا اب وہ بازی ہار چکا تھا اور مملوک سلطان قانصوہ اس کو شکست دے چکا تھا۔ رہی سہی کسر شاہ ایران کے وفد نے پوری کر دی تھی۔ وہ عورت کو چور نظروں سے دیکھنے لگا۔ جھٹلانے کی آخری کوشش کی۔"عورت! تو معلوم نہیں کیوں بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ معلوم نہیں کس استاد ارسلان کی بات کر رہی ہے تو...... زکریا میرا شاگرد نہیں بیٹا ہے ہم دونوں سیاح ہیں، اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔"

عورت نے جواب دیا۔"استاد ارسلان! آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں بس یہی کہتے رہیں۔ ہمیں جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔ عنقریب آپ کو سلطان کے روبرو پیش کر دیا جائے گا۔ وہاں بھی آپ اپنی بات پر اڑے رہیں یہاں تک کہ آپ دونوں مشتبہ ہو جائیں گے اور کچھ دنوں کے لیے آپ دونوں کو زندگی مل جائے گی۔ آپ دونوں اس وقفے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔"

ارسلان کی عقل نے جواب دے دیا تھا۔ وہ بوکھلاہٹ میں اٹھا اور زکریا کے پاس پہنچ گیا۔ ارسلان نے اس کو آواز دی اور جب وہ ارسلان سے ملا تو ارسلان نے سرگوشی میں کہا۔"زکریا! غضب ہو گیا، ہم دونوں پہچان لیے گئے۔ بتاؤ اب ہم کیا کریں؟"

زکریا نے آہستہ سے جواب دیا۔"استادِ محترم! مجھ کو بھی ساری باتیں معلوم ہو چکی ہیں۔ میں نے رباب پر اعتبار کر کے بڑی غلطی کی۔ میں نے محبت کے جوش میں اس کو سب کچھ بتا دیا تھا، جو نہیں بتانا چاہیے تھا۔ مجھ کو یہ بات کہاں تک چھپانی تھی، افسوس کہ پہلے نہیں جانتا تھا۔"

استاد ارسلان نے چونک کر پوچھا۔"تو ساری باتیں تو نے خود ہی رباب کو بتا دی تھیں؟"

زکریا نے سر جھکا کر جواب دیا۔"ہاں! میں آپ کا اور سلطان کا گناہ گار ہوں۔"

استاد ارسلان ہاتھ ملنے لگا۔"ہائے یہ تو نے کیا کر دیا؟ افسوس کہ میں تجھ کو اپنے ساتھ لایا، اے کاش نہ لایا ہوتا تو اس مصیبت میں نہ پھنستا۔"

لیکن اسی وقت ارسلان اور زکریا کو سلطان قانصوہ کے آدمیوں نے گرفتار کر لیا۔ ان دونوں کو باندھ کر قلعے کے کسی حصے میں ڈال دیا گیا۔ ایک ایسی تنگ و تاریک جگہ پر، جہاں ہوا کا بھی گزر نہ تھا۔ کئی دن بعد ان دونوں کو مملوک سلطان قانصوہ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ سلطان نے ان دونوں کو قہر کی نظروں سے دیکھا اور بطور خاص استاد ارسلان کو مخاطب کیا۔"مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تو ترک فرماں روا کی تعریف کیوں کیا کرتا تھا۔"

ارسلان نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔"ہماری بابت سلطان کو جو کچھ بھی بتایا گیا ہے، غلط ہے۔ ہم دونوں باپ بیٹے اور محض سیاح ہیں اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

سلطان نے کہا۔"استاد ارسلان! مکرنے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ افسوس کہ تیرا سلطان سلیم دیارِ بکر سے چل چکا ہے اور وہ عنقریب حلب کے شمالی میدانوں میں پڑاؤ ڈال دے گا۔ میں اس وقت تک تم دونوں کو زندہ اور قید میں رکھوں گا جب تک کہ ہمیں میدانِ جنگ کے نتائج نہ معلوم ہو جائیں۔ سلطان سلیم کو شکست دینے کے بعد تم دونوں پر مقدمہ چلے گا اور تم مستحق سزا سے خود کو نہیں بچا سکو گے۔"

ارسلان کے لیے یہ بڑی عمدہ خبر تھی۔ اس کے آقا سلطان سلیم کی آمد کا صریح یہ مطلب تھا کہ حلب سلطان قانصوہ کے ہاتھ سے نکل گیا کیونکہ سلطان سلیم کے پاس بندوقیں بھی تھیں اور توپ خانہ بھی۔ مملوک سلطان اپنی تلواروں سے بندوقوں اور توپوں کا کیا مقابلہ کرے گا اور کب تک جنگ کرے گا؟

سلطان قانصوہ ان دونوں کو قہر کی نظروں سے دیکھ رہا تھا مگر ارسلان اور زکریا زیادہ پریشان نہیں تھے۔

کئی دن بعد عصر کے وقت سلطان سلیم اور سنان پاشا اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ حلب کے شمال میں بارہ میل دور مرج دابق میں داخل ہو گئے۔ یہاں حضرت داؤد علیہ السلام کی قبر تھی۔ سلطان اور سنان پاشا نے پیغمبر داؤدؑ کی قبر پر حاضری دی۔ یہیں بنو امیہ کے مشہور خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کی قبر بھی ہے۔ سلطان نے سنان پاشا کے ساتھ اموی خلیفہ کے مزار پر بھی حاضری دی اور قبر کی پائنتی کھڑے ہو کر کہا۔ ''سلیمان! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ بنی اسرائیل کے پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام کے پدر بزرگوار کی قبر بھی مرج دابق میں ہے اور اموی خلیفہ سلیمان کی قبر بھی اسی جگہ ہے، گویا حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمانؑ ایک ہی جگہ دفن ہیں۔''

دابق کی چراگاہ میلوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ عربی میں چراگاہ کو مرج کہتے ہیں اس لیے اس جگہ کو مرج دابق کہتے ہیں۔ ترکوں کے سامنے جنوب میں حلب تھا۔ وہ خوش تھے کہ اب انہیں حلب میں داخل ہونے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔ اسی جگہ سنان پاشا کا ایک مخبر جو حلب میں تاجر کے روپ میں مقیم تھا، بچتا بچاتا، چھپتا چھپاتا مرج دابق پہنچ گیا اور یہ خبر پہنچانے میں کامیاب ہو گیا کہ سنان ارسلان اور زکریا کو سلطان قانصوہ نے قید کر دیا ہے کیونکہ اس کو کسی طرح یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ دونوں باپ بیٹے اور سیاح نہیں ہیں۔ سلطان بہت برہم ہوا۔ اور اس نے غصے میں کہا۔ ''یقیناً اس میں زکریا کی کوتاہیوں کا ہاتھ ہوگا ورنہ ارسلان ایک جہاندیدہ، تجربہ کار اور ہوشیار شخص ہے۔''

سلطان نے سنان پاشا کے مخبر سے پوچھا۔ ''ارسلان اور زکریا کو آخر پہچانا کس طرح گیا؟''

مخبر نے جواب دیا۔ ''سننے میں آیا ہے کہ زکریا کو کسی شہر کے والی نے بطور نذرانہ ایک کنیز بخش دی تھی، پس وہی کنیز بعد میں سلطان قانصوہ کی مخبر ثابت ہوئی۔ گویا اس گھر کو گھر کے ہی ایک چراغ نے جلا دیا۔''

سلطان نے سنان پاشا سے کہا۔ ''سنان پاشا! زکریا پر سختی کی ضرورت ہے۔ اس کو لڑکیاں برباد کر دیں گی۔ یہ استاد ارسلان کو کیا ہو گیا تھا جو وہ ایک خام شاخ کو اپنی مرضی سے جھکا نہیں سکا۔'' پھر اپنا یک موضوع بدل دیا سنان پاشا سے کہا۔ ''وہاں، سلطان قانصوہ کو مطلع کر دو کہ میں اپنے ان سفیروں کو واپس لینے آیا ہوں جنہیں بلا وجہ قید خانوں میں ڈال دیا گیا ہے۔''

سنان پاشا نے معذرانہ جواب دیا۔ ''ہمارے آدمی

نئے ڈرامے

بچی۔ ''دادی..... دادی کیا آپ ڈراما آرٹسٹ ہیں؟''

دادی جان۔ ''نہیں تو، بھلا کیوں؟''

بچی۔ ''آج ممی پاپا سے کہہ رہی تھیں کہ لو وہ آ گئی بڑھیا، اب روز گھر میں نئے نئے ڈرامے ہوا کریں گے۔''

حاضر جواب

ایک لڑکا اپنے پڑوسی کے کتے کو روز تنگ کرتا۔ ایک دن پڑوسی نے کہا۔ ''اب اگر تم نے میرے کتے کی ٹانگ پکڑی تو میں تمہاری ٹانگ توڑ دوں گا اور اگر گردن پکڑی تو میں تمہاری گردن توڑ دوں گا......''

لڑکے نے فوراً جواب دیا۔ ''تو میں اس کی دم پکڑ لوں گا۔''

مرسلہ۔ طیب اسد، ڈی آئی خان

حضور کا یہ پیغام لے کر جا چکے ہیں۔ شاید ہمیں پرسوں تک اپنے مراسلے کا جواب بھی مل جائے گا۔''

سلطان کو یہ چراگاہ بہت پسند آئی، اس نے کہا۔ ''اے کاش یہاں میں مستقل رہ سکتا۔''

ترکوں کے مویشی چراگاہ پر پل پڑے اور بے قراری سے چراگاہ میں منہ مارتے پھر رہے تھے۔ چراگاہ سے متصل کھلے میدان میں آناً فاناً خیموں کا ایک عظیم الشان شہر آباد ہو گیا۔

سلطان، سنان پاشا کو اپنے ساتھ لے کر ادھر ادھر نکل جاتا اور مقامی لوگوں سے پوچھ گچھ کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کرتا رہتا۔ دوسرے دن وہ دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار سلطان قانصوہ کی فوج کا معائنہ کرنے لگے جو ان کے عین مقابل حلب کے شمالی دروازے پر جمع ہو رہی تھی۔

جب یہ دونوں حلب کے شمالی دروازے پر نظریں جمائے کچھ دیکھ رہے تھے، انہوں نے کئی سواروں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا جب یہ لوگ سلطان اور سنان پاشا کے قریب پہنچے تو ان دونوں نے پہلی نظر ہی میں انہیں پہچان لیا۔ یہ وہ سفیر تھے جو عرصے سے سلطان قانصوہ کی قید میں تھے۔ سلطان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ سنان

پاشا سے کہا۔ ''سنان پاشا! جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، کیا تو بھی دیکھ رہا ہے؟''

سنان پاشا نے مؤدبانہ عرض کیا۔ ''حضور کیا دیکھ رہے ہیں؟ پتا نہیں لیکن شاید وہی کچھ دیکھ رہے ہیں جو یہاں کی ہر آنکھ دیکھ رہی ہے۔ میں اپنے سامنے ان سفیروں کو دیکھ رہا ہوں جو عرصے سے سلطان قانصوہ کی قید میں تھے۔ کیا حضور بھی یہی سب دیکھ رہے ہیں؟''

سلطان بہت جھنجلایا ہوا تھا بولا۔ ''سلطان قانصوہ کو آخر ہو کیا گیا ہے؟ یقیناً وہ پچھتر سالہ مخبوط الحواس حکمران اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ اگر اس نے میرے سفراء کو آزاد ہی کرنا تھا تو اسی وقت پر کیوں اٹھا رکھا گیا۔''

جب یہ سفراء ان کے قریب پہنچے تو سلطان اور سنان پاشا کو مؤدبانہ سلام کیا اور سلطان قانصوہ کا ایک خط سلطان کے حوالے کر دیا۔ اس میں مصر کے مملوک فرماں روا نے ترک فرماں روا کو لکھا تھا۔

''ترک فرماں روا کو یہ بات معلوم ہونا چاہیے کہ میں جنگ نہیں چاہتا۔ میں حلب میں اس لیے مقیم ہوں کہ یہاں سے ترک سلطان اور شاہ ایران میں مصالحت کرانے کی کوشش کروں۔ میں سلطان کے اسیر سفراء کو اس امید پر چھوڑ رہا ہوں کہ سلطان کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ میں جنگ نہیں چاہتا۔ میں حتیٰ الامکان جنگ سے بچنے کی کوشش کروں گا لیکن اگر یہ ہم پر مسلط ہی کر دی گئی تو پھر ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ہم نے منگولوں کے نامور سردار قط بوغا کو شکست دی تھی، وہ قط بوغا جس نے سینتیس جگہوں میں مسلسل فتوحات حاصل کی تھیں۔ مصر کے مملوک سلطان بیبرس نے اس کو شکستِ فاش دی تھی۔

''سلطان کے پاس جو کچھ ہے اس پر قانع رہنا چاہیے، ورنہ زیادہ کی ہوس میں جو کچھ ہے، اس سے بھی محروم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اللہ بس باقی ہوس...''

سلطان سلیم خط پڑھ کر خاموش ہو گیا۔ اس نے کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہیں کیا۔ سنان پاشا کو شبہ گزرا کہ شاید سلطان متذبذب ہو گیا ہے اس نے پوچھا۔ ''سلطان معظم! اس خط کا کیا جواب دیں گے؟''

سلطان نے جواب دیا۔ ''کوئی جواب نہیں، مصری فرماں روا یہ بار بار شاہ ایران کا ذکر کیوں کرتا ہے جبکہ اس کا کہیں کوئی وجود ہی نہیں، کیسی مصالحت؟ کس بات کی مصالحت؟ اس نے میرے سفراء کو بلا وجہ قید کیا تھا۔ اب اس نے خوفزدہ ہو کر انہیں چھوڑ دیا تو اس سے قانصوہ کے جرم میں کمی تو نہیں ہو گئی۔'' پھر کچھ سوچ کر طیش میں کہا۔ ''وہ قط بوغا کا ذکر کر رہا ہے جس کو مرے ہوئے بھی صدیاں گزر گئیں۔ کہتا ہے زیادہ کی ہوس میں، میں اس سے بھی محروم ہو جاؤں گا، جو کچھ میرے پاس ہے۔ وہ یہ کیوں نہیں سوچتا کہ مجھ سے خواہ مخواہ الجھ کر وہ اس سے بھی محروم ہو جائے گا جو اس کے پاس ہے۔'' سنان پاشا! میں جنگ کروں گا، میں جنگ کرنے آیا ہوں۔ میں قط بوغا نہیں، سلیم ہوں، قط بوغا سے مختلف اور بالکل الگ۔''

شام سے ذرا پہلے جب ترکوں نے میدانوں میں کھانا پکانے کے لیے اپنے چولہے جلائے تو اس کے دھوئیں سے پوری فضا شام سے پہلے ہی دھندلا گئی۔ ہر طرف کہر سا چھا گیا۔ سلطان قانصوہ دور سے ترکوں کی نقل و حرکت دیکھتا رہا۔ وہ اپنے خط کے جواب کا انتظار کرتا رہا جو اسے کبھی نہیں ملا۔ قانصوہ بھی کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ ترک سلطان کی خاموشی نے اس کو باور کرا دیا کہ جنگ ناگزیر ہو چکی ہے۔ اس نے اعلانِ جنگ کرنے میں ذرا سی بھی تاخیر نہیں کی پچھتر سالہ بوڑھے نے ایک عرصے بعد اپنے جسم کو زرہ بکتر میں اور سر کو خود میں چھپا لیا جس کی کڑیاں دانتوں تک کی حفاظت کرتی ہیں۔

میدانِ جنگ میں اترنے سے پہلے ہی اس نے ارسلان اور زکریا کو ایک بار پھر اسی جگہ پہنچا دیا جہاں وہ دونوں ربابہ کے ساتھ رہ رہے تھے اور جس جگہ ایک عورت کا اضافہ ہو گیا تھا۔ سلطان قانصوہ نے ارسلان سے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ تو اور تیرا ساتھی زکریا، دونوں ترک فرماں روا کے لیے جاسوسی کر رہے ہیں یا نہیں۔ میں سلطان سلیم سے دوستی کا خواہاں ہوں اس لیے اگر تم دونوں واقعی سلطان کے آدمی ہو تو اس کے پاس جا سکتے ہو مگر شرط یہ ہے کہ تم سلطان کو مفاہمت اور صلح پر آمادہ کر دو گے۔''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''ہم سلطان کے آدمی نہیں ہیں، اس لیے آپ چاہے قید میں رکھیں یا آزاد چھوڑ دیں ہم نہیں رہیں گے اور جب جنگ کے بادل چھٹ جائیں گے تو ہم کسی اور طرف نکل جائیں گے۔''

شاید سلطان قانصوہ کو ارسلان کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ کچھ دیر ٹکٹکی باندھے ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد میدانِ جنگ کی طرف نکل گیا۔ مرج وابق کی رزم گاہ حلب سے زیادہ دور نہیں تھی صرف بارہ میل کے فاصلے پر۔

سلطان سلیم اور سلطان قانصوہ اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ آمنے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے۔ سلطان سلیم کا

توپ خانہ اور بندوق بردار فوج جواں ہمت تھی اور اس کو اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ دوسری طرف سلطان قانصوہ تھا جو اپنے ساتھیوں کی ہمت یہ کہہ کہہ کر بڑھا رہا تھا کہ اگر اس کی فوج نے ہمت اور جواں مردی دکھائی تو توپ خانے پر قبضہ کر کے ترک فرماں روا کو بڑی شرمناک شکست دی جاسکتی ہے۔

طلوعِ آفتاب کے بعد دونوں سلطانوں نے اپنی اپنی فوج کے سامنے سے گزر کر ان کی ہمت افزائی کی اور انہیں بتایا کہ دشمن کچھ زیادہ طاقت ور نہیں ہے بس پامردی، استقلال سے اس کا پیچھا کرنے کی ضرورت ہے، انہیں بڑی آسانی سے مغلوب کیا جاسکتا ہے۔

طبلِ جنگ بجا اور نقاروں پر چوٹ پڑی۔ دونوں فوجیں بڑی سرعت سے ایک دوسرے پر جھپٹیں اور کاٹ چھانٹ شروع کردی۔ سلطان سلیم نے تو کچھ دیر بعد ہی توپ خانے کا منہ کھول دیا اور بندوقوں کی باڑھ پر سلطان قانصوہ کی فوج کو رکھ لیا۔

سنان پاشا توپ خانے کو اپنی مرضی سے استعمال کررہا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ سلطان کو اس کی زو میں لے لیا جائے۔ کافی دیر بعد مصری فرماں روا توپ خانے کی زد میں آگیا، سنان پاشا نے حکم دیا۔ ''بزن.....''

اور توپ خانہ بھیانک آواز کے ساتھ ہی چل گیا۔ سلطان کا گھوڑا بدکا اور اس کو لے کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ کسی فوجی کی بندوق نے اس پر گولی چلادی، نشانہ خطا ہوگیا مگر خود سلطان قانصوہ اپنے گھوڑے سے گر گیا۔ اس کے پیچھے سے آنے والے گھوڑوں نے سلطان کو کچل کر خاک میں ملادیا۔ جن لوگوں نے یہ دلدوز منظر دیکھا تھا، وہ چیخ چیخ کر اعلان کرنے لگے۔ ''سلطان ہلاک ہوگیا اس لیے جو لڑنا مرنا جانتے ہوں وہ میدانِ جنگ میں ڈٹے رہیں اور جنہیں سلطان قانصوہ کے بعد کسی دوسرے سلطان کے دربار کا رخ کرنا ہے تو وہ جنگ سے بچیں اور مستقبل کی فکر کریں۔''

سلطان قانصوہ کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ سلطان سلیم نے مصری فرماں روا کی لاش پر قبضہ کرلیا اور حلب میں درانہ وار گھستا چلا گیا۔ مرج وابق کی جنگ کے بعد کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ سلطان سلیم نے اپنی فوج کے منتخب دستے کے ساتھ قلعے کا رخ کیا۔ سنان پاشا اس کے ساتھ تھا۔ اس کو سنان پاشا سے یہ بات معلوم ہوچکی تھی کہ ارسلان اور زکریا حلب کے قلعے میں موجود ہیں

اس نے اپنے آدمیوں کو ان کی تلاش میں چھوڑ دیا۔

استاد ارسلان کو جب یہ معلوم ہوا کہ سلطان قانصوہ مارا گیا اور سلطان سلیم حلب میں داخل ہوچکا ہے تو وہ بہت پریشان ہوگیا۔ زکریا کے چہرے کی رنگت بھی زرد پڑگئی تھی وہ سلطان کے تصور سے کانپ رہا تھا۔ ارسلان نے اس کو چھیڑنے کے لیے کہا۔ ''زکریا! اب کیا ہوگا، کیا ہم دونوں مصر بھاگ چلیں؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''آپ میرا مذاق اڑا سکتے ہیں لیکن میری رائے نہیں بدل سکتے۔ میں اب بھی سلطان کی قربت سے لرزاں و ترساں ہوں اور اگر اس وقت بھی مجھ کو فرار کا موقع مل گیا تو میں ہمیشہ کے لیے غائب ہوجاؤں۔''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''میں ایک بار پھر تجھ کو یہی مشورہ دوں گا کہ یہ فضول باتیں ہیں اور تو کہیں بھی رہ اور کہیں بھی چلا جا، سلطان تیری بو سونگھتا پھر رہا ہے۔''

خوف اور وحشت کی ایک لہر پورے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ منصوبے بنا رہا تھا جو ارسلان کو بھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔ آخرکار ربابہ کو لے کر چلے جانے کا ایک منصوبہ تیار کیا گو وہ اب بھی مصر جانے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھا۔

سلطان کے آدمیوں نے ان دونوں کو پالیا اور انہیں سلطان کی خدمت میں پہنچا دیا۔ دونوں کا مارے ڈر کے برا حال تھا۔ اس وقت سلطان کے پاس سنان پاشا بھی موجود تھا۔ سلطان ان دونوں کو بڑی توجہ سے دیکھتا رہا پھر زکریا سے کہا۔ ''تو مصر کب تک جارہا ہے غالباً تیرے ساتھ وہ لڑکی بھی جائے گی، کیا نام ہے اس کا واہ واہ۔''

استاد ارسلان نے اپنے طور پر جواب دیا۔ ''جی بندہ پرور اس کا نام ربابہ ہے۔''

سلطان نے ارسلان سے کہا۔ ''تیری بھیجی ہوئی معلومات نے میرا بڑا ساتھ دیا لیکن یہ زکریا، اس نے کچھ بھی تو نہیں کیا۔'' پھر سنان پاشا سے کہا۔ ''سنان پاشا! ہم مصر جائیں گے اور اس کو فتح کریں گے۔ استاد ارسلان کے مزاج میں نرمی ہے تم سخت ہو، اب میں زکریا کو تیرے حوالے کرتا ہوں۔ تو اس کے دل سے عورت کو نکال دے۔ یہ کام کا آدمی خودبخود بن جائے گا۔''

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ''سلطان محترم! انشاء اللہ آپ کو مایوس نہیں کروں گا اور زکریا کو الف کی طرح سیدھا کردوں گا۔''

سلطان نے کچھ عرصہ حلب میں قیام کیا۔ اس نے ارسلان اور زکریا سے ربابہ اور سلطان قانصوہ کی عطا کردہ

عورت کو اپنی تحویل میں لے لیا اور دونوں کو کچھ بھی پتا نہ چلا کہ انہیں کس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ زکریا کو یہ بات گراں تو بہت گزری مگر وہ سلطان کے غصے اور عتاب سے خوف زدہ بھی رہتا تھا۔ وہ ایک بار پھر زخم خوردہ سانپ کی طرح تلملا کر رہ گیا۔ اس کا دل اکتا چکا تھا، کسی بات میں لگتا ہی نہ تھا اور اس پر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اب وہ سنان پاشا کے حوالے کیا جا چکا تھا، اور سنان پاشا نسبتاً سلطان سے کچھ کم مگر سخت آدمی تھا۔ زکریا میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ کسی بھی موضوع پر بے تکلفی سے سنان پاشا سے بات ہی کر سکتا۔

ادھر سلطان سلیم مصر پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہا تھا اور دوسری طرف مصر میں چوبیس سردار سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے اور انہیں اپنے ہی میں سے کسی کو سلطان قانصوہ کا جانشین چن لینا تھا۔ چوبیس سرداروں کو اس انتخاب میں دشواری نہیں پیش آئی۔ انہوں نے اپنے ایک سردار طومان بے کو مصر کا سلطان بنا دیا۔ اس سلطان کی پشت پر نام نہاد عباسی خلیفہ مستمسک باللہ کا ہاتھ تھا اور اس نے طومان بے کو عالم اسلام کا سلطان تسلیم کر لیا تھا اور اس کے لیے سندِ حکومت جاری کر دی تھی۔

سلطان نے سنان پاشا کو توپ خانہ دے کر مصر کی طرف روانہ کر دیا اور خود اس کے پیچھے چلا۔ زکریا سنان پاشا کے ساتھ سائے کی طرح تھا خاموش، چپ چاپ اپنی خواہش اور مرضی سے لاتعلق بلکہ بیگانہ ان کاموں میں مشغول رہتا جن پر سنان پاشا نے لگا دیا تھا۔ مصر کے قریب تقریباً ساحل مگر ریگستانی مقام غزہ میں سنان پاشا نے پڑاؤ ڈالا اور زکریا کو ہراول دستے کے ساتھ مصر کی طرف روانہ کر دیا۔ زکریا نے محسوس کیا کہ سنان پاشا خود کو بچا رہا ہے اور زکریا کو ہلاکت میں دھکیلنے کی فکر میں ہے۔ زکریا بولا تو کچھ بھی نہیں مگر دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ہراول دستے کے ساتھ قاہرہ چلا جائے گا اور ترکوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر لے گا۔

ابھی وہ صحرائے سینائی کے مغربی کناروں تک ہی پہنچا تھا کہ سنان پاشا کے بھیجے ہوئے ایک دستے نے انہیں روک لیا اور حراست میں لیے ہوئے غزہ میں واپس لے گیا۔ اس وقت غزہ میں سنان پاشا اور مصری فوج کے درمیان زبردست معرکۂ جدال و قتال برپا تھا۔ آخر توپ خانے اور بندوقوں کی برتری نے مصریوں کو مغلوب کر دیا اور سنان پاشا غالب آیا۔ کچھ دیر بعد سلطان سلیم بھی وہیں پہنچ گیا۔ اس نے سنان پاشا کو فتح کی مبارک باد نہیں دی کیونکہ سلطان کی نظر میں یہ کوئی کارنامہ نہیں تھا۔

سنان پاشا زکریا کو ایک گوشے میں لے گیا اور اس کو سرزنش کرنے لگا، بولا۔ ''زکریا! سچ سچ بتا، تیرے ارادے کیا تھے؟ کیا تو فرار نہیں ہو رہا تھا؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''جناب والا! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ چاہتے کیا ہیں؟''

سنان پاشا نے سختی سے کہا۔ ''میں خود تجھ سے سوال کر رہا ہوں میں نے تجھ کو بس اتنا ہی اختیار دیا ہے کہ میں تجھ سے سوال کروں اور تو ان کے جواب دیتا رہ۔ میں نے سوال کرنے کا کوئی اختیار تجھے نہیں دیا۔''

زکریا نے بھی تند و تیز لہجے میں کہا۔ ''جناب والا! میں بھی آپ ہی کی طرح کا ایک انسان ہوں۔ ایک ایسا انسان، جس میں غیرت بھی ہوتی ہے انا بھی اور میں ان چیزوں کو کچل کر بے حس، بے غیرت اور بے ضمیر انسان نہیں ہو سکتا۔''

سنان پاشا تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پاس ہی رکھے ہوئے کوڑے کو اٹھا لیا اور پھر وہ زکریا پر برسنے لگے۔ وہ ہر ضرب پر پہلو بدل کر رہ جاتا۔ سنان پاشا عالم غیظ و غضب میں کہہ رہا تھا۔ ''میں ارسلان نہیں ہوں۔ وہ خوش نصیب شخص ہے جس کو میں شرف ہم کلامی بخش دوں لیکن وہ شخص بدنصیب ہے جو تجھ سے تلخ کلامی کرے۔''

زکریا اور زیادہ تڑپ کر بولا۔ ''سلطان کے دستِ راست سنان پاشا! تم میرے جسم کو زخمی کر کے اس پر حکومت کر سکتے ہو لیکن تم اگر یہ چاہو کہ میرے دل اور دماغ پر حکومت کر لو تو یہ ناممکن ہے۔''

سنان پاشا نے کہا...... ''پہلے میری بات کا جواب دے، کیا تو فرار ہو رہا تھا......؟''

زکریا نے بیزاری سے کہا۔ ''میرے پاس تمہارے اس فضول سوال کا کوئی جواب نہیں۔''

سنان پاشا نے کہا۔ ''زکریا! میں تجھ کو قید میں ڈال سکتا ہوں۔ میں نے سنا ہے تو بلا کا ذہین اور ہوشیار نوجوان ہے لیکن یہاں باتیں کچھ اور ثابت کر رہی ہیں۔ تو جب تک میری نگرانی میں رہے گا میری مرضی کا تابع رہے گا۔ میں تجھ کو سیدھا کر دوں گا۔''

زکریا کے مضطرب جھے سینے میں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے کم از کم ایک بات ذہن نشین کر لی تھی۔ سنان پاشا سے رحم اور مروت کی امید نہیں کی جا سکتی۔

سلطان غزہ کی تسخیر کے بعد مصر میں داخل ہو گیا وہاں

طومان بے مصر کا سلطان اپنی فوج کے ساتھ سلطان کے استقبال کے لیے کھڑا تھا۔ سلطان سلیم طومان بے کی مستعدی دیکھ کر حیران رہ گیا، پھر بھی اس نے طومان بے کو مرعوب اور متاثر کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا پرزہ بھیج دیا۔

''مصر کے نئے سلطان بے کے نام سلطان شرق وغرب سلیم کا خصوصی پیغام! طومان بے اگر چاہے تو اپنی اطاعت اور فرماں برداری کا اظہار کر کے اور خراج کی رقم اور اشیا مقرر کر کے اپنی جان اور حکومت کا تحفظ حاصل کر سکتا ہے ورنہ تیرا جو حشر ہوگا، وہ تو نہیں دوسرے لوگ دیکھیں گے اور عبرت پکڑیں گے۔''

طومان بے نے اس کا منہ توڑ جواب دیا۔ ''خلافت عباسیہ کی سرپرستی ہمیں حاصل ہے اور حکومتوں کی سند حکمرانی ہمارے یہاں سے جاری ہوتی ہیں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ترک فرماں روا کو اس قسم کی کوئی سند نہیں دی گئی اور سلطان سلیم کو جائز حکمرانوں میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ہم ناجائز کو ہٹا کر جائز کو بٹھا دیں گے تاکہ لوگ دیکھیں اور عبرت حاصل کریں۔''

جب یہ مکتوب سلطان کو ملا تو وہ پاگل سا ہو گیا۔ اس خط نے سلطان کے ذہن میں ایک نئی بات ڈال دی تھی۔ حیرت انگیز اور انتہائی سودمند۔ اس نے طومان بے کے خط کو اپنے امرا، اور جاں نثاروں کے سامنے رکھ دیا اور ان سے مشورہ کیا...... ''ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

اکثریت نے یہ مشورہ دیا۔ ''جتنی جلد ممکن ہو مصر کو فتح کر لینا چاہیے اور طومان بے کو زندہ گرفتار کر لینا چاہیے۔''

یہاں استاد ارسلان بھی موجود تھا۔ اس نے مشورہ دیا۔ ''مصر کی تسخیر کے بعد سلطان کو خلافت پر بھی قبضہ کر لینا چاہیے۔ تاکہ ہر جائز و ناجائز کے اختیارات بھی سلطان ہی کو حاصل ہو جائیں!''

اس مشورے نے سلطان کو حد درجہ مسرور کر دیا۔ بولا۔ ''میں اس مشورے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔'' پھر سنان پاشا سے پوچھا۔ ''تیری کیا رائے ہے؟''

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ''اگر استاد ارسلان سے پہلے مجھ سے مشورہ لیا جاتا تو میں یہی رائے دیتا۔''

سلطان کو معلوم نہیں کیوں، زکریا یاد آگیا۔ پوچھا۔ ''سنان پاشا! اس نوجوان کا کیا حال ہے؟ زکریا کا!''

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ''میں نے اسے سیدھا کر دیا ہے مگر سرکشی اور تمرد نے اس کو ہلکان اور پریشان کر رکھا ہے۔''

یہ بچے

ایک بچہ اپنی ماں اور دو جڑواں بہنوں کو دیکھنے میٹرنٹی ہوم گیا۔ جب بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو سارے وارڈ میں گھومنے پھرنے لگا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے اسے پیار سے اپنے پاس بلایا۔ کچھ باتیں کرنے کے بعد بچے نے اس سے پوچھا۔

''آپ یہاں کب آئی تھیں؟''

''دو ہفتے ہوئے۔''

''آپ کا بچہ کہاں ہے، میں دیکھ لوں؟''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔''

''ارے۔'' بچے کو بڑی حیرت ہوئی۔ ''آپ تو بہت سست ہیں۔ میری امی تو دو روز پہلے آئی تھیں اور اب تک دو بچے آگئے۔''

مرسلہ۔ نوشین اظہر علی پور، حافظ آباد

ارسلان نے زکریا کی سفارش کی۔ ''سلطان معظم کو شاید معلوم نہیں کہ زکریا کو سنان پاشا نے کس طرح سیدھا کیا ہے۔''

سنان پاشا گرم ہو گیا۔ ''گستاخوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے تادیبی کارروائی کرنا ہی پڑتی ہے۔''

ارسلان بھی گرم ہو گیا لیکن سلطان کے مقربین میں ہر کوئی یہ بات جانتا تھا کہ زکریا نے ایک بار سلطان کی جان بچائی تھی، آج وہی زکریا سنان پاشا سے کوڑوں سے پٹ رہا ہے۔

سلطان نے سنان پاشا سے پوچھا۔ ''سنان پاشا! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟''

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ''حضورِ والا! وہ فرار ہو رہا تھا۔ اس کو صحرائے سینائی کی مغربی سرحد سے پکڑ کر لایا گیا تھا۔ اگر میں چوک جاتا تو وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا اور میں سلطان کو کیا جواب دیتا۔''

ارسلان نے زکریا کی وکالت کی۔ ''سلطان معظم! یہ بہتان ہے، زکریا پر الزام تراشی ہے!''

سنان پاشا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''استاد ارسلان کو ایسی ناشائستہ زبان نہیں استعمال کرنا چاہیے اور انہیں یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ میں پاشا ہوں۔''

سلطان نے ان دونوں کو ڈانٹ دیا۔ ''بس اب تم دونوں چپ ہو جاؤ۔'' پھر سنان پاشا سے کہا۔ ''سنان پاشا! تم سختی کرو لیکن اس میں کوڑے کا استعمال نہیں ہونا چاہیے۔'' پھر ارسلان کو سمجھایا۔ ''تیری نرمیوں نے اکثر تیرے شاگردوں کو گستاخ کر دیا ہے۔ تہذیب و تربیت کے لیے سختی بھی ایک ضروری حربہ ہے۔''

اس کے بعد سلطان نے اعلان کیا۔ ''میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب خلافت کو قسطنطنیہ کا سفر کرنا چاہیے۔ یہ مدینے سے کوفے منتقل ہوئی، اس کے بعد شام کے شہر دمشق میں مقیم ہوگئی...... جب وہاں سے جی اکتایا تو سرمن رائے اور پھر بغداد کا رخ کیا اور عراق کو اقصائے عالم میں رشک انگیز بنا دیا۔ بغداد منگولوں کے ہاتھوں برباد ہوا تو خلافت قاہرہ میں جا بسی۔ اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ قاہرہ میں بھی یہ اکتا گئی ہوگی۔ اب میں اس کو یہاں سے بہت دور قسطنطنیہ لے جاؤں گا۔''

ارسلان اور سنان پاشا نے سلطان کا اصل مفہوم سمجھ لیا تھا کہ اب وہ مصر کے مملوک سلطان ہی کو زیر کرنے کا ارادہ نہیں کر چکا تھا بلکہ وہ خلافت نام کے اس بت کو بھی قاہرہ سے اٹھا لے جانا چاہتا تھا جس کے ہاتھ میں ملتِ اسلامیہ کے اثر و اقتدار کی باگ ڈور تھی۔

قاہرہ کے قریب رضوانیہ میں سلطان سلیم کا مصر کے سلطان طومان بے سے آمنا سامنا ہوا۔ طومان بے کی فوج زرہ بکتر اور جوشن و خود میں غرق فولادی چٹانوں کی طرح ڈٹی کھڑی تھی۔ سلطان سلیم کا توپ خانہ گاڑیوں پر لدا ہوا تھا جس کو گھوڑے کھینچ رہے تھے اور بندوق برداروں کے پرے مصری فوج پر نشانے قائم کر چکے تھے۔ اس عالم میں طومان بے کے چند ساتھی چوری سے سلطان سلیم سے جا ملے اور اس کو یہ راز کی بات بتادی کہ طومان بے کا سارا زور توپ خانے کی تسخیر اور بربادی پر ہوگا۔ سلطان کو ان پر شبہ گزرا کہ کہیں یہ کسی مغالطے میں تو نہیں ڈال رہے، اس نے ان سے پوچھا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون سا جذبہ تھا جس نے تمہیں میری حمایت اور اپنے ساتھیوں کی مخالفت پر آمادہ کر دیا۔''

ایک نے جواب دیا۔ ''سلطان کو ہم پر شبہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہم نے جب یہ دیکھا کہ سلطان کا توپ خانہ اور بندوقیں، ہر جگہ تلواروں، تیروں اور دوسری دست بہ دست لڑائیوں میں کام آنے والے آلات کو شکست دے چکی ہیں تو یہاں بھی شکست دے دیں گی۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے طاقتور مسلمان بھائیوں کو کمزور اور ناعاقبت اندیش بھائیوں پر ترجیح دیں۔''

سلطان نے ذرا سا سکوت اختیار کیا اور پھر ان پر اعتبار کیا۔ اس نے طومان بے کے ساتھیوں کی باتوں اور لہجوں میں چھپی ہوئی سچائی کو بہ آسانی پکڑ لیا تھا۔ اس نے فوج کی تربیت اور قیادت میں توپ خانے کی حفاظت کو مقدم رکھا۔

سنان پاشا نے زکریا کو بھی میدان جنگ میں رکھا، کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ زکریا جنگ کی گھن گرج کا بھی تجربہ حاصل کرے اور عملاً یہ بات سمجھ لے کہ مردوں کی اصل جگہ میدانِ کارزار ہے، عورتوں کی آغوش تو تھکے ہارے سورماؤں کے سکون اور وہ بھی محض وقتی سکون حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ زکریا یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ اس خوفناک اور لرزہ خیز ماحول میں بھی سنان پاشا بہت خوش تھا۔ سلطان سلیم توپ خانے سے متصل قلب کو سنبھالے ہوئے تھا۔

نقارے پر چوٹ پڑی اور جنگ کا طبل بج گیا۔ مصری فوج پر بندوقوں کی بوچھاڑ پڑی لیکن یہ سر پھرے اور جیالے لوگ دیوانہ وار یوں آگے بڑھے گویا موت کوئی شے نہیں جو گر جاتے۔ دوسرے ان کو روندتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ سلطان سلیم کا خیال تھا کہ بندوقوں کی باڑ دشمنوں کے حوصلے پست کر دے گی لیکن یہ خیالِ خام ثابت ہوا۔ طومان بے کی فوج کے تاتاری شجاعت میں ترکوں سے زیادہ تھے۔ طومان بے اپنے ساتھیوں کو لے کر توپ خانے میں گھس گیا۔ اس وقت کسی میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ ان سرفروشوں کو روک لیتا۔ یہ اپنے دائیں بائیں اور سامنے آنے والوں کا صفایا کرتے ہوئے سنان پاشا تک پہنچ گئے۔ زکریا نے انہیں اپنے سر پر آتا ہوا دیکھا تو توپ خانے کی ایک گاڑی کی آڑ میں ہو گیا۔ سلطان سلیم نے جب تاتاریوں کو سنان پاشا کے قریب پہنچتے دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے ایسے بہادر اب تک نہیں دیکھے تھے۔

طومان بے نے سنان پاشا کے سر پر پہنچ کر کہا۔ ''سلطان سلیم! میں قانصوہ کا بدلہ لینے آ گیا ہوں اور یہ قسم بھی پوری کرنے کہ میں سلطان سلیم کو اپنے نیزے سے ہلاک کر دوں گا۔''

وہ سنان پاشا کو سلطان سلیم سمجھ بیٹھا تھا۔ طومان بے کا نیزہ اس کے دوڑتے ہوئے گھوڑے کے زور اور داہنے ہاتھ کی کلائی کی قوت سے سنان پاشا کی پسلیوں کو توڑتا اور پشت کو چھیدتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ سنان پاشا سیخ میں پروئی ہوئی مچھلی کی طرح لٹک گیا۔ طومان بے نے نیزے کو سنان پاشا سمیت پھینک دیا۔ وہ اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ اس نے گھوڑے کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جو طومان بے اور اس کے ساتھیوں کو ترکوں کے عقب میں لیے چلا گیا اور وہاں سے ایک طویل چکر کاٹ کر وہ پھر اپنے لشکر میں داخل ہو گیا

لیکن اب جنگ کا پانسا پلٹ چکا تھا۔ ترکوں کا توپ خانہ اور بندوقیں حاوی آچکی تھیں۔ مصری مغلوب ہو چکے تھے۔ طومان بے بہت خوش تھا کہ اس نے ترک فرماں روا کو اپنے نیزے سے، اس کی فوج میں گھس کر قتل کیا ہے۔ لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ جنگ میں سلطان سلیم اب بھی موجود ہے اور فوج کی قیادت کے فرائض بدستور انجام دے رہا ہے تو اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کی فوج برباد ہو چکی تھی۔ وہ ترکوں کے ہاتھوں گرفتار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو یکجا کیا اور راہِ فرار اختیار کی۔

زکریا نیزے میں چھدے ہوئے سنان پاشا کے پاس پہنچا۔ اس وقت اس کا پورا جسم تھرتھرا رہا تھا، شاید اس کی روح قفسِ عنصری کو خیرباد کہہ رہی تھی۔ کرب و اذیت نے اس کے چہرے پر جگہ بنالی تھی اور پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ سنان پاشا نے زکریا کو اپنے چہرے پر جھکا ہوا دیکھا مگر شاید پہچان نہ سکا۔ زکریا کو رونا آگیا۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا اور سنان پاشا کے سر کو اپنے زانو پر رکھ کر بین کرنے لگا۔ ''میرے آقا! میرے پاشا! یہ تجھے کیا ہوگیا، تو میرے حق میں بہت سخت تھا مگر اپنے آقا، اپنے سلطان کا انتہائی وفادار اور جاں نثار تھا۔ افسوس کہ تو نے جو جگہ چھوڑی ہے، وہ کسی اور سے پُر نہیں ہو سکتی۔''

زکریا نے اپنے پیچھے کسی کی آہٹ محسوس کی۔ گھوم کر دیکھا تو سلطان کو اپنے پیچھے کھڑا دیکھا۔ سلطان کے ساتھ کچھ دوسرے امراء بھی تھے، ان میں ارسلان بھی شامل تھا۔ سلطان کو دیکھتے ہی زکریا نے اٹھنے کی کوشش کی...... مگر سلطان نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ پھر سلطان بھی سنان پاشا کے لاشے کے پاس بیٹھ گیا۔ سلطان کی اتباع دوسروں نے بھی کی۔ سلطان نے حکم دیا کہ نیزے کو سنان پاشا کے جسم سے نکال دیا جائے۔

زکریا نے آہستہ سے سنان پاشا کے سر کو زمین پر رکھ دیا۔ نیزے کی اَنی کو ڈنڈے سے الگ کر کے، ڈنڈے کو کھینچ لیا گیا۔ بچا کھچا خون پھر بہہ نکلا۔ سلطان اپنے ساتھیوں کو لیے ہوئے کچھ دیر ساکت و صامت کھڑا رہا۔ پھر سنان پاشا کے حق میں دعائے مغفرت کی۔

رضوانیہ میں سلطان کو کامل فتح حاصل ہو چکی تھی مگر سنان پاشا کی موت نے اس کو غمزدہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے خیمے میں گیا اور کچھ دیر تنہا اور خاموش بیٹھا رہا۔ پھر ارسلان اور زکریا کو طلب کیا۔ دونوں سلطان کے سامنے مؤدبانہ کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک سلطان نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ سنان پاشا کے سوگ میں خاموش تھا۔

اس وقت سلطان کو مطلع کیا گیا کہ اس کے سہ رکنی وزرا میں سے ایک وزیر یونس قسطنطنیہ سے آیا ہوا ہے اور وہ بعض اہم خبریں بھی لایا ہے۔ سلطان نے اس کو بھی بلوالیا۔ وزیر یونس بھی ارسلان اور زکریا کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر بعد سلطان نے ارسلان اور وزیر یونس کے بجائے زکریا کو مخاطب کیا۔ ''زکریا! کیا یہ سچ ہے کہ سنان پاشا تیری کوڑوں سے پٹائی کیا کرتا تھا؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''جی، سلطان معظم!''

سلطان نے پھر پوچھا۔ ''اور کیا یہ بھی درست ہے کہ سنان پاشا تجھ سے سختی سے پیش آتا تھا؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''جی سلطان معظم!''

سلطان نے حیرت سے پوچھا۔ ''پھر وہ کیا چیز تھی جس نے تجھے سنان پاشا کی موت پر آنسو بہانے اور بین کرنے پر مجبور کر دیا تھا؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''سلطان معظم! سنان پاشا حضور والا کا سب سے زیادہ جاں نثار اور وفادار تھا۔ مجھ کو اس غم اور اس قلق نے رونے پر مجبور کر دیا تھا کیونکہ ہم سب جس مرکز کا طواف کرتے ہیں، اس کی وفاداری اور جاں نثاری ہی ہمارے لیے سب کچھ ہے!''

سلطان نے آہستہ سے کہا۔ ''زکریا! اگر خدامِ سلطنت تیری طرح سوچنے لگیں تو ایک سلطان کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے!''

پھر ارسلان سے کہا۔ ''ارسلان! زکریا ایک بار پھر تیرے حوالے کیا جاتا ہے۔''

اب سلطان یونس سے مخاطب ہوا پھر اس کو لے کر تخلیہ میں چلا گیا۔

☆☆☆

چند بدوؤں نے روپوش طومان بے کو سلطان سلیم کے حوالے کر دیا۔ سلطان سلیم نے اس بہادر کی بڑی عزت کی مگر بعد میں اس کی بدکلامی اور گستاخی سے ناراض ہو کر قتل کرا دیا اور اس کی لاش قاہرہ کے دروازے پر لٹکا دی۔

شاہی محل میں داخل ہونے کے بعد سلطان نے عباسی خلیفہ کو تلاش کیا جو ایک گوشے میں خوفزدہ دبکا ہوا تھا۔ سلطان نے اس کی بے عزتی نہیں کی، اس کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آیا۔ خلیفہ بھی خلافِ توقع عزت و تکریم سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ سلطان نے اس کو سمجھایا۔ ''اگر خلافت کا مطلب قوت ہے تو وہ عملاً کہیں

موجود نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کو موجود رہنا چاہیے۔ اپنی پوری قوت اور اثر ونفوذ کے ساتھ!''

عباسی خلیفہ یہ سمجھا کہ شاید عثمان سلطان بھی اس کو مملوک سلاطین کی طرح اس کے موجودہ منصب پر برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ وہ بہت خوش ہوا اور امید وبیم سے سلطان کو دیکھنے لگا۔

سلطان نے کہا۔''خلافت کے تبرکات میرے حوالے کر دیجیے تاکہ میں بحیثیت خلیفہ امورِ سلطنت انجام دے سکوں۔ رہے آپ کی عزت اور گزر اوقات کے مسائل تو میں یہ ذمے داریاں قبول کرتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ قسطنطنیہ چلیں اور شاہانہ زندگی بسر کریں!''

کمزور خلیفہ کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ سلطان کی بات مان لے۔ اس نے تبرکاتِ خلافت میں ایک علم، ایک چادر، ایک تلوار اور ایک عصا سلطان کے حوالے کر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

سلطان اپنا کام پورا کر چکا تھا، اس نے مصر کی حکومت ان کے حوالے کر دی جنہوں نے طومان بے سے غداری کر کے اس کی جنگی حکمتِ عملی سلطان تک پہنچادی تھی اور جس کے طفیل مصر کی تسخیر آسان ہو گئی تھی۔ سلطان نے ایک ہزار اونٹوں پر سونا چاندی بار کیا اور قسطنطنیہ واپس ہوا۔

وزیر یونس سلطان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، اس کو بڑا افسوس تھا کہ جس مصر کو بہت ساری جانی قربانیاں دے کر فتح کیا گیا تھا، اب اسے مصریوں ہی کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ سلطان، وزیر یونس اور ارسلان ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سلطان کے محافظوں نے انہیں اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ سلطان نے قسطنطنیہ کا ذکر چھیڑ دیا اور وزیر یونس سے پوچھا۔''قسطنطنیہ میں کسی نے کسی قسم کی سرکشی تو اختیار نہیں کی؟''

یونس نے جواب دیا۔''نہیں، سلطان معظم کا دبدبہ بدستور قائم ہے۔''

سلطان نے دور سے نظر آنے والے شامی پہاڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''اللہ نے چاہا تو ہم بہت جلد شامی حدود میں داخل ہو جائیں گے!''

یونس نے شامی کوہستانوں کی طرف دیکھ کر اپنی فوج پر نظر ڈالی اور سرد آہ بھر کے خاموش ہو گیا۔

سلطان نے بے چینی سے پوچھا۔''یونس! تو نے یہ سرد آہ کیوں بھری؟ اور یہ اپنی فوج پر نظر ڈالنے کا مطلب؟''

یونس نے جواب دیا۔''حضور والا! ہم اس سفر میں اپنی نصف فوج ضائع کر کے واپس جا رہے ہیں اور افسوس کہ مصر کو پھر انہی کے حوالے کر دیا ہے، جن سے بڑی محنت اور جدوجہد کے بعد حاصل کیا تھا۔''

سلطان نے تلملا کر یونس کی طرف دیکھا۔''اس طرح تو کہنا کیا چاہتا ہے؟''

یونس نے جواب دیا۔''صرف یہ کہ ہم نے مصر پر حملہ آور ہو کر کیا نفع حاصل کیا؟ شاید اس سوال کا ہمارے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہوگا۔''

سلطان نے ارسلان سے کہا۔''اس احمق کی بات سن لی!'' پھر اپنے ایک محافظ سپاہی کو کہا۔''تو اس ناہنجار معترض کی گردن اڑا دے۔''

محافظ نے پلک جھپکتے میں یونس کا سر اڑا دیا۔ اس کا بے سر اور بے جان لاشہ گھوڑے کی پشت سے نیچے آ رہا۔ دوسروں پر اس کا اتنا اثر پڑا کہ بعد میں کسی نے کسی بات پر تنقید نہیں کی۔

سلطان شب و روز منزلیں مارتا قسطنطنیہ میں داخل ہو گیا، وزیراعظم پیری پاشا نے اس کا شاندار استقبال کیا۔ زکریا کو اقامتی درس گاہ میں بھیج دیا گیا۔ استاد ارسلان بدستور سلطان کے پاس رہا کیونکہ سلطان کو ارسلان بہت اچھا لگتا تھا۔ اقامتی درس گاہ کے کمروں میں زکریا کو ناہید اور ربابہ کی یاد اتنی شدت سے آتی رہی کہ وہ اپنی بے بسی اور مجبوری پر آنسو بہانے لگا۔ اس کو کچھ پتا نہ تھا کہ ربابہ اور ناہید کہاں چلی گئیں؟

ایک دن سلطان نے زکریا کو اچانک طلب کر لیا۔ جب وہ پہلے صحن کو عبور کر کے دوسرے کمرے میں داخل ہوا تو استاد ارسلان کو اپنا منتظر پایا۔ استاد ارسلان نے کہا۔''معلوم نہیں کیوں، سلطان تجھے بہت زیادہ یاد کر رہا ہے۔''

زکریا نے سہم کر پوچھا۔''استاد محترم! سلطان بشاش ہیں یا ناخوش؟ جب انہوں نے میرے پاس آدمی بھیجا تھا تو وہ کس قسم کے جذبات رکھتے تھے؟''

ارسلان نے جواب دیا۔''افسوس کہ سلطان کے جذبات کا اندازہ لگانا بڑا مشکل کام ہے!''

ارسلان، زکریا کو لیے ہوئے سلطان کی بارگاہ میں داخل ہوا تو سلطان کو پیری پاشا سے باتیں کرتے دیکھا۔ پیری پاشا نے زکریا کو کسی تمہید کے بغیر مخاطب کیا۔''زکریا! تیرے والدین اور بہنیں تجھ سے ملنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ عام حالات میں شاید تجھے پتا ہی نہ چلتا کہ یہ لوگ تجھ سے ملنا چاہتے ہیں، لیکن سلطان معظم تیری وفاداریوں اور

جاں نثاریوں کے پیشِ نظر تجھ کو تیرے والدین اور تیری بہنوں سے ملوا دینا چاہتے ہیں۔ کیا تو خود بھی ان سے ملنا پسند کرے گا؟''

زکریا کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ بولا۔ ''میں ان سے ضرور ملوں گا!''

پیری پاشا نے ارسلان سے کہا۔ ''بس تو پھر استاد ارسلان کے ساتھ چلا جا، شاہی خدام تجھے وہاں تک پہنچا دیں گے۔''

سلطان نے پیری پاشا سے کہا۔ ''اس سے کہو، اپنے والدین اور بہنوں سے ملنے کے بعد سیدھا میرے پاس آئے گا۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''میں سلطانِ والا شان کا ایک ادنیٰ سا خادم ہوں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ سیدھا یہیں آؤں گا۔''

ارسلان، زکریا کو لے کر باہر نکلا تو چند خدمت گاروں نے ان دونوں کی راہنمائی کی اور قسطنطنیہ کے باہر اس حصے میں لے گیا جہاں طلیلہ کے خونی رشتے دار دور دراز جزائر اور شہروں سے آکر با امید ملاقات رہ بس گئے تھے۔ پُرپیچ گلیوں اور کچے پکے اور چوبی مکانات کو پیچھے چھوڑتے ہوئے یہ لوگ ایک ایسے مکان کے سامنے پہنچ گئے جو دوسرے مکانوں کے مقابلے میں شاندار تھا۔ مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ایک بوڑھی عورت دیوار سے ٹیک لگائے آنے جانے والوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ آنے والوں کو اپنے پاس آتے دیکھ کر عورت کھڑی ہوگئی۔ خدمت گاروں میں سے ایک کے پاس چند کاغذات بھی تھے۔ عورت وفورِ جذبات میں چھلک گئی۔ باری باری ہر ایک کی طرف دیکھ کر زکریا کو گھورنے لگی۔ پھر پوچھا۔ ''ان میں میرا فیوچک یا میمو کون ہے؟'' پھر زکریا کو دونوں شانوں سے پکڑ کر پوچھا۔ ''شاید یہ ہے میرا فیوچک! بالکل وہی خدوخال..... وہی چہرہ مہرہ!''

جس کے ہاتھ میں کاغذات تھے، وہ انہیں پڑھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں ماں جی! یہ ہے آپ کا بیٹا فیوچک...... مگر اب یہ فیوچک نہیں، زکریا ہے...... ایک عرصے سے زکریا ہے۔''

عورت نے زکریا کو سینے سے لگا لیا۔ اس کے لباس سے مچھلیوں کی بساند آرہی تھی۔ زکریا کو یہ بو بہت ناگوار گزری۔ اس نے اپنے نتھنوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ زکریا نے محسوس کیا کہ یہ عورت جو خود کو اس کی ماں کہہ رہی ہے، زکریا کے دل میں وہ جوش اور ہیجان نہیں پیدا کر سکی جو ایک بیٹے کے دل میں ماں کے لیے پیدا ہو سکتا ہے۔

زکریا نے کوشش کی کہ وہ اپنی اجنبی ماں کی آغوش سے نکل جائے، لیکن عورت نے اسے نہیں چھوڑا۔ ماں کا والہانہ انداز اور اس کے والہانہ کلمات نے پورے ماحول کو زیروزبر کر کے رکھ دیا۔ مکان کے اندر سے ایک بوڑھا اور دو لڑکیاں بھی نمودار ہوئیں..... ماں نے بوڑھے مرد اور لڑکیوں کو..... بے چینی سے پکارا۔ ''ارے یہاں آؤ میرے پاس، میرا فیوچک مجھے مل گیا۔ میں نے اپنے فیوچک کو پالیا ہے۔''

لیکن بوڑھے باپ اور لڑکیوں کے دلوں میں کوئی ہلچل نہیں پیدا ہوئی، کوئی جوش نہیں پیدا ہوا۔ یہ اچھے اور شاندار لباس والا مسلمان نوجوان کسی طرف سے بھی فیوچک نہیں نظر آتا تھا۔ زکریا نے بھی بوڑھے اور اس کی دونوں لڑکیوں کو دیکھ کر ان کے لیے اپنے دل میں کوئی تڑپ محسوس نہیں کی۔

ماں دوسروں کی سرد مہری سے بڑی دل برداشتہ ہوئی۔ آخر اس نے سلطانی خدمت گاروں سے پوچھا۔ ''لیکن میرا بیٹا میمو کہاں ہے؟ اس کو کیوں نہیں لائے؟''

خدمت گار نے جواب دیا۔ ''وہ بھی آرہا ہے ماں جی! پریشان نہ ہوں۔''

اور کچھ ہی دیر بعد ایک خدمت گار کے ساتھ ایک دوسرا نوجوان بھی وہیں پہنچ گیا۔ ماں نے زکریا کی طرف سے ذرا سی بےپروائی برتی اور اب اس نوجوان کو بغور دیکھتی رہی۔ زکریا نے بھی اس کو بغور دیکھا کیونکہ وہ یہ جان چکا تھا کہ آنے والا نوجوان اس کا بڑا بھائی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے لاعلم رہ کر زندگی گزار رہے تھے۔ زکریا کو یہ نوجوان کچھ جانا پہچانا نظر آیا۔ اس کو یاد آیا کہ اس سے کہیں اور بھی ملاقات ہو چکی ہے۔ ماں نے میرا میمو کہہ کر اس نوجوان کو بھی اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس نوجوان نے بھی ماں کے کپڑوں کی بساند سے بچنے کے لیے نتھنوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ نوجوان بھی زکریا کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ آخر ان دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ زکریا نے بے اختیار پوچھا۔ ''تو جعفر چلپی، یہ تم ہو؟''

دوسرے نوجوان نے زکریا سے کہا۔ ''اور زکریا! یہ تم ہو؟''

جعفر چلپی، زکریا کے دل پر آرے چلا رہا تھا کیونکہ یہی وہ نوجوان تھا جو اس کی پہلی محبوبہ ناہید کا حقدار قرار پایا تھا۔ ناہید اس کے حوالے کر دی گئی تھی۔ ماں نے ان دونوں کو باری باری ایک بار پھر اپنے سینے سے لگا لیا اور انہیں چومتی رہی۔ دونوں لڑکیاں اور ان کا باپ اس بار بھی اجنبیوں اور

بیگانوں کی طرح کھڑے ان کی صورتیں دیکھتے رہے۔
ماں نے ان دونوں سے کہا۔ ''میں تم دونوں کو اپنے ساتھ کریٹ لے جاؤں گی۔''
زکریا نے پوچھا۔ ''میں کریٹ جا کر کیا کروں گا، وہاں میرا کیا ہے؟''
جعفر چلپی نے کہا۔ ''اگر تو میری ماں ہے تو میرے پاس رہ جا!''
ماں نے جواب دیا۔ ''میں یہاں بھی رہ سکتی ہوں بشرطیکہ تم دونوں مجھے مذہب چھوڑنے پر مجبور نہ کرو۔''
زکریا نے کہا۔ ''اللہ کے پسندیدہ دین اسلام کو اختیار کر کے سچ مچ کی مسلمان بن جا، اس کے بعد ہم ماں بیٹے کی طرح رہ سکتے ہیں۔''
لیکن ماں اس پر تیار نہ ہوئی۔ وہ اپنے دین کو کیونکر چھوڑ سکتی تھی، آخر وقت پورا ہوا اور سلطانی خدمت گاروں نے اعلان کیا کہ آج کی ملاقات کا وقت پورا ہوا۔ کل پھر ملاقات کرائی جا سکتی ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا۔ ماں کی بے چینی بتا رہی تھی کہ اس کا دل سیر نہیں ہوا، مگر سلطانی خدمت گاروں نے انہیں زبردستی الگ کر دیا تھا۔ بیٹوں کی جدائی نے اس کو سسکیاں بھرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ دونوں کو اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک یہ ماں کو نظر آتے رہے۔
راستے میں زکریا نے جعفر سے کہا۔ ''تو یہ تم تھے، جس نے کسی خواہش اور کوشش کے بغیر ہی ناہید کو حاصل کر لیا تھا۔''
جعفر نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ استاد ارسلان بڑا متاثر نظر آ رہا تھا۔ انہیں ایک بار پھر سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔
پیری پاشا نے سلطان کی طرف سے کہا۔ ''سلطان معظم زکریا سے اس کی خواہش، سب سے بڑی خواہش معلوم کرنا چاہتے ہیں!''
زکریا کے پاؤں تلے سے زمین سرکنے لگی۔ اس کو اپنی نگاہوں تلے موت نظر آنے لگی۔ یکایک سلطان نے پیری پاشا کو ہاتھ کے اشارے سے چپ کرایا اور خود زکریا کو مخاطب کیا۔ ''میں تیری جاں نثاری اور وفاداری کے صلے میں کچھ دینا چاہتا ہوں۔ بول کیا چاہتا ہے؟''
زکریا کا دل بھر آیا۔ وہ خوفزدہ بھی تھا، اسے شبہ تھا کہ سلطان نے جو کچھ کہا ہے اس کا وہی مفہوم ہے یا کچھ اور بھی۔ پھر بھی اس نے بڑی دلیری سے کہہ دیا۔ ''حضورِ والا! میں نے پہلی بار ناہید سے محبت کی تھی، جو میری بدقسمتی سے شاہ ایران کی بیوی بن گئی تھی مگر جب وہ دوبارہ سلطانِ والا شان کے قبضہ و اختیار میں آئی تو اس کو شومئ قسمت سے جعفر چلپی کے حوالے کر دیا گیا۔ اس وقت وہ محض جعفر چلپی تھا مگر اب وہ میرا حقیقی بڑا بھائی ہے۔''
زکریا نے ذرا دم لیا اور پھر مزید کہا۔ ''پھر میں ربابہ کی طرف متوجہ ہو گیا اور میں نے ربابہ کے ساتھ کچھ وقت بھی گزارا مگر فتح حلب کے موقع پر اس کو بھی مجھ سے چھین لیا گیا۔ اب میں کس چیز کی خواہش کروں؟''
سلطان نے پیری پاشا کے کان میں کچھ کہا۔ پیری پاشا کچھ دیر کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گیا مگر جب واپس آیا تو ناہید، ربابہ اور سلطان قانصوہ کی نذر کردہ عورت اس کے ساتھ تھیں۔ پیری پاشا نے زکریا سے کہا۔ ''ناہید اور ربابہ موجود ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لے۔''
زکریا چکرا گیا۔ پیری پاشا کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اچانک سلطان کی آواز سنائی دی۔ ''پیری پاشا کی بات کا فوراً جواب دے۔ ناہید یا ربابہ، جو پسند ہو، اس کا ہاتھ پکڑ لے۔''
زکریا کو اپنی ساری زندگی میں شاید ہی کوئی ایسی کشمکش پیش آئی ہو جس سے وہ اس وقت دوچار تھا۔ ناہید اور ربابہ دونوں ہی زکریا کو دیکھ رہی تھیں۔ ناہید کی نظروں میں شکایت تھی اور ساتھ ہی استفسار بھی۔ گویا وہ ربابہ کی بابت پوچھ رہی ہو کہ یہ کون ہے؟ ربابہ کی نظروں میں التجا تھی مگر شرمندگی بھی۔ شاید وہ اس بات پر شرمندہ تھی کہ اس نے سلطان قانصوہ کے لیے زکریا اور ارسلان کے خلاف جاسوسی کی تھی۔ زکریا نے آگے بڑھ کر ناہید کا ہاتھ پکڑ لیا۔
پیری پاشا نے سلطان کے اشارے پر جعفر چلپی کو حکم دیا۔
''ربابہ تیری ہے، تو اس کا ہاتھ پکڑ لے۔''
جعفر چلپی نے ڈرتے ڈرتے ربابہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔
ارسلان حیران تھا کہ سلطان میں اتنی فیاضی اور رحم دلی کہاں سے آ گئی ہے؟
سلطان نے اچٹتی نظروں سے ارسلان کی طرف دیکھا اور حکم دیا۔ ''استاد ارسلان، زکریا اور جعفر چلپی کے اتالیق اور نگراں کی حیثیت سے ان کے پاس رہیں گے۔ دونوں جاں نثاروں اور وفاداروں کو اجازت دی جاتی ہے کہ وہ بحیرۂ باسفورس کے اس پار نئی شہر چلے جائیں، وہاں انہیں ایک محل میں پہنچا دیا جائے گا جہاں دونوں بھائی اپنی متاہلانہ زندگی کا آغاز کریں گے۔''
استاد ارسلان کچھ پریشان سا ہو گیا۔ فوری طور پر کچھ

سمجھ میں نہیں آیا کہ سلطان کیا کہہ رہا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے؟

سلطان نے ارسلان سے کہا۔ ''یہ عورت، جو ایک سلطان نے... نذر کی تھی، اگر تو پسند کرے تو دوسرا سلطان بھی نذر کرسکتا ہے۔''

استاد ارسلان کو اپنے رتبے کا پاس تھا۔ دل چاہنے کے باوجود وہ اپنی زبان سے ہاں نہیں کرسکا۔ آخر سلطان نے خود ہی فیصلہ کردیا۔ ''سلطان کی بخشش کو ٹھکرا دینا ناقابلِ معافی جرم ہے۔ وزیر اعظم پاشا! اس عورت کو ارسلان کے حوالے کردیں۔''

انہیں اسی وقت ضروری ساز و سامان کے ساتھ بحیرۂ باسفورس کے ساحل پر پہنچا دیا گیا جہاں ایک کشتی ان کی منتظر تھی۔ یہ سب اس پر سوار ہوگئے۔ بحری پاشا کے چند خدمت گاران کے ساتھ تھے، جو ینی شہر کے مذکرہ محل تک راہنمائی کے لیے ساتھ کردیے گئے تھے۔

شہر کا شاندار محل دیکھ کر زکریا، جعفر چلپی اور استاد ارسلان حیرت زدہ رہ گئے۔ انہیں بس ایک ہی سوال پریشان کررہا تھا۔ سنگدل سلطان سلیم ان پر اتنا مہربان کیوں ہوگیا تھا؟

استاد ارسلان کے پاس اس سوال کا جواب تھا۔

''سلطان زکریا کی جاں نثاری اور وفاداری سے بے حد متاثر ہے۔ جعفر چلپی اور ارسلان کو جو کچھ ملا ہے زکریا کے طفیل ملا ہے۔''

زکریا نے جعفر چلپی سے پوچھا۔ ''مگر بھائی! آپ کے پاس میرے اس سوال کا کیا جواب ہے کہ جب ناہید کو ایک بار آپ کے حوالے کردیا گیا تو یہ دوبارہ مجھے کس طرح بخش دی گئی؟''

جعفر چلپی نے جواب دیا۔ ''اس کا جواب بہت آسان ہے، ناہید کو تجھے دکھا دینے کے لیے میرے حوالے کردیا گیا تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اسے ابھی تک سلطان ہی کی تحویل میں رکھا گیا تھا۔''

زکریا بہت بے چین تھا۔ ایک سوال کا جواب مل جاتا تھا تو دوسرا سوال کلبلانے لگتا تھا اور جب اس کا بھی جواب مل جاتا تھا تو پھر تیسرا سوال پریشان کرنے لگتا تھا۔ زکریا نے استاد ارسلان کو شک و شبہے کی نظروں سے دیکھا۔ ''اور استاد محترم! میرے اس سوال کا آپ کے پاس کیا جواب ہے کہ سلطان نے ہمیں اتنی جلدی ینی شہر کو کیوں بھیج دیا؟ ہمیں جتنی عجلت میں یہاں بھیجا گیا ہے، وہ ایسا ہے گویا ہمیں سزا دی گئی اور اس پر فوراً ہی عمل درآمد ہوگیا۔''

استاد ارسلان کے ہونٹوں پر بڑی کربناک مسکراہٹ نمودار ہوکر غائب ہوگئی۔ بولا۔ ''میرے پاس تیرے اس سوال کا جواب بھی موجود ہے۔ سلطان کو تیرے والدین اور بہنوں کی موجودگی سے خطرات پیدا ہوگئے تھے۔ اگر تیری ماں تجھ کو مجبور کرتی کہ تو کچھ عرصے کے لیے اس کے ساتھ کریٹ چلا جائے اور تو اپنی ماں کے جذبات سے متاثر ہوکر سلطان سے درخواست کرگزرتا تو سلطان اپنے اس تاثر اور جذبے کے زیر اثر جو اس کے دل پر تیری وفاداری اور جاں نثاری کی وجہ سے مرتسم ہوچکا ہے، یہ اجازت دینا پڑ جاتی۔ چنانچہ سلطان نے تجھے فوراً ہی ینی شہر بھیج کر ایک بڑے خطرے سے نجات حاصل کرلی۔''

یکایک زکریا کو اپنی ماں یاد آگئی۔ بے چین، مضطرب، حواس باختہ، مادری جذبے اور محبت سے سرشار ماں..... اسی عالم میں اس کو جزیرۂ کریٹ کا اپنا آبائی مکان یاد آگیا۔ چوبی مکان، جس میں وہ، میمو، ماں باپ، دو بہنیں اور تین بڑے بھائی ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ اس نے اس سلسلے میں خود کو اپنے بھائی میمو کے ساتھ بہت سارے بچوں سمیت ایک جہاز پر سوار، بحیرۂ مارمورا کی طرف جاتے دیکھا۔ پھر قسطنطنیہ اور اس کی اتاتی درس گاہ کی سیر کرنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ آخر میں سیر کرتا ہوا ینی شہر کے محل میں داخل ہوگیا۔ جب ہوش میں آیا تو وہ واقعی اس محل میں موجود تھا۔ کرۂ ارض کے جس نقطے سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا، آخر کار وہیں پہنچ گیا۔ اس کا دل بھر آیا، آنکھیں نم ہوگئیں۔

استاد ارسلان نے پوچھا۔ ''زکریا! کوئی اور سوال؟''

زکریا نے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں پر لے لیا اور آہستہ سے جواب دیا۔ ''سردست بس..... مزید کوئی سوال نہیں!''

ناہید حیران تھی کہ اس خوشی کے موقع پر وہ رو کیوں رہا ہے؟

کہانی کے تاریخی ماخذ

تاریخ اسلام — اکبر شاہ خان نجیب آبادی
تمدن عرب — ڈاکٹر گستاؤلی بان
تاریخ ایران — مقبول بیگ بدخشانی
تاریخ الخلفاء — جلال الدین سیوطی
اسٹینلے لین پول
ابن اثیر



نظام انصاف

کاشف زبیر

انسان فطری طور پر چاہے کتنا ہی غیر متوازن شخصیت کا مالک ہو مگر جب بات اپنی ذات کی آجائے تو ہر چیز میں توازن بھی چاہتا ہے اور انصاف بھی... نظام کوئی بھی ہو ترتیب تو رکھنی پڑتی ہے مگر جہاں عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ترتیب کو تدبیر سے بگاڑنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں نہ توازن کا احساس ملتا ہے اور نہ ہی انصاف کی نوبت آتی ہے۔ گویا ثابت ہوتا ہے کہ من مانی کا عنصر اجتماعی مفاد کا دشمن ہے اور دشمنی سوائے تباہی کے کچھ نہیں لاتی۔

مغربی معاشرے کی بے حسی کا پردہ چاک کرتی عبرت اثر کہانی

ریگ کو یہ جگہ کچھ عجیب سی لگی تھی۔ اگرچہ بہ ظاہر لیک ووڈ امریکا کے ان ہزاروں قصبوں کی طرح تھا جو شمال سے لے کر جنوب تک اور مشرق سے لے مغرب تک پورے امریکا میں پھیلے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے قصبے جو کسی وجہ سے آباد ہوئے۔ بہت سے قصبوں کے ختم ہونے کی بنیادی وجہ روزگار کا ختم ہونا یا ان کی آبادی سکڑ کر نہ ہونے کے برابر رہ گئی اور وہاں ایسے بے گھر اور ناکارہ لوگ آکر بس گئے جن کا ملک کی معیشت اور معاشرت میں کوئی حصہ

نہیں تھا۔ بہت سے قصبے روزگار کی وجہ سے ختم ہونے پر بھی قائم رہے کیونکہ وہاں روزگار کے دوسرے ذرائع آ گئے تھے۔ کچھ قصبے ایسے تھے جہاں پرانا روزگار آج بھی قائم تھا اور یہ ٹاؤن ان میں سے ایک تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں ریاست شمالی ڈکوٹا میں جھیل کے اطراف میں پھیلا ہوا یہ قصبہ جنگل کی کٹائی کرنے والوں نے بسایا تھا۔

لیک ووڈ کا علاقہ گنجان جنگلوں اور ناہموار پہاڑیوں پر مشتمل تھا۔ یہاں قیمتی لکڑی والے اونچے اور بڑے درختوں پر مشتمل جنگلات سیکڑوں مربع میل کے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم تک شمال مشرقی شہروں کے سرمایہ داروں نے یہاں بے دریغ جنگل کی کٹائی کی اور قیمتی لکڑی سمیٹ کر لے گئے مگر دوسری جنگِ عظیم تک مقامی لوگوں نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ مقامی ٹاؤن کونسل نے بڑی کمپنیوں پر پابندی لگا دی اور لکڑی کی کٹائی صرف چھوٹی کمپنیوں اور افراد کے لیے محدود کر دی۔ ساتھ ہی ختم ہو جانے والے درختوں کی جگہ نئے درخت لگائے جانے لگے۔ جنگِ عظیم کے بعد یہ علاقہ لکڑی کے بجائے اس سے تیار مصنوعات کے لیے مشہور ہونے لگا۔ یہاں کے لوگ ہنرمند تھے جو لکڑی کے شوپیس سے لے کر گھروں اور دفتروں کے لیے فرنیچر اور دوسری چیزیں تیار کرنے لگے تھے۔ مقامی لوگوں کے پاس پیسا آیا تو انہوں نے جدید ورکشاپس قائم کیں۔ لکڑی کی مصنوعات تیار کرنے سے لے کر اسے فروخت کرنے تک جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرنے لگے۔

لیک ووڈ کی ٹاؤن کونسل نے قانون بنایا ہوا تھا کہ لیک ووڈ میں صرف وہی شخص آ کر آباد ہو سکتا ہے جو لکڑی سے متعلق کسی کام یا ہنر کا ماہر ہو۔ ریگر ولیم انجینئر تھا اور اس نے لکڑی کاٹنے کے بعد بچ جانے والے برادے کی مدد سے پلائی تیار کرنے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ اس طریقے سے حاصل ہونے والی پلائی عام پلائی کی نسبت دو گنا مضبوط اور واٹر پروف ہونے کے ساتھ سستی بھی پڑتی تھی۔ ریگ پہلے منی سوٹا میں کام کرتا تھا مگر وہاں برادے کا حصول مشکل ہو گیا تھا۔ برادے سے مراد لکڑی کا سفوف نہیں بلکہ کارخانوں اور ورکشاپس میں لکڑی کے وہ بچ جانے والے ٹکڑے ہوتے ہیں جنہیں برادے میں بدل لیا جاتا ہے۔ یہ لکڑی صرف جلانے یا برادہ بنانے کے کام آتی ہے۔ کینیڈا سے آنے والی لکڑی بہت مہنگی تھی اور مقامی جنگل سے لکڑی کا حصول پابندیوں کی وجہ سے دشوار تھا۔ منی سوٹا میں لکڑی استعمال کرنے والی صنعتیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان سے برادے کا حصول مہنگا پڑتا تھا۔ اس لیے ریگ نے لیک ووڈ آنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے انٹرنیٹ پر اس قصبے کے بارے میں پڑھا تھا کہ یہاں کا ہر فرد لکڑی سے متعلق کام کرتا ہے۔ یہاں چھوٹی چھوٹی ورکشاپس اور کارخانے ہیں۔

ریگ نے چند مہینے پہلے یہاں کا ایک چکر لگایا اور سروے کر کے دیکھا تو اسے لگا کہ یہاں اس کے لیے بہت مواقع تھے۔ یہاں لکڑی کے برادے کا حصول آسان تھا اور جدید ٹیکنالوجی سے متعلق ہر چیز دستیاب تھی۔ اس نے ٹاؤن کونسل سے لیک ووڈ میں آ کر آباد ہونے کی اجازت چاہی جو اسے بہ خوشی دے دی گئی مگر ساتھ ہی اسے بتایا گیا کہ یہ اجازت ایک سال کی آزمائشی مدت سے مشروط ہو گی۔ اگر اس دوران میں وہ ٹاؤن کونسل کے اعتماد پر پورا اترا تو اس کا اجازت نامہ مستقل ہو جائے گا۔ دوسری صورت میں اسے یہاں کام کرنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ یعنی اسے جو عارضی اجازت نامہ ملا وہ منسوخ ہو جائے گا۔ اگرچہ ریگ کو یہ شرط عجیب اور امریکا کے آئین کے منافی لگی تھی جو ہر شخص کو رہائش، روزگار اور نقل و حرکت کی آزادی دیتا تھا مگر اس نے اعتراض نہیں کیا۔ اسے ایک سال کی مدت تو مل رہی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس دوران میں وہ یہاں اپنا کاروبار جما لے گا۔

واپس آ کر اس نے اپنا مکان فروخت کیا۔ ورکشاپ کا جو سامان وہ لے جا نہیں سکتا تھا، اسے بھی ورکشاپ سمیت فروخت کر دیا۔ یہ دونوں چیزیں اسے باپ سے وراثت میں ملی تھیں۔ اپنی اہم اور آزمودہ مشینری اس نے پیک کر کے بلٹی کرا دی۔ یہ اسے لیک ووڈ میں مل جاتی۔ ریگ اکیلا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی اور ستائیس برس کی عمر تک اس نے لڑکیوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لی... اس کی زیادہ توجہ اپنے کام پر رہی تھی۔ خون کے رشتوں میں صرف ایک بہن تھی جو اسپرنگ فیلڈ میں رہتی تھی اور اس نے وہیں شادی کر لی تھی۔ ریگ اور اس کی بہن بینٹ کی آخری ملاقات گزشتہ سال کرسمس پر ہوئی تھی جب ریگ اس کے گھر گیا تھا۔ ریگ نے بینٹ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ریگ نے چند دوستوں سے الوداعی ملاقات کی اور لیک ووڈ کے لیے روانہ ہو گیا۔ فروری کے آخر میں موسم خاصا سرد تھا۔

ہائی ویز کے کنارے اور اس سے دور تازہ پڑنے والی برف کا ڈھیر تھا۔ چوبیس گھنٹے کے سفر کے بعد وہ لیک

ووڈ پہنچا اور اس نے سب سے پہلے فیس ادا کر کے ٹاؤن کونسل سے یہاں کاروبار کا اجازت نامہ حاصل کیا۔ رہائش اور ورکشاپ کے لیے جگہ اس نے پہلے ہی دیکھ لی تھی۔ یہ لیک ووڈ کے نواحی علاقے میں درختوں سے گھری جگہ تھی جہاں سے جھیل بھی زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ یہ جگہ اسے کسی قدر مہنگی پڑی لیکن اسے پسند آئی تھی اس لیے اس نے قیمت کی پروا نہیں کی۔ اس دوران میں وہ ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ مارچ کے وسط تک موسم اس قدر بہتر ہوا کہ وہ کام کا آغاز کر سکے۔ اس دوران میں اس نے مقامی لوگوں سے تعلقات استوار کر لیے۔ وہ شریف اور ایک دوسرے کا خیال رکھنے والے لوگ تھے۔ انہوں نے کشادہ دلی سے ریگ کو لیک ووڈ میں خوش آمدید کہا۔ اس کے باوجود ریگ کو احساس ہوا کہ وہ کچھ عجیب سے تھے۔

لیک ووڈ اور اس کے آس پاس کا علاقہ صدیوں سے کم آباد رہا تھا۔ لیکن لیک ووڈ لکڑی اور اس کے کام کے لحاظ سے... پورے ملک میں مشہور تھا مگر اس کی آبادی چند ہزار نفوس سے زیادہ نہیں تھی۔ شام کے وقت مقامی بار میں اس کے دوست بن جانے والے ایرک نے اسے بتایا کہ گزشتہ ایک صدی سے لیک ووڈ کی آبادی پانچ ہزار کے آس پاس ہی ہے۔ نہ کم ہوئی ہے اور نہ بڑھی ہے۔ یہاں شرح پیدائش اور شرح اموات دونوں بہت کم ہیں۔ اوسط عمر اسی سال کے لگ بھگ ہے۔ بوڑھوں کا تناسب آبادی میں پچیس فیصد ہے مگر یہاں ریٹائرمنٹ کی کوئی عمر نہیں ہے۔ جب تک آدمی کے ہاتھ پاؤں میں قوت اور قوتِ فیصلہ برقرار رہتی ہے، وہ کام کرتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں ستّر سال کی عمر میں بھی کام کرنے والے لوگ تھے۔

نوجوان نسل بھی لکڑی کے کام میں دلچسپی لے رہی تھی۔ جو اس سے ہٹ کر کوئی کام کرنا چاہتے تھے، انہیں لیک ووڈ سے کہیں اور جانا پڑتا تھا۔ جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی۔ چوری، راہزنی، مجرمانہ حملے، قتل کی وارادات سالوں میں جا کر کہیں ہوتی تھی۔ عام لڑائی جھگڑے بھی نہ ہونے کے برابر تھے کیونکہ سب ایک دوسرے کی حدود اور حقوق کا احترام کرتے تھے۔ کسی بھی تنازعے کی صورت میں مقامی ثالثی کونسل تھی اور اگر مسئلہ اس سے حل نہیں ہوتا تھا تو اسے عدالت لے جایا جاتا تھا۔ عام طور سے ان دو جگہوں پر یہ مسئلہ حل ہو جاتا تھا اور اسے ذاتی طور پر حل کرنے کی نوبت شاذ ہی پیش آتی تھی۔ کیونکہ اکثر لوگ اپنا کام کرتے تھے اس لیے فی کس آمدنی خاصی تھی اور ٹاؤن کونسل کو ٹیکسوں کی مد میں اتنی آمدنی ہوتی تھی کہ اس نے پورے قصبے کو جدید سڑکوں اور سہولتوں سے آراستہ کر رکھا تھا۔ صفائی اور دوسرے کاموں کے لیے جدید ترین مشینریز موجود تھیں۔

لوگوں نے خوب صورت تمام سہولتوں اور آسائشوں سے آراستہ مکانات بنائے ہوئے تھے۔ کیونکہ جگہ کی کمی نہیں تھی اس لیے مکانوں کے درمیان فاصلہ تھا اور درمیانی فاصلے میں لان یا چھوٹے چھوٹے پودے اگائے گئے تھے۔ ریگ نے دیکھا کہ آس پاس جنگل ہونے کے باوجود لوگوں کی درختوں سے محبت کم نہیں ہوئی تھی اور انہوں نے قصبے اور اپنے مکانات کے آس پاس جہاں جگہ ملی، وہاں درخت لگائے ہوئے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یہاں ہوا میں ایک صحت بخش تازگی اور شفافیت تھی۔ یہاں سانس لینا خوشگوار عمل تھا۔ منی سوٹا میں جہاں ریگ کا مکان تھا، وہ جگہ بھی اگرچہ جنگل کے پاس تھی مگر وہاں ہوا میں ایسی تازگی اور مہک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ابھی برف پگھلی نہیں تھی اور موسم سرد تھا مگر ریگ نے مکان اور ورکشاپ کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ دونوں جگہیں مکمل طور پر لکڑی سے تعمیر کی جاتی تھیں اور لکڑی کی یہاں کوئی کمی نہیں تھی۔

ٹاؤن کونسل کے پاس گزشتہ سال کی نیلامی سے بچ جانے والی کچھ لکڑی پڑی تھی۔ ریگ نے وہ خرید لی۔ یہ پچاس اور چالیس فٹ طویل اور دو سے ڈھائی فٹ تنوں والے درخت تھے جن سے اس کے کام کی لکڑی بہ آسانی نکل سکتی تھی۔ اس کی مشینری آگئی تھی۔ اس میں سے کام والی مشین نکال کر اس نے باقی اسی طرح پیک رہنے دی۔ فی الحال وہ سب کھلی جگہ پڑی تھی اور یہاں روز ہی رات میں ہلکی پھوار یا برف گرتی تھی۔ اسے بجلی کا عارضی کنکشن مل گیا تھا۔ وہ اس سے کام چلا رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے ورکشاپ کا شیڈ تیار کیا تاکہ اس کی ساری مشینری اس کے نیچے آکر موسم سے محفوظ ہو جائے۔ یہ کام مارچ کے آخر تک ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد غیر متوقع طور پر ایک طویل برفانی طوفان کی آمد ہوئی۔ پورے ایک ہفتے تک یخ بستہ ہواؤں کے ساتھ برف گرتی رہی اور سڑکوں، گلیوں اور مکانوں پر پھر سے برف کی دو فٹ سے زیادہ موٹی تہ آگئی۔

اس غیر متوقع برف باری نے پہلے سے سرما کے دوران کمزور ہو جانے والے مکانوں کو خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ کئی مکانوں کی چھتیں گر گئی تھیں اور بہت سے مکانوں کے سامنے والے شیڈز گر گئے تھے۔ برف جمنے سے بجلی کی تاریں وزنی ہو کر گریں تو کئی علاقوں میں بجلی بند ہو گئی۔ یہ

پورا ہفتہ ریگ نے اپنے ہوٹل کے کمرے یا اس بار میں گزارا جہاں اس کی تقریباً ہر شام گزرتی تھی۔ وہ نارمل پینے والا آدمی تھا۔ وہاں صرف وقت گزاری کے لیے جاتا تھا اور عام طور سے ایک دو پیگ کے بعد وہ کافی یا سوڈے سے شغل کرتا تھا۔ شام کے وقت بار میں خاصی رونق ہو جاتی تھی اور ماحول اتنا اچھا تھا کہ بعض افراد تو اپنی فیملی کے ساتھ چلے آتے تھے۔ ان کے ساتھ بچے بھی ہوتے تھے جو اپنے کھیل کود میں مگن ہو جاتے۔ ریگ کو یہ ماحول اور سرگرمی پسند آئی تھی۔ برف باری کے دوران اس نے اپنا نام رضا کاروں میں لکھوا دیا۔

طوفان تھمنے کے بعد صفائی اور مرمت کا کام شروع ہوا۔ مصروفیت کے باوجود ریگ اس کام میں شامل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے تھوڑی سی مدت میں قصبے والوں میں مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ مرمت میں لکڑی والا کام اس نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ اس کے ساتھ اور نوجوان بھی تھے اور انہوں نے تین دن میں اپنا کام ختم کر لیا۔ اس کے بعد ریگ دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا۔ شیڈ تیار ہو جانے کی وجہ سے اس کا سامان طوفان کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہا تھا۔ اگلے مرحلے میں اس نے ورکشاپ کو مکمل کیا تاکہ بہار کی آمد کے ساتھ ہی اپنے کام کا آغاز کر سکے۔ اس کے پاس مستقبل کے دو آرڈرز پہلے سے موجود تھے۔ اس نے مشینیں سیٹ کیں۔ آرا مشین اور برادہ بنانے والی مشین اس نے کھلی جگہ لگائی تھی کیونکہ یہ سائز میں خاصی بڑی تھیں اور ان پر کام کے لیے جگہ بھی اچھی خاصی درکار ہوتی تھی۔ باقی مشینیں ورکشاپ میں آگئیں۔

برادے کی لکڑی کے لیے وہ درجن سے زیادہ ورکشاپس اور کارخانوں سے بات کر چکا تھا اور سب نے لکڑی اسے فروخت کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ لکڑی کی ٹرانسپورٹ کے لیے ریگ کے پاس پک اپ تھی۔ اس سنگل کیبن پک اپ کا پچھلا حصہ خاصا بڑا تھا۔ ریگ کو ٹیکساس کی ایک پارٹی نے پلائی کی دو سو شیٹس کا آرڈر دیا ہوا تھا، اسی طرح کیلی فورنیا سے بھی ایک آرڈر تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ اپریل کے اینڈ تک آرڈر پورا کر دے گا۔ پلائی کی تیاری کے لیے اب اسے صرف خام مال کی ضرورت تھی۔ ورکشاپ مکمل ہوتے ہی اس نے برادے کی لکڑی جمع کرنا شروع کر دی۔ جگہ جگہ سے مال اٹھانا آسان نہیں تھا۔ اس کام کے لیے اس نے پہلے ہی ایک نوجوان سے بات کر لی تھی۔ جارج ہائی اسکول میں پڑھتا تھا اور وہ آئس ہاکی کا پروفیشنل کھلاڑی بننا چاہتا تھا۔ مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ شکاگو جیسے بڑے شہر میں جائے اور اس کے لیے اسے رقم کی ضرورت تھی۔ اسے جہاں موقع ملتا، وہ رقم کے لیے کام کرنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ وہ رضا کاروں میں بھی شامل تھا اور ریگ کی اس سے وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ ریگ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ جب اسے کسی آدمی کی ضرورت ہوئی تو وہ اسے ہی بلائے گا۔

کیونکہ جارج تین بجے کے بعد دستیاب ہوتا تھا اس سے پہلے ریگ کارخانوں اور ورکشاپس میں جا کر مال دیکھ کر اس کا سودا کر لیتا تھا۔ تین بجے کے بعد وہ مال اٹھانے کا کام شروع کرتا۔ پہلے دن ہی اس کے پاس ایک ٹن سے زیادہ مال آگیا تھا۔ پلائی بنانے کے لیے ضروری کیمیکل اور دوسری چیزیں وہ پہلے ہی لے چکا تھا۔ اس لیے دوسرے دن اس نے کام شروع کر دیا۔ اس کے پاس رقم تھی اس لیے مال کی فوری ادائیگی کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جلد اسے مال دینے والوں کی تعداد دو درجن سے تجاوز کر گئی تھی۔ اپریل کے آخر تک وہ اتنا مصروف رہا کہ سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملتی۔ وہ صبح سات بجے ہوٹل سے نکلتا تو رات دس بجے سے پہلے واپسی نہیں ہوتی تھی۔ جس دن مال جمع کرنے نہیں جاتا، اس دن وہ جارج کو اپنے ساتھ ورکشاپ میں لگا لیتا کیونکہ پلائی کی بھاری شیٹیں اٹھانا اور سنبھالنا آسان کام نہیں تھا۔

مئی کے آغاز میں اس نے تیار پلائی شیٹس ٹرک بلٹی سے روانہ کیں۔ اس کے بعد اس نے دو دن آرام کیا۔ وہ بیشتر وقت سوتا رہا۔ صرف کھانے کے لیے اٹھتا تھا۔ تیسرے دن سے اس نے اپنے مکان پر کام شروع کیا۔ مصروفیت کے باوجود وہ تہ خانے کی تیاری کروا چکا تھا۔ تہ خانے کا فرش اور دیواریں اینٹوں سے بنی تھیں۔ اس کے بعد باقی سارا کام لکڑی کا تھا۔ دونوں پارٹیوں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر پلائی ان کے معیار کے مطابق ہوئی تو وہ اسے مزید آرڈرز کریں گے۔ مگر اس میں وقت تھا اس لیے اس نے یہ موقع غنیمت جان کر مکان پر کام شروع کر دیا۔ ہوٹل میں اس کا خرچ بہت زیادہ ہو رہا تھا اور اب سیزن کا آغاز ہو گیا تھا اس لیے کرایہ بھی بڑھ گیا تھا۔ کام جلد نمٹانے کے لیے اس نے یہاں بھی جارج کو ساتھ رکھا اور وہ خوش تھا کہ اسے مسلسل کام مل رہا تھا۔ ورنہ اسے ہفتے میں مشکل سے ایک دو دن ہی کام ملتا تھا۔ یہاں اصل میں کام تھا ہی نہیں کیونکہ سب اپنا اپنا کام خود کرتے تھے۔

جارج مضبوط اور طاقتور نوجوان تھا جو بھاری لٹھے اور تنے بھی اٹھا لیا کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے ریگ کو بہت آسانی ہو رہی تھی۔ درحقیقت جارج کی وجہ سے کام کی رفتار تین گنا ہو گئی تھی۔ اسے اچھی مزدوری دے کر بھی ریگ فائدے میں رہا۔ پھر جارج کی صورت میں اسے اچھا ساتھی ملا ہوا تھا۔ وہ کام کے دوران گپ شپ کرتے۔ ایک دوسرے کو اپنی دلچسپیوں کے بارے میں بتاتے۔ ریگ کی طرح جارج کو بھی لڑکیوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ حالانکہ اس کی جسامت کی وجہ سے لڑکیاں اس کی طرف آتی تھیں مگر جارج زیادہ متوجہ ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے خیال میں لڑکیاں لڑکوں کو ان کی زندگی کے اصل مقصد سے بھٹکا دیتی ہیں۔ مئی کے آخر تک مکان کا نچلا حصہ تیار ہو چکا تھا۔ ریگ نے مکان زیادہ بڑا نہیں بنایا تھا۔ نیچے صرف ایک لیونگ روم اور لاؤنج کے ساتھ کچن کا سن تھا۔ اوپر ایک بیڈ روم اور باتھ روم تھا۔ بیڈ روم کے سامنے اس نے ٹیرس رکھا تھا۔

جارج حسبِ معمول نصف دن کے لیے کام پر آتا تھا۔ وہ تین بجے آتا اور شام سات بجے تک ریگ کے ساتھ کام کرواتا تھا۔ صبح کے اوقات میں اگر خام مال نہیں لانا ہوتا تو ریگ چھوٹے موٹے کام نمٹاتا یا مکان کے حصوں کو تیار کرتا۔ جون میں اسے دوسرا آرڈر مل گیا۔ یہ خاصا بڑا آرڈر تھا مگر ریگ نے اس کی تیاری پہلے سے کر لی تھی۔ خام مال وہ خاصا جمع کر چکا تھا۔ اس لیے اس نے مکان پر کام چھوڑ کر بلائی کی تیاری شروع کر دی۔ اسے پچھلے آرڈر کی قیمت مل چکی تھی۔ اگرچہ اس کے پاس رقم موجود تھی مگر زیادہ رقم زیادہ مضبوط کرتی ہے۔ جون کے اینڈ تک اس نے یہ آرڈر پورا کیا اور ساتھ میں تھوڑا بہت مکان پر بھی کام کرتا رہا۔ جولائی میں جارج کا اسکول گرما کی چھٹیوں میں بند ہوا تو وہ فل ٹائم ریگ کے ساتھ کام کرنے لگا۔ اس وجہ سے جولائی کے آخر تک ریگ کا مکان مکمل طور پر تیار ہو گیا۔ اب اسے فرنش کرنا تھا۔ ریگ نے تقریباً تمام ہی سامان اور فرنیچر مقامی طور پر تیار کیا ہوا لیا۔

لیک ووڈ میں مئی سے لے کر ستمبر تک کا وقت گرما اور بہار کا ہوتا ہے۔ اکتوبر سے یہاں سرما شروع ہو جاتا ہے جو اپریل کے وسط تک جاری رہتا ہے۔ اس وقت یہاں کے باشندے کوئی آؤٹ ڈور تفریح نہیں کرتے...... زیادہ تر گھروں میں بند رہتے یا بارز اور پارٹیز کے لیے گھروں سے نکلتے تھے۔ گرما کا ابتدائی حصہ ریگ نے مصروفیت میں گزار دیا۔ اس دوران میں زیادہ تر جارج اس کے ساتھ رہا۔ دونوں میں اچھی ہم آہنگی ہو گئی تھی۔ ایک دن ریگ نے ہچکچاتے ہوئے جارج سے اپنے تاثر کے بارے میں بات کی جو وہ یہاں کے لوگوں کے بارے میں رکھتا تھا کہ وہ بہت اچھے تھے مگر ساتھ ہی ان میں عجیب سی بات بھی تھی۔ جارج نے تسلیم کیا کہ وہ کسی حد تک عجیب تھے۔ ریگ نے وجہ پوچھی تو جارج نے کہا۔ ''یہ شاید اس لیے عجیب ہیں کہ اپنے معاملات خود اور اپنے طریقے سے طے کرتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' ریگ نے پوچھا۔

''بنیادی طور پر لیک ووڈ کے باسی جرمن ہیں اور نسلاً قبائلی ہیں۔ جرمنی میں بھی ہمارے آباؤ اجداد لکڑی کا کام کرتے تھے اور یہاں بھی ہم نے لکڑی کا کام اختیار کیا۔ ہمارے کچھ رواج ہیں جو اب تک ہم میں چلے آرہے ہیں۔''

''کیسے رواج؟''

اس سوال پر جارج اسے دیکھتا رہا اور اس نے خاصی دیر بعد کہا۔ ''تم یہاں رہو گے تو دیکھ لو گے۔''

ریگ نے سر ہلایا۔ ''نسلاً میں بھی جرمن ہوں لیکن میرے آباؤ اجداد بڑھئی کا کام نہیں کرتے تھے۔ یہ پیشہ میرے دادا نے اختیار کیا اور میں اس کام میں تیسری نسل ہوں۔''

جارج نے سر ہلایا۔ ''اب سمجھ میں آیا کہ تمہیں لڑکیوں اور عورتوں سے کیوں دلچسپی نہیں ہے۔ اس معاملے میں ہم جرمن سب سے ڈل قوم ہیں۔''

ریگ ہنسا۔ ''میں نے تو انگریزوں کو یہ بات کہتے سنا ہے۔''

اگست کے آغاز میں فراغت تھی کیونکہ مکان مکمل ہو گیا تھا اور ان دنوں کوئی آرڈر بھی نہیں تھا۔ اس لیے ریگ نے جارج کے ساتھ پکنک کا پروگرام بنایا۔ جارج نے چند اور افراد کو بھی شامل کرنے کی تجویز دی۔ اتفاق سے یہ سب ہی ریگ کے واقف کار بن چکے تھے اس لیے وہ بہ خوشی مان گیا۔ طے پایا کہ آنے والے ویک اینڈ پر وہ جھیل کے کنارے پکنک منانے جائیں گے۔ ہر فرد اپنا انتظام خود کرے گا اور جس کی مرضی جتنے افراد یا کسی دوست کو ساتھ لے آئے۔ ریگ نے پیشکش کی کہ سامان اس کی پک اپ میں رکھ دیا جائے۔ اس طرح گاڑیوں میں زیادہ افراد کی جگہ بنے گی اور کم گاڑیاں لے جانی پڑیں گی۔ ریگ کی پیشکش مان لی گئی۔ پکنک کے لیے جھیل کا سب سے بعید گوشہ چنا گیا تھا کیونکہ وہاں اوپر پہاڑوں سے آتی ایک ندی آبشار کی طرح گر رہی تھی۔ جارج کا کہنا تھا کہ اس سے زیادہ خوب صورت جگہ اس پورے علاقے میں کہیں نہیں تھی۔

پکنک والے دن سارے افراد ریگ کے گھر کے سامنے جمع ہوئے اور وہ یہاں سے روانہ ہو گئے..... سب نے کھانے پینے کا اپنا اپنا بندوبست کیا تھا۔ ریگ نے صبح ناشتے میں ہی چند بڑا ایک سینڈوچز اور کافی کا تھرماس تیار کر لیا تھا۔ اسے مچھلی کے شکار کا شوق تھا کیونکہ زندگی کے سارے ہی سال اس نے مشی گن جھیل کے کنارے گزارے تھے جہاں کئی اقسام کی مچھلیاں ملتی ہیں۔ جارج نے بتایا تھا کہ یہاں سالمن کی کچھ اقسام پائی جاتی تھیں جو کھانے میں لذیذ تھیں۔ اسی لیے اس نے فشنگ راڈ اور دوسرا سامان بھی ساتھ رکھ لیا۔ ریگ کی پک اپ کے علاوہ چار گاڑیاں اور تھیں جن میں تقریباً بائیس افراد تھے۔ جارج اس کی پک اپ میں آ گیا۔ وہ بھی فشنگ راڈ لایا تھا۔ جھیل کا یہ حصہ بارہ میل کی دوری پر تھا... شروع میں کچھ حصہ پکی سڑک کے بعد تقریباً سارا ہی کچا تھا مگر راستہ ہموار اور صاف تھا اس لیے ڈرائیونگ آسان رہی۔ ریگ نے نقشہ دیکھ لیا تھا مگر جب اس نے ایک راستے پر مڑنا چاہا جو اس کے خیال میں جھیل تک جانے کا شارٹ کٹ تھا تو جارج نے اسے روک لیا۔

''اس راستے پر نہیں...... اس طرف۔'' اس نے دوسرے راستے کی طرف اشارہ کیا۔ ریگ نے حیرت سے کہا۔

''لیکن یہ شارٹ کٹ ہے۔''

''یہ راستہ ٹھیک نہیں ہے۔'' جارج نے اصرار کیا۔ ریگ نے شانے اچکا کر پک اپ اس طرف موڑ دی جس طرف جارج نے اشارہ کیا تھا۔ جھیل اب زیادہ دور نہیں تھی مگر انہیں ایک میل زیادہ سفر کرنا پڑا تھا۔ ریگ کے خیال میں جارج اسی علاقے کا رہنے والا تھا اس لیے وہ بہتر واقفیت رکھتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ جھیل کے اس خوب صورت کنارے پر موجود تھے۔ یہاں سفید ریت پر جھیل کا پانی لہریں لے رہا تھا اور کچھ ہی دور آبشار کوئی ساٹھ ستر فٹ کی بلندی سے نیچے گر رہی تھی۔ بلاشبہ یہ خوب صورت منظر تھا۔ سب گاڑیوں سے اتر آئے۔ لوگ کرسیاں، ربڑ کی بنی دریاں اور چادریں ساتھ لائے تھے۔ وہ بچھا کر اپنا سامان لگانے لگے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں سرد پانی کی پروا کیے بغیر کپڑے اتار کر جھیل میں گھس گئے۔ ریگ نے آبشار سے کچھ دور ایک مناسب جگہ فشنگ کے لیے چنی اور وہاں آ گیا۔ جارج بھی نہانے والوں میں شامل تھا۔ ریگ نے چارا لگا کر ڈوری پانی میں پھینک دی اور انتظار کر رہا تھا کہ اسے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے رخ موڑ کر دیکھا تو نزدیک ہی ایک کسی قدر طویل قامت اور خوب صورت لڑکی بیٹھی تھی۔ ریگ نے اسے کارپینٹر ایرک کی گاڑی میں دیکھا تھا۔ ریگ کو متوجہ پا کر وہ مسکرائی۔

''ہائے۔''

''ہائے۔'' ریگ نے جواب دیا۔ ''تم ایرک کے ساتھ آئی ہو؟''

لڑکی نے سر ہلایا۔ ''ایرک میرا بہنوئی ہے۔ میں لیانا ہوں۔''

''ریگ۔'' اس نے ہاتھ آگے کیا اور لیانا کا نازک ہاتھ تھام لیا۔ لیانا کا گلابی چہرہ سرخ ہو گیا کیونکہ ریگ نے اس کا ہاتھ کچھ دیر تھامے ہی رکھا تھا۔ اس نے خفیف ہو کر ہاتھ چھوڑا۔ ''تمہیں مچھلی کا شکار پسند ہے؟''

لیانا نے سر ہلایا۔ ''ہاں، میں اسی لیے اس طرف آئی تھی کہ تمہیں بتا سکوں۔ تم نے جو بیٹ لگایا ہے، وہ ڈل ہے۔ یہاں نیچے سبزہ اور کائی بہت ہے اور پانی نیم تاریک ہوتا ہے۔ مچھلیاں ڈل بیٹ پر نہیں آتیں۔ انہیں متوجہ کرنے کے لیے چمک دار بیٹ لگانا پڑتا ہے۔''

''یہ تم نے اچھا نکتہ بتایا ہے۔'' ریگ نے اپنا ڈبا ٹٹولا جس میں بیٹ تھے مگر کوئی بھی چمک دار نہیں تھا۔

''میں لاتی ہوں۔'' لیانا کھڑی ہو گئی۔ ''ایرک کی گاڑی میں فشنگ کا سامان پڑا ہے۔''

لیکن اس سے پہلے کہ لیانا جاتی، ریگ کی فشنگ راڈ میں حرکت ہوئی اور پھر ڈوری کھنچنے لگی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''لگتا ہے کوئی تیز آنکھوں والی مچھلی ہے جس نے میرا ڈل بیٹ بھی دیکھ لیا۔''

لیانا ہنسی اور واپس بیٹھ گئی۔ ''نہیں، میرا خیال ہے تمہاری قسمت تیز ہے۔''

لیانا کی بات درست ثابت ہوئی۔ چند منٹ کی کشمکش کے بعد ریگ نے ایک ڈھائی کلوگرام سے اوپر وزن کی سالمن پکڑ لی۔ اس پر سب نے اسے مبارک دی۔ فشنگ کے دوران ریگ بیئر کی دو بوتلیں پی چکا تھا اور اب مثانے پر دباؤ محسوس ہو رہا تھا اس لیے وہ لیانا کو اپنی فشنگ راڈ کا نگران بنا کر جھیل کے عقب میں واقع جنگل کی طرف بڑھا۔ غیر ارادی طور پر وہ اس سمت آ نکلا جہاں جارج نے اسے آنے سے منع کیا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ یہ شارٹ کٹ راستہ اچھا نہیں ہے۔ ایک مناسب جگہ پر اس نے اپنا بوجھ ہلکا کیا اور پتلون کی زپ بند کر رہا تھا کہ اس کی نظر راستے پر گئی اور اس نے دیکھا کہ راستہ بالکل ہموار اور صاف تھا۔ وہ دیکھنے کے لیے بڑھا کہ راستہ واقعی صاف ہے یا آگے کہیں خراب

ہے، اس کا ارادہ تھا کہ اگر راستہ صاف ہوا تو وہ واپس اسی راستے سے جائے گا۔ وہ ذرا آگے آیا تو ایک جگہ اسے درختوں سے خالی دکھائی دی۔ وہ حیران ہوا کیونکہ یہاں درخت کاٹ کر ان کے تنے چھوڑ دیے گئے تھے۔ باقی تنے تو سفید یا کاہی لگنے سے سبز ہو رہے تھے۔ صرف ایک کٹا ہوا تنا ایسا تھا جو بھورے رنگ کا ہو رہا تھا۔ یہ تقریباً دو فٹ قطر کا کوئی بڑا درخت تھا جس کا تنا زمین سے دو فٹ کی اونچائی پر بہت صفائی سے کاٹا گیا تھا اور اس میں ذرا بھی کھردرا پن یا اونچ نیچ نہیں تھی۔ ریگ نزدیک آیا تو اسے سڑنے جیسی بدبو آئی۔ تنے کے آس پاس کی زمین بھی اسی رنگ کی ہو رہی تھی۔ ریگ تنے سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کے مزید نزدیک جاتا، عقب سے ایرک کی آواز آئی۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

ریگ چونک کر مڑا اور اس نے چھوٹی انگلی سے اشارہ کیا۔ ''میں اس لیے آیا تھا لیکن یہاں یہ......''

''کچھ نہیں ہے۔'' ایرک نے بے پروائی سے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔ میرے پاس میونخ کی بہترین بیئر آئی ہے جو میں پکنک پر لایا ہوں۔''

ریگ اس کے ساتھ وہاں سے نکل آیا۔ ''میرا خیال ہے اس جنگل سے ہمیں راستہ مختصر پڑتا ہے۔ جس راستے سے ہم آئے ہیں، وہ ایک میل زیادہ طویل ہے۔''

ایرک نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور اپنے آئس باکس سے ایک بیئر کی بوتل نکال کر اسے تھما دی۔ ریگ سمجھ گیا کہ وہ اس بارے میں بات کرنا نہیں چاہ رہا۔ ایرک بڑھئی تھا اور اس کا کام بہت اچھا چل رہا تھا۔ لیک ووڈ میں اس کا خوب صورت اور بڑا سا مکان تھا۔ اس کا خاندان بھی بڑا تھا۔ اس کے چھ بچے تھے۔ چھ بچوں کے باوجود اس کی بیوی کیٹ ایک خوب صورت اور اسمارٹ عورت تھی۔ لیانا میں اس کی جھلکیاں موجود تھیں۔ دونوں بہنیں فشنگ راڈ کے پاس بیٹھی آپس میں گپ شپ کر رہی تھیں۔ ایرک نے لیانا کی طرف اشارہ کیا۔ ''لیانا اچھی لڑکی ہے۔ اس کا شوہر گزشتہ سال انتقال کر گیا۔''

''اوہ...... یہ سن کر افسوس ہوا۔''

''وہ واقعی افسوسناک واقعہ تھا۔'' ایرک نے اپنے لیے بھی بوتل کھولی۔ ''راڈرک اپنی گاڑی میں مردہ پایا گیا تھا۔ کسی نے عقب سے اس کے گلے میں رسی یا ایسی کوئی چیز ڈال کر اسے قتل کر دیا تھا۔''

''قاتل پکڑا گیا؟''

''نہیں۔'' ایرک نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''راڈرک بینک سے رقم نکلوا کر لا رہا تھا۔ وہ رقم بھی غائب پائی گئی۔''

''یقیناً اسے رقم کی خاطر قتل کیا گیا ہوگا؟''

''سامنے کی بات ہے مگر لیانا پاگل ہو گئی تھی۔ وہ راڈرک سے محبت کرتی تھی پھر بہت دن لگے اسے سنبھلنے میں۔''

ریگ نے لیانا کی طرف دیکھا۔ ''اس نے خود کو سنبھال لیا ہے۔''

''ہاں لیکن کبھی کبھی اسے مسئلہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے کیٹ اسے اپنے ساتھ لے آئی ہے۔ اب لیانا ہمارے ساتھ ہی رہتی ہے۔''

ایرک کا مکان لیک ووڈ کے مرکز میں تھا لیکن یہ جگہ ریگ کے مکان سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ایرک یار باش آدمی تھا اور آئے دن اس کے بڑے سے گھر میں پارٹیاں ہوتی رہتی تھیں۔ تقریباً پورا قصبہ اس کے حلقۂ احباب میں شامل تھا۔ وہ ایک بار ٹاؤن کونسل کا ممبر بھی رہا لیکن پھر اس نے مزید الیکشن لڑنے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے کسی کے خلاف لڑنا اچھا نہیں لگتا اس لیے اس نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اسے صرف دوست بنانا اچھا لگتا تھا۔ ریگ کی طرف بھی وہ خود بڑھا تھا۔ درحقیقت ریگ کی اب جتنے بھی افراد سے واقفیت تھی، وہ سب ایرک کے توسط سے متعارف ہوئے۔ ریگ کو کچھ دیر تک اس جگہ کا خیال آتا رہا خاص طور سے بھورے رنگ والا تنا مگر جب لیانا اس کی طرف آئی اور اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو وہ سب بھول گیا۔ لیانا اسے آبشار والے حصے تک لائی۔

یہاں پانی کے کنارے ایسے پھول کھلے ہوئے تھے جو ریگ نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ اور لیانا بہت دیر تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور جب اٹھے تو انہیں لگا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ ریگ نے اسے اگلے دن ڈنر کی دعوت دی۔ واپسی پر ریگ کی پک اپ سب سے پیچھے تھی اور سب نے وہی راستہ اختیار کیا جس سے آئے تھے اس لیے ریگ کو بھی اسی راستے پر جانا پڑا۔ ورنہ اس نے سوچا تھا کہ وہ شارٹ کٹ کی طرف جائے گا۔ ایک بار پھر اسے خیال آیا کہ یہ لوگ اس طرف سے جانے سے کیوں گریز کر رہے ہیں۔ بہرحال یہ بات ایسی نہیں تھی جو زیادہ دیر اس کے ذہن میں رہتی۔ اب اس کی سوچوں کے لیے ایک ہستی موجود تھی۔ اگلے دن اس نے کچھ کام نمٹائے۔ اسے دوسری شپ منٹ کی رقم بھی مل

گئی تھی اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ لیانا کے ساتھ بہترین قسم کا ڈنر کرے گا۔

لیک روڈ سے کچھ فاصلے پر ایک اعلیٰ درجے کا ریستوران تھا۔ ریگ نے وہاں کال کر کے ٹیبل ریزرو کرائی تھی۔ لیانا سے اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ اسے سات بجے لینے آئے گا۔ وہ سات بجے ایرک کے گھر پہنچا تو لیانا تیار تھی اور بہت نک سک سے تیار تھی۔ ریگ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جب وہ پکنک پر آئی تھی تو لاابالی سی لڑکی لگ رہی تھی مگر آج وہ سر تا پا ایک خوب صورت عورت تھی۔ ایرک اور کیٹ نے انہیں گرم جوشی سے رخصت کیا۔ ریستوران ایک چھوٹی سی پہاڑی کے اوپر تھا جہاں سے اس سارے علاقے کا منظر دور تک نظر آتا تھا۔ وہ اتفاق سے اسی جگہ سے گزرے تھے جہاں سے وہ پکنک منانے آئے تھے اور وہ جگہ بھی ہائی وے سے زیادہ دور نہیں تھی جہاں ریگ نے بھورے رنگ والا کٹا ہوا تنا دیکھا تھا اور جارج نے اس طرف جانے سے انکار کیا تھا۔ جب وہ ریستوران میں داخل ہوئے تو سورج غروب ہونے والا تھا اور اس کی آخری کرنیں جنگل اور اس سے آگے موجود جھیل کو روشن کر رہی تھیں۔

ڈنر سے پہلے ریگ نے اپنے لیے شیمپین اور لیانا کے لیے شیری کا آرڈر دیا۔ راستے میں وہ زیادہ تر خاموش رہے اور یہاں بھی بات کرتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ ریگ نے اچانک کہا۔ ”مجھے راڈرک کے بارے میں جان کر افسوس ہوا۔“

لیانا کا چمکتا ہوا چہرہ ذرا ماند پڑا۔ ”سوری، میں نے تمہیں راڈرک کے بارے میں......“

”اوہ...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ ریگ نے جلدی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں تمہارے احساسات۔“

لیانا نے شیری کا ایک بڑا گھونٹ لیا اور چند لمحے کے لیے خاموش رہی۔ ”میرا اور اس کا ساتھ صرف تین مہینے رہا تھا۔“

”ایرک نے بتایا ہے کہ اس کا قاتل پکڑا نہیں گیا۔“

”شاید......“ لیانا نے بے خیالی میں کہا۔

ریگ چونکا۔ ”شاید......“

لیانا جیسے ہوش میں آگئی۔ ”میں نے کیا کہا؟“

”تم نے کہا شاید راڈرک کا قاتل نہیں پکڑا گیا۔“

”میں نے غلطی سے کہہ دیا۔“ لیانا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کا قاتل نہیں پکڑا گیا۔“

ریگ چپ ہو گیا۔ اسے لگا کہ لیانا نے غلطی سے نہیں کہا تھا مگر اس نے دوبارہ اس موضوع کو چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ پہلے ہی غلطی کر چکا تھا۔ ریستوران کے بینڈ نے میوزک چھیڑا اور جوڑے ہال میں رقص کے لیے خالی جگہ پر آگئے۔ ریگ نے لیانا کی طرف دیکھا تو وہ اس کا ہاتھ تھام کر کھڑی ہو گئی۔ ریگ نے نرمی سے اسے بانہوں میں لے لیا۔ قربت نے تمام باتوں کو بھلا دیا اور جب وہ واپس میز پر آئے تو پہلے سے زیادہ بے تکلف اور پُراعتماد تھے۔ ریگ اسے اپنے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس نے اعتراف کیا کہ آج سے پہلے اس نے کبھی صنفِ نازک پر توجہ نہیں دی تھی۔ یہ سن کر لیانا کا چہرہ پہلے کی طرح جگمگانے لگا...... اس نے اس بار از خود راڈرک کا ذکر چھیڑ دیا۔ ”اس کے بعد میرے لیے زندگی بہت مشکل ہو گئی تھی مگر رفتہ رفتہ میں سنبھل گئی۔ اس کے باوجود مجھے لگتا تھا کہ میرے اندر کی عورت مر گئی ہے۔“

”اور اب؟“ ریگ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”اب...... اب میں زندہ ہوں۔“

پُرتکلف ڈنر بہت طویل تھا۔ جب وہ رات گیارہ بجے وہاں سے اٹھے تو بہت خوش اور پُرخمار تھے۔ آج ریگ نے... بدپرہیزی کرتے ہوئے زیادہ پی لی تھی مگر اس کے حواس پوری طرح بیدار تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے نشہ کم کرنے کے لیے لیمن ڈراپس لیے۔ پہاڑی سے نیچے اترتے ہوئے ریگ نے جھیل کے پاس جنگل دیکھا اور لیانا سے پوچھا۔ ”وہ جھیل کے ساتھ ایک حصہ ہے۔ جب ہم پکنک پر گئے تو اس حصے کے بجائے ہم گھوم کر جھیل کے کنارے گئے تھے۔ جارج نے مجھے بتایا کہ اس طرف کا راستہ خراب ہے۔“

لیانا کسی قدر نروس ہو گئی۔ ”ہاں...... اس نے ٹھیک کہا تھا۔ جھیل تک جانے کا یہ راستہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”مگر جب میں وہاں گیا تو مجھے راستے میں کوئی خرابی محسوس نہیں ہوئی۔ بالکل صاف اور ہموار راستہ تھا۔ البتہ وہاں میں نے ایک جگہ درختوں کے کٹے ہوئے تنے دیکھے۔ ایک تنا براؤن ہو رہا تھا۔ میں اس کے قریب جا کر نہیں دیکھ سکا کیونکہ ایرک وہاں آگیا اور وہ مجھے وہاں سے لے گیا۔ اب مجھے خیال آرہا ہے کہ ایرک میرے پیچھے آیا تھا اور جان بوجھ کر مجھے وہاں سے لے گیا تھا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ لیانا نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اصل میں تم یہاں اجنبی ہو اور ایرک کو فکر ہو گی کہ تم راستہ بھول کر کہیں اور نہ نکل جاؤ۔“

”میں اب اتنا بھی اجنبی نہیں ہوں۔“ ریگ نے ذرا

تیز لہجے میں کہا۔ ''اس سارے علاقے کے نقشے سے واقف ہوں۔''

''پلیز۔'' لیانا نے مڑ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''کیا تم کوئی اور بات نہیں کر سکتے؟''

لیانا کے لہجے میں ایسی التجا تھی کہ ریگ کو خاموش ہونا پڑا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''سوری، میں زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ مجھے لگا جیسے مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔''

''تم سے کچھ نہیں چھپایا جا رہا۔'' لیانا پھر باہر دیکھنے لگی۔ ان کے درمیان پھر سے خاموشی چھا گئی اور یہ خاموشی ایرک کے گھر تک برقرار رہی۔ ریگ نے اپنی پک اپ روکی تو لیانا نیچے اتر کر اس کی طرف آئی اور جھک کر کہا۔ ''شکریہ۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ہے۔'' لیانا کے لہجے میں اصرار تھا۔ ''آج کتنے عرصے بعد میں نے خود کو مختلف محسوس کیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے لیانا اچانک اس کے چہرے پر جھک گئی اور جب وہ اس سے الگ ہو کر بھاگتی ہوئی گھر کی طرف گئی تب بھی ریگ کو وہ انوکھا لمس اپنے ہونٹوں پر محسوس ہوتا رہا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی اور ریگ ٹھنڈی سانس لے کر روانہ ہو گیا۔ اگلی صبح وہ دیر سے اٹھا۔ کام کوئی نہیں تھا۔ اس نے ناشتا بنایا اور ٹیرس میں بیٹھ کر ناشتا کیا۔ اس دوران میں وہ لیانا کے بارے میں سوچتا رہا۔ گزشتہ رات کے بعد وہ اس کے لیے خاص ہو گئی تھی۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل تھا کہ ریگ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے لیکن وہ اس کا طلب گار ضرور ہو گیا تھا۔ لیک ووڈ میں زندگی شہروں کی نسبت سست لیکن زیادہ سوشل تھی۔ یہاں اکیلے فرد کی اہمیت نہیں تھی۔ اہمیت خاندان والے کی ہوتی تھی۔ شادی کے بغیر مرد عورت کا ساتھ رہنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اور ایسے لوگوں کا معاشرتی بائیکاٹ کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لیک ووڈ ایسی بہت سی برائیوں سے پاک تھا جو اب شہروں کا خاصہ بن گئی تھیں۔

ریگ نے سوچا کہ وہ فارغ ہے تو گھر کے لیے کچھ سامان لے آئے۔ اسے اپنے لیے بھی کپڑوں کی ضرورت تھی۔ وہ شاپنگ کے لیے روانہ ہوا۔ لیک ووڈ کا کمرشل ایریا ایک ہی تھا اور وہاں سے ضرورت کی ہر چیز مل جاتی تھی۔ ٹاؤن کونسل کا دفتر اور شیرف آفس بھی یہیں تھا۔ یہ جان کر اسے حیرت ہوئی کہ شیرف آفس صرف تین افراد پر مشتمل تھا۔ ایک شیرف جان کیسل، دوسرا اس کا نائب مارٹن شولز اور تیسری دفتر سیکریٹری مارتھا تھی۔ لیک ووڈ کے آس پاس پیٹرولنگ کے لیے ہائی وے پولیس تھی مگر وہ شیرف کی ماتحت نہیں تھی البتہ ضرورت پڑنے پر وہ اس سے کام لے سکتا تھا۔ لیک ووڈ میں جرائم کا تناسب نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے یہ مختصر سا عملہ بھی عملاً فارغ ہی رہتا تھا۔ ریگ لیک ووڈ کے سب سے بڑے اسٹور میں آیا۔ یہاں سے اس نے کچن کا سامان لیا اور پھر ایک گارمنٹ شاپ میں آیا۔ ابھی وہ اپنے لیے کپڑے دیکھ رہا تھا کہ باہر ہلکا سا شور بلند ہوا۔ اس نے شیشے سے باہر دیکھا تو اسے جارج اور ایک لڑکی آپس میں جھگڑتے دکھائی دیے۔ کم سے کم ان کا انداز ایسا ہی تھا۔ ریگ باہر نکل آیا اور سڑک پار کر کے ان دونوں کی طرف بڑھا۔ تماشا دیکھنے کے لیے وہاں اور بھی کئی افراد آ گئے تھے۔ شیرف جان اپنے آفس سے نکل کر ان کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''ہے...... میا! یہ کیا ہو رہا ہے؟''

لڑکی میا نے شیرف کی طرف توجہ دیے بغیر اچانک ہی جارج کو تھپڑ مارا اور پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ جارج اسے گھور رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں غصہ تھا۔ شیرف نے اس سے پوچھا۔ ''جارج! یہ کیا چکر ہے؟''

''سب تمہارے سامنے ہے۔'' جارج نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''وہ پہلے کتیا کی طرح بھونکتی رہی اور پھر تھپڑ مار کر چلی گئی۔''

شیرف نے آس پاس دیکھا اور لوگوں سے کہا۔ ''پلیز آپ سب جائیں اور اپنا کام کریں۔ جارج! تم میرے ساتھ آؤ۔''

جارج خاموشی سے شیرف کے ساتھ چلا گیا۔ ریگ واپس پلٹ آیا۔ اس نے میا نامی اس لڑکی کو دو تین بار دیکھا تھا۔ وہ شاید بار کے مالک جوہانس کی بیٹی تھی۔ شام کے وقت وہ بار میں کام کرتی تھی مگر روز نہیں...... جس دن رش زیادہ ہوتا جوہانس اسے بلا لیتا تھا۔ جوہانس کی رہائش بار کے نزدیک ہی تھی۔ ریگ نے جارج کی زبان سے بھی میا کا ذکر نہیں سنا تھا۔ کچھ لڑکیاں جو جارج کے پیچھے آئی تھیں، اس نے ریگ کو ان کے بارے میں بتایا تھا لیکن میا ان میں شامل نہیں تھی۔ شاپنگ کے بعد اس نے وہیں ایک ریسٹوران میں لنچ کیا اور پھر گھر کے لیے روانہ ہوا۔ شام کے وقت وہ ورکشاپ کی صفائی کر رہا تھا کہ جارج آ گیا۔ اس نے ریگ سے ہاتھ ملایا اور ایک طرف ٹک گیا۔ صفائی سے فارغ ہو کر ریگ نے اس کے اور اپنے لیے بیئر نکالی اور وہ لان میں رکھی کرسیوں پر آ بیٹھے۔ جارج سنجیدہ تھا۔ اس

نے کہا۔

''تم نے دیکھ لیا ہوگا؟''

''لیکن یہ چکر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ تم نے کبھی میا کا ذکر نہیں کیا۔''

''کیونکہ اس سے میرا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔''

''پھر اس طرح سرِعام جھگڑنا؟''

جارج نے گہری سانس لی۔ ''اس پاگل کتیا کا خیال ہے کہ اس کی بہن شیما کی گمشدگی میں میرا ہاتھ ہے۔''

''گمشدگی؟''

''ہاں، وہ گزشتہ موسم بہار میں اچانک غائب ہوگئی تھی۔''

''تمہارا اس سے تعلق رہا تھا؟''

جارج اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ہچکچایا پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ایک رات میں نشے میں تھا اور میں بار سے نکلا تو شیما مل گئی تھی۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے لیکن وہ مجھے اسکول کے جمنازیم میں لے گئی۔ یہ اس سے میرا پہلا اور آخری تعلق تھا۔ اس کے بعد نہ وہ مجھ سے ملی اور نہ ہی میں نے اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔''

''میا کو اس تعلق کا علم کیسے ہوا؟''

''میں نہیں جانتا ممکن ہے شیما نے بتایا ہو لیکن اس کی گمشدگی میں میرا قطعی کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ وہ آوارہ مزاج لڑکی تھی اور ممکن ہے یہاں سے گزرنے والے کسی مسافر کے ساتھ چلی گئی ہو۔ اسے لیک ووڈ پسند نہیں تھا اور وہ... سرِعام اس کا اعلان بھی کرتی تھی۔''

''اگر وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی تو اس کے جانے کو گمشدگی کیوں کہا جا رہا ہے؟''

''کیونکہ وہ صرف پہنے ہوئے کپڑوں میں گھر سے غائب ہوئی تھی۔ اس کی تمام چیزیں، رقم اور حتیٰ کہ موبائل فون تک گھر میں تھا۔ وہ بس نکلی اور پھر واپس نہیں آئی۔''

''اس کی عمر کیا تھی؟ میرا مطلب ہے وہ......''

''وہ انیس سال کی تھی اور اپنی مرضی کی مالک تھی۔'' جارج نے ریگ کی بات سمجھ کر کہا۔

''میا نے تم پر شک کیوں کیا؟''

''میں نہیں جانتا مگر وہ دو تین بار میرے بارے میں یہ بات کر چکی ہے۔ پہلے دوسروں سے کرتی رہی اور آج اس نے مجھے مارکیٹ میں روک لیا۔''

''شیرف نے تم سے کچھ کہا؟''

''اس نے پہلے ہی مجھ سے اس بارے میں سوال کر لیے تھے جب شیما غائب ہوئی تھی۔ آج اس نے مجھ سے پھر پوچھا مگر اس نے شک نہیں کیا۔''

''میا نے سب کے سامنے تمہیں تھپڑ مارا۔ تم اس کے خلاف قانونی کارروائی کر سکتے ہو۔''

''قانونی کارروائی؟'' جارج نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ''ہم لوگ قانونی کارروائی کے قائل نہیں ہیں۔''

ریگ چونکا۔ ''کیا مطلب؟''

''کچھ نہیں۔'' جارج نے یوں کہا جیسے اس کے منہ سے غلطی سے نکل گیا ہو۔ ''میں تمہارے پاس اور مقصد سے آیا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں مزید میری ضرورت ہے؟''

''ضرورت تو ہوگی مگر فی الحال نہیں کیونکہ کوئی آرڈر نہیں ہے۔''

جارج نے سر ہلایا۔ ''میں نے ہائی اسکول پاس کر لیا ہے مگر جس گریڈ میں کیا ہے، اس سے مجھے معمولی ملازمت بھی نہیں ملے گی۔ میرے پاس ایک ہی چانس ہے کہ آئس ہاکی کا پیشہ ور کھلاڑی بننے کی کوشش کروں۔ میرے پاس کچھ رقم جمع ہوگئی ہے لیکن کچھ کم پڑ رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ رقم پوری کر کے جاؤں تاکہ آنے والے سیزن سے قبل وہاں کسی کلب سے معاہدہ کر سکوں۔''

ریگ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے پوچھا۔ ''تمہیں مزید کتنی رقم کی ضرورت ہے؟''

''دو ہزار ڈالرز کی۔'' جارج نے کہا۔ ''میں نے آٹھ ہزار ڈالرز جمع کر لیے ہیں اور میں دس ہزار ڈالرز ساتھ لے کر جانا چاہتا ہوں۔''

ریگ سوچ رہا تھا کہ فارغ بیٹھنے کے بجائے ڈیزائن والی پلائی تیار کرے۔ آرڈر تو اسے مل ہی جائے گا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''اوکے، میں کل سے کام کا آغاز کرتا ہوں...... تم آ جاؤ۔''

''شکریہ۔'' جارج نے خوش ہو کر کہا۔ ''اگر ایسا ہو جائے تو میں ایک مہینے بعد جا سکوں گا۔''

''اس صورت میں میرا تو نقصان ہو جائے گا۔'' ریگ ہنسا۔ ''مجھے تم جیسا مددگار کہاں ملے گا؟''

''تم فکر مت کرو۔ میرا ایک دوست روبین میری طرح طاقتور اور محنتی ہے۔ تم اس سے کام لے سکتے ہو۔''

اگلے دن سے ریگ نے کام شروع کر دیا۔ وہ پلائی بنانے کے دوران کیمیکلز اور رنگوں کی مدد سے پلائی شیٹ پر ڈیزائن بنانے کا ماہر تھا۔ اگرچہ یہ کام بڑے کارخانوں میں اور مشینوں کی مدد سے ہوتا تھا مگر ریگ اسے اپنی مشین پر ہاتھ کی مدد سے کر لیتا تھا۔ جارج جوش و خروش سے اس کی

مدد کر رہا تھا مگر ریگ نے محسوس کیا کہ وہ پریشان بھی تھا۔ اس نے ایک دوبار اس کی پریشانی کا سبب پوچھا مگر وہ ٹال گیا۔ چوتھے دن اس نے ریگ سے کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے، مجھے جلد ہی جانا پڑے گا۔''

''جارج! مسئلہ کیا ہے؟ تم مجھے پریشان لگ رہے ہو۔''

''مسئلہ ہے اور اس کا نام میا ہے۔ وہ مسلسل میرے پیچھے پڑی ہے اور اس نے کیمونٹی سے کہنا شروع کر دیا ہے کہ میرا ٹرائل کیا جائے۔''

''تمہارا ٹرائل؟'' ریگ نے حیرت سے کہا۔ ''کیمونٹی کیسے ٹرائل کر سکتی ہے؟''

''تم اس بارے میں نہیں جانتے۔'' جارج نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ''اگر ایسا ہوا تو میں پھنس جاؤں گا۔''

''کوئی تمہارا ٹرائل بھلا کیسے کر سکتا ہے، یہ تو عدالت کا کام ہے؟''

جارج نے جواب نہیں دیا پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''جو ہوگا دیکھا جائے گا مگر میں بتا دوں کہ اب میں پندرہ دن سے زیادہ کام نہیں کر سکوں گا۔''

''تم نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟''

''ہاں، میں جتنی دیر یہاں رہوں گا، خطرہ بڑھتا جائے گا۔''

ڈنر کے بعد لیانا سے ریگ کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے ایک شام جب ریگ ورکشاپ بند کرنے سے پہلے وہاں کی صفائی کر رہا تھا تو لیانا اچانک ہی آگئی۔ ریگ اسے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ ''تم......؟ ابھی میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔''

''کیا سوچ رہے تھے؟''

''یہی کہ تم سے ملے کئی دن ہو گئے ہیں۔''

''میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ تم مصروف تھے؟''

''نہیں، مصروف تو نہیں تھا مگر میں نے سوچا کچھ کام پہلے سے کر کے رکھ لوں۔ جارج بھی جانے والا ہے۔''

''جارج۔'' لیانا سنجیدہ ہو گئی۔ ''وہ اچھا لڑکا ہے مگر مشکل میں ہے۔''

''میرا تو خیال ہے کہ میا بلاوجہ اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔'' ریگ نے کہا۔ اس نے صفائی مکمل کر لی تھی۔ ورکشاپ کی روشنیاں بجھا کر اس نے اس کا شٹر گرایا اور لاک لگا دیا۔ وہ لیانا کو لے کر گھر میں آیا۔ ''کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''کیوں نہیں۔'' لیانا میز کے کنارے ٹک گئی۔

''جارج اتنا بھی بے قصور نہیں ہے۔ کم سے کم ثیما سے اس کے تعلقات تو تھے؟''

ریگ نے کافی مشین میں کافی ڈالی۔ ''جارج نے مجھے بتایا تھا۔ لیکن اس نے ایک بات اور کہی جو میں سمجھ نہیں سکا۔''

''کیا بات کی تھی؟''

ریگ نے تیار ہونے والی کافی مگوں میں ڈالی اور میز پر آ گیا۔ ''اس نے کہا تھا کہ میا اس کا معاملہ کیمونٹی کے پاس لے جا رہی ہے اور وہ مشکل میں پڑ سکتا ہے۔''

لیانا چپ ہو گئی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

''کیمونٹی بھلا کسی مجرمانہ فعل کی تحقیق اور سزا کا فیصلہ کیسے کر سکتی ہے؟''

''ہمارے ہاں اس کا رواج ہے۔''

ریگ دم بہ خود رہ گیا۔ ''رواج ہے...... تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟ یہ امریکا ہے کوئی پسماندہ افریقی ملک نہیں ہے جہاں کیمونٹی فیصلہ کرتی ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' لیانا نے کہا۔ ''لیکن شاید تم نہیں جانتے۔ اسی امریکا میں سات سو سے زیادہ کیمونیٹیز ہیں جو اپنے فیصلے اپنے قانون کے تحت کرتی ہیں، نہ کہ امریکی قانون کے تحت۔''

''ناقابلِ یقین۔''

''شہروں سے باہر تمہیں ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا...... مگر ان سات سو کیمونیٹیز میں سے سو سے کچھ اوپر شہروں سے تعلق رکھتی ہیں اور وہ قتل کے معاملات کا فیصلہ اپنے قانون کے تحت کرتی ہیں۔''

''تم کیسے جانتی ہو؟''

''راڈرک کے بعد میں بہت مایوس تھی اور ان دنوں میں نے دھیان بٹانے کے لیے اس بارے میں تحقیق کی تھی۔ اب میں چاہوں تو اس موضوع پر کتاب لکھ سکتی ہوں۔''

''کیا یہاں بھی قتل کے فیصلے کیمونٹی کرتی ہے؟''

لیانا نے سر ہلایا۔ ''بالکل۔''

''تم لوگوں کو قانون کا خوف نہیں ہے؟''

''قانون یہاں صرف ہمارا چلتا ہے۔ یہاں کیمونٹی والے ہیں۔''

''اور جو میری طرح باہر سے آتے ہیں؟''

''میں نے کہا نا یہاں صرف کیمونٹی والے ہی ہوتے ہیں۔ جو باہر سے آتا ہے، وہ بھی اسی کیمونٹی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔'' لیانا نے پھر کہا۔ ریگ خاموش ہو گیا۔ اگرچہ

اس کی تشفی نہیں ہوئی تھی مگر اس نے لیانا سے بحث کرنے سے گریز کیا۔ اسے اب تک یقین نہیں آرہا تھا اور جھٹلانے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی کیونکہ لیانا کو اس سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے جارج کی بات کی تصدیق کی تھی۔ اس نے موضوع بدل دیا۔

''تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' لیانا نے جواب دیا۔ ''مجھے کچھ جگہوں سے جابس کی آفرز ہیں مگر میں نے ان کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا ہے۔''

''میرا خیال ہے تمہیں اب اپنے بارے میں سوچ لینا چاہیے۔''

لیانا نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم نے کیا سوچا ہے؟''

ریگ نے پرخیال نظروں سے اسے دیکھا۔ ''مجھے یہ جگہ اچھی لگی ہے اور میرے کام کے مطابق بھی ہے۔ امید ہے کہ اس سال کے آخر تک میرا کام سیٹ ہو جائے گا۔ اس کے بعد میرا شادی کا ارادہ ہے۔ میں گھر بسانا چاہتا ہوں۔''

لیانا کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''تم نے بہت اچھا سوچا ہے، کوئی لڑکی دیکھی ہے؟''

ریگ نے ہمت کی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''ہاں، دیکھی ہے اور مجھے بہت اچھی لگی ہے لیکن وہ نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچتی ہے۔''

''تم کسی کو برے لگ ہی نہیں سکتے۔''

''اس لڑکی کو بھی؟''

لیانا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ریگ ذرا آگے جھکا۔ ''اگر میں اسے پرپوز کروں تو وہ مان جائے گی؟''

لیانا نے اس بار بھی اثبات میں سر ہلایا۔ ریگ نے پیش قدمی کی تو لیانا نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ اس رات ریگ کے گھر میں ہی رہی۔ صبح ریگ کی آنکھ کھلی تو لیانا نیچے ناشتا تیار کر رہی تھی۔ وہ نہا دھو کر نکھر گئی تھی۔ ریگ مسکرایا۔ ''ریہرسل ہو رہی ہے؟''

''ایسا ہی سمجھ لو، مجھے کھانا بنانا اچھا لگتا ہے۔''

ناشتا کرتے ہوئے ریگ کا چھٹی کا موڈ ہو گیا۔ اس نے لیانا سے کہا۔ ''آج باہر چلتے ہیں۔''

لیانا نے سر ہلایا۔ ریگ سوچ رہا تھا کہ جارج آیا تو وہ اسے چھٹی دے دے گا مگر وہ آیا ہی نہیں۔ ناشتے کے بعد اس نے اپنی پک اپ صاف کی۔ ورکشاپ کے لیے مال لانے میں وہ گندی ہو جاتی تھی۔ وہ روانہ ہوئے اور ریگ نے پک اپ کا رخ جھیل کے آبشار والے حصے کی طرف موڑ دیا۔ اس دن اتفاق سے وہاں کوئی نہیں تھا۔ لیانا نے سینڈوچز بنا لیے تھے۔ ساتھ میں پانی، تھرماس میں کافی اور بیئر کی بوتلیں رکھ لی تھیں۔ ان کی پکنک مکمل تھی۔ اس روز انہوں نے جھیل میں تیراکی بھی کی۔ ان کے پاس تیراکی کا لباس نہیں تھا مگر وہاں.... دیکھنے والا کوئی نہیں تھا اس لیے انہیں کپڑے اتار کر تیراکی کرنے میں آسانی رہی۔ لنچ کے بعد انہوں نے آرام کیا۔ لیانا سو گئی تھی، کچھ دیر بعد ریگ کو مثانے میں دباؤ محسوس ہوا تو وہ لیانا کو سوتا چھوڑ کر جنگل کے اسی حصے میں آیا۔ فارغ ہو کر اس نے کٹے تنوں والے حصے کا رخ کیا۔

اس بار اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا اس لیے وہ بھورے تنے کے پاس آیا۔ اب اس کے پاس سے بدبو نہیں آرہی تھی مگر اس کا بھورا رنگ زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ اس نے جھک کر تنے کو ایک سوکھی شاخ کی نوک سے کریدا تو اوپر کا بھورا رنگ اتر گیا اور اندر سے سرخی سی جھلکنے لگی۔ ریگ کو عجیب سا احساس ہوا۔ اس نے انگلی پر تھوک لگا کر اسے سرخ حصے پر رگڑا تو سرخی اس کی انگلی پر اتر آئی اور سونگھنے پر اسے خون کی کراہت آمیز بو محسوس ہوئی۔ یہ خون تھا مگر تنے پر خون کہاں سے آیا؟ اگر یہ کسی جانور کا خون تھا تو صرف اسی تنے پر کیوں تھا؟ زمین بھی صرف اسی تنے کے آس پاس بھورے رنگ کی تھی۔ اس نے شاخ سے جگہ جگہ کرید کر دیکھا اور ہر جگہ اندر سے سرخ خون ہی نکلا۔ اس کے اندر خوف سا ابھرنے لگا۔ وہ واپسی کے لیے پلٹا تھا کہ اس نے لیانا کو کھڑے دیکھا۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''تم......؟''

''تو تم اس لیے یہاں آئے تھے؟'' لیانا نے کہا۔

''نہیں، تم غلط سمجھ رہی ہو۔'' ریگ نے کہنا چاہا مگر لیانا پلٹ کر چل پڑی۔ ریگ اس کے پیچھے آیا۔ اس نے وضاحت بھی کی کہ وہ جنگل میں کیوں گیا تھا۔ پھر لیانا کا موڈ کافی دیر تک خراب رہا اور بہ مشکل وہ راستے میں اسے منانے میں کامیاب ہوا۔ وہ شام کے وقت قصبے میں داخل ہوئے تو ریگ کو گڑبڑ کا احساس ہو گیا۔ لوگ ٹاؤن ہال کی طرف جا رہے تھے۔ تقریباً سب مسلح تھے اور جانے والوں میں صرف بڑی عمر کے مرد تھے۔ ریگ نے تشویش سے کہا۔ ''یہ کیا چکر ہے؟''

''کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔'' لیانا نے کہا۔ ''ٹاؤن ہال کی طرف چلو۔''

ٹاؤن ہال کے آگے اچھا خاصا مجمع تھا۔ شیرف اور چند دوسرے لوگ جو ٹاؤن کونسل کے ممبر تھے، ان میں ٹاؤن کونسل کا سربراہ ایڈ رابرٹ بھی شامل تھا۔ ریگ اور لیانا پک اپ سے اترے۔ ایرک بھی آ گیا تھا اور وہ اسی کی طرف آئے۔ لیانا نے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''میا صبح سے غائب ہے۔'' ایرک نے جواب دیا۔ ''قصبے میں اس کی تلاش کی جا چکی ہے، اب آس پاس کے جنگلوں میں دیکھا جائے گا۔'' ایرک نے کہتے ہوئے ریگ کی طرف دیکھا۔ ''جارج آج تمہارے پاس آیا؟''

''نہیں، دس بجے تک تو نہیں آیا تھا۔'' اس نے انکار کیا۔ ''اس کے بعد میں اور لیانا باہر گئے تھے۔ اگر میرے پیچھے آیا ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

''ہم نے دیکھا تھا، تمہارا گھر اور ورکشاپ دونوں بند تھے۔''

''کیا تم لوگ میا کے ساتھ جارج کو بھی تلاش کر رہے ہو؟''

''ہاں کیونکہ گیارہ بجے کے بعد سے جارج بھی نظر نہیں آیا۔''

شیرف ان کی طرف آیا اور اس نے ایرک سے کہا۔ ''میں نے ہائی وے پولیس کو خبردار کر دیا ہے اگر وہ فرار کی کوشش کر رہا ہے تو جلد پکڑا جائے گا۔''

''کیا تم جارج کے بارے میں بات کر رہے ہو؟'' ریگ نے پوچھا۔

شیرف نے سر ہلایا۔ ''میا کے ساتھ اس کی گم شدگی معنی خیز ہے۔''

''میرا نہیں خیال کہ جارج کا اس گم شدگی میں کوئی ہاتھ ہے۔''

''یہ تمہارا خیال ہے۔'' شیرف کا لہجہ کھردرا ہو گیا۔ ''قصبے والوں کا خیال اس سے مختلف ہے۔''

ریگ دیکھ رہا تھا کہ وہاں جمع ہونے والے افراد میں جوش و خروش تھا۔ وہ آپس میں تند و تیز لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ میا کا باپ جوہانس بھی وہاں موجود تھا۔ اس کے ساتھ ایک کسی قدر معمر اور طویل قامت مگر دبلی جسامت کا شخص بھی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے شانے سے شاٹ گن لٹکا رکھی تھی۔ سخت چہرے والا بار رشتے میں جوہانس کا کزن تھا۔ مسلح افراد اپنے ساتھ کتے بھی لائے تھے۔ جلد وہ مختلف پارٹیاں بنا کر روانہ ہونے لگے۔ شیرف نے انہیں واکی ٹاکی دیئے تھے تاکہ وہ اس سے رابطے میں رہ سکیں۔ اسی نے پارٹیاں تشکیل دی تھیں۔ آخر میں شیرف خود بھی روانہ ہوا۔ ریگ نے لیانا کو گھر چھوڑا اور اپنے گھر کی طرف آتے ہوئے جارج کو موبائل پر کال کی مگر اس کا موبائل بند جا رہا تھا۔ وہ گھر میں آیا۔ سورج غروب ہونے والا تھا اور کچھ دیر میں تاریکی چھا جاتی۔

ریگ ٹیرس میں آیا۔ یہاں سے نزدیکی جنگل دکھائی دے رہا تھا اور وہاں اسے ایک پارٹی درختوں اور جھاڑیوں میں گشت کرتی نظر آئی۔ اچانک اسے نیچے سے کھٹکے کی آواز آئی۔ ریگ نیچے آیا۔ اسے لگا کہ آواز ورکشاپ سے آئی تھی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا مگر اس نے کچن سے ایک بڑا گوشت کاٹنے والا چاقو اٹھا لیا۔ وہ دبے قدموں باہر آیا۔ اس نے ورکشاپ کا شٹر کھولنے کی کوشش نہیں کی بلکہ عقبی سمت میں موجود دروازے تک آیا۔ چابی سے اس کا لاک کھولا اور اندر داخل ہوا تو ورکشاپ کے اندر تاریکی تھی۔ وہ کچھ دیر کھڑا اپنی آنکھوں کو تاریکی سے ہم آہنگ کرتا رہا اور ساتھ ہی سن گن بھی لیتا رہا۔ ریگ اپنی سماعت پر زور دے رہا تھا۔ ایک طرف سے اسے ہلکی سی آہٹ سنائی دی اور وہ اس طرف جھپٹا تھا کہ کوئی دونوں ہاتھ اٹھائے اس کے سامنے آ گیا۔ ''پلیز، میں جارج ہوں...... یہاں چھپا ہوا ہوں۔''

ریگ کا اٹھا ہوا ہاتھ رک گیا اور اس نے رکی ہوئی سانس خارج کی۔ ''میرے خدا' جارج! تم ابھی مارے جاتے۔'' اس نے کہتے ہوئے ورکشاپ میں روشنی کرنا چاہی مگر جارج نے گھگیا کر کہا۔

''پلیز روشنی مت کرنا، وہ آس پاس ہیں اور مجھے تلاش کر رہے ہیں۔''

ریگ رک گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور بولا۔ ''جارج! یہ کیا چکر ہے...... میا کہاں ہے؟''

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں مجھے نہیں معلوم۔''

''جھوٹ مت بولو۔'' ریگ نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم صبح کیوں نہیں آئے تھے؟''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ساڑھے دس بجے مام کو جوہانس کی کال آئی اور اس نے میا کی گم شدگی کا بتاتے ہوئے مجھے اس کا ذمے دار قرار دیا۔''

''اور تم اپنی صفائی دینے کے بجائے یہاں آ چھپے؟ احمق آدمی، تمہیں اندازہ ہے تم نے اپنا کیس کس حد تک خراب کر لیا ہے؟ کیا یہی بات تم اپنی صفائی میں نہیں کہہ سکتے تھے؟''

''اس وقت میں بدحواس ہو گیا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور میں خاموشی سے گھر سے نکل آیا۔ چھپنے کے لیے بھی مجھے کوئی جگہ سمجھ نہیں آ رہی تھی، سوائے تمہاری ورکشاپ کے۔''

''تم اندر کیسے آئے؟ ایرک بتا رہا تھا کہ انہوں نے میرا گھر اور ورکشاپ بھی دیکھی تھی۔''

''میرے پاس عقبی دروازے کی چابی ہے۔ تم نے دی تھی۔ وہ آئے تو میں یہیں تھا اور بہت ڈرا ہوا تھا۔''

''جارج! تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم خود کو شیرف کے حوالے کر دو۔ اگر تم بے گناہ ہو تو تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

''میں بے گناہ ہوں لیکن یہ لوگ اس بات کو تسلیم نہیں کریں گے۔''

''کیوں؟''

''تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔'' جارج بے چینی سے بولا۔ ''یہ اپنے خیال کو ہی کافی سمجھتے ہیں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ دس دن پہلے انہوں نے راڈرک کے قاتل کو سزائے موت دی ہے؟''

ریگ چونکا۔ ''نہیں، مجھے نہیں معلوم۔''

''ہاں، تم ابھی اجنبی ہو اس لیے یہ باتیں تم سے چھپائی جائیں گی مگر جب تم یہاں رچ بس جاؤ گے تو تم سب جان جاؤ گے اور پھر اس کمیونٹی کا ایک حصہ بن جاؤ گے۔'' جارج کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''میں کبھی ایسی واہیات بات کو تسلیم نہیں کروں گا۔'' ریگ نے پختہ لہجے میں کہا۔ ''میرے خیال میں کسی انسان یا کمیونٹی کو سزا دینے کا اختیار نہیں ہے۔ اس کے لیے اس ملک میں ایک منظم نظام اور مکمل قانون موجود ہے۔''

''اس کے باوجود بیتھون کو راڈرک کے قتل کا مجرم ٹھہرا کر اسے سزا دے دی گئی۔ وہ ایک آوارہ گرد شخص تھا جو جنگل میں کیبن بنا کر رہتا تھا۔ اس کے پاس سے وہ بیگ برآمد ہوا جس میں راڈرک بینک سے رقم لے کر آ رہا تھا۔ بیتھون نے بتایا کہ بیگ اسے سڑک کے ساتھ جنگل میں ملا تھا۔ اس نے راڈرک کو قتل نہیں کیا مگر کسی نے اس کی نہیں سنی اور اسے جھیل کے پاس والے جنگل میں لے جا کر اس کا سر کلہاڑے سے الگ کر دیا۔''

ریگ کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ اسے بھورا تنا یاد آ گیا اور اب وہ سمجھ گیا کہ اس پر اور اس کے آس پاس کس کا خون تھا۔ یہ ان کی پکنک سے صرف دو دن پہلے کی تو بات تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''اور اس کی لاش؟''

''کہیں جنگل میں خاموشی سے دفنا دی گئی ہو گی جیسا کہ اس سے پہلے مارے جانے والوں کی لاشیں دفنائی جاتی رہی ہیں۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ اتنے مہذب اور اچھے اخلاق والے لوگ ایسا کرتے ہیں۔''

''اس وقت تک جب تک یہ آپ کو مجرم نہیں سمجھ لیتے۔'' جارج نے کہا تھا کہ اچانک باہر تیز روشنیاں لہرانے لگیں اور پھر کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ ریگ نے کہا۔

''میرے خدا! یہ کتوں کی مدد سے تمہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آ گئے ہیں۔''

''مجھے جانے دو۔'' جارج نے کہا اور جھپٹ کر دروازے سے نکلا تھا مگر اسے ورکشاپ سے دور جانا نصیب نہیں ہوا۔ چند افراد اس سے چمٹ گئے اور اسے نیچے گرا کر اس کے ہاتھ پشت پر ہتھکڑی سے باندھ دیے۔ ریگ ورکشاپ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ ایرک اس کی طرف آیا اور سرد لہجے میں بولا۔

''تو اسے تم نے پناہ دی ہوئی تھی؟''

''بالکل بھی نہیں۔'' ریگ نے جلدی سے کہا۔ ''یہ یہاں خود چھپا ہوا تھا اور میں نے بھی ابھی اسے تلاش کیا ہے۔''

''یہ بات تم کمیونٹی کو بتانا۔'' ایرک نے کہا اور اپنی رائفل کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ ''تم بھی ساتھ چلو گے۔''

ریگ نے حیرت سے دیکھا۔ ''میں کیوں...... میں نے کیا کیا ہے؟''

''تم نے مجرم کو چھپا کر اس کی مدد کی ہے۔''

ریگ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا ورنہ اسے شدید غصہ آ رہا تھا۔ وہ خود کو سمجھا رہا تھا کہ اتنے سارے مسلح افراد سے بحث کرنا بھی ٹھیک نہیں ہے جو اس وقت اپنے طور پر منصف بنے ہوئے تھے۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''کیا جارج مجرم ثابت ہو گیا ہے یا تم لوگوں نے اپنے طور پر اسے مجرم فرض کر لیا ہے؟''

''وہ مجرم ثابت ہو گیا ہے۔'' ایرک نے کہا۔ ''جلد یہ بات تم جان لو گے۔''

دوسری طرف جارج مچل رہا تھا اور شور کر رہا تھا کہ وہ بے گناہ ہے، اسے چھوڑ دیا جائے مگر درجن سے اوپر افراد اسے اور ریگ کو زبردستی پکڑ کر ٹاؤن ہال کی طرف لے گئے جہاں قصبے والوں کا ایک بڑا مجمع پہلے ہی جمع ہو گیا تھا۔ ریگ کو کسی نے پکڑا نہیں تھا مگر تین افراد نے اسے گھیرے میں

ضرور لیا ہوا تھا۔ جارج کی حالت خراب تھی۔ وہ مسلسل اپنی بے گناہی پر اصرار کر رہا تھا مگر کوئی اس کی نہیں سن رہا تھا۔ ایڈ ایک طرف کھڑا تھا۔ جوہانس بھی آگیا تھا اور وہ جارج پر جھپٹا۔ وہ اسے گھونسوں سے مار رہا تھا۔ کسی نے اسے روکنے یا جارج کو بچانے کی کوشش نہیں کی۔ جارج کے خاندان میں صرف ماں تھی اور وہ وہاں نظر نہیں آرہی تھی۔ شاید اسے وہاں آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ریگ نے اپنے آس پاس موجود افراد سے کہا۔ ''یہ ظلم ہے اگر جارج نے کچھ کیا ہے تب بھی اسے اس طرح مارنا ٹھیک نہیں ہے۔''

کسی نے ریگ کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ سب اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کچھ دیر میں شیرف بھی وہاں آگیا۔ اس دوران میں جوہانس نے مار مار کر جارج کو لہولہان کر دیا تھا اور اب اسے دو آدمیوں نے پکڑا ہوا تھا اور وہ ان کے سہارے جھول رہا تھا۔ شیرف کو دیکھتے ہی ریگ نے بلند آواز سے کہا۔ ''شیرف! یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم قانون کے محافظ ہو۔''

شیرف جان اس کی طرف آیا۔ ''اس وقت میں کمیونٹی ممبر ہوں۔''

''یہ سب غیر قانونی ہے۔'' اس نے جارج کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیا ثبوت ہے کہ یہ مجرم ہے؟''

ریگ کے کہنے پر شاید شیرف جان کو خیال آگیا کہ قانون کوئی بھی ہو، مجرم کو ثبوت اور گواہی پر ہی سزا ہوتی ہے۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''شمالی جنگل سے ایک جگہ میا کا پھٹا ہوا لباس اور جوتے ملے ہیں۔ وہاں خون کے دھبے بھی ہیں۔''

''اس کی لاش یا وہ خود ملی؟''

''نہیں، اس کی تلاش جاری ہے۔''

''اس سے جارج مجرم ثابت نہیں ہوتا۔''

''جائے وقوع پر اس کے جوتوں کے نشانات مل گئے ہیں اور وہ جوتے جارج کے گھر کے باہر موجود تھے۔ کل شام بارش ہوئی تھی اور جنگل کی نرم گیلی زمین پر یہ نشان بہت واضح آئے ہیں۔''

ریگ کا لہجہ مدھم ہو گیا مگر اس نے بحث جاری رکھی۔ ''اس سے بھی جارج مجرم ثابت نہیں ہوتا۔ ممکن ہے میا زندہ ہو اور تم لوگوں نے اپنے طور پر اسے مردہ فرض کر لیا ہو۔''

''اس کے گھر والوں نے تصدیق کی ہے کہ وہ اسی لباس اور جوتوں میں گھر سے نکلی تھی۔ اس کی تمام چیزیں اور کپڑے گھر پر ہیں۔ اب وہ جنگل میں کیا لباس اور جوتے چھوڑ کر برہنہ نہیں چلی گئی ہوگی۔'' شیرف جان کہتے ہوئے اس کی طرف جھکا۔ ''ریگ! تم بلاوجہ ایک مجرم کے پیچھے قصبے میں اپنا تاثر خراب کر رہے ہو۔''

''جارج کی طبیعت خراب تھی اور وہ صبح گھر میں تھا۔''

''اس کا کوئی گواہ نہیں ہے، سوائے اس کی ماں کے اور تم جانتے ہو قریبی عزیز کی گواہی قبول نہیں کی جاتی ہے۔''

ریگ نے ہار نہیں مانی۔ اس نے بات جاری رکھی۔ ''اگر یہ مجرم ہے تب بھی اسے سزا دینے کا اختیار صرف عدالت کو ہے۔''

''ہاں لیکن لیک ووڈ میں نہیں ہے۔ اس کی حد سے باہر ہے۔'' شیرف نے کہا اور پلٹ کر چلا گیا۔ سب لوگ ٹاؤن ہال میں جا رہے تھے جہاں ایڈ اور چند دوسرے افراد نے اپنی عدالت سجائی تھی۔ جارج کو مجرم کی حیثیت سے پیش کرنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ ایک طرف میز پر میا کا پھٹا ہوا لباس، اس کے جوتے اور جارج کے جوتے تھے جن کے نشانات جائے وقوع پر زمین پر پائے گئے تھے۔ یہ سب جارج کے خلاف بہ طور ثبوت پیش کیا جانا تھا۔ اس کے بعد اس کی سزا کا فیصلہ کیا جانا تھا۔ جب اسے احاطے میں لایا گیا تو اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ زخموں کے نشانات بھی یہ زردی نہیں چھپا پا رہے تھے۔ ایڈ نے کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے پہلے جارج پر فردِ جرم سنائی۔ ریگ اگلی قطار میں شیرف اور ایرک کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ذرا جھک کر سرگوشی میں شیرف سے کہا۔

''تم نے قانون پڑھا ہوا ہے..... کیا امریکا میں کسی کو ان شواہد کی بنیاد پر سزا ہو سکتی ہے؟''

''اسی ملک میں کئی بار اس سے بھی کہیں معمولی شواہد پر لوگوں کو سزائے موت سنائی جا چکی ہے۔'' شیرف نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

ریگ کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ ''کیا سزائے موت کا بھی امکان ہے؟''

''ہمارے ہاں قتل کی سزا صرف موت ہے۔'' شیرف نے کہا۔

اس دوران میں ایڈ نے جارج سے اپنی صفائی پیش کرنے کو کہا۔ وہ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ''اگرچہ میں جانتا ہوں میرا صفائی پیش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ تم لوگ مجھے قاتل تصور کر چکے ہو۔ مگر میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے میا کو دیکھا بھی نہیں ہے۔ کل شام میں ریگ کی ورکشاپ سے سات

بجے روانہ ہوا تھا۔''

''لیکن تم رات نو بجے گھر پہنچے تھے؟''

''میں نے کالینن کے اسٹور سے بیئرز لی تھی اور جنگل کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں میں گھومتا رہا مگر میں شمالی جنگل کی طرف نہیں گیا تھا بلکہ مشرق کی طرف گیا تھا۔''

''تب تمہارے جوتوں کے نشانات وہاں کیسے پائے گئے؟''

''میں نہیں جانتا، خدا کی قسم بالکل نہیں جانتا۔ جب بارش ہونے لگی تو میں گھر کی طرف آیا۔ میرے جوتے چونکہ گیلے اور کیچڑ میں خراب ہو رہے تھے اس لیے میں نے انہیں گھر سے باہر چھوڑ دیا۔''

''تمہاری ماں نے تمہیں ننگے پاؤں آتے نہیں دیکھا؟''

''میں نے برآمدے میں موجود اپنے سلیپر پہن لیے تھے۔''

''اس سے تم بری الذمہ نہیں ہو جاتے۔ تمہارے جوتوں کے نشانات جائے وقوع پر پائے گئے ہیں۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو؟''

''نہیں......''

''وہاں تازہ خون کے نشانات بھی پائے گئے ہیں اور کچھ ہی دیر میں اس کی رپورٹ بھی آنے والی ہے۔'' ایڈ نے کہا۔ ''اگر وہ میا یا اس کے گروپ کا خون ثابت ہوا تو تم خود کو مردہ سمجھنا۔''

جارج کا چہرہ ستا گیا۔ ڈاکٹر کورن ڈیک قصبے کے اسپتال کا سربراہ اور پیتھالوجسٹ تھا۔ وہ کچھ دیر بعد ہال میں داخل ہوا اور سیدھا ایڈ کے پاس گیا۔ اس نے لفافے میں بند رپورٹ اس کے سپرد کی اور خود آگے والی قطار میں اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ ایڈ نے لفافہ کھولا اور رپورٹ نکال کر پڑھی اور اعلان کیا۔ ''ڈاکٹر ڈیک کی رپورٹ کے مطابق جائے وقوع پر پائے جانے والے خون کے نمونے میا کے بلڈ گروپ سے میچ کر گئے ہیں۔''

''نہیں۔'' جارج چلایا۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا۔''

''اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ جارج ہی میا کے قتل یا گمشدگی میں ملوث ہے۔ عدالت اسے آخری موقع دیتی ہے کہ وہ اپنے جرم کا اقرار کر لے اور میا کے بارے میں بتا دے کہ اس کی لاش کہاں ہے۔ دوسری صورت میں تمہیں سزا سنادی جائے گی اور صبح سورج نکلتے ہی اس پر عمل درآمد ہوگا۔''

جارج دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ فریاد کر رہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں کیا ہے۔ اسے بنا کسی قصور کے سزا دی جا رہی ہے۔ مگر ایڈ اور اس کے ساتھ موجود لوگ پتھر چہروں کے ساتھ خاموش بیٹھے تھے۔ بالآخر جارج نے اپنے آنسو صاف کیے اور بولا۔ ''میرے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے۔''

''مجرم نے ایک طرح سے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے۔'' ایڈ نے کہا۔ ''اس کے باوجود اس کیس میں کچھ شواہد کم ہیں اور اس کی کو ہم عوامی رائے سے پورا کریں گے۔ یہاں موجود تمام افراد کمیونٹی کے معزز ممبران ہیں۔ انہوں نے کمیونٹی کی ترقی کے لیے ان تھک محنت کی ہے۔ یہ تمام ممبران رائے دیں کہ کیا جارج کو سزائے موت دی جائے یا اسے شک کا فائدہ دیتے ہوئے بری کر دیا جائے؟''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' ریگ نے اس بار ایرک سے پوچھا تو اس نے استہزائیہ انداز میں جواب دیا۔

''اسے جیوری کہتے ہیں اور یہ سسٹم امریکا میں رائج ہے۔''

''یہ اس کی ایک بھونڈی نقل ہے۔''

''مسٹر ریگ! تم اس قسم کی باتیں کر کے کمیونٹی میں نہیں رہ سکتے۔''

''میں اس پر لعنت بھیجتا ہوں جہاں اس جدید دور میں بھی زمانہ قدیم کے انداز کی عدالتیں کام کر رہی ہیں۔ آخر تم لوگوں اور ان میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔''

''یہ ہم نہیں جانتے مگر ہم صدیوں سے اسی طرح انصاف کرتے آئے ہیں۔'' ایرک نے جواب دیا۔ اس دوران میں رائے لینے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لوگوں سے کہا گیا کہ جو جارج کو رہا کرنے کے حق میں ہیں، وہ بائیں طرف آ جائیں اور جو اسے سزائے موت دینے کے حق میں ہیں وہ دائیں طرف آ جائیں۔ لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ کر دائیں بائیں جانے لگے۔ ریگ نے فوراً ہی محسوس کر لیا تھا کہ دائیں طرف جانے والوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ جبکہ بائیں طرف آنے والوں کی تعداد کم تھی اور ایک منٹ سے بھی پہلے صورتِ حال واضح ہو گئی تھی۔ بائیں طرف آنے والوں کی تعداد مشکل سے ایک درجن تھی جبکہ باقی افراد جو سو سے اوپر تھے وہ دائیں طرف جا چکے تھے۔ جب سب لوگ دائیں بائیں چلے گئے سوائے ریگ کے، کیونکہ شیرف نے اٹھتے ہوئے اسے بتا دیا تھا کہ وہ یہاں اجنبی ہے اس لیے ووٹ دینے کا حق نہیں رکھتا ہے۔

جارج سب دیکھ رہا تھا اور وہ برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔ ریگ اس کے لیے ہمدردی محسوس کر رہا تھا مگر وہ اس

کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ ایک خود ساختہ عدالت نے اسے سزائے موت سنادی تھی اور چالاکی سے کمیونٹی سے اس کی توثیق بھی کرالی تھی۔ ایڈ اور دوسرے ممبران نے بھی کھڑے ہو کر ووٹ دیا اور انہوں نے بھی سزائے موت کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اس کے بعد شیرف جارج کو اپنی تحویل میں لے کر چلا گیا۔ ایرک نے ریگ سے کہا کہ فی الحال اسے بری کر دیا گیا ہے لیکن اگر اس نے اپنا رویہ تبدیل نہیں کیا تو جلد اسے لیک ووڈ سے نکال دیا جائے گا۔ ریگ نے جو دیکھا تھا، اب اس کا خود یہاں رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر وہ اپنے منہ سے یہ بات نکال کر خود کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ ایرک نے ڈھکے چھپے انداز میں لیانا کا حوالہ بھی دیا کہ وہ اس سے بھی محروم ہوسکتا ہے۔ ریگ نے اس کے بارے میں بھی سوچ لیا تھا کہ اگر وہ اس کے ساتھ جانے کو تیار نہ ہوئی تو وہ اسے چھوڑ کر چلا جائے گا۔

ریگ واپس آیا اور ابھی اس نے سامنے والا دروازہ بند کیا تھا کہ عقبی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ جن حالات سے گزر کر آیا تھا، اب وہ یہاں کسی پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ دستک دینے والے کو باہر سے ہی بھگا دے گا مگر جب اس نے لیانا کی آواز سنی تو دروازہ کھول دیا۔ وہ تیزی سے اندر آئی اور عقب میں دروازہ بند کرلیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اس نے... بے تابی سے ریگ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''یہ تم نے کیا کیا...... تمہیں اس معاملے میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''لیانا! یہاں بہت غلط ہو رہا ہے اور مجھے یقین ہے تم میں سے بہت سے لوگ اسے غلط ہی سمجھتے ہوں مگر کمیونٹی کی وجہ سے خاموش رہتے ہوں، اس طرح تو خرابی بڑھتی جائے گی اور بالآخر ایک دن آئے گا جب تم لوگ کمیونٹی کے نام پر یرغمال بن جاؤ گے۔ ایسے حالات میں چپ رہنا بھی جرم ہے۔''

''تم جانتے نہیں ہو، تم نے کتنا خطرناک کام کیا ہے۔''

''میں جانتا ہوں اور میں نتائج کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار ہوں مگر میں غلط کو غلط ہی کہوں گا۔'' ریگ کو غصہ آ گیا۔ ''کیا کریں گے یہ لوگ؟ مجھے بھی مار دیں گے؟ اپنے نام نہاد انصاف کی بھینٹ چڑھا دیں گے؟''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا مگر یہ مجھے تم سے دور کر دیں گے۔ تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔''

''میں خود بھی اب یہاں نہیں رہنا چاہتا۔'' ریگ نے کہا اور لیانا کا چہرہ ہاتھوں میں بھر لیا۔ ''کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟''

''نہیں......''

''پلیز۔'' ریگ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر جھک گیا۔ اس بار لیانا کی مزاحمت جواب دے گئی۔ اس رات وہ لاؤنج میں ہی سو گئے۔ ریگ کی آنکھ کھلی تو صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ اس نے انگڑائی لی اور دوسرے صوفے پر سوتی لیانا کو دیکھا۔ اس نے ٹی وی کھولا مگر آواز بند کر دی تھی۔ اس نے ایک نیوز چینل لگایا۔ اس میں ایک ہائی وے حادثے کا منظر دکھا رہے تھے۔ ایک کار ٹائر برسٹ ہونے سے حادثے کا شکار ہوئی تھی مگر کار میں سوار افراد بچ گئے تھے۔ انہیں معمولی زخم آئے تھے اور پیرا میڈک انہیں طبی امداد دے رہے تھے۔ یہ حادثہ جنوبی ڈکوٹا میں پیش آیا تھا اور یہ جگہ یہاں سے ہزار میل سے زیادہ دور تھی۔ جب اسکرین پر اس جوڑے کو دکھایا گیا جو کار میں سوار تھا تو ریگ اچھل پڑا۔ پھر اس نے جھپٹ کر لیانا کو جھنجوڑا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔

''کک...... کیا ہوا؟''

ریگ نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا تو لیانا بھی اچھل پڑی کیونکہ اس پر دکھائی جانے والی لڑکی میا تھی۔ اس کے ساتھ موجود لڑکا اجنبی تھا مگر وہ سو فیصد میا تھی۔ نیوز کاسٹر نے اس کے نام کی تصدیق بھی کی تھی۔ ریگ نے جھپٹ کر اپنا موبائل اٹھایا اور شیرف کو کال کرنے لگا۔ اس نے خاصی دیر بعد کال ریسیو کی اور غنودہ لہجے میں بولا۔ ''ریگ! کیا بات ہے؟''

''میا زندہ ہے۔'' اس نے ہیجانی لہجے میں کہا۔ ''وہ جنوبی ڈکوٹا میں ایک کار حادثے میں زخمی ہوئی ہے اور اسے چینل فور پر دکھا رہے ہیں۔''

''میرے خدا......'' شیرف کے لہجے سے غنودگی غائب ہوگئی۔

''جارج کہاں ہے، لاک اپ میں؟''

''نہیں، وہ اسے لے گئے ہیں۔''

''میرے خدا! جان...... انہیں روکو۔ وہ ایک... بے گناہ کو قتل کرنے والے ہیں۔''

''اب مشکل ہے کیونکہ لیک ووڈ کے باہر موبائل سگنل نہیں ہیں اور وہ ہائی وے سے بھی نہیں گئے ہیں۔''

''لعنت ہو تم لوگوں پر۔'' ریگ نے کہا اور پک اپ کی چابیاں اٹھاتا ہوا باہر کی طرف لپکا۔ لیانا اس کے پیچھے

آئی۔ ریگ نے پک اپ اسٹارٹ کرتے ہوئے اسے بتایا۔ ''وہ اسے لے گئے ہیں۔''

''میرے خدا!''

پک اپ کا ٹھنڈا انجن اسٹارٹ ہونے میں دیر لگا رہا تھا اور ریگ پر ایک ایک لمحہ بھاری گزر رہا تھا۔ بالآخر انجن اسٹارٹ ہوا اور اس نے تیزی سے پک اپ آگے بڑھائی۔ سڑک سے اترنے کے بعد کچے راستے پر بہت زیادہ جھٹکے لگ رہے تھے مگر ریگ نے رفتار کم نہیں کی۔ معاملہ ایک انسانی جان کا تھا۔ لیانا نے سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی، اس کے باوجود وہ بری طرح ہل رہی تھی اور اس نے سیٹ کے ساتھ ڈیش بورڈ پر بھی ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ وہ ریگ سے رفتار کم کرنے کو بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ رفتار بتانے والی سوئی ساٹھ اور ستر کے درمیان میں تھی۔ دس منٹ بعد وہ اس جگہ کے پاس پہنچ گئے تو لیانا نے پک اپ رکواتے ہوئے کہا۔ ''یہاں روک لو...... ہم پیدل جلدی پہنچ سکتے ہیں۔''

وہ نیچے اتر آئے۔ لیانا آگے تھی اور وہ اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ ساتھ ہی دونوں بلند آواز سے شور بھی کر رہے تھے کہ وہ لوگ سن لیں اور اگر جارج کو قتل کرنے والے ہوں تو رک جائیں مگر جب وہ اس جگہ کے سامنے پہنچے تو انہیں دور سے ایک چوڑے پھل والا کلہاڑا ہوا میں بلند نظر آیا۔ سورج کی ابتدائی روشنی میں اس کا پھل چمک رہا تھا۔ لیانا اور ریگ بیک وقت چلائے مگر کلہاڑا نیچے جا چکا تھا۔ لیانا رکی اور پلٹ کر ریگ کے سینے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ ریگ اس کا شانہ تھپک رہا تھا۔ انہوں نے پوری کوشش کر لی تھی مگر ہونی کو نہیں روک سکے تھے۔ پھر وہ اسے لے کر سست قدموں سے اس طرف بڑھنے لگا۔ دائرہ نما جگہ پر آتے ہی اسے اسی بھورے کٹے ہوئے تنے کے آس پاس چار پانچ افراد دکھائی دیے۔ حیرت انگیز طور پر انہوں نے لیانا اور ریگ کی آوازیں بھی نہیں سنی تھیں اور جلد اس کی وجہ بھی جان گئے۔ جھیل کی طرف سے بہت تیز اور سیٹیوں جیسی آواز نکالتی ہوا آ رہی تھی اور اس کے شور میں انہیں ان دونوں کی آواز سنائی نہیں دی۔ ان میں ایرک بھی تھا، اس نے پلٹ کر دیکھا اور تیزی سے ان کی طرف آیا۔ لیانا اور ریگ ہجوم کے پار جارج کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایرک نے کہا۔

''لیانا...... ریگ! تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟''

''تمہیں یہ بتانے کہ تم نے ایک بے گناہ کو قتل کر دیا ہے۔'' ریگ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میا زندہ ہے اور ایک ہائی وے ٹریفک حادثے میں زخمی ہو گئی ہے۔ اسے ٹی وی پر دکھایا جا رہا ہے۔''

''میرے خدا!'' ایرک بولا۔ ''وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

''ہے...'' ریگ نے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کی۔ ''تمہارا مطلب ہے وہ زندہ ہے؟''

ایرک پلٹ کر ان کے ساتھ ہجوم کی طرف آیا۔ جارج کٹے ہوئے تنے کے ساتھ بندھا بیٹھا تھا مگر وہ زندہ اور سلامت تھا۔ کلہاڑا اس سے کچھ دور زمین میں پیوست تھا مگر زندہ بچ جانے کے باوجود اس کا چہرہ زرد تھا۔ اس نے ایرک کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''کک...... کیا ہوا؟''

''انصاف۔'' ایرک نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم نے جس جرم سے انکار کیا، اس میں تم بے گناہ ثابت ہو گئے لیکن جس جرم کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا، اس کا تم نے خود اقرار کر لیا۔''

ریگ اور لیانا حیران ہوئے۔ ''کس جرم کا اقرار؟''

''شیما کے قتل کا اور اسے جنگل میں دفن کرنے کا۔'' ایرک نے بتایا۔ ''اس نے جگہ بھی بتا دی ہے۔''

ریگ اور لیانا اچھل پڑے تھے۔ ریگ نے پوچھا۔ ''اب کیا ہوگا؟''

''اب اس پر شیما کے قتل کا مقدمہ چلے گا اور کل صبح یہ یہیں آئے گا۔''

☆☆☆

لیانا، ریگ کے ساتھ ورکشاپ میں کام کروا رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی کہ ریگ نے یہاں سے جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ مگر ریگ نے واضح طور پر کہا تھا کہ وہ کیمونٹی کے نظام انصاف سے مطمئن نہیں ہے اور وہ اس لیے بھی رکا ہے تاکہ اس نظام کو بدل سکے۔ وہ لوگوں کو قائل کر سکے کہ حکومت کا نظام انصاف ہی بہتر ہوتا ہے کیونکہ اسی نظام انصاف کی بدولت امریکا آج ایک ترقی یافتہ اور خوشحال ملک ہے۔ لیانا اس سے متفق تھی اور وہ جن لوگوں سے بات کرتا تھا، ان میں سے بھی بہت سے اس سے متفق تھے۔ اسے امید تھی کہ جلد زیادہ لوگ اس سے متفق ہو جائیں گے تو وہ اس نظام کو تبدیل کرا سکے گا۔ ایک ہفتے بعد اس کی اور لیانا کی شادی تھی۔ اسے جارج کا افسوس تھا مگر اس کی موت کا افسوس نہیں تھا کیونکہ اس نے سچ مچ شیما کو قتل کیا تھا اور اس کی لاش چھپا دی تھی۔ میا کو یقین تھا کہ وہی اس کی بہن کا قاتل ہے اس لیے اس نے فرار سے پہلے سازش کی اور جارج کو پھنسا گئی۔

★



شیش محل

اسماء قادری

قسط:4

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربِ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ وخم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کر دیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اندرونِ شہر کے پردوں میں خوف رنگ بدلتی وارداتِ قلبی کی عکاس دلچسپ داستان



ڈاکٹر کا ہاتھ دلاسا دینے کے لیے اس کے شانے پر رکھا تھا اور اس کا دل اندیشوں سے گھبرا بری طرح لرز رہا تھا۔

''ابھی بتاؤ ڈاکٹر صاحب کہ اپنا ہیرو کیسا ہے؟'' قلبی کیفیت کو حتی الامکان چہرے سے ظاہر کیے بغیر اس نے دھیمے مگر مضبوط لہجے میں پوچھا۔ یہ مضبوطی کا اظہار اس کی مجبوری بھی تھی اور ذمے داری بھی۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا جو اپنے جذبات کا من وعن اظہار کرنے کی آزادی رکھتا۔ وہ دادا تھا دادا...... جس کی اصل متاع ہی وہ جرأت اور حوصلہ مندی تھی جس کا اسے ہمیشہ سے مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔ یہ جرأت وحوصلہ مندی ایک طرف اسے اس کی گدی پر جمائے رکھنے کی ضمانت تھی تو دوسری طرف ان سب کا سہارا بھی جو اس سے عقیدت کی حد تک محبت کرتے تھے اور جنہیں اس کا وجود ہر مصیبت میں کسی شجر سایہ دار کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ فاروق کے کمرے کے سامنے کھڑے اتری شکلوں والے وجے اور جانی اس سمے بھی اس کی طرف ہی دیکھ رہے ہیں، وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لیے اپنے چہرے پر حوصلہ مندی کی نقاب تانے ڈاکٹر سے مخاطب تھا۔

''وہ......'' ڈاکٹر اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پل بھر کے لیے کسی سوچ میں گم ہو گیا اور پھر بولا۔ ''آپ میرے ساتھ میرے روم میں آجائیں۔ میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے جیسا آپ بولو۔'' ربن نے فوراً ہامی بھر لی لیکن اس کی تشویش میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اگر فاروق کی حالت تسلی بخش ہوتی تو ڈاکٹر اس سے ایسا مطالبہ کرنے کے بجائے تسلی کا ایک جملہ کہہ کر اپنی جان چھڑا سکتا تھا لیکن وہ اسے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں چلنے کی دعوت دے رہا تھا تو اس کے پیچھے کوئی تو خاص بات تھی۔ جانی اور وجے نے بھی یقیناً ڈاکٹر کی اس بات کا ایسا ہی کوئی مفہوم اخذ کیا تھا جب ہی ان کے چہروں پر بھی تشویش کے سائے مزید گہرے ہو گئے تھے۔ ربن نے ڈاکٹر کے پیچھے اس کے کمرے تک جانے سے قبل باری باری دونوں کے شانے تھپکے اور مضبوطی سے قدم جماتا آگے بڑھ گیا۔

''بیٹھیے۔'' اپنے کمرے میں پہنچ کر ڈاکٹر اپنی کرسی سنبھال چکا تو اس نے ربن کو بھی پیشکش کی۔ وہ خاموشی سے اس کے سامنے پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

''کیا گڑبڑ ہے ڈاکٹر صاحب؟ کہیں کوئی خطرے کی تو بات نہیں؟'' اسے اپنے سامنے بٹھا کر بھی ڈاکٹر نے فوراً کچھ نہیں کہا تو ربن اس سے سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''میں واضح طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہ ظاہر زخم ٹھیک ہو رہا ہے۔ سوجن بھی پہلے کے مقابلے میں کافی کم ہو گئی ہے اس کے باوجود سر میں اتنے شدید درد کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ ایک اندیشہ یہ ہے کہ ظاہری طور پر جتنی چوٹ نظر آرہی ہے اندر اس سے کہیں زیادہ نقصان ہوا ہے لیکن میری اپنی ذاتی رائے ہے کہ......'' ڈاکٹر نے ذرا سا توقف کیا اور اپنے سامنے رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر اس میں سے دو گھونٹ پانی پیا۔ دو گھونٹ پانی کا یہ وقفہ بھی ربن کے لیے بڑا جاں گسل تھا۔

''آپ کیا رائے دیتے ہو؟'' وہ بیتابی سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی بیتابی پر ڈاکٹر ذرا سا مسکرایا اور پوچھنے لگا۔

''کیا رشتہ ہے آپ کا پیشنٹ سے؟ لگتا ہے آپ اس سے بہت محبت کرتے ہیں؟''

''بھائی، بیٹا، دوست سب کچھ ہے وہ اپن کا...... پر ابھی آپ اپن کو وہ بات بولو جس کے لیے ادھر بلایا تھا۔''

''ہاں، میں یہ کہہ رہا تھا کہ......'' ڈاکٹر نے پانی کا ایک گھونٹ مزید بھرنے کے بعد گلاس واپس رکھا۔

''مجھے ایسا لگتا ہے کہ چوٹ کے علاوہ بھی مسٹر فاروق کی تکلیف کے پیچھے کوئی کارن ہے۔ وہ مجھے بہت زیادہ ذہنی دباؤ میں دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں خاصی زخمی حالت میں یہاں لایا گیا ہے لیکن جب سے وہ یہاں آئے ہیں، ان کا ایک ہی اصرار ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں اس لیے انہیں یہاں سے جانے کی اجازت دے دی جائے۔ کیا آپ اس ضد کا بیک گراؤنڈ جانتے ہیں؟ کیونکہ مجھے یہی فیل ہوتا ہے کہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہنا کسی بھی کارن ان کے اعصاب کے لیے بوجھ بن رہا ہے اور وہ کہیں جانے کے لیے سخت بے چین ہیں۔'' ڈاکٹر نے بالآخر اسے اپنے تجزیے سے آگاہ کر دیا۔

''ایسا کدھری کو جانا ہے اسے؟'' ڈاکٹر کی بات سن کر ربن بڑبڑایا۔ اتنا تو اسے بھی معلوم تھا کہ فاروق سمیت اڈے کے کسی بھی آدمی کے لیے اسپتال جیسی کسی جگہ پر رہنا ذرا مشکل کام تھا کیونکہ ان کی آزاد طبیعت اسپتال کے نظم و ضبط والے ماحول سے میل نہیں کھاتی تھی۔ پچھلے دنوں جب بجو کے آدمیوں سے مقابلے میں کمو شدید زخمی ہو گیا تھا تو ڈاکٹر کے اصرار کے باوجود اس نے بھی اسپتال میں داخل ہونا قبول نہیں کیا اور اس کا سارا علاج معالجہ اڈے پر رہ کر

ہی ہوتا رہا تھا لیکن فاروق کا کیس ذرا مختلف تھا۔ سر جیسی حساس جگہ پر لگنے والی چوٹ کی وجہ سے ربن نے خود بھی یہی مناسب سمجھا تھا کہ اسے اسپتال میں داخل رکھ کر ڈاکٹروں کی پوری تسلی حاصل کرلی جائے۔ دوسرے جولیٹ کے گھر کے حالات کی وجہ سے بھی وہ فاروق کو اڈے سے دور رکھنا چاہتا تھا لیکن معلوم نہیں کیوں وہ خود وہاں سے نکلنے کے لیے اس قدر بے چین تھا۔

''یعنی آپ بھی نہیں جانتے کہ وہ کون سی بات ہے جو آپ کے مریض کے لیے ذہنی دباؤ کا سبب بن رہی ہے۔'' اس کی کیفیت سے ڈاکٹر نے اندازہ لگالیا کہ وہ فاروق کے اضطراب کی وجہ نہیں جانتا۔ اس کے پاس ڈاکٹر کے اندازے کی تصدیق کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

''اپن کوشش کرتا ہے اس سے معلوم کرنے کی۔ آپ اپنا بولو کہ آپ کے حساب سے اس کی حالت کیسی ہے؟'' فاروق کی پریشانی کی طرف سے ناواقفیت کا اظہار کرنے کے بعد اس نے ڈاکٹر کی رائے جاننا چاہی۔

''میں نے تمہیں بتایا نا کہ بہ ظاہر پروگریس بہت اچھی ہے لیکن کوئی بھی فائنل بات تو ڈاکٹر فورڈ ہی بتا سکتے ہیں۔ آج شام میں وہ راؤنڈ پر آئیں گے تو رپورٹس دیکھنے کے بعد ہی کوئی رائے دیں گے لیکن میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ اس لڑکے کی پریشانی اور ذہنی دباؤ کا ریزن معلوم کرنا ضروری ہے۔ سر کی چوٹ کے ساتھ اتنا ذہنی دباؤ خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔'' ڈاکٹر نے ایک بار پھر اسی پہلی والی بات پر اصرار کیا۔

''اپن دیکھتا ہے اس مسئلے کو۔'' ربن اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

''تھوڑا احتیاط سے۔ ابھی تو اسے پین کلر دیا ہے جس کے اثر سے دو ڈھائی گھنٹے تک وہ سوتا رہے گا۔ سو کر اٹھنے کے بعد بھی اس سے بہت سوچ سمجھ کے اور سنبھل کر بات کرنا۔ کہیں زیادہ اصرار بھی اس کے اعصاب کے لیے بوجھ نہ بن جائے۔'' ڈاکٹر نے اسے تنبیہ کی تو وہ سر کو تفہیمی جنبش دیتا ہوا باہر نکل گیا۔ وجے اور جانی اس کے منتظر تھے۔

''کیا بولا ڈاکٹر نے دادا؟'' اسے دیکھتے ہی وہ اس کی طرف لپکے۔

''بولتا ہے سب ٹھیک ہے، پر اصل بات شام کو گورا ڈاکٹر چیک اپ کرنے کے بعد بولیں گا۔'' اس نے انہیں مختصر جواب دیا پھر موضوعِ گفتگو تبدیل کرتے ہوئے بولا۔

''تو ادھر رشید کی جگہ لے لے جانی۔ ادھر اپن موجود ہے۔ وجے اور رشید دونوں اڈے پر واپس جائیں گے اور ادھر سے دوسرے آدمیوں کو بھیج دیں گے۔ رات سے دونوں ادھر ہیں، تھک گئے ہوں گے۔''

''اپن ٹھیک ہے دادا...... کوئی تھکن وکن نہیں ہوا ہے اپن کو۔'' وجے کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ واپس نہیں جانا چاہتا۔

''ابھی اپن نے جیسا بولا ویسا کرنا مانگتا ہے۔'' ربن نے سخت لہجہ اختیار کر کے اسے مزید اصرار سے روک دیا۔ بادل ناخواستہ اسے وہاں سے روانہ ہونا پڑا۔ اب ربن نے کمرے کا رخ کیا اور دروازے کو دھکیل کر بے آواز کھولا۔ اندر وہی رات والی نرس موجود تھی۔ اسے دروازے پر پاکر لپک کر اس کی طرف آئی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموشی سے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ دنیا کو اپنے اشارے پر چلانے والے ربن کو اس کم عمر سی لڑکی کی ہدایت پر عمل کرنا پڑا۔

''پیشنٹ سویا ہوا ہے اور اسے سکون کی بہت ضرورت ہے۔ اس لیے ہم نے یہاں اٹینڈنٹس کو الاؤ نہیں کیا ہے۔'' رات کے مقابلے میں اس نے خاصے نرم لہجے میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''اپن کوئی آواز نہیں نکالے گا بس اسے ایک نظر دیکھنے کو مانگتا ہے۔'' ربن نے عاجزی سے درخواست کی تو وہ ذرا نرم پڑ گئی۔

''اوکے لیکن صرف دو منٹ کے لیے۔'' اجازت دیتے ہوئے وہ تنبیہ کرنا نہیں بھولی تھی۔ ربن نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دبے قدموں کمرے میں داخل ہوگیا۔ سفید براق بستر پر فاروق دواؤں کے زیرِ اثر گہری نیند سویا ہوا تھا لیکن حالتِ نیند میں بھی اس کے چہرے پر اضطرابی سی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ نہ جانے وہ کون سی بات تھی جس نے اسے اس قدر بے چین کر رکھا تھا۔ ربن خود کو ملی مہلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نظروں سے اس کے ایک ایک نقش کو ٹٹولتا رہا۔ نرس نے آکر اسے احساس دلایا تو چونک کر باہر نکل آیا۔ اسے اندازہ تھا کہ دو منٹ کی اجازت تقریباً دس منٹ پر محیط ہوگئی تھی۔ شاید اس کی بے پناہ محویت کو دیکھتے ہوئے نرس اتنی رعایت پر مجبور ہوگئی تھی کہ نظم و ضبط کی پابند ہونے کے باوجود بہر حال وہ بھی تھی تو انسان ہی جسے انسانی جذبات کا ادراک تھا۔ اسی ادراک نے اسے ربن کو تسلی دینے پر مجبور کیا۔

''آپ فکرمند نہ ہوں۔ آپ کا پیشنٹ ٹھیک ہو

جائے گا۔ ڈاکٹر فورڈ دماغ کے بہت ماہر ڈاکٹر ہیں۔ ان کے علاج سے بہت سیریس مریض بھی صحت یاب ہوتے دیکھے ہیں میں نے۔ مسٹر فاروق تو پھر بہت اچھی حالت میں ہیں۔'' اس پل اس کے چہرے پر موجود سختی کا نقاب اتر گیا تھا اور وہ بڑے نرم تاثرات کے ساتھ ربن کو حوصلہ دے رہی تھی۔

''ٹھیک تو اس کو ہونا ہی ہوئیں گا۔ یہ کوئی اکیلا تھوڑا ہے اس سنسار میں۔ کتنے دلوں کے تار ہیں جو اس کی سانسوں کے ساتھ بندھے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی ایک ایک دھڑکن کے ساتھ اس کے لیے دعا کر رہا ہے۔ اپن کو ڈاکٹر فورڈ کی مہارت سے زیادہ ان دعاؤں پر بھروسا ہے۔'' اس نے پورے یقین کے ساتھ نرس کی بات کا جواب دیا اور باہر نکل کر بیٹھ گیا۔ اب وہ ڈاکٹر پرکاش سے ہونے والی گفتگو پر غور کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ فاروق بے پناہ ذہنی دباؤ کا شکار نظر آتا ہے اور وہ تنہا بیٹھا اس ذہنی دباؤ کی وجہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جولیٹ اور اس کے خاندان کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا، فاروق کی عدم موجودگی میں پیش آیا تھا، اس لیے اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ یہ واقعات اس کے ذہنی دباؤ کا سبب بنے ہوں۔ لڑائی بھڑائی اور پولیس سے آنکھ مچولی بھی ان کے معمولات میں شامل تھی اور معمول سے ہٹ کر صرف اتنا ہوا تھا کہ فاروق نے زندگی میں پہلی بار کسی بالا خانے پر قدم رکھا تھا۔ چاند بانو سے ہونے والی ملاقات سے یہ بھی واضح ہو گیا تھا کہ اس کے اس اقدام کے پیچھے اس کی ذاتی خواہش سے زیادہ چاند بانو کے اصرار کا دخل تھا لیکن شاید اتنی بات بھی فاروق کے اعصاب کے لیے بوجھ بن گئی تھی۔ وہ جو ہمیشہ اس گندگی سے دور رہا تھا، یہ سوچ کر دل میں شرمندہ ہو گا ... کہ اس کو چھڑانے کے لیے تھانے تک پہنچ جانے والا ربن یقیناً اس کے چوری چھپے زمرد بائی کے کوٹھے پر جانے سے واقف ہو چکا ہو گا اور جانے اس کے بارے میں کس انداز سے سوچ رہا ہو گا۔ ربن جوں جوں اس نکتے پر سوچتا گیا، اسے یقین ہوتا گیا کہ فاروق کے ذہنی دباؤ کے پیچھے یہی وجہ ہو گی۔ کسی شیشہ محل کی طرح سنبھال کر رکھے گئے کردار پر شک کے بادل منڈلاتے دیکھ کر وہ اپنی بے حد حساس طبیعت کی وجہ سے بے پناہ بوجھل ہو گیا ہو گا اور یہ بوجھ اب اس کی صحت پر اثر ڈال رہا تھا۔

''پگلا۔'' حتمی نتیجے پر پہنچنے کے بعد ربن محبت سے بڑبڑایا اور فیصلہ کیا کہ اب فاروق سے گفتگو ہونے پر اسے اس حوالے سے مطمئن کرنے کی کوشش کرے گا۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ فاروق کے اسپتال میں قیام کا دورانیہ بڑھانا ضروری ہے کیونکہ اسے جولیٹ کے حالات سے بے خبر رکھنے کی یہی واحد تدبیر تھی۔ سوچ بچار کے اس مرحلے سے گزر کر وہ ایک بار پھر فاروق کے کمرے کا چکر لگا آیا۔ وہ ہنوز حالتِ نیند میں تھا۔ وہ وہاں سے پلٹا تو رامو اسپتال پہنچ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور بندہ بھی موجود تھا۔

''کیسا ہے اپنا شہزادہ؟ وجے نے اپن کو بولا کہ اس کا طبیعت خراب ہو گیا تھا تو اپن اڈے پر نہ رک سکا۔'' فاروق کی طبیعت کے بارے میں دریافت کرتے ہوئے اس نے بنا بلاوے کے اپنے وہاں آنے کی وجہ بیان کی۔

''ٹھیک ہی ہے، بس دعا کرتا رہ اس کے لیے۔'' ربن نے اسے جواب دیا اور پھر چونک کر پوچھنے لگا۔

''کہیں اس وجے حرام خور نے سارے اڈے پر تو یہ خبر نہیں پھونک دی؟ وہ سالے تو سن کر دیوانے ہو جائیں گے اور وہ چہ یا گولو تو بالکل ہی لوٹ پوٹ ہو جائے گا۔''

''نہیں دادا، اس نے صرف اپن کو بتایا ہے اور اپن نے اسے سختی سے بول دیا تھا کہ کسی اور کے کان تک یہ بات نہیں پہنچنی چاہیے۔'' رامو نے اس کی تشویش دور کی اور ایک بار پھر فاروق کی طبیعت کے بارے میں استفسار کرنے لگا۔ جواب میں ربن نے اسے ڈاکٹر پرکاش سے ہونے والی پوری گفتگو مع اپنے تجزیے کے سنا ڈالی۔ ایک رامو ہی تھا جس سے وہ کھل کر ہر بات کر لیا کرتا تھا اور وہ سب بھی سمجھ جاتا تھا جو وہ اپنی زبان سے نہ کہتا تھا۔

''تم ٹھیک سوچ رہے ہو دادا، وہ پگلا ایسا ہی نازک دل کا ہے۔ ویسے تو اس میں دس بندوں کو ایک ساتھ پھڑکا دینے کا حوصلہ ہے لیکن ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو من سے لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔'' رامو نے اس کے خیال کی تائید کی۔

''تو آہی گیا ہے رامو تو ایسا کر کہ آج مجو کا معاملہ بھی فائنل کرنے کا بندوبست کر دے۔ اپن کے سینے میں جو آگ لگی ہے تا اس کو بجھانے کو اس...... کا حساب کرنا ضروری ہے۔ اپن اب اسے اور ڈھیل دینے کو نہیں مانگتا۔'' مجو کے نام کی جگہ ایک بڑی سی گالی ٹانکتے ہوئے اس نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔

''اپن کرنے کو دو گھنٹے میں سارا تماشا سجانے کا انتظام کر دے گا لیکن تم سوچ لو کہ تمہارے لیے مشکل نہ ہو جائے۔ دل دماغ تو سب ادھر اٹکا ہوا ہے، دو راتوں سے

ڈھنگ کی نیند بھی نہیں لی، ایسے میں کہیں چال الٹی نہ پڑ جائے۔'' رامو نے اسے اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کی۔

''اپنا چاقو کبھی اپنے کو دھوکا نہیں دیا رامو...... یہ اپن کا پکا، سچا یار ہے۔'' ربن نے جیب میں پڑے چاقو کو اوپر سے ہی تھپتھپایا اور بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اپن کے چاقو کو دل، دماغ اور جسم کے آرام سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ اپن کے اندر کی آگ کی کتنی جازتی کے حساب سے چلتا ہے اور تجھے خبر ہے کہ ابھی اپن کے اندر کس زوروں کی آگ لگی ہوئی ہے۔ اپنے اور بجو کے درمیان اصل فیصلہ تو یہ آگ ہی کرے گی۔ بجو نے بہت بڑی غلطی کی یہ آگ بھڑکا کر۔ اپنے شہزادے پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اسے سو بار سوچنے کا تھا۔ نہیں سوچا تو اب اس کا بھگتان بھی بھگتے گا۔''

اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ رامو نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑتی محسوس کی۔ وہ برسوں سے ربن کے ساتھ تھا اور جانتا تھا کہ وہ بہت ٹھنڈے دماغ کا آدمی ہے جسے بڑکیں مارنے کی عادت نہیں تھی لیکن اگر بجو کے معاملے میں اس کا لہجہ سنگین تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس کا انجام واقعی بہت برا ہونے والا ہے۔

''ٹھیک ہے دادا تو پھر آج کی رات تماشے کے لیے محفل سج جائے گی۔'' اس بار اس نے بغیر کوئی بحث کیے ربن کو یقین دہانی کروائی اور فاروق کو ایک نظر دیکھنے کے بعد روانہ ہو گیا۔ ربن نے بھی جولیٹ کی طرف ایک چکر لگا لینا مناسب سمجھا۔ وہ صبح کے مقابلے میں خاصی بہتر حالت میں تھی اور خود کو ذہنی طور پر سنبھال لیا تھا۔ ربن نے فیصلہ کر لیا کہ اگر ڈاکٹر سریتا اسے چھٹی دیتی ہے تو وہ اس معاملے میں کوئی دخل نہیں دے گا۔ اسپتال سے گھر جانے کی صورت میں اسے جوزفین کی موت کا جھٹکا تو ضرور برداشت کرنا پڑتا لیکن یہ ناگزیر تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا لیکن اصل اہمیت اس بات کی تھی کہ باپ بیٹی ایک دوسرے کے گلے لگ کر اپنے غم بانٹ لیں۔ اوروں کی غم گساری اور خلوص اپنی جگہ لیکن جو دو افراد اصل متاثرین تھے، وہ جس طرح ایک دوسرے کو سنبھال سکتے تھے وہ کسی اور کے لیے ممکن نہیں تھا۔ جولیٹ سے ملاقات کرنے کے بعد وہ واپس آیا تو فاروق جاگ چکا تھا اور نرس اسے سوپ پلا رہی تھی۔ اس بار اس نے بنا کسی حجت کے ربن کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔

''کیسا ہے رے۔ اب تو سر نہیں دکھتا؟'' ربن نے اس کے چہرے کو نظروں سے ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، اب بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے جھکی نظروں کے ساتھ جواب دیا تو ربن اپنے اندازے کے بارے میں اور بھی پُریقین ہو گیا۔

''آپ کا پیشنٹ بہت ہمت والا ہے سر اور ایسا آدمی آسانی سے اپنی بیماری سے جیت جاتا ہے۔ ابھی بھی دیکھیں انہوں نے کتنی تیزی سے خود کو سنبھال لیا ہے ورنہ دوپہر میں ان کو جتنا شدید درد ہوا تھا، ہم سب ہی تھوڑا گھبرا گئے تھے۔'' نرس نے ان کی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے ربن کو بتایا۔

''یہ میری ہمت سے زیادہ آپ جیسے خیال رکھنے والوں کا کمال ہے سسٹر کیتھرائن کہ اب میں خود کو بالکل ٹھیک محسوس کر رہا ہوں۔'' فاروق نے مسکرا کر نرس سے کہا تو اس کے خوب صورت چہرے پر بیک وقت مسکراہٹ اور سرخی دوڑ گئی پھر وہ متانت سے بولی۔

''تھینک یو سر! ہم تو صرف اپنی ڈیوٹی ایمان داری سے پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں باقی پیشنٹ پر ہوتا ہے کہ وہ سیٹسفائی ہو پا نہیں۔ کسی کو خوش کرنے کی خاطر ہم اپنی لمٹ سے باہر تو جا نہیں سکتے۔'' بولتے بولتے وہ خالی ہو جانے والا سوپ کا پیالہ اور بیڈ پر مریض کے لیے لگائی جانے والی مخصوص میز بھی وہاں سے ہٹاتی جا رہی تھی۔ ربن اور فاروق دونوں نے بیک وقت اس کی بات کی معنویت کو محسوس کیا اور جیسے یک دم ہی ان پر اس لڑکی کی شخصیت کھل گئی۔ وہ خوب صورت اور کم عمر تھی اور اسے یہاں ہر طرح کے مریضوں سے نمٹنا پڑتا تھا۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہوں گے جو اس سے ان خدمات سے ہٹ کر خدمات کے متقاضی ہوں جن کی اسے اسپتال سے تنخواہ ملتی تھی۔ اونچی حیثیت رکھنے والے مریضوں یا ان کے تیمارداروں کی طرف سے اسے ان زائد خدمات کے لیے الگ سے معاوضے کی پیشکش بھی ہوتی ہوگی لیکن ظاہر ہے وہ کوئی بکاؤ مال نہیں تھی جو ایسی پیشکشوں کو قبول کرتی پھرتی، سو ایسے لوگوں سے نمٹنے کے لیے ہی اس نے اپنے خوب صورت چہرے پر سختی کا نقاب چڑھا لیا تھا اور جان بوجھ کر اکھڑ لہجے میں بات کرتی تھی۔

''انسان کا کردار کھرا ہو تو اسے کسی کے سامنے اس کی صفائی دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کردار تو خود بخود ہی سامنے آ جانے والی چیز ہے۔'' وہ سب سمیٹنے کے بعد باہر نکل گئی تو ربن نے بہ ظاہر سرسری لہجے میں تبصرہ کیا لیکن فاروق کھٹک گیا۔ اسے معلوم تھا کہ دادا کو ایسے ہی کوئی بات کرنے کی عادت نہیں ہے اور اس کی عام سی بات کے پیچھے بھی عموماً کوئی خاص وجہ ہوتی ہے۔

''ٹھیک کہا دادا! اسسٹر کیتھرائن مجھے بھی بہت اچھے کردار کی مالک لگی۔ کسی کو زیادہ منہ نہیں لگاتی لیکن اپنی ڈیوٹی پوری ایمان داری اور محنت سے انجام دیتی ہے۔'' وہ خاموش تو نہیں رہ سکتا تھا اس لیے خود بھی ربن کی تائید کرنے لگا۔

''یہ لڑکی جسے اپن کو دیکھے صرف دو دن ہوئے ہیں، اس کے کردار کے بارے میں اپنی رائے تیرے کو بالکل ٹھیک لگتی ہے پھر یہ بتا کہ جسے اپن آٹھ سال سے اپنے سینے سے لگا کر رکھا ہے اس کے کردار پر کیسے شک کرسکتا ہے؟ اپن اتنی پرکھ والی آنکھ رکھ کر کیسے کچھ الٹا سیدھا سوچ سکتا ہے؟''

ربن کا لہجہ خاصا تیکھا تھا جس نے فاروق کو گڑبڑا کر رکھ دیا اور وہ ہڑبڑا کر فقط اتنا ہی کہہ سکا۔ ''کیا بول رہے ہو دادا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔''

''تیری سمجھ کام کرتی تو دماغ پر اتنا زور ڈال کر بیٹھتا ہی کیوں؟ سچ بتا تیرے کو یہ فکر نہیں ہے کیا کہ اپن تیرے چاند بانو سے ملاقات کے لیے زمرد بائی کے کوٹھے پر جانے کا بن کر جانے تیرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔'' اس نے اپنے لہجے کا تیکھاپن کم کیے بغیر سوال کیا تو فاروق نے اپنا سر جھکالیا۔

''اب کیوں ایسے منڈی ڈال کر بیٹھ گیا ہے۔ بتا کیا تجھے لگتا ہے کہ دادا تیرے کردار پر شک کرسکتا ہے؟'' ربن اسے بخشنے کو قطعی تیار نہیں تھا۔

''معاف کردو دادا، میں نے واقعی غلط سوچا لیکن اس غلطی کے پیچھے تمہاری پرکھ پر شک سے زیادہ اپنے اندر ہی پلتے اوہام اور سوالات کا ہاتھ ہے۔ میں نے سوچا کہ جب تمہیں میرے چوری سے زمرد بائی کے بالا خانے پر جانے کی خبر ہوئی ہوگی تو تم نے سوچا ہوگا کہ یہ فاروق کیسا بودا آدمی ہے جو ایک طرف تو کسی کے عشق کا دم بھرتا ہے اور دوسری طرف شہر کی حسین ترین طوائف کے پیچھے دوڑ آگیا ہے۔ میں تمہیں بتا کر، تمہاری اجازت سے گیا ہوتا تو ایسی شرمندگی میرے حصے میں نہ آتی۔ بغیر بتائے جا کر میں نے ایک طرف خود اپنی ذات کو مشکوک بنایا تو دوسری طرف تمہارے بھروسے کی بھی انسلٹ کی۔ اپنی اس غلطی پر میں جتنا نادم ہوں اتنا کم ہے۔'' فاروق نے بہت آسانی سے اس کے سامنے اعتراف کرلیا۔ یہ اعتراف کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے تھے۔

''جانے دے رے۔ کاہے کو بے کار باتوں کی ٹینشن لے کر الٹی سیدھی سوچتا ہے۔ اپن نے تیرے بارے میں کچھ ایسا ویسا نہیں سوچا۔ اپن جانتا ہے کہ تیرے قدم ادھری کو اٹھے تھے تو اس کے پیچھے چاند بانو کا حسن نہیں تھا۔ تو عورت کا حسن دیکھ کر رال ٹپکانے والوں میں سے ہے ہی نہیں۔ یہ بات اپن گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے کو سمجھ نہیں آئے گی تو پھر کسے آئے گی، پر تو ایسا کر اب اس بات کو جانے دے اور اپن کو وہ باقی کی بات بھی بتا جو سینے میں تیرے دل کو گھونٹ رہی ہے۔ اپن کو یقین ہے کہ اس قصے سے ہٹ کر بھی کوئی بات ہے جو تیرے لیے بوجھ بنی ہوئی ہے۔'' ربن بہت زیرک آدمی تھا۔ فاروق سے گفتگو کرتے ہوئے ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ اس کے اعصابی بوجھ کے پیچھے کوئی اور وجہ بھی موجود ہے اور وہ کوئی ایسی وجہ ہے جسے وہ خود نہیں بوجھ سکتا چنانچہ دوٹوک لفظوں میں اس سے سوال کر ڈالا۔ اس کے سوال پر پہلے تو حیرت سے فاروق کا منہ کھلا پھر اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپالیا۔

''ایسا کیا ہے شہزادے جو تو اپن کو بولنے سے بھی جھجکتا ہے۔ ماں قسم تو بھلے سے خون کسی کا بھی ہو لیکن اپنے خون میں ایسے شامل ہوگیا ہے کہ تجھے الگ کردوں تو یہ سالا خون رگوں میں بہنے سے ہی انکاری ہوجائے گا۔ چل اب بول دے کہ کیا بات ہے؟'' ربن اس کے ساتھ ہی بستر پر جا بیٹھا اور کسی بچے کی طرح پچکارتے ہوئے اصرار کرنے لگا۔ وہ اتنا اصرار کبھی نہ کرتا اگر جو اس بات کا یقین نہ ہوجاتا کہ چوٹ سے زیادہ اعصابی دباؤ نے اسے نڈھال کر رکھا ہے۔ یہ اعصابی دباؤ دور کرنے کی ایک ہی تدبیر تھی کہ اس کے اندر کی بات کسی طور باہر نکل آئے۔

''کیا بولوں دادا، تم سنو گے تو بولو گے کہ یہ فاروق بھی پاگل ہوگیا ہے اور بیکار کے وہم پال کر اپنا اور ہمارا دماغ خراب کرتا ہے۔'' اس نے اپنے چہرے پر سے ہاتھ ہٹالیے اور گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

''اپن کیا سوچتا ہے اور کیا بولتا ہے، اس کو چھوڑ اور وہ بول جو تیرے دل میں ہے۔'' ربن نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے حوصلہ دیا تو وہ چند لمحوں کے لیے خود کو مجتمع کرتا رہا پھر دھیمی آواز میں بولنا شروع ہوا۔

''جب میں وہاں تھانے میں زخمی حالت میں الٹا لٹکا ہوا تھا تو میں نے ایک بہت عجیب خواب دیکھا تھا۔'' وہ آہستہ آہستہ ربن کو اپنے خواب کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا کہ کیسے اس نے جولیٹ کو ایک بے حد مخدوش راستے پر برے حالوں میں چلتے اور پھر غائب ہوتے دیکھا تھا۔ اس کا خواب سن لینے کے بعد ربن فوری طور پر کچھ نہیں بول سکا۔

''مجھے معلوم ہے دادا کہ خواب تو ایسے ہی ہوتے

ہیں۔ خواب میں آدمی کچھ بھی دیکھ سکتا ہے لیکن میں پھر بھی خود کو اس خواب کے اثر سے نکال نہیں پا رہا۔ کوئی ہے جو میرے دل کو مٹھیوں میں بھر کر بھینچے جا رہا ہے اور مجھے کسی پل سکون نہیں ملتا۔ ایسا شاید اس لیے بھی ہے کہ میں نے پچھلے دنوں جولیٹ کے چہرے پر پریشانی کے رنگ دیکھے تھے۔ صاف لگتا تھا کہ کوئی مسئلہ ہے جس میں وہ الجھی ہوئی ہے۔ کوشش کے باوجود میں اس سے اس کی پریشانی کی وجہ نہیں جان سکا اور شاید اسی لیے میرے دل میں برے برے وہم آ رہے ہیں۔'' وہ اپنی قلبی کیفیت کی توجیہات ڈھونڈ رہا تھا اور ربن اپنی جگہ گنگ بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا کوئی کسی کو ایسے بھی چاہتا ہے؟ جولیٹ پر جو کچھ گزری اس کا علم نہ ہونے کے باوجود وہ اندر سے ایسا مضطرب تھا جیسے کسی ان دیکھی لہر نے اس تک سب کچھ پہنچا دیا ہو۔ یہ اضطراب، یہ بے چینی، یہ بے قراری سب اس لیے بھی تھی کہ اس کی محبوب ہستی تکلیف میں مبتلا تھی اور کمال یہ تھا کہ اس محبوب کو اس کی اتنی شدید محبت کا علم ہی نہیں تھا۔

''کیا سوچنے لگے دادا؟'' اس کی مسلسل خاموشی پر فاروق نے اسے ٹوکا تو وہ چونک کر اپنے خیالات سے باہر آیا اور ذرا سنبھل کر بولا۔

''دیکھ شہزادے، بات یہ ہے کہ تیری بے چینی کچھ ایسی غلط بھی نہیں ہے۔ اس طرف سچ مچ تھوڑی گڑبڑی ہے۔''

''کیوں؟ کیا ہوا؟'' اس کے اعتراف نے فاروق کو مزید بے چین کر دیا۔

''اس کی ماں دل کے دورے میں مر گئی ہے رے۔'' ربن نے اسے آدھی حقیقت سے باخبر کیا۔ اسے معلوم تھا کہ حقائق فاروق سے چھپے نہیں رہ سکتے اس لیے یہی بہتر سمجھا کہ ایک دم سب کچھ اس کے سامنے آنے سے پہلے خود ہی تھوڑا تھوڑا کر کے بتانا شروع کرے۔

''وہ کیسے مر گئی؟ وہ تو اچھی بھلی صحت مند عورت تھی۔ عمر بھی کوئی اتنی زیادہ نہیں تھی۔'' جوزفین کی موت سے متعلق خبر سن کر وہ بھونچکا رہ گیا اور اس کی نظروں میں درمیانی قامت، گندمی رنگت اور سرخی مائل کتھئی بالوں والی جوزفین کا سراپا گھوم کر رہ گیا۔ چالیس سال سے کچھ اوپر اس عورت کو موت نے یوں اچانک دبوچ لیا تھا، سن کر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ فاروق نے اسے بہت کم گھر سے نکلتے دیکھا تھا لیکن پھر بھی اتنی بات تو یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ جسمانی طور پر بالکل صحت مند اور چاق و چوبند تھی۔ ایسے میں جان لیوا دل کا دورہ کچھ سمجھ نہ آنے والی بات تھی۔

''موت کا کیا ہے رے، یہ جب کسی کو اپنے ساتھ لے جانے کے واسطے جھپٹتی ہے تو اچھی صحت اور کم عمری کو بھی خاطر میں نہیں لاتی اور مرضی نہ ہو تو برسوں سے بستر پر ہڈیوں کا پنجر بنے بڈھے کے پکار پکار کر بلانے پر بھی کنی کترا کر نکل جاتی ہے۔'' ربن نے فلسفیانہ انداز میں اس کی بات کا جواب دیا۔ اسی وقت کیتھرائن نامی نرس دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک وھیل چیئر بھی تھی جسے دھکیل کر اندر لاتے ہوئے اس نے بالکل بستر کے قریب کھڑا کر دیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''چلیے مسٹر فاروق! ڈاکٹر فورڈ معائنے کے کمرے میں آپ کے منتظر ہیں۔''

''اس وھیل چیئر کی کیا ضرورت تھی سسٹر! میں اپنے پیروں پر چل کر جا سکتا ہوں۔'' فاروق کو وھیل چیئر پر اعتراض ہوا۔

''آپ کی ہمت کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں لیکن اسپتال کے اپنے بھی کچھ اصول اور احتیاطیں ہیں جن کو فالو کرنا ضروری ہے۔ فرض کریں یہاں سے معائنے کے کمرے تک جاتے ہوئے آپ کو اچانک چکر آ جاتے ہیں اور آپ گر جاتے ہیں تو اس حادثے کی ذمے داری کس کے سر ہوگی؟ ظاہر ہے آپ کو تو کوئی کچھ نہیں کہے گا اور مصیبت میرے سر پر ہی آئے گی کہ بے شک پیشنٹ کا اپنے قدموں پر چلنے پر اصرار تھا لیکن میں نے قواعد کی پابندی کیوں نہیں کی؟ اس لیے آپ اپنی نہیں میری بچت کی خاطر اس وھیل چیئر پر بیٹھ جائیں تو میں بہت تھینک فل ہوں گی۔'' کیتھرائن نے بہت نرم لہجے میں اسے سمجھایا تو ربن بھی اس کی تائید کرنے لگا۔

''یہ ٹھیک بولتی ہے رے۔ چل بیٹھ جا کرسی پر اور.... بے چاری کو مشکل میں نہ ڈال۔'' بارعب لہجے میں دی گئی اس ہدایت کو رد کرنے کا فاروق تصور بھی نہیں کر سکتا تھا چنانچہ خاموشی سے وھیل چیئر پر بیٹھ گیا۔ کیتھرائن نے پشت کی جانب کھڑے ہو کر اسے دھکیلا۔

''کتنا ٹائم لگے گا سسٹر؟'' ربن نے بے چینی سے دریافت کیا۔

''یہ تو ڈاکٹر کی مرضی پر ہوگا۔ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں ہے۔ میں انہیں معائنے کے کمرے میں پہنچا کر آف کر جاؤں گی۔ پورے چوبیس گھنٹے سے ڈیوٹی پر ہوں اس لیے دوسری نرس جو میری جگہ چارج لے گی، اسے ہی آگے کی تفصیلات کا علم ہوگا۔'' اس نے خلافِ عادت ذرا تفصیل

سے جواب دیا۔ گزشتہ روز کے مقابلے میں اس کے رویے میں اس بدلاؤ کا سبب ان لوگوں کا سلوک تھا۔ وہ اسے ایک خوب صورت عورت کے بجائے مسیحا کی نظروں سے دیکھتے اور عزت کرتے رہے تھے اس لیے وہ بھی ان سے قدرے مانوس ہوگئی تھی۔

''وہ دوسرا نرس بھی تمہاری طرح خیال کرنے والا ہے یا نہیں؟'' ربن کو فوراً فکر لاحق ہوئی۔

''ڈونٹ وری، سسٹر میری مجھ سے زیادہ کیئرنگ اور تجربے کار ہیں۔ وہ بہت اچھی طرح مسٹر فاروق کو لک آفٹر کریں گی۔'' کیتھرائن نے اسے تسلی دی اور مسکرا کر وھیل چیئر دھکیلتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ چوبیس گھنٹے کی مسلسل ڈیوٹی نے بے شک اسے تھکا دیا تھا لیکن اس کی پیشہ ورانہ مستعدی میں کسی قسم کی کمی نہ آئی تھی۔ فاروق اور کیتھرائن کے پیچھے ربن سے بھی کمرے میں نہ ٹھہرا گیا اور وہ برآمدے میں ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے انتظار کے ساتھ ساتھ حالات کے متعلق بھی سوچ بچار کرتا رہا۔ رامو کے ساتھ اسپتال آنے والے آدمی کو اس نے جانی کے پاس بھیج دیا تھا۔ جولیٹ کی چھٹی ہونے پر وہ جانی کے ساتھ اسے اسپتال سے گھر منتقل کرنے کا بندوبست کرتا اور پھر یہیں اسپتال میں رک جاتا۔

آج رات ربن کو رامو کے ساتھ ایک اہم مہم درپیش تھی چنانچہ چند گھنٹوں کے لیے اسپتال سے غیر حاضری لازم ہوگئی تھی۔ اپنی غیر موجودگی کے اس وقفے میں وہ کسی اور کو فاروق کے پاس چھوڑنے پر مجبور تھا کہ اسے دلی جذبات سے ہٹ کر دادا کی ذمے داریاں بھی پوری کرنی تھیں۔

مختلف النوع خیالات میں ڈوبے ادھر سے ادھر ٹہل لگاتے اسے آدھا گھنٹا ہی گزرا تھا کہ ڈاکٹر کی طرف سے بلاوا آگیا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ڈاکٹر کے کمرے کا رخ کیا۔ آج ڈاکٹر پرکاش کے ساتھ کمرے میں ایک انگریز ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ اس کی شخصیت کا رعب داب دیکھ کر اسے اندازہ ہوگیا کہ یہی ڈاکٹر فورڈ ہے جس کی مہارت اور قابلیت کے گن ہر ایک گاتا ہے۔ اس نے احترام سے دونوں کو سلام کیا جس کا جواب اسے اشارے سے ملا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر پرکاش نے اسے بیٹھنے کا بھی اشارہ کیا۔ وہ کرسی پر ٹک گیا اور دونوں ڈاکٹرز کے چہروں پر محتاط نظر ڈالی۔ ڈاکٹر فورڈ کا چہرہ سپاٹ تھا اور وہ اس کی طرف سے بے نیاز اپنے سامنے رکھی فائل کی طرف متوجہ تھا البتہ ڈاکٹر پرکاش کے چہرے پر ہلکی سی حوصلہ افزا مسکراہٹ موجود تھی۔ اس مسکراہٹ نے ربن کو حوصلہ دیا۔

''یہ ڈاکٹر فورڈ ہیں، مسٹر فاروق کے معالج۔'' اس نے سب سے پہلے ربن کا ڈاکٹر سے تعارف کروایا اور ڈاکٹر سے بھی انگریزی میں کچھ ایسے جملے کہے جن کے متعلق ربن یہی اندازہ لگا سکا کہ ڈاکٹر سے اسے متعارف کروایا جارہا ہے کیونکہ ڈاکٹر پرکاش کے خاموش ہونے پر ڈاکٹر فورڈ نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تھا لیکن زبان سے بہرحال کچھ نہیں بولا تھا۔ شاید اس لیے کہ اسے معلوم تھا، وہ اس کی بات نہیں سمجھ سکتا۔

''ڈاکٹر فورڈ دو دن سے مستقل تمہارے پیشنٹ کا تفصیلی معائنہ کررہے ہیں۔ ضروری ٹیسٹ کی رپورٹیں بھی آچکی ہیں جن کی مدد سے یہ معلوم ہوا ہے کہ پیشنٹ کے سر کے پچھلے حصے پر لگائی جانے والی ضرب بے شک خاصی مہلک تھی لیکن اس پراوپروالے کا کرم ہوا اور خاصی بچت ہوگئی۔ جو رپورٹیں سامنے آئی ہیں، ان کے مطابق اندر بہت معمولی مقدار میں خون جم گیا ہے جو دواؤں کے مستقل استعمال، آرام اور وقت کے ساتھ ساتھ ٹھیک ہوجائے گا۔ اچھی بات یہ ہے کہ پیشنٹ خود بھی مضبوط دل پاور کا مالک ہے اس لیے اسے ری کور کرنے میں آسانی رہے گی۔ ہاں، یہ ہوسکتا ہے کہ ری کوری کے اس عرصے میں اسے شدید سر درد کے کئی دوروں کو برداشت کرنا پڑے۔ خصوصاً ذہنی دباؤ کی صورت میں ان دوروں کی تعداد اور شدت بڑھ سکتی ہے اس لیے اس بات کا خاص انتظام کرنا پڑے گا کہ پیشنٹ کو دوا اور آرام کی فراہمی کے ساتھ ساتھ ہر طرح کے ذہنی دباؤ سے دور رکھا جائے۔'' ڈاکٹر پرکاش کا لہجہ اور الفاظ کا چناؤ اگرچہ خاصا حوصلہ افزا تھا لیکن ربن نے ایک بات سمجھ لی کہ بہرحال فاروق مکمل طور پر فٹ نہیں ہے اور مکمل صحت یابی کے لیے اسے وقت درکار ہوگا۔ دوا اور آرام کا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ دونوں سہولیات آسانی سے فراہم کی جاسکتی تھیں لیکن ذہنی دباؤ سے بچانا ایک کارِ مشکل ثابت ہوتا۔ جب تک فاروق اسپتال میں تھا پھر بھی اسے حالات سے بے خبر رکھا جاسکتا تھا لیکن اڈے پر واپس جانے کے بعد تو وہ کسی نہ کسی طرح واقف ہو ہی جاتا اور اتنا بڑا ذہنی جھٹکا برداشت کرنا یقیناً اس کے لیے بہت مشکل ثابت ہوتا۔

''کیا بات ہے؟ آپ میری بات سن کر خوش ہونے کے بجائے پہلے سے زیادہ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟'' ڈاکٹر پرکاش نے فوراً اس کی پریشانی کو بھانپ لیا۔

''ابھی آپ اسے اور کتنے دن اسپتال میں روکنے کا ہے ڈاکٹر صاحب؟'' اس کے سوال کا جواب دینے کے

بجائے ربن نے اس سے پوچھا۔

''ابھی دو چار دن اسے انڈر آبزرویشن رکھیں گے پھر ہی ڈسچارج کرنے کا فیصلہ ہوگا۔ ویسے ڈاکٹر فورڈ کا خیال ہے کہ اسپتال میں زیادہ نہیں رکھنا پڑے گا، گھر پر رہ کر بھی علاج ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر پرکاش نے پہلے ڈاکٹر فورڈ سے اس کے سوال کے متعلق رائے لی پھر اسے بتانے لگا۔

''علاج میں کتنا ٹیم لگے گا؟'' سوچ میں گھرے ربن نے ایک اور سوال داغا۔

''اس بارے میں حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ چند ہفتوں سے لے کر مہینوں تک کتنا بھی ٹائم لگ سکتا ہے۔ اس قسم کے کیسز میں پیشنٹ کی ایج، جسمانی صحت، دیکھ بھال، دوا اور غذا سے لے کر اسے پیش آنے والے حالات تک ہر ہر فیکٹر اپنا کردار ادا کرتا ہے، اسی حساب سے ری کوری کا ڈیوریشن بھی طے ہوتا ہے۔ میں آپ سے یہی کہوں گا کہ اپنے پیشنٹ کے اردگرد سب کچھ اچھا رکھیں تو وہ جلد اچھا ہو جائے گا۔ باقی اوپر والے کی مرضی ہے۔'' ڈاکٹر پرکاش کا جواب مکمل تھا۔

''بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب! اپن ابھی پوری کوشش کرے گا کہ سب اچھا رہے کیونکہ ربن اپنے ہیرو کو جلد سے جلد ٹھیک دیکھنے کو مانگتا ہے۔''

''گاڈ بلیس یو۔'' اس کے جذباتی لہجے میں کہی بات پر ڈاکٹر نے پُرخلوص لہجے میں کہا اور یوں بہت مضطرب انتظار کے بعد ہونے والی ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی۔

☆☆☆

''ڈیڈ...... ڈیڈ......'' ایک بہت شناسا سی آواز کانوں سے گزر کر اس کے دماغ سے ٹکرائی تو بند پپوٹوں کے پیچھے اس کی آنکھوں کے ڈیلوں نے بے قراری سے حرکت کی لیکن وہ اپنی پلکوں کو جنبش نہ دے سکا۔ یہ نہیں کہ وہ اس عمل پر سرے سے قادر ہی نہیں تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ ایسا کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ آنکھیں کھول کر اس دنیا کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا جس میں اس کی جوزفین موجود نہیں تھی۔ جوزفین تو یہاں تھی۔ بند پلکوں کے پیچھے، اس کے دماغ کے پردے پر ایک جیتی جاگتی تصویر کی طرح۔ اور یہ کوئی ایک تصویر نہیں تھی۔ چلتی پھرتی تصویروں کا ایک تسلسل تھا جس میں وہ جوزفین کی زندگی کا ہر دور دیکھ سکتا تھا۔ اس کی یادداشت کے پردے پر جوزفین کی جو پہلی تصویر تھی، وہ لکڑی کے رنگین پنگوڑے میں آنکھیں موند کر لیٹی ایک گول گوتھنی سی سنہری رنگت والی گڑیا کی تھی۔ وہ جو باہر گلی میں اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ گھٹنوں کے حساب سے کھیل کر آنے کے بعد دھول مٹی سے اٹا، اپنے گھر میں اپنی ماں کو غیر موجود پا کر اس کی تلاش میں سیدھا پڑوس میں مقیم ماں کی سب سے چہیتی سہیلی سنتھیا کے گھر آ پہنچا تھا، تصویر حیرت بنا سرخی مائل گھنی بالوں والی اس گڑیا کو دیکھ رہا تھا جس کا سویرے تک تو کوئی نام و نشان نہیں تھا لیکن اب جانے کہاں سے وہ آنٹی سنتھیا کے گھر ٹپک پڑی تھی۔

''ادھر آؤ جوزف، کیا دیکھ رہے ہو؟'' اس کی حیرانی کو دیکھ کر پنگوڑے کے ساتھ ہی بچھے پلنگ پر لیٹی آنٹی سنتھیا نے اسے کمزور آواز میں پکارا۔

''یہ کون ہے آنٹی؟'' اس نے ان کے قریب جائے بغیر خوابیدہ لہجے میں سوال کیا۔

''یہ لٹل فیری ہے جسے اینجل آنٹی سنتھیا کو دے کر گیا ہے۔'' جواب آنٹی سنتھیا کے بجائے کمرے میں داخل ہوتی اس کی ماں نے دیا۔ ماں کے ہاتھ میں چینی کا ایک پیالہ تھا جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ آنٹی سنتھیا کے پلنگ کے قریب آ کر اس نے آنٹی کو سہارا دے کر اٹھایا اور پیالے میں موجود شے کو پینے کی ہدایت کرنے لگی۔ جوزف کو اس بات سے قطعی دلچسپی نہیں تھی کہ آنٹی اس کی ماں کی لائی ہوئی وہ گرم شے کتنی مشکلوں سے منہ بناتے ہوئے پی رہی ہے۔ اس کا سارا دھیان تو لٹل فیری کی طرف تھا جس کی من موہنی صورت نے پہلی نظر میں ہی اس کا دل موہ لیا تھا۔

''میں اس کا نام جوزفین رکھوں گی۔ کیوں جوزف، یہ نام اچھا ہے نا؟'' آنٹی سنتھیا کی آواز نے اس کی محویت کو توڑا۔

''بہت...... بہت اچھا نام ہے۔ میں جوزف اور یہ جوزفین...... واہ یہ تو بہت اچھا رہے گا۔'' جوزف نام کے اس انتخاب پر خوش ہو گیا اور پہلی بار اس ننھی پری کو چھونے کے ارادے سے اپنے ہاتھ پنگوڑے کی طرف بڑھائے لیکن فوراً ہی اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر لگی مٹی پر پڑ گئی اور اس نے یک دم ہی ہاتھ پیچھے کھینچ لیے۔ اتنے گندے ہاتھوں سے وہ اس پیاری سی گڑیا کو چھو کر اسے میلا نہیں کر سکتا تھا چنانچہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ گھر جا کر اس نے پہلے خوب رگڑ رگڑ کر صابن سے منہ ہاتھ دھوئے اور جب اس پر بھی اطمینان نہ ہوا تو نہا کر کپڑے تبدیل کر ڈالے۔ یوں اس نے جب پہلی بار جوزفین کو گود میں لیا تو کرسمس کے علاوہ یہ دوسرا موقع تھا جب وہ اس قدر صاف ستھرے حلیے میں تھا۔

اصل میں وہ حد سے زیادہ کھلنڈرا بچہ تھا جسے باہر گلی

میں دن بھر کھیلنے سے کچھ ایسا عشق تھا کہ اپنے ہوش بھلا بیٹھتا تھا۔ ایسے میں کپڑوں اور جسم کا گندا ہونا تو لازمی تھا لیکن جوزفین کی دنیا میں آمد کے بعد اس کی ذات میں یہ زبردست انقلاب آیا کہ وہ جوزفین کے میلا ہوجانے کے ڈر سے خود کو بہت صاف ستھرا رکھنے لگا اور اس کے دن کا بیشتر حصہ گلی کے بجائے آنٹی سنتھیا کے گھر جوزفین کی قربت میں گزرنے لگا۔ اس کی ماں کو بھی اس کی طرف سے تھوڑا اطمینان ہوگیا۔ جوزف اس کی اکلوتی اولاد تھا لیکن اس کے بعد پے در پے تین مردہ بچوں کو جنم دینے کے بعد اس کی اپنی جسمانی حالت اتنی خراب رہنے لگی تھی کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی بھرپور توجہ نہیں دے پاتی تھی۔ دن بھر روزی روٹی کمانے کے چکر میں گھن چکر بنے جوزف کے باپ کے پاس بھی اپنے بیٹے کے لیے بہت کم وقت ہوتا تھا، نتیجتاً وہ ایک مشنری اسکول میں ایک نالائق طالب علم کے طور پر مارے باندھے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اپنی اس نالائقی کے باوجود بہرحال وہ کسی کے لیے تکلیف دہ یا ناپسندیدہ بچہ نہیں تھا اس لیے آنٹی سنتھیا نے بھی اپنے گھر میں اس کی آمد پر منہ نہیں بنایا تھا اور یوں وہ آرام سے جوزفین کے ساتھ گھنٹوں گزارتا تھا۔ جوزف کی یادداشت میں جوزفین کی جو دوسری تصویر محفوظ تھی، وہ ایک گھٹنوں چلنے والی روتی بلکتی بچی کی تھی جو اپنے گھر کے بجائے اب زیادہ تر وقت ان کے گھر میں رہتی تھی۔ اس تبدیلی کی وجہ جوزفین کے باپ کو اچانک پیش آنے والا وہ حادثہ بنا تھا جس نے اس سے اس کی زندگی چھین لی تھی۔ سر سے باپ کا سایہ اٹھا تو آنٹی سنتھیا کو جوزفین کا باپ بننے کے لیے گھر سے قدم نکالنا پڑا۔ وہ دن بھر ایک تولیا فیکٹری میں چار پیسے کمانے کی خاطر مشقت کی چکی میں پستی رہتی اور اس کی شیر خوار بچی اچانک ماں کے دودھ سے محروم ہو جانے پر بلبلا بلبلا کر احتجاج کرتی رہتی۔ جوزف کی ماں نے سنتھیا سے اپنی گہری دوستی نبھانے کے لیے جوزفین کو دن بھر اپنے پاس رکھنے کی ذمے داری قبول تو کرلی تھی لیکن اپنے نحیف وجود کے ساتھ... ہر وقت روتی بسورتی بچی کو سنبھالنا اس کے لیے کارِ دشوار تھا۔ گر جوزف نہ ہوتا تو شاید وہ گھبرا کر سنتھیا کو انکار ہی کرڈالتی لیکن جوزف نے ننھی جوزفین کو بالآخر اپنی محبت اور توجہ سے سنبھال ہی لیا لیکن اس مصروفیت میں اس کی پہلے ہی سے خراب تعلیمی حالت کا بالکل ہی بیڑا غرق ہوگیا۔

جوزف کی یادداشت میں جوزفین کا تیسرا عکس ایک اسکول جاتی ہوئی بچی کا تھا۔ اپنے سرخی مائل کتھئی بالوں کو دو چھوٹی چھوٹی پونیوں کی صورت ہلاتی وہ اسکول کے لیے روانہ ہوتی تو جوزف کو بہت پیاری لگتی۔ اسے اسی مشنری اسکول میں داخل کروایا گیا تھا جہاں جوزف جاتا تھا۔ جوزفین کو اسکول لے جانے اور وہاں سے واپس لانے کی ذمے داری نبھانے کے لیے جوزف خود بھی پابندی سے اسکول جانے لگا لیکن وہ کبھی بھی زیادہ اچھا طالب علم ثابت نہ ہوسکا۔ البتہ جوزفین شروع ہی سے پڑھائی میں بہت اچھی تھی۔ اس کی ماں سنتھیا کو اس بات کا بڑی شدت سے احساس تھا کہ اگر وہ تعلیم یافتہ ہوتی تو دن بھر تولیا فیکٹری میں مشقت کی چکی میں پسنے کے بجائے کسی دفتر میں نسبتاً آرام دہ ملازمت کر رہی ہوتی۔ چنانچہ اس نے جوزفین کے دماغ میں یہ بات بہت اچھی طرح بٹھا دی تھی کہ اسے اچھی تعلیم حاصل کرنی ہے۔ جوزفین اپنی ماں کی یہ خواہش پوری کرنے کے لیے دل و جان سے محنت کرتی ایک ایک کر کے عمر کی منزلیں طے کرنے لگی۔ عمر کی طے ہوئی ان منزلوں کے ساتھ اس کا شباب بھی پروان چڑھتا گیا اور وہ محلے کے کئی لڑکوں کی دھڑکنوں میں بسنے لگی لیکن وہ لڑکوں کی خود میں اس دلچسپی سے قطعی بے نیاز تھی۔ اس نے جوزف کے علاوہ کسی دوسرے لڑکے سے کبھی بات کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اور جوزف بھی ہر پل اس کا نگہبان بنا ان لڑکوں کے آگے ایک دیوار کی طرح کھڑا رہتا تھا۔

گزرتے ماہ و سال نے اس کے دل میں جوزفین کے لیے موجود محبت کے رنگ بھی بدل ڈالے تھے۔ اب وہ اس کے لیے ایک ننھی پری کے بجائے محبوبہ تھی جس کے حسن کے جلوؤں کو وہ چوری چوری دیکھتا اور دل کو سنبھالتا رہتا تھا۔ اسے جوزفین کے اپنے لیے خیالات کا علم نہیں تھا لیکن ایک یقین سا تھا کہ جب وہ اس سے اس کا ساتھ طلب کرے گا تو وہ انکار نہیں کرسکے گی لیکن اس یقین کو آزمانے سے قبل ہی ایک بار پھر حالات نے کروٹ بدل لی۔ اس بار موت کا فرشتہ جوزفین کی ماں کو اپنے ساتھ لے جانے آیا تھا۔ تولیا فیکٹری کی مشقت کی چکی میں پستی وہ عین اس وقت ہمت ہار گئی تھی جب جوزفین ایف اے کا امتحان دے رہی تھی۔ ماں کے بعد جوزفین نے امتحان تو جوں توں دے لیا لیکن زندگی بسر کرنے کو اس کے پاس اب کوئی آسرا نہیں تھا۔ زندگی کی گاڑی کو چلانے کے لیے وہ ملازمت کے لیے اخبارات کو چھاننے اور عرضیاں دینے میں مصروف ہوگئی۔ جوزف کو اس کی پریشانی کا احساس تھا اور وہ اس کا سہارا بھی بننا چاہتا تھا لیکن اپنی واجبی سی تعلیم کے ساتھ وہ ابھی تک

کوئی ڈھنگ کی ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا، ایسے میں جوزفین کو کیسے سہارا دیتا۔ خود اس کے اپنے گھر کے حالات گزرتے وقت کے ساتھ مزید خراب ہو گئے تھے۔ باپ بڑھتی عمر کے باعث پہلے جیسی مشقت کے لائق نہیں رہا تھا اور کم مشقت کا مطلب تھا کم آمدنی۔ اس پر اس کی سدا کی بیمار ماں کی بیماریوں میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ چنانچہ وہ تھوڑا بہت جو بھی کماتا، وہ گھر کے مسائل حل کرنے میں ہی ختم ہو جاتا۔ ایسے میں وہ جوزفین کو سہارا دینے کی خواہش کیسے پوری کرتا۔ جوزفین خود بھی اس کے مسائل کو سمجھتی تھی اس لیے اس نے کبھی اس سے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا اور خاموشی سے زندگی کی جنگ لڑنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ اسی جدوجہد نے اس سے بمبئی چھوڑنے کا فیصلہ کروا لیا۔ جوزف اس کے اس فیصلے پر بہت اداس ہوا اور کوشش کی کہ اسے روک سکے لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔

''سوری جوزف! مجھے خود بھی یہ شہر اور تم سب کو چھوڑ کر جانا اچھا نہیں لگ رہا لیکن میری مجبوری ہے۔ وہاں مجھے بہت اچھی جاب مل رہی ہے جبکہ یہاں تم خود ہی دیکھ رہے ہو کہ میں کتنے عرصے سے خوار ہو رہی ہوں۔ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے مجھے فرینڈز سے قرض لینا پڑ رہا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ یہ سلسلہ مزید لمبا ہو اس لیے بہتر ہے کہ تم مجھے جانے دو۔'' اس کے اصرار کے جواب میں جوزفین نے اس سے یہ بات کہی تھی اور اس کا اصرار دم توڑ گیا تھا۔ چنانچہ ایک روز بہت خاموشی سے اس کا چھوٹا سا بیگ تھام کر اسے ریلوے اسٹیشن چھوڑ آیا تھا جہاں سے وہ ریل میں بیٹھ کر اس سے دور بہت دور چلی گئی تھی۔

دوری کا یہ عرصہ ایک سال پر محیط تھا لیکن جوزف کو وہ ایک سال ایک صدی کے برابر لگا تھا۔ اس ایک سال نے جوزفین کو اس سے بہت دور کر دیا تھا حالانکہ وہ بہت پابندی سے اسے خطوط لکھ کر اپنے روز و شب کے احوال سے آگاہ کرتی تھی۔ وہ وہاں خوش اور مطمئن تھی لیکن جوزف کے دل کی کلی مرجھاتی جا رہی تھی۔ اس ایک سال کے عرصے میں جو کچھ بیتا اسے جوزف نے کبھی یاد نہ رکھنا چاہا، چنانچہ اب بھی آنکھیں بند کیے جوزفین کے ساتھ اپنی زندگی کے مختلف ادوار کو دہراتے ہوئے اس نے اس ایک سال کے عرصے کو فراموش کر دیا اور زندگی کے اس دور کو یاد کرنے لگا جب جوزفین اس کی زندگی میں شامل ہوئی۔ ہاں...... وہ اس کے یقین کے مطابق ایک دن اس کی ہو گئی تھی لیکن کچھ اس طرح کہ ملن کی ان گھڑیوں میں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے پھول تھے، نہ آنکھوں میں خوش رنگ خوابوں کی کرنیں۔ اس نے جیسے ایک بے جان مجسمے کو اپنے جیون میں شامل کر لیا تھا لیکن پھر یہ اس کی محبت کا ہی کمال تھا کہ وہ بے جان مجسمہ آہستہ آہستہ زندگی کی حرارت سے آشنا ہونے لگا تھا۔

اس نے جوزفین کے ساتھ زندگی کے بہت سے ماہ و سال بہت خوش خوش گزارے تھے حالانکہ وہ جانتا تھا کہ جوزفین کے دل کا ایک گوشہ ایسا ہے جہاں قفل پڑا ہوا ہے اور جہاں تک جوزفین نے اسے کبھی رسائی نہیں دی لیکن وہ پھر بھی خوش تھا کہ اس کی جوزفین اس کے پاس ہے۔ وہ قناعت پسند بندہ تھا اور اس کی محبت کو بہت زیادہ کی ہوس نہیں تھی۔ اپنی قناعت پسندی کی وجہ سے وہ اتنے سالوں سے ایک مطمئن زندگی گزار رہا تھا لیکن قسمت کو اس کا اطمینان اچھا نہیں لگا اور موت نے یک بیک جوزفین کو اس سے جھپٹ کر لے گئی۔ موت کے اس وار نے اسے اپنی زندگی کا وہ دن شدت سے یاد دلایا جب جوزفین بمبئی چھوڑ کر جا رہی تھی اور وہ ریلوے اسٹیشن پر تنہا اور اداس کھڑا تھا لیکن اس وقت اور موجودہ وقت میں ایک بہت بڑا فرق یہ تھا کہ جوزفین جس منزل کی طرف گئی تھی، وہاں سے اسے واپسی کی گاڑی مل گئی تھی اور وہ آدھی ادھوری ہی سہی جوزف تک واپس لوٹ آئی تھی لیکن اب تو ایسا کوئی امکان، کوئی بھی امید نہیں تھی۔ وہ جس منزل کو گئی تھی، وہاں سے واپسی کی کوئی گاڑی نہیں ملتی تھی اور جوزف کے پاس بس یہ امکان رہ گیا تھا کہ وہ ریلوے اسٹیشن پر کھڑا اس گاڑی کا انتظار کرتا رہے جو اسے بھی جوزفین تک پہنچا دے لیکن وہ گاڑی آتی نہیں تھی اور یہاں کوئی تھا جو مسلسل اسے آوازیں دے دے کر بلا رہا تھا۔

''ڈیڈ! پلیز آنکھیں کھولیں ڈیڈ۔ دیکھیں آپ کی جولی آپ کے پاس آئی ہے۔ کیا آپ اپنی جولی سے بات نہیں کریں گے؟ پلیز ڈیڈ! مجھ سے بات کریں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ مام تو میرے آنے سے پہلے ہی چلی گئی ہیں، کیا آپ بھی مجھے اکیلا چھوڑ دیں گے؟'' بلک بلک کر روتے ہوئے وہ اسے پکار رہی تھی جو جوزفین ہی کی ذات کا ایک حصہ تھی اور جسے اس نے جوزفین کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ چاہا تھا۔ وہ اس کی پکار کو کیسے اور کب تک نظرانداز کر سکتا تھا چنانچہ اسے اپنی پلکوں پر پڑے پہاڑ جیسے بوجھ کو ہٹانے کے لیے جدوجہد کرنا ہی پڑی اور اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے جانے کتنے عرصے بعد اس نے جوزفین کے چہرے کے سوا کسی دوسرے چہرے کو دیکھا۔ جوزفین کے

بہت سے نقش خود پر سجائے، یہ چہرہ آنسوؤں سے تربتر تھا۔ جوزف کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ جولیٹ اس کی جوزفین کی نشانی تھی اور اسے ہر حال میں عزیز تھی، سوائے یہ خیال نہیں آیا کہ وہ اغوا ہونے کے بعد بدنامی کا داغ بن کر اس کے گھر واپس لوٹی ہے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پوری شدت سے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا اور دونوں باپ بیٹی ٹوٹ کر رونے لگے۔ جوزفین کی موت سے لے کر اب تک خشک آنکھوں سے ماتم کناں سکتہ زدہ سے جوزف کے لیے بہتے یہ آنسو بہت ضروری تھے چنانچہ جولیٹ کے ساتھ کمرے کے دروازے تک آنے والے غلام چاچا نے وہیں سے پلٹ جانا مناسب سمجھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر دل بھر کر رو لیتے تو ان کے دلوں کا بوجھ کم ہو جاتا۔

☆☆☆

نانا کی سواری مجو کے اڈے پر پہنچی تو یہ مجو کے لیے کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس کے اور نانا کے درمیان دیرینہ تعلقات تھے اور یہ تعلقات اختلافات کے باوجود ختم نہیں ہوئے تھے۔ یہ اور بات کہ تعلقات کو قائم رکھنے میں زیادہ کردار نانا کا ہی تھا۔ وہ آپس میں پیدا ہونے والی ناگوار صورتِ حال کے باوجود بھی اس سے ملنے کے لیے آتا جاتا رہا تھا۔ ورنہ سچ یہ تھا کہ اب مجو کو اس کا آنا بھی ناگوار گزرنے لگا تھا۔ ثریا بانو والے معاملے میں نانا کا جھکاؤ ربن کی طرف دیکھ کر اس کے دل میں نانا کے لیے گرہ سی پڑ گئی تھی اور اب تو حالات اور بھی زیادہ خراب تھے۔ فاروق کے ہاتھ میں آ کر نکل جانے کے واقعے نے اس کی طبیعت کو خاصا مکدر کر رکھا تھا۔ اس نے مسٹر ولیم سے وعدہ لیا تھا کہ وہ فاروق سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے بعد اسے اس کے حوالے کر دیں گے لیکن اچانک ہی بازی پلٹ گئی اور ربن اپنے وکیل کی مدد سے اسے تھانے سے لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

مسٹر ولیم اور اسے دونوں ہی کو قدرے تاخیر سے اس واقعے کا علم اس وقت ہوا جب متعلقہ تھانے دار نے مسٹر ولیم کو فون کر کے اطلاع دی۔ مسٹر ولیم نے فوراً اپنا نوکر اس کے اڈے بھجوا دیا کہ وہ فاروق کو لینے جانے کے لیے تھانے کا رخ نہ کرے۔ بعد میں انہوں نے خود آ کر اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ کفِ افسوس ملنے لگا کہ کاش اس نے اپنے آدمی تھانے کی نگرانی پر مقرر کیے ہوتے تو عین اس وقت جب ربن فاروق کو وہاں سے لے جا رہا تھا، ہلا بول کر ان لوگوں کو قابو کیا جا سکتا تھا۔ اس نے مسٹر ولیم سے بھی بہت شکوہ کیا کہ انہوں نے اس کے ساتھ کیا وعدہ ایفا نہ کیا لیکن ولیم کی اپنی مجبوری بہت واضح تھی۔ ایک نامی گرامی وکیل، صحافی اور پولیس کے اعلیٰ افسر کی مداخلت کے باعث وہ بالکل بے دست و پا ہو گیا تھا اور فاروق کے ہاتھ سے نکل جانے پر کوئی حرفِ شکایت زبان پر لانا تو دور کی بات، خود اسے اپنی صفائی پیش کرنا مشکل ہو گئی تھی۔

بغیر ایف آئی آر کے فاروق کو رات بھر تھانے میں رکھنے اور تشدد کا نشانہ بنانے پر اسے خاصی تنقید کا سامنا کرنا پڑا تھا کیونکہ انگریز حکومت کے تمام ہمدردوں کا یہی خیال تھا کہ بدلتی ہوئی سیاسی صورتِ حال میں یہ واقعہ خاصا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر چاؤلہ عقل مندی و سمجھداری سے کام نہ لیتا تو پریس سرکار کے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔ اس واقعے نے ولیم کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ واقعی اب ہندوستان میں ان کی حکمرانی کا سورج غروب ہونے کو ہے۔ اس بھیانک سچ کو تسلیم کرنے کے بعد اس نے فوری طور پر چند فیصلے کیے تھے جس میں سرفہرست یہ فیصلہ تھا کہ اپنی فیملی کو واپس انگلستان منتقل کر دیا جائے۔ اس کام کے لیے اس نے فوری طور پر عمل بھی شروع کر دیا تھا۔ اس لیے مجو جیسے لوگوں سے دوبارہ ملاقات کی فرصت سے محروم تھا۔ ولیم کی دوستی پر نازاں مجو نے اس کے اس بدلے ہوئے رویّے کو بہت محسوس کیا تھا اور پہلے ہی سے بگڑا اس کا مزاج کچھ اور بگڑ گیا تھا۔ ایسے میں نانا اس کے اڈے پر پہنچا تو اس نے روایت کے مطابق زیادہ گرم جوشی سے اس کا استقبال نہیں کیا۔ نانا ہی نے اس سے دو چار ادھر ادھر کی باتیں کیں جن کا وہ بے دلی سے جواب دیتا رہا۔ اسی دوران اسے ماہم کے دادا کے اڈے پر پہنچنے کی خبر ملی تو اس نے اسے محض ایک اتفاق جانا لیکن جب چند ایک منٹ کے وقفے سے وہاں کلابے، دادر، جوہو اور بمبئی کے دیگر علاقوں کے داداؤں کی آمد کا سلسلہ جاری ہو گیا تو اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ کچھ خاص ہونے والا ہے اور یہ سب بلاوجہ اس کے اڈے پر نہیں پہنچے ہیں۔ وجہ بھی اس وقت اس کے سامنے آ گئی جب اس نے ربن دادا کو اپنے خاص ساتھی رامو اور چند دوسرے چیلوں کے ساتھ اپنے اڈے پر پایا۔ اسے یقین ہو گیا کہ سارے دادا ربن کے کہنے پر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اس تماشے کے پیچھے مقصد کیا تھا، یہ البتہ وہ فوری طور پر نہ سمجھ سکا اور سٹپٹایا ہوا سا اپنے آدمیوں کو مہمانوں کی خاطر مدارات کے سلسلے میں ہدایات دینے لگا۔

''ابھی اس سب کی ضرورت نہیں ہے رے۔ پہلے فیصلہ ہونے دے کہ اس اڈے پر خاطر مدارت کا حق کس کو ملنے کا ہے پھر ہم سب خود اپنی اپنی پسند بولیں گے۔'' نانا نے اپنی پاٹ دار آواز میں ہدایات جاری کرتے ہوئے مجو کوٹو کا تو وہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔

''کیا بولے را ہے نانا؟ میں تیری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔'' ایک پل کے سکوت کے بعد اس نے نانا کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

''تیرا مسئلہ یہی ہے کہ تو بات کو سمجھتا ہی نہیں ہے ورنہ میں تیرے کو کتنے دنوں سے سمجھا رہا ہوں کہ دیکھ مجو آپے میں رہ اور اپنے اڈے پاڑے کے اصولوں کو مت توڑ لیکن تیری تو ہوا ہی بدلی ہوئی ہے۔ دو چار انگریزوں کو دوست بنا کر سمجھتا ہے کہ ہندوستان کی حکمرانی تیرے ہاتھ لگ گئی ہے۔ اب سنبھال کر دکھا اپنی حکمرانی کو تو تجھے مرد جانوں گا میں۔'' اس کی نگاہوں سے خائف ہوئے بغیر نانا بلند آواز میں بولتا چلا گیا تو مجو کے ماتھے پر مزید بل پڑ گئے اور وہ منہ بنا کر بولا۔

''حد سے جاستی نہ بول نانا، تو ادھر مہمان ہے اس لیے میں تیرا خیال کر رہا ہوں ورنہ کسی کو اتنی ہمت نہیں ہے کہ مجو کے سامنے اتنی بات کر سکے۔''

''تو نانا کو بولنے سے نہیں روک سکتا مجو کیونکہ یہ ہم سب کا فیصلہ ہے کہ جو کچھ بولنا ہے، نانا بولے گا اور ہم دیکھیں گے کہ تو کتنا اڈے کی دنیا کے اصولوں کا خیال کرتا ہے۔ جو دادا اپنی دنیا کے نیم نہیں جانتا بوجھتا پھر اسے فیصلے کے لیے تیار ہونا پڑتا ہے۔ تو بھی اپنے اوپر خود یہ سے لے آیا ہے۔'' مجو کی بلند آواز کو ماہم کے دادا نے دبا ڈالا اور وہ کچھ سٹپٹایا ہوا سا ایک ایک کا چہرہ دیکھنے لگا۔ ان چہروں میں ربن دادا کا چہرہ بھی شامل تھا جس پر گہرا سکوت طاری تھا اور وہ یوں بے نیازی سے بیٹھا ہوا تھا جیسے وہاں ہونے والی گفتگو سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ ربن کی اس بے نیازی پر اپنے دل میں عجیب سی وحشت محسوس کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر نانا کی طرف متوجہ ہوا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''اپن کو تجھ سے زیادہ لمبی بات نہیں کرنے کا ہے کیونکہ اپن پہلے بھی تجھ سے بہت بار بات کیا ہے اور تجھ کو سمجھانے کا کوشش کیا ہے کہ اپن لفڑوں میں باہر کے آدمی کو نہیں مانگتا ہے اور نہ یہ چاہتا ہے کہ اپنا آدمی لگے بندھے نیم سے ہٹ کر کچھ کرے، پر تو اپنی بات نہیں سمجھا۔ تو نے اپنے کہنے پر نہ تو ربن دادا کے ساتھ بیٹھ کر ٹھنڈے مغز سے بات کیا، نہ اس کے علاقے میں اپنے آدمی بھیج کر حملہ کروانے سے باز آیا اور یہ سب تو نے ایک ایسی عورت کی خاطر کیا جو کسی کی ودھوا اور ایک بیٹے کی ماں ہے۔ وہ عورت خود تجھ سے بیاہ کے لیے تیار ہوتی تو چل کوئی بات نہیں تھی، پر تو اس کے ساتھ جور جبردستی کرے لا تھا جب ہی وہ تجھ سے بھاگ کر ربن کے علاقے میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ ربن دادا نے اسے پناہ دیا پر تیرے کو یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اب اسے نہیں چھیڑنے کا ہے۔ تو اتنا غیرت مند ہوتا تو اس کے پیچھے ہی کاہے کو پڑتا۔ یہ تو تیرے کو خود سمجھنے کا تھا کہ گھر بیٹھی بہو بیٹی پر ہاتھ ڈالنا کسی دادا کی شان نہیں۔ دادا اپنے علاقے کا رکھوالا ہوتا ہے اگر وہی لوگوں کی عزتوں پر ہاتھ ڈالنے لگے تو پھر وہ کس کے پاس جا کر فریاد کریں گے؟ تو اپنی ہوس میں اتنا پاگل ہو گیا تھا کہ تجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اڈے پاڑے کے لوگ اپنے لفڑوں میں باہر کے لوگوں کو شامل نہیں کرتے۔ تیرے انگریز دوست ولیم نے ربن دادا کے لڑکے کو تھانے میں لے جا کر اتنا پٹوایا کہ وہ ابھی تک اسپتال میں پڑا ہے اور ربن دادا تیرا یہ جرم معاف کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس نے اپن سب کو تجھ سے حساب لینے کو یہاں جمع کیا ہے اور اب چار کے پنچ انصاف سے جو فیصلہ ہوگا، وہ تجھے ماننا ہوگا۔'' نانا نے اپنی پاٹ دار آواز میں اس پر فردِ جرم عائد کرتے ہوئے حتمی لہجے میں اعلان کیا۔

''کیسا فیصلہ؟'' مجو نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے دریافت کیا۔ اس وقت اتنے داداؤں کی موجودگی میں وہ جس بری طرح گھرا ہوا تھا، اس کی ساری اکڑ غائب تھی اور وہ لہجہ دھیما رکھ کر بات کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

''تجھے نہیں معلوم کہ اپنے پاس فیصلہ کیسے ہوتا ہے؟'' نانا نے کاٹ دار لہجے میں الٹا اسی سے دریافت کیا پھر استہزائیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بات کو آگے بڑھایا۔ ''ربن دادا کا کہنا ہے کہ تیرے جیسا دادا جو چوکی کے اصولوں پر عمل کرنا نہیں جانتا چوکی پر بیٹھنے کا حق بھی نہیں رکھتا۔ یہ تجھے تیری چوکی سے اتارنے کو مانگتا ہے۔''

''ایسے کیسے اتارنے کو مانگتا ہے۔ یہ چوکی اس کے باپ کا جاگیر ہے کیا؟'' مجو بری طرح بدکا۔

''جاگیر یہ کسی کے باپ کا نہیں ہے۔ ہر دادا اپنے بل پر چوکی حاصل کرتا ہے اور بل پر ہی چوکی پر بیٹھتا ہے۔ ربن دادا آج تیرے کو چیلنج کرنے کے واسطے ادھر آیا ہے۔ اب تیرے میں دم ہے تو اپنی چوکی بچا لے ورنہ جو فیصلہ ہو اس کو مان لینا۔ ہم سارے ادھر اس واسطے ہی جمع ہوئے ہیں کہ جو

فیصلہ ہو۔ انصاف سے ہو اور کل کو کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اس کے ساتھ بے ایمانی ہوئی ہے۔'' نانا نے اسے صاف لفظوں میں آگاہ کیا۔

''اگر اپن ربن کا چیلنج ماننے سے انکار کر دے تو؟'' متذبذب سے مجو نے اس سے سوال کیا۔ اسے خود بھی احساس تھا کہ وہ بہت بری طرح پھنس چکا ہے اور فرار کی کوئی راہ باقی نہیں رہی ہے اس لیے اس کی گہری سانولی رنگت بالکل سیاہ پڑ گئی تھی۔ جس زمانے وہ اس چوکی پر بیٹھا تھا، چھریرے بدن کا چست و پھرتیلا آدمی تھا لیکن گزرتے وقت نے اس سے اس کی یہ خصوصیات چھین لی تھیں۔ برسوں کی حکمرانی نے اسے سہل پسند بنا دیا تھا اور وہ اپنے ہاتھ پیر چلانے سے زیادہ چیلوں چانٹوں سے کام لینے کا عادی ہو گیا تھا۔ ایسے میں ربن کا چیلنج اس کے لیے پریشانی کا سبب بن گیا تھا تو کچھ ایسا عجب بھی نہیں تھا۔

''انکار کا مطلب ہوگا کہ تو نے بغیر لڑے ہی ہار مان لی اور اپنی چوکی اپنے ہاتھ سے ربن کے حوالے کر دی۔'' نانا نے واضح الفاظ میں کہا تو باقی سب بھی اس کی تائید میں سر ہلانے لگے۔

''اس کی تو اپن ایک جھٹکے میں انتڑیاں نکال کر باہر رکھ دے گا۔'' مجو کو جوش آ گیا اور وہ ایک جھٹکے سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ربن نے بھی اپنی جگہ سے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی لیکن وہ مجو کی طرح جوش یا غیظ و غضب میں مبتلا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کسی گہرے سمندر کی طرح خاموش اور پُرسکوت تھا۔ وہاں موجود داداؤں نے فریقین کو میدان میں اترتے دیکھا تو ایک دم الرٹ ہو گئے اور اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کر دیواروں کے ساتھ سمٹ کر کھڑے ہونے لگے۔ ان کے حکم پر ہی اس بڑے سے ہال نما کمرے سے کرسیاں سمیٹ کر باہر لے جائی جانے لگیں۔ یہ کام کرنے والے مجو کے اپنے آدمی تھے لیکن اس وقت ان کے لیے بھی حالات ایسے ہو گئے تھے کہ وہ محض مجو کے حکم کے پابند نہیں رہے تھے۔ انہیں وہاں موجود سب بڑوں کے مشترکہ فیصلوں کا احترام کرنا تھا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد ہی مجو سمیت ان سب کی قسمت کا فیصلہ بھی ہونے والا ہے۔ مجو جیت جاتا تو سب کچھ پہلے جیسا رہتا لیکن اس کی شکست کی صورت میں انہیں یا تو ربن کی غلامی قبول کرنی پڑتی یا اپنے لیے نئی راہیں تلاش کرنی پڑتیں اور یہ دونوں باتیں اتنی آسان نہیں تھیں۔ انہیں خوف تھا کہ ان پر تسلط حاصل کرنے کے بعد جانے ربن ان کے ساتھ کیا سلوک کرتا کہ قریباً وہ سب کے سب ہی اس کے علاقے پر حملہ کرنے والوں میں شامل رہے تھے۔

ربن کی غلامی قبول نہ کرنے کی صورت میں انہیں کسی دوسرے اڈے کا رخ کرنا پڑتا اور یہ ضروری نہیں تھا کہ دوسری جگہ انہیں قبول کر لیا جاتا، سو ان کی پریشانی بالکل جائز تھی۔ پریشانی کے باوجود انہوں نے خود کو ملنے والے احکامات کی تعمیل بہ احسن طریقے سے کی اور لمحوں میں وہاں مقابلے کا میدان سج گیا۔ اس مختصر عرصے میں مجو نے بھی خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا اور اب اس کے چہرے پر جھجک یا تذبذب کے بجائے عزم سا دکھائی دے رہا تھا جیسے طے کر چکا ہو کہ ہر حال میں یہ لڑائی جیتنی ہے۔ یہ جیت اس کے لیے لازمی بھی تھی کہ اس جیت سے اس کی عزت اور بقا دونوں ہی جڑی ہوئی تھیں۔ اس عزم نے اس کے جسم میں سو جانے والی اس کی چستی اور پھرتی کو بھی جگا دیا تھا اور اب وہ چاقو ہاتھ میں تھامے ربن کے مقابل یوں کھڑا تھا کہ اس کا چاقو دونوں ہاتھوں کے درمیان برق کے کوندوں کی طرح حرکت کر رہا تھا۔ اس لپکتی برق پر کسی کی نظریں نہ ٹھہرتی تھیں البتہ بالکل ساکت و سامت کھڑے ربن کی نگاہیں اپنے پورے ارتکاز کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے چاقو پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ اس کے ارتکاز کا ہی کمال تھا کہ جب مجو نے بالکل اچانک چاقو کو دونوں ہاتھوں کے درمیان حرکت دینا چھوڑ کر دائیں ہاتھ سے ربن کے بائیں پہلو پر حملہ کیا تو وہ بہت سہل طور پر دائیں جانب جھک کر اس وار کو بچا گیا۔ مجو نے بھی جواباً پھرتی سے پینترا بدلا اور فوراً ہی اس کے دائیں پہلو پر حملہ آور ہوا۔ اس حملے میں ایسی پھرتی اور چابک دستی تھی کہ مقابل ربن کے بجائے کوئی اور ہوتا تو اس کا دایاں بازو بری طرح ادھڑ چکا ہوتا۔ ربن نے بھی یہ وار بس چند سینٹی میٹر کے فاصلے سے ہی بچایا تھا اور وہاں موجود حاضرین کی گویا سانسیں رک گئی تھیں۔

چاقو وہ سب ہی چلانا جانتے تھے لیکن ایسی نوبت بہت کم آتی تھی کہ دو اس قدر منجھے ہوئے افراد ایک دوسرے کے مقابل آن کھڑے ہوں۔ وہ سب کے سب حقیقتاً بنا پلک جھپکائے یہ مقابلہ دیکھ رہے تھے کہ سب ہی کو معلوم تھا کہ پلک جھپکانے کے مختصر عرصے میں بھی صورتِ حال میں کوئی بڑی تبدیلی آ سکتی ہے۔ دوسرے حملے کی ناکامی کے بعد مجو نے بلاتاخیر تیسرا وار ربن کی پسلیوں پر کیا تھا جس سے بچنے کے لیے وہ یک دم ہی زمین پر پلٹ گیا اور لیٹے لیٹے ہی مجو کے پیروں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس زور سے

اسے اچھالا کہ وہ اس کی دوسری طرف جا کر الٹ گیا۔ مجو کے تین حملوں کے جواب میں یہ ربن کا پہلا داؤ تھا اور اس میں بھی اس نے چاقو کا استعمال نہیں کیا تھا۔ گرنے کے بعد مجو بے مثال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی اسپرنگ کی طرح فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ربن بھی اس اثنا میں اپنے قدموں پر کھڑا ہو چکا تھا اور اب اس کی انگلیوں کے درمیان دبا اس کا چاقو سب کو صاف دکھائی دے رہا تھا۔ تیز دھار والے چمک دار چاقو کو دیکھ کر کچھ کے ہونٹوں سے بے ساختہ ہی سسکاریاں سے نکل گئیں۔ ربن دادا کے چاقو کے کارنامے سب نے ہی سن رکھے تھے اور کہنے والے کہتے تھے کہ جب یہ چاقو کھلتا ہے تو انسانی خون کا ذائقہ چکھے بغیر بند نہیں ہوتا۔ اس چاقو کو دیکھ کر مجو کی آنکھوں میں بھی خون اتر آیا اور وہ تقریباً اڑتا ہوا اس طرح ربن پر آیا کہ اس کے ہاتھ میں کھلے چاقو کا نشانہ ربن کا دل تھا۔ ربن دائیں بائیں کسی بھی سمت جھکائی دیے بغیر کسی پہاڑ کی طرح اپنی جگہ ڈٹا کھڑا رہا اور عین وقت پر اپنے چاقو والے ہاتھ کو آگے پھیلا دیا۔ دونوں چاقوؤں کے آپس میں ٹکرانے سے فضا میں چنگاریاں سی چمکیں لیکن دونوں ہی شہ زوروں میں سے کسی کے ہاتھ سے چاقو جدا نہ ہوا۔

اس بار ربن نے حملے میں پہل کی اور نیم دائرے کی صورت گھومنے کے بعد اپنا ہاتھ پھیلا کر یوں مجو پر وار کیا کہ دیکھنے والوں کو گمان گزرا کہ مجو کا جسم سینے سے لے کر پیٹ تک ادھڑ کر رہ جائے گا لیکن اگلا پل مجو سمیت ہر ایک کے لیے حیرت انگیز تھا۔ چاقو نے مجو کی کھال تک کو نہ چھوا تھا اور اس کے جسم پر موجود سفید کرتہ نہایت نفاست سے گریبان سے لے کر دامن تک چاک ہو گیا تھا۔ چاک ہو جانے والے کرتے سے مجو کا کسی ریچھ کی طرح بالوں سے بھرا سینہ اور پیٹ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اتنے نفیس وار پر وہاں موجود افراد کے لبوں سے بے ساختہ ہی نعرۂ تحسین بلند ہوا اور مجو کا چہرہ احساسِ ذلت سے سیاہ پڑ گیا۔ ربن نے عملاً بھری محفل میں اس کے کپڑے اتار کر رکھ دیے تھے۔ اس بے عزتی پر وہ کسی وحشی جانور کی طرح چنگھاڑتا ہوا ربن کی طرف لپکا۔ اس حیوانی لپک میں پھرتی اور تندی تو ضرور تھی لیکن وہ حساب کتاب پورا نہیں تھا جو حملے کو کامیاب بناتا ہے۔ حساب کتاب کی اس کمی کو ربن کی زیرک نگاہوں نے فوراً ہی جانچ لیا اور ذرا سا دائیں طرف ہٹتے ہوئے اس نے اپنی ایک ٹانگ کو یوں حرکت دی کہ مجو کو اڑنگا لگ گیا اور وہ منہ کے بل پختہ فرش پر گرا۔ گرنے کے نتیجے میں اس کے سامنے کے کم سے کم تین دانت ٹوٹ گئے تھے اور منہ سے خون ابل پڑا تھا۔ اس کا خون دیکھ کر اس کے ہمدردوں میں سے چند نے بے ساختہ حرکت کرنی چاہی لیکن نانا نے اپنے دائیں بازو کو تنبیہی انداز میں بلند کر کے ان کے ارادے کی راہ میں آہنی دیوار کھڑی کر دی۔ وہ سب اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گئے کیونکہ یہ تو ہر ایک جانتا تھا کہ فیصلہ ہو جانے سے قبل کسی کو مداخلت کی اجازت نہیں مل سکتی۔ مجو کو اگر خود کو زور آور ثابت کرنا تھا تو زخمی حالت میں بھی کھڑے ہو کر لڑنا تھا ورنہ دوسری صورت یہی تھی کہ وہ اپنی شکست کو تسلیم کر لیتا اور اس کے منہ سے بہتے خون کی روک تھام کے لیے کوئی تدبیر کی جاتی۔ مجو نے ایک دادا کی شان کے مطابق زخمی حالت میں کھڑے ہو کر لڑائی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس موقع پر ربن نے بھی اسے خاصی رعایت دی اور اس کے کھڑے ہو جانے تک خود کوئی وار نہیں کیا۔

''تو اپن سے اپنی گدی نہیں چھین سکتا ربن۔'' چند منٹ کی لڑائی میں ہی ربن کا پلہ واضح طور پر بھاری دکھائی دینے لگا تھا اور مجو خود بھی اس حقیقت کو محسوس کر چکا تھا اس لیے شاید آپ اپنا حوصلہ بڑھانے کے لیے وحشت زدہ لہجے میں یہ اعلان کیا۔ سامنے کے دانت ٹوٹ جانے کے باعث اس کے دہانے سے جو آواز نکلی، وہ بہت عجیب و غریب تھی۔ خود وہ بھی اپنے سیاہ رنگت والے بدصورت چہرے پر منہ سے بہتے خون کی لالی سجائے خاصا عجیب الخلقت لگ رہا تھا۔ اس کی بھڑک سن کر ربن یوں استہزائیہ انداز میں مسکرایا جیسے کوئی بڑا بچے کے طفلانہ دعوے پر مسکراتا ہے۔ اس کی اس مسکراہٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مجو دادا بالکل ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے کسی بھینسے کی طرح ڈکراتے ہوئے چاقو سمیت ربن پر حملہ کیا۔ ربن نے فوراً ہی پہلو بدلا اور اپنے چاقو والے ہاتھ کو جنبش دی۔ اگلے ہی پل سب نے مجو کی دلدوز چیخ سننے کے ساتھ اس کے چاقو کو زمین پر گرا ہوا دیکھا۔ چاقو کے قریب ہی دو خون آلود ٹکڑے بھی گرے ہوئے تھے۔ چند انچ کے ان ٹکڑوں کے بارے میں پہلی نظر میں تو کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکا کہ یہ کیا شے ہیں لیکن بائیں ہاتھ سے اپنے دائیں ہاتھ کو تھام کر خون روکنے کی کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ چیخیں مارتے مجو کو دیکھ کر سب نے جانا کہ چاقو کے قریب پڑے وہ دو خون آلود ٹکڑے دراصل اس کے ہاتھ سے جدا ہونے والی دو انگلیاں ہیں۔ ان دو انگلیوں میں سے ایک دراصل اس کا انگوٹھا تھا اور یہ کٹا ہوا انگوٹھا اعلان کر رہا تھا کہ چوکی پر بیٹھنا تو دور کی بات مجو اب

کبھی ہاتھ میں چاقو بھی نہیں تھام سکے گا۔

مجو کے اس انجام پر جہاں ربن کے حامیوں نے فاتحانہ نعرے بلند کیے، وہیں سنجیدہ مزاج افراد اس کے تیزی سے بہتے خون کو روکنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ غم اور ذلت سے لبریز مجو نے بلاتفریق ہر دو طرح کے افراد کو گالیوں سے نوازنا شروع کر دیا۔ اس کی گالیوں کا کسی نے اثر نہیں لیا کہ سب ہی جانتے تھے یہ ایک شکست خوردہ آدمی کا اظہارِ جھنجلاہٹ ہے۔ عارضی طور پر خون کے بہاؤ کو کم کرنے کی تدبیریں کرنے کے بعد مجو کو فوراً ہی اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ اسے اسپتال لے جانے والوں میں دادر اور ماہم کے پاڑوں کے غیر جانبدار افراد شامل تھے۔ وہ اسپتال روانہ ہو گیا تو خون آلود فرش کی صفائی کے بعد ایک بار پھر سارے دادا اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ سامنے فرش پر ان کے ساتھ آئے افراد کے علاوہ مجو کے اڈے کے جملہ ارکان براجمان تھے۔ مجو کے انجام نے ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑا دی تھیں۔ ربن اور اس کے درمیان جس نوعیت کا مقابلہ ہو رہا تھا اس میں امکان تو یہاں تک بھی تھا کہ دونوں میں سے کوئی ایک فریق اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا لیکن ربن نے مجو کو جس دردناک انجام سے دوچار کیا تھا، وہ اپنی جگہ خود ایک مثال تھا۔

علاج کے بعد مجو آرام سے چلتا پھرتا، سانسیں لیتا اپنی زندگی کو جاری رکھ سکتا تھا لیکن اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اب وہ کبھی اپنے ہاتھ میں چاقو تھام سکے۔ چاقو تھامنے سے محرومی کسی دادا کے لیے جان چلے جانے سے بڑھ کر سزا تھی اور سب جانتے تھے کہ ربن نے مجو کو یہ سزا فاروق کی وجہ سے دی ہے ورنہ اس سے قبل وہ ثریا بانو کے اغوا کے لیے اپنے علاقے پر کیے جانے والے حملے پر انہیں طرح دے چکا تھا۔ اس کے ساتھیوں میں سے اس وقت وہ افراد سب سے زیادہ خوف زدہ تھے جو زمرد بائی کے کوٹھے پر فاروق اور مجو کے درمیان ہونے والی جھڑپ کے موقعے پر موجود تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ ربن چاہے دیگر افراد کو بخش دے لیکن فاروق کے لیے باعثِ آزار بننے والوں کو نہیں بخشے گا۔ وہ ایک خوف کے عالم میں داداؤں کے جھرمٹ میں خاموشی سے بیٹھے ربن کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے سپاٹ چہرے سے اس کے کسی بھی ارادے کا اندازہ لگانا سخت دشوار تھا۔ اپنی قسمت کا لکھا پڑھنے کے لیے اس کے چہرے کو ٹٹولتی نگاہوں کو ناکام و نامراد ہو کر مایوس پلٹنا پڑا پھر وہ نانا کی آواز پر ہمہ تن گوش ہو گئے جو اپنی پاٹ دار آواز میں ان ہی سے مخاطب تھا اور کہہ رہا تھا۔

''میرے دوستو! یہاں جو کچھ ہوا تم سب نے اپنی نگاہوں سے دیکھا۔ تم جانتے ہو کہ اس مقابلے میں کوئی بے ایمانی اور دھوکا نہیں کیا گیا اور ربن دادا نے اپنے چیلنج کے نتیجے میں صاف طور پر اس اڈے کی گدی حاصل کر لی جس پر تھوڑی دیر پہلے مجو دادا بیٹھا کرتا تھا۔ ہماری ریت کے مطابق آج سے اس اڈے کا مالک ربن دادا ہے۔ اگر کوئی اسے اڈے کی چوکی پر بٹھانے سے انکاری ہے اور سمجھتا ہے کہ ربن دادا کو ایسا کوئی ادھیکار نہیں ہے تو وہ کھل کر بول سکتا ہے۔ بولنے والے کو کچھ نہیں کہا جائے گا، بس اسے ریت کے مطابق ربن دادا کو پچھاڑ کر اپنے چیلنج کو ثابت کرنا ہوگا کیونکہ یہی ہماری ریت ہے کہ دادا اپنے بل پر اڈے کی چوکی پر بیٹھتا ہے اور ہر دم تیار رہتا ہے کہ کب کوئی سوا سیر آ کر اسے اس چوکی سے اتار دے۔ تم سب کے لیے بھی راستہ پوری طرح کھلا ہوا ہے۔ تم میں سے جو چاہے ربن کے سامنے چاقو لے کر کھڑا ہو جائے اور اس گدی کو حاصل کر لے۔''

نانا کی پاٹ دار آواز میں کیے گئے اس اعلان پر کسی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا اور سب کے سب سر نیہوڑائے بیٹھے رہے۔ نانا نے تھوڑی دیر ردِعمل کا انتظار کیا اور پھر بولا۔

''اپن نے تمہارا فیصلہ سن لیا ہے۔ تم ربن کو اس چوکی کا مالک مانتا ہے اور اسے چیلنج کرنے کا نہیں ہے۔ ایسے میں اپنا کام ختم ہو جاتا ہے۔ اب تم سے تمہارا یہ دادا ہی بات کریں گا۔'' اپنی بات ختم کر کے نانا ربن کی طرف دیکھنے لگا۔ ربن نے متانت سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پہلے تو نانا سمیت ان سب داداؤں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے اس کے بلاوے پر یہاں تک آنے کی زحمت کی اور اس مقابلے کی شفافیت کا گواہ بننا منظور کیا پھر وہ براہِ راست اپنے زیرِ نگیں آ جانے والوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

''اپن جانتا ہے کہ تم میں سے بہت سارے لوگ اس بات سے ڈر رہے ہیں کہ جانے چوکی پر بیٹھنے کے بعد سالا ربن دادا تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ اپن یہاں موجود تم میں سے ہر ایک کا اگلا پچھلا اچھی طرح جانتا ہے اور اپنے کو پوری جانکاری ہے کہ کس نے کدھر کیا کیا، کر رکھا ہے۔ پر اپن کو تم میں سے کسی سے بدلہ لینے کا نہیں ہے۔ ایسا سمجھو کہ ادھر چوکی پر صرف تمہارا نیا دادا نہیں بیٹھا ہے بلکہ تم سب سالا بھی ایک دم نیا ہو گیا ہے۔ اپن تمہارے ساتھ

اپنے پچھلے سارے کھاتے بند کر رہا ہے پر دھیان رکھنا کہ آگے کا سارا حساب کتاب صاف رہے کیونکہ اپن ذرا الگ مزاج کا بندہ ہے جو دشمنوں کو تو معاف کر دیتا ہے لیکن اپنے بندوں کو سونے کا نوالہ کھلا کر شیر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔''

ربن کے یہ الفاظ ان سب کے لیے زندگی کا پیام تھے۔ گزرے ہوئے پر معافی کا اعلان کر کے اس نے ان کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ سب یک دم جوش میں آگئے اور بلند آواز میں ربن دادا زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ یہ ہنگامہ تھا تو مٹھائی اور مشروبات سے خاطر مدارات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہاں موجود دو داداؤں نے باقاعدہ گلے لگا کر ربن کو اس کامیابی کی مبارک باد دی۔ راموسمیت ربن کے ساتھ آئے اس کے آدمی خوشی سے چہچہاتے رہے۔ خوشی کا اظہار کرنے میں مجو کے ساتھی بھی پیچھے نہیں تھے۔ کس کے دل میں کیا ہے، یہ تو وہ خود ہی جانتا تھا لیکن بہ ظاہر تو ذرا سی دیر میں ہر ایک مجو دادا کو بھول کر ربن سے وفاداری جتانے میں لگا ہوا تھا۔ وہاں اس وقت دنیا کی وہی تلخ ترین سچائی دہرائی جا رہی تھی کہ دنیا چڑھتے سورج کی پجاری ہوتی ہے اور مجو دادا ایک غروب ہو جانے والا سورج تھا جس کے دوبارہ طلوع ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ جہاندیدہ ربن کو سارے حقائق کا اچھی طرح ادراک تھا چنانچہ اس کے چہرے پر فتح کی سرشاری سے زیادہ تدبر کی سنجیدگی تھی۔ اسے احساس تھا کہ ایک نئے اڈے کی چوکی پر بیٹھ جانا اتنا بڑا کمال نہیں، اصل کمال اس چوکی پر جمے رہنا ہے اور اس کے لیے اسے بڑی بیدار مغزی سے کام لینا ہوگا۔ یہ اس کی فہم و فراست ہی تھی جس نے رات گئے تک اسے چوکی سے اٹھنے نہیں دیا اور وہ متانت سے اپنی جگہ بیٹھا اس محفل طرب میں شریک رہا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اس کا دل فاروق کے پاس پہنچنے کے لیے مضطرب تھا کہ ایک طرف ڈاکٹر کی تسلی کے باوجود اسے اس کی فکر دامن گیر تھی تو دوسری طرف وہ اسے یہ خوش خبری سنانے کو بے چین تھا کہ اسے اسپتال کے بستر تک پہنچانے کے ذمے داروں میں سے سب سے بڑا ذمے دار اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔

آدھی رات کے قریب جب سارے دادا ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہونا شروع ہوئے تو ربن کو موقع مل سکا کہ وہ بھی وہاں سے اٹھ سکے۔ روانگی سے قبل وہ کچھ آدمیوں کے ساتھ راموکو اپنے نائب کی حیثیت سے وہاں چھوڑ کر نکلا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں راموہی سب سے زیادہ تجربہ کار اور زیرک آدمی کا کردار ادا کر سکتا تھا اور ایک نئے اڈے کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے فی الحال انہیں بہت محنت کرنی تھی۔

☆☆☆

''سو جاؤ یار جانی! کب تک اس طرح کھونٹے کی طرح میرے سرہانے بیٹھے رہو گے۔'' آگے کی طرف سفر کرتی گھڑی کی سوئیوں کی طرف دیکھتے ہوئے فاروق نے کرسی پر الرٹ بیٹھے جانی کو مخاطب کر کے اس سے کہا۔

''اپن بالکل ٹھیک ہے فاروق بھائی، آپ بالکل ریلیکس ہو کر سو جاؤ۔ اپن ادھر اپنا ڈیوٹی دیتا ہے۔'' جانی نے اسے جواب دیا۔

''کیسی ڈیوٹی؟'' فاروق ہنسا۔ ''مجھے تو تم اپنے اٹینڈنٹ سے زیادہ چوکیدار لگ رہے ہو، بالکل ایسے مجھ پر نظریں جمائے بیٹھے ہو جیسے ڈر ہو کہ میں ذرا بھی تمہاری نظروں سے اوجھل ہوا تو اس اسپتال سے نکل بھاگوں گا۔ میرے ساتھ مریض کے بجائے خطرناک قیدی کا سا سلوک تو مت کرو یار۔'' فاروق نے اس کے سامنے اپنے احساسات کا اظہار کیا تو وہ بے چارہ شرمندہ ہو گیا۔

''ایسا کاہے کو بولتا ہے فاروق بھائی، اپن کیوں تمہارا چوکیداری کریں گا۔ وہ تو دادا اپن کو سختی سے بول کے گیا ہے کہ ایک دم ہوشیاری سے آپ کو لک آفٹر کرنا ہے تو اپن الرٹ بیٹھا ہے۔ آپ اپن کو بولو کہ آپ اپنے سے کیا خدمت کرنا مانگتا ہے؟'' اس نے نہایت سادگی سے اپنے اس طرح تن کر بیٹھنے کی وجہ بتاتے ہوئے اس سے پوچھا تو اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے فاروق کی دماغی رو ربن کی طرف مڑ گئی۔

''دادا کدھر گیا ہے؟ ڈاکٹر سے ملنے کے بعد جو وہ غائب ہے تو میں نے دوبارہ اس کی شکل نہیں دیکھی۔''

''دادا کو کدھری جانا ہے۔ راموا استاد ہی زبردستی کھینچ کھانچ کر اڈے پر لے گیا ہے کہ دادا ذرا آرام کر لے۔ یہ سالا اسپتال میں ڈھنگ سے نیند کدھر آتا ہے۔'' جانی نے اسے وہی بتایا جو اسے سکھایا گیا تھا۔ ربن کی طرف سے اس بات کی خاص تاکید تھی کہ فاروق کو اس کے مجو کے اڈے جانے کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے کیونکہ یہ خبر اس کے اعصاب کے لیے تناؤ کا سبب بن سکتی تھی اور ڈاکٹر نے اسے ہر طرح کی ٹینشن سے دور رکھنے کی ہدایت کی تھی۔

''یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو کہ اسپتال میں آدمی کو ڈھنگ سے نیند نہیں آتی۔ دواؤں کے سہارے کچھ دیر

کے لیے سوجاتا ہوں لیکن اڈے والی بےفکری کی نیند کا مزہ نہیں ملتا۔'' فاروق نے گم صم سے انداز میں اس کی بات کی تائید کی۔ ربن نے اسے بتایا تھا کہ جولیٹ کی ماں جوزفین دل کا دورہ پڑنے کے باعث چل بسی ہے اس خبر نے جہاں ایک طرف اسے اپنے وحشت ناک خواب کی توجیہہ دے کر قدرے مطمئن کر دیا تھا، وہیں وہ جولیٹ کے دکھ پر افسردہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ انسان مرنے والوں پر ایک نہ ایک دن صبر کر ہی لیتا ہے لیکن جدائی کا یہ جھٹکا فوری طور پر سہنا بہت مشکل ہوتا ہے پھر جولیٹ جیسی لڑکی کے تو جس کے پاس اس نے ماں باپ کے سوا کوئی تیسرا رشتہ نہیں دیکھا تھا، اس حادثے سے بہت زیادہ متاثر ہونے کے امکانات تھے۔ جولیٹ کے اس غم کا خیال اس کے دل کو بار بار مضطرب کر دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اچھا خاصا وقت گزر جانے کے باوجود نیند اب تک اس کی آنکھوں سے دور تھی حالانکہ سسٹر میری رات کے کھانے کے بعد اسے اس کی دوائیں کھلا کر جا چکی تھی اور ہونا یہی چاہیے تھا کہ اسے دوا کے اثر سے نیند آجاتی لیکن وہ اب تک جاگ رہا تھا اور جاگنے کی اس وحشت کو دور کرنے کا یہی حل رہ گیا تھا کہ جانی سے ہی گپ شپ کر لی جائے۔

''اڈے کا تو بات ہی الگ ہے۔ ادھر تو سالا ایسا چکاس نیند آتا ہے کہ ہم کبھی اپنے باپ کے گھر میں بھی اتنا ایزی ہو کر نہیں سویا ہوں گا۔'' جانی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''یہ تو تم نے بڑی عجیب بات کہی جانی۔ باپ کے گھر سے زیادہ بھلا آدمی کو اور کہاں آرام ملتا ہے؟'' جانی کی بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فاروق کا ذہن کہیں کھونے سا لگا تھا۔

''ہاں بولتے تو یہی ہیں کہ سالا ماں باپ کا چھاؤں آدمی کے لیے سب سے اچھا اور گھنا ہوتا ہے، پر اپن تم کو بتائے کہ دنیا میں سب کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ اپن نے اپنے باپ کے گھر میں بڑا ڈینجرس ٹائم گزارا ہے۔ وہ بڑا پکا شرابی تھا۔ اپن نے کبھی اس کو شراب کا بوتل کے بغیر نہیں دیکھا۔ شراب پی کر وہ اپن کی ماں کو روئی کی طرح دھنکتا تھا اور جب وہ گھر سے چلی جاتی تھی تو ہم بچہ لوگ کے پٹنے کی باری آجاتی تھی۔ نشے میں وہ ہم سب کو ننگی ننگی گالیاں دیتے ہوئے اس بات پر الجھتا رہتا کہ ہم پانچوں میں سے جانے کون اس کا چائلڈ ہے اور کون نہیں ہے۔ ایسا اس لیے تھا کہ وہ روپے کے لیے اپن کا ماں سے پیشہ کرواتا تھا۔ خود اس کے پاس تو نشے سے اتنی فرصت ہی نہیں ہوتا تھا کہ کمانے دھمانے کو جا سکے، اس لیے بیوی کو دھندے سے لگا کر اس نے اپنے لیے آسانی پیدا کرلی تھی۔ ہم پانچوں ہر رات پہلے اپنی ماں کو پٹتے دیکھتا، پھر اسے اپنے مردہ تن پر شوخ کپڑے اور سرخی پاؤڈر مل کر دھندے پر جاتے دیکھنے کی اذیت سہتا تھا اور آخر میں خود بھی چار چوٹ کی مار کھاتا تھا۔ تو تم بولو کہ ایسے میں اپن کو بےفکری کا نیند کدھر سے آتا ہوئیں گا جبکہ اکثر تو اپنے پیٹ میں روٹی بھی نہیں ہوتا تھا۔ کیا سمجھا تم...... اپنا ماں جو اپنی روح اور جسم کو بیچ کر پیسا لاتا تھا، اس میں سے باپ کا نشے کا لت پوری ہونے کے بعد ہی اپنے پیٹ کے لیے روٹی مل سکتا تھا اور یہ روٹی روزانہ نہیں ملتا تھا۔ اسی لیے اپن صرف گیارہ سال کا ایج میں گھر چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ گھر سے بھاگ کر بھی اپن نے بڑا بھوک جھیلا، لوگوں کی لاتیں کھایا اور فٹ پاتھوں پر کچی پکی نیند سویا تب کہیں جا کر ربن دادا کے اڈے تک پہنچا اور ادھر آ کر اپن کو زندگی میں پہلی بار پیٹ بھر کھانے کے ساتھ آرام کا نیند سونے کا ملا۔ اس لیے اپن اچھی طرح جانتا ہے کہ اڈے سے زیادہ اچھا نیند آدمی کو کدھر نہیں آتا۔'' جانی اسے اپنی زندگی کے تلخ حقائق کی جھلکیاں دکھا رہا تھا اور وہ دم بخود بیٹھا تھا کہ دنیا میں کیسے کیسے حادثات رونما ہوتے ہیں۔ ہر دم ہنسنے بولنے والے جانی کو دیکھ کر کون گمان کر سکتا تھا کہ وہ اپنے دل پر کیسے داغ لیے پھر رہا ہے لیکن داغ تو شاید ان سب کے دلوں پر ہی موجود تھے۔ اپنے اپنے حالات سے فرار وہ سب مختلف وجوہات کی بنا پر ایک ایسی دنیا میں اکٹھے ہو گئے تھے جو عام آدمی کی دنیا سے بہت الگ تھی لیکن ان کی دنیا کو تعجب کی نگاہ سے دیکھنے والے نہیں سمجھتے تھے کہ جب کسی انسان کو نارمل زندگی جینے کا حق نہیں ملتا تو ہی وہ ایسی دنیا کا حصہ بن جاتا ہے جو انہیں اجنبی دکھائی دیتی ہے۔

''تم ابھی تک سویا نہیں مسٹر فاروق؟'' جانی کی داستان حیات نے اسے اتنا محو کر دیا تھا کہ سسٹر میری کے دروازہ کھول کر اندر آنے کا علم نہ ہو سکا۔ وہ لگ بھگ چالیس سال کی ایک قبول صورت عورت تھی جس کے چہرے پر ممتا کے تاثرات گویا ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ اپنی آنکھوں کے نرم تاثرات اور ہونٹوں پر ہردم پھیلی مہربان مسکراہٹ کے ساتھ وہ ہمیشہ ایک ماں دکھائی دیتی تھی جس کی ممتا جنس، عمر، قوم اور نسل کی تفریق کے بغیر ہر ایک کے لیے عام تھی۔ اس وقت بھی اپنے بستر پر بیٹھ کر جاگتے فاروق کو ٹوکتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک بے حد محبت کرنے والی ماں کی

ہی مصنوعی خفگی تھی۔

''نیند نہیں آرہی تھی سسٹر اس لیے ہم آپس میں باتیں کرنے لگے۔'' فاروق نے بھی کسی بچے کی سی ہی معصومیت کے ساتھ اسے جواب دیا۔

''ایسے فل لائٹس آن کر کے آپس میں ٹاک کرتا رہے گا تو نیند کیسے آئے گا۔ ہم لائٹس آف کر رہا ہے۔ تم آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ جاؤ، نیند بھی آجائے گا۔'' اس نے وہی اپنے ممتا بھرے مخصوص لہجے میں حکم صادر کیا اور آگے بڑھ کر اس کے سرہانے رکھا تکیہ درست کرنے لگی۔ فاروق تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا تو اس نے اس کے پائنتی پڑی چادر کھول کر قرینے سے اس کے اوپر پھیلائی اور تیز روشنی والی بتیاں بجھا کر مدھم روشنی کا سبز بلب جلا دیا۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر وہ جانی کی طرف مڑی اور ذرا بارعب لہجے میں بولی۔

''تم بھی اب سو جاؤ مسٹر......! تمہیں رات بھر ایسے بیٹھ کر پیشنٹ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کا کوئی نیڈ نہیں ہے۔ تمہارے ایسے بیٹھے رہنے سے یہ ڈسٹرب ہوگا۔ خود بھی ایزی رہو اور اسے بھی ریلیکس کرنے دو۔ ہم ادھر رات بھر ڈیوٹی پر ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد راؤنڈ مار کر آبزرو کرتا رہے گا۔''

''ٹھیک ہے سسٹر، اپن سو جاتا ہے۔'' اس کے تحکمانہ انداز پر جانی سٹپٹا گیا اور کرسی سے اٹھ کر سونے کی تیاری کرنے لگا۔ میری مطمئن سی ہو کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اب کمرے میں خاموشی کا راج تھا۔ بے حد پُرسکون ماحول میں وہ دونوں اپنی اپنی جگہ آنکھیں موندے لیٹے تھے۔ فاروق کو اب بھی نیند نہیں آرہی تھی لیکن وہ جانی کے خیال سے جلد ہی خود کو سوتا ہوا ظاہر کرنے لگا تاکہ وہ اس کی طرف سے بے فکر ہو کر سو جائے۔ اس کی اس حکمتِ عملی اور کمرے کے پُرسکون ماحول نے آخر کار اپنا اثر دکھا ہی دیا اور تھوڑی دیر بعد جانی ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگا۔ خراٹوں کی آواز اتنی بلند نہیں تھی کہ فاروق کو ڈسٹرب کرنے کا سبب بنتی لیکن وہ ڈسٹرب ہو رہا تھا۔ جانی کے خراٹوں سے نہیں بلکہ اس دشمن جان کے خیال سے جو بنا دستک دیے جب چاہے اس کے تصور کی دنیا میں چلی آتی تھی اور آج کل تو یہ حال تھا کہ اس کا خیال ذہن سے جدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اس کے دکھ کے خیال سے اپنے دل کو دکھی کر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی طرح ہی وہ بھی اپنے بستر پر لیٹی جاگ رہی ہوگی اور شاید اس کی آنکھ سے آنسو نکل کر اس کے تکیے کو بھگو رہے ہوں گے۔ وہ جس مزاج کی لڑکی تھی اس سے اسے یہی توقع تھی کہ اس نے اپنے غم کو آنسوؤں کی صورت دوسروں کے سامنے آنکھوں سے بہانے میں بہت احتیاط کی ہوگی اور صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتی رہی ہوگی، خصوصاً اس لیے بھی کہ اسے اپنے باپ کا احساس ہوگا کہ کہیں اس کے رونے سے اس کے باپ کا غم مزید بڑھ نہ جائے۔ اپنے باپ کے حوصلے کو قائم رکھنے کے لیے وہ اپنے دل پر جبر کرتی رہی ہوگی اور ایسے مطمئن لوگ جو سب کے سامنے کھل کر نہ رو سکیں، رات کے اندھیرے میں اپنے تکیے کے ساتھ ہی اپنے آنسو بانٹتے ہیں۔

جولیٹ کے بارے میں اس کا یہ اندازہ اتنا غلط بھی نہیں تھا، وہ جوزف سے پہلی بار گلے ملنے پر اپنے لٹنے اور ماں کے کھو جانے کے غم پر روئی ضرور تھی لیکن پھر اس نے بہت جلد خود کو سنبھال لیا تھا اور ضبط و ہمت کا پیکر بنی نڈھال پڑے جوزف کو ہمت اور دلاسا دیتی رہی تھی اور اب رات کی تاریکی میں جوزف کے سو جانے کے بعد بہت خاموشی سے اپنے تکیے پر سر رکھے آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے آنسو فاروق کے دل تک رسائی حاصل کر رہے تھے اور وہ خود کو اندر سے بھیگا بھیگا سا محسوس کر رہا تھا۔ انسانی وصف ہے کہ جب کسی دوسرے کا غم شدت سے محسوس ہو تو اپنے اندر کے کھاتے بھی خود بخود ہی کھلتے چلے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ بھی یہی ہونے لگا۔ جدائی کے جو عذاب اس نے سہے تھے، رات کے اس پہر وہ بھی آ کر اس کے دل پر برسنے لگے اور ذرا دیر میں اتنا جل تھل ہو گیا کہ نمکین پانیوں کا اندر ہی ٹھہرے رہنا ممکن نہ رہا اور اس کی آنکھوں کے گوشوں سے سیلابی ریلے سے بہہ کر تکیے میں جذب ہونے لگے۔ یہ سیلابی ریلے اتنے ہی خاموش تھے جیسے کسی گاؤں میں رات کے آخری پہر اچانک بند توڑ کر گھس آنے والا پانی ہوتا ہے۔ میٹھی نیند میں ڈوبے دیہاتیوں کو اس سیلاب کی آمد کی خبر اس وقت تک نہیں ہو پاتی جب تک وہ خود اس کی لپیٹ میں نہیں آجاتے۔

پُرسکون کمرے میں اس سے چند فٹ کی دوری پر سویا ہوا جانی بھی بالکل بے خبر تھا اور وہ آنسوؤں کے سیلابی ریلے میں بہے چلا جا رہا تھا۔ اچانک ہی اس کے کانوں نے دروازہ کھولے جانے کی ہلکی سی آواز سنی۔ وہ سمجھ گیا کہ سسٹر میری راؤنڈ لگانے آئی ہے۔ گو کمرے میں بہت مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا پھر بھی اندیشہ تھا کہ اس کے آنسو سسٹر کی نظروں میں آجائیں گے۔ ان آنسوؤں کی پردہ پوشی کے

لیے اس نے جلدی سے کروٹ بدل کر دیوار کی طرف منہ کرلیا اور کسی گہری نیند سوئے ہوئے آدمی کی طرح خود کو بالکل ساکت کر لیا۔ ذرا ہی دیر میں دروازہ دوبارہ بند ہوگیا۔ یقیناً سسٹر اپنا اطمینان کرنے کے بعد واپس جا چکی تھی۔ اس کی آمد نے البتہ یہ کام دکھایا تھا کہ فاروق کے ذہن میں چلتا تکلیف دہ خیالات کا سلسلہ تھم گیا تھا اور اس سلسلے کے رکنے سے آنسو بھی خود بخود تھم گئے تھے لیکن وہی بات تھی کہ سیلاب جب بھی آتا ہے تو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہنچاتا ہے۔ اس کے وجود پر سے گزرنے والے سیلاب نے بھی اپنا اثر دکھایا اور وہ سر میں ٹیس سی محسوس کرنے لگا۔ ایسی ٹیسوں کا رونے کے بعد اٹھنا عموماً ایک قدرتی سا عمل ہوتا ہے۔ اس لیے اس نے زیادہ پروا نہیں کی حالانکہ ڈاکٹر نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے یہ بات سمجھا دی تھی کہ اگر وہ اپنے سر کی تکلیف سے جلد از جلد نجات چاہتا ہے تو علاج کے ساتھ ساتھ ذہنی دباؤ سے بھی بچنے کی کوشش کرنی ہوگی۔

ڈاکٹر کی ہدایت کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ اسے یوں بھگتنا پڑا کہ سر میں اٹھتی ٹیسیں آہستہ آہستہ شدت اختیار کرنے لگیں۔ اس صورتِ حال میں بھی اس نے گہری نیند سوئے ہوئے جانی کو آواز دے کر جگانا مناسب نہ سمجھا، نہ ہی سرہانے لگی نرس کو بلانے والی گھنٹی کا بٹن دبایا اور یہ سوچ کر کہ شاید کھلی فضا میں ٹہلنے سے درد میں کچھ افاقہ ہوجائے، بستر سے اتر کر بہ آہستگی پیر میں چپلیں ڈال کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ لمبے سے برآمدے میں ایک قطار میں بہت سے کمروں کے دروازے کھل رہے تھے۔ یہ سب کے سب پرائیویٹ رومز تھے۔ برآمدے کے آخر میں استقبالیہ کاؤنٹر تھا جہاں ڈیوٹی نرس موجود ہوا کرتی تھی۔ اس وقت کاؤنٹر خالی پڑا تھا۔ اس نے قیاس کیا کہ ڈیوٹی پر موجود سسٹر میری کسی کمرے میں ہوگی۔ سسٹر کی غیر موجودگی اسے اچھی لگی۔ وہ ہوتی تو اس سے سوال جواب کرتی اور رات کے اس پہر اس کے ٹہلنے کے لیے جانے کی خواہش کو قطعی منظور نہ کرتی چنانچہ موقعے کا فائدہ اٹھانے کے لیے اس نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کردی لیکن اپنے کمرے سے تیسرے کمرے کے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹک گیا۔ اندر سے ایسی آواز آئی تھی جیسے کوئی شے فرش پر گری ہو۔ ساتھ ہی اس نے کسی مرد کی نحیف سی آواز بھی سنی۔ اس نحیف آواز نے کیا کہا یہ تو وہ نہ سمجھ سکا لیکن جواب میں ابھرنے والی درشت مردانہ آواز بڑی واضح تھی۔

''چپکا پڑا رہ بڈھے اور میرا مزہ کرکرا نہ کر ورنہ ابھی تجھے ہمیشہ کے لیے خاموش کر ڈالوں گا۔'' اس آواز کے ساتھ ہی فاروق کو ایک گھٹی گھٹی سی نسوانی چیخ بھی سنائی دی اور بالکل ایسا لگا کہ کوئی اپنے منہ پر رکھی ہتھیلی کو ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخا ہو۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ اندر کوئی بڑی گڑ بڑ ہے۔ مختصر دورانیے کے لیے سنائی دینے والی گھٹی ہوئی نسوانی چیخ نے اس کے قدموں کو خاص طور پر تھام لیا تھا۔ وہ سر میں اٹھتی ٹیسوں اور باہر کھلی فضا میں ٹہلنے کے خیال کو یکسر بھول کر بند دروازے کی طرف لپکا اور اس کا ہینڈل گھمایا۔ اسے شک تھا کہ دروازہ اندر سے لاک ہوگا لیکن اندازے کے برعکس ہینڈل گھمانے پر دروازہ کھلتا چلا گیا۔ کھلے دروازے سے اس نے جو منظر دیکھا، اس نے اس کی رگوں میں خون کو کھولا کر رکھ دیا۔ وہ ایک تنومند جوان آدمی تھا جس کے نیچے کیتھرائن کسی ننھی چڑیا کی طرح دبی پھڑ پھڑا رہی تھی جبکہ مریضوں والے بستر پر ایک کمزور سا بوڑھا بے بسی کی تصویر بنا لیٹا تھا۔ اس کے دائیں بازو میں گلوکوز کی سوئی لگی ہوئی تھی۔

بس ایک نظر میں اس منظر کو دیکھنے کے بعد وہ کسی عقاب کی طرح کیتھرائن پر چھائے آدمی کی طرف جھپٹا اور اسے کالر سے پکڑ کر اس زور سے کھینچا کہ وہ ایک ہی جھٹکے میں کھڑا ہوگیا۔ فاروق نے براہِ راست اس کے منہ کو اپنے گھونسوں کی زد میں لے لیا۔ وہ آدمی یقیناً وہاں کسی کی آمد کی توقع نہیں کررہا تھا۔ اس لیے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ شاید اسے یہ یقین ہوگا کہ رات کے اس پہر وہاں کوئی نہیں آئے گا۔ اس یقین کی وجہ سے ہی اس نے کمرے کو اندر سے لاک کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا ہوگا۔ یوں فاروق کو آسانی سے اندر داخل ہونے کا موقع مل گیا تھا اور وہ نہایت غضب کے عالم میں اس خبیث کو مزہ چکھا رہا تھا جس نے ابتدائی چار پانچ گھونسے تو خاموشی سے کھا لیے لیکن پھر سنبھل کر اپنے دفاع کے لیے حرکت میں آیا اور بڑی زور سے اپنی دائیں ٹانگ فاروق کے گھٹنے میں ماری۔ اس گھٹنے پر تھانے میں کیے گئے ٹارچر کے نتیجے میں بھی ایک زخم آیا تھا۔ اس زخم پر چوٹ لگی تو وہ بلبلا سا گیا اور مقابل کو موقع مل گیا کہ اس پر دوسرا حملہ کرسکے۔ اس بار اس نے اپنے بھاری سر سے فاروق کے سینے کو نشانہ بنایا تھا۔ سینے پر لگنے والی سر کی یہ ضرب بھی خاصی زوردار تھی جس نے فاروق کو چند قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا۔ اپنی اس کامیابی پر مقابل کو جوش چڑھ گیا اور وہ مکا تان کر فاروق پر حملہ آور ہوا لیکن اس بار اسے کامیابی نصیب نہیں ہوئی اور فاروق نے درمیان میں ہی

اس کی کلائی پکڑ کر اس زور سے موڑی کہ وہ بے ساختہ چیخ اٹھا۔ فاروق نے اس کے باوجود بھی اس کی کلائی کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اسے یہ یقین نہیں ہو گیا کہ کلائی کا جوڑ کھل چکا ہے۔ مقابل جو اس کی نسبت خاصا صحت مند تھا، اس داؤ کی زد میں آکر کسی ذبح کیے جانے والے جانور کی طرح ڈکراتا چلا گیا اور یقیناً اس کی آواز دور تک سنائی دی تھی جو ردِعمل میں کئی کمروں کے دروازے کھلنے اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ فاروق نے اپنے مقابل کو کسی حقیر کیچوے کی طرح زمین پر پٹخا اور کیتھرائن کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ زمین سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور ایک دیوار سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ تنومند آدمی سے کھینچا تانی میں اس کے بلاؤز کے کئی بٹن ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ دائیں شانے پر سے بھی کپڑا پھٹ گیا تھا۔ اپنی اس عریانی کو چھپانے کے لیے وہ دونوں بازوؤں کی قینچی سی بنائے سینے پر باندھے ہوئے تھی۔ فاروق نے صاف محسوس کیا کہ وہ مکمل طور پر اپنے حواسوں میں نہیں ہے اور حادثہ اس پر بہت بری طرح اثر انداز ہوا ہے۔ اس نے بستر پر لیٹے بوڑھے کی ٹانگوں پر پڑی چادر کھینچ کر اس کی طرف پھینکی تو وہ ذرا سا چونکی اور اس کا مقصد سمجھتے ہوئے جلدی جلدی چادر کو اپنے گرد لپیٹنے لگی۔ اس دوران دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں کمرے تک آچکی تھیں اور دو تین لوگ کمرے میں بھی داخل ہو گئے تھے۔ اندر داخل ہونے والوں میں ایک اسپتال کا چوکیدار بھی تھا۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' کمرے کے منظر پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس نے سخت لہجے میں سوال کیا۔

''یہ کوئی بدمعاش ہے جو زبردستی یہاں گھس آیا ہے، یہ ہمیں لوٹنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے میرا یہ حال کر دیا۔ ہائے میرا ہاتھ......'' فاروق سے مار کھا کر فرش پر گرنے والے نے ذرا دیر کے لیے اپنی ہائے وائے چھوڑ کر نہایت درد بھرے لہجے میں دہائی دی۔ اس کے اس صریح جھوٹ پر فاروق کو طیش آ گیا اور اس نے پیر کی ایک زوردار ٹھوکر اس کے پہلو میں ماری۔

''جھوٹ بولتا ہے سالا، ابھی یہیں تیرا کام تمام کر دوں گا۔'' وہ غضب ناک ہو کر دہاڑا۔

''تم خود کو کنٹرول میں رکھو مسٹر...... سچ اور جھوٹ کا فیصلہ ہم خود کر لیں گے۔'' عین اسی وقت کمرے میں پہنچنے والے ایک خوش لباس اور متین سے آدمی نے قدرے سخت لہجے میں فاروق کو ٹوکا تو اس نے گھور کر اس شخص کو بغور دیکھا۔ فوراً ہی اسے اس آدمی کی جیب کے اوپر لگا بیج نظر آ گیا جس کے مطابق وہ یہاں اسپتال کے منتظم کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کا نام بیج پر آر اچاریہ لکھا ہوا تھا۔

''آپ اپنے اسٹاف کو ڈھنگ کی سیکیورٹی نہیں دے سکتے تو اور کون سا کام ٹھیک کر لیں گے۔'' کیتھرائن پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر فاروق نے اچاریہ کو طنز کا نشانہ بنایا جس پر اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی لیکن اس نے جواب میں فاروق کو کچھ کہنے کے بجائے کمرے کے اندر اور باہر جمع ہو جانے والے افراد کی طرف رخ کیا اور بارعب لہجے میں بولا۔

''میری آپ حضرات سے ریکویسٹ ہے کہ واپس اپنے اپنے رومز میں جائیں۔ یہاں جو بھی پرابلم ہے، اس سے اسپتال مینجمنٹ خود نمٹ لے گی۔'' ریکویسٹ کا لفظ استعمال کرنے کے باوجود اس کے لہجے میں جو تحکم تھا، اسے ہر ایک نے محسوس کیا۔ اس کے الفاظ کے ساتھ ہی اسپتال کا چوکیدار بھی حرکت میں آ گیا تھا اور ہاتھ میں موجود ڈنڈے سے اشارہ کرتے ہوئے انہیں وہاں سے ہٹانے لگا تھا اس لیے جلد ہی بھیڑ چھٹ گئی۔ اس بھیڑ میں فاروق کو جانی کا چہرہ بھی نظر آیا تھا۔ وہ بے چارہ خاصا پریشان اور حواس باختہ تھا۔ فاروق نے اسے ہاتھ کے اشارے سے مطمئن رہنے کا کہتے ہوئے واپس اپنے کمرے میں جانے کی ہدایت کی۔ جب وہاں سے سب لوگ ہٹ گئے تو اچاریہ نے کمرے کا دروازہ بند کروا دیا اور سب کو چھوڑ کر کیتھرائن کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے پوچھا۔

''تم بتاؤ سسٹر کہ یہاں کیا ہو رہا تھا اور یہ ہنگامہ کیسا تھا؟''

''اس آدمی نے میرے ساتھ مس بی ہیو کرنے کی کوشش کی تھی سر۔'' وہ فرش پر بیٹھے شخص کی طرف اشارہ کر کے بولی اور یک دم ہی سسکنے لگی۔

''یہ نرس جھوٹ بول رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بھی اسی اچکے کی ساتھی ہے۔ اسی نے انکل کا چیک اپ کرنے کے بہانے دروازہ کھلوایا تھا اور پیچھے سے یہ اچکا بھی اندر گھس آیا۔'' تنومند آدمی نے کیتھرائن کو جھٹلاتے ہوئے فوراً ہی اپنی بنائی کہانی میں مزید اضافہ کیا۔

''ابھی تم چپ رہو۔ میں بعد میں تمہاری بات بھی سن لوں گا۔'' اچاریہ نے اسے ٹوکا اور ایک بار پھر کیتھرائن کی طرف متوجہ ہوا۔

''پوری تفصیل بتاؤ سسٹر۔''

اس کے حکم پر سسکتی ہوئی کیتھرائن نے کسی نہ کسی طرح خود پر قابو پایا اور رک رک کر بتانے لگی۔ ''جب سے

مسٹر بھاٹیہ یہاں ایڈمٹ ہیں، یہ شخص مستقل مجھے تنگ کر رہا ہے۔ شروع شروع میں اس نے مجھے لالچ دے کر بہلانا پھسلانا چاہا لیکن جب دیکھا کہ میں اس کے جال میں پھنسنے کے لیے تیار نہیں ہوں تو دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ میں نے ڈاکٹر گپتا سے اس کی کمپلین بھی کی تھی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر مجھے ٹال دیا کہ یہ آدمی مسٹر بھاٹیہ کا بھتیجا ہے اور مزاجاً تھوڑا سا دل پھینک ہے لیکن مجھے اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہاسپٹل کی چار دیواری میں یہ میرے ساتھ کچھ بھی الٹا سیدھا نہیں کر سکتا ہے۔ ان کے کہنے پر میں نے خاموشی اختیار کر لی اور اس کی فضول حرکتوں کو اگنور کرتی رہی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی دینے کے بعد آج میرا آف تھا لیکن سسٹر میری کے گھر میں کوئی ایمرجنسی ہوگئی اور انہیں جلدی میں گھر واپس جانا پڑا۔ ہاسپٹل سے نزدیک رہنے کی وجہ سے مجھے ان کی جگہ ڈیوٹی پر کال کر لیا گیا۔ مجھے ڈیوٹی پر آئے ہوئے ایک گھنٹا ہی ہوا ہے۔ آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی اس آدمی نے میرے پاس آ کر کہا کہ مسٹر بھاٹیہ کی طبیعت بگڑ رہی ہے اور انہیں سانس لینے میں مشکل ہو رہی ہے۔ میں اس اطلاع پر فوراً ان کے کمرے کی طرف دوڑی چلی آئی اور میرے یہاں آتے ہی اس نے پیچھے سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اگر مسٹر فاروق یہاں نہ آتے تو آج جانے اس کے ہاتھوں میرا کیا حال ہوتا۔'' اپنی بات کہہ کر وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

''یہ نرس جھوٹی ہے۔ خود کو اور اپنے ساتھی کو بچانے کے لیے مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہی ہے۔'' تنومند جوان ایک بار پھر چلایا لیکن اس کی آواز میں وہ مضبوطی نہ تھی جو ایک سچے آدمی کی آواز میں ہوتی ہے۔

''سسٹر جھوٹ نہیں بول رہی ہے۔ منوہر نے اس کے ساتھ سچ مچ وہ سب کچھ کیا ہے جو اس نے بتایا ہے۔ یہ میرا بھتیجا ضرور ہے لیکن ایک بدکردار آدمی ہے جو پہلے بھی کئی لڑکیوں کا جیون تباہ کر چکا ہے۔'' بستر پر لیٹے نحیف و نزار مسٹر بھاٹیہ نے بالکل اچانک گواہی دے کر صورتِ حال کو صاف کر دیا۔

''تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے انکل۔'' منوہر نامی وہ نوجوان غیظ سے چلایا۔

''سوری مائی سن، میں پہلے ہی اپنے مرے ہوئے بھائی کی محبت میں تمہیں بہت ڈھیل دے چکا ہوں لیکن آج تم نے میری نظروں کے سامنے جو بے شرمی دکھانے کی کوشش کی، اس کے بعد تمہاری مزید سائڈ لے کر میں اپنے کن پر اور بوجھ نہیں ڈال سکتا۔'' بوڑھے بھاٹیہ نے بھتیجے سے نظریں چرالیں۔ وہ بے چارہ بوڑھا اور کمزور ہونے کے علاوہ ایک پیر سے معذور بھی تھا اسی لیے عملی طور پر کوئی قدم اٹھانے کے بجائے اوباش بھتیجے کو صرف زبان سے ہی باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

''یہ آدمی پیے ہوئے ہے سر، اس کے منہ سے شراب کا بو آرہا ہے۔'' چوکیدار جو اس خدشے کی بنیاد پر منوہر کے نزدیک ہو گیا تھا کہ کہیں وہ بھاگنے کی کوشش نہ کرے، جوش سے چلایا۔

''اسے قابو میں رکھو۔ میں ابھی پولیس کو کال کرتا ہوں۔ اپنے اسٹاف کے ساتھ ایسا سلوک کرنے والے کو میں کسی صورت معاف نہیں کر سکتا۔'' اچاریہ نے غصے سے کہا پھر بستر پر دراز بھاٹیہ کی طرف رخ کر کے بولا۔

''سوری مسٹر بھاٹیہ! مجھے آپ کے بھتیجے کو پولیس کے حوالے کرنا ہی ہوگا۔'' جواب میں بھاٹیہ فقط سر ہلا کر رہ گیا البتہ منوہر شور مچانے اور اس سے التجائیں کرنے لگا۔

''مجھے اریسٹ ہونے سے بچالو انکل۔ میں اریسٹ ہو گیا تو تمہاری بھی بہت بدنامی ہوگی۔ میں تم سے پرامس کرتا ہوں کہ آئندہ کوئی غلط کام نہیں کروں گا اور من سے تمہارا خیال رکھوں گا۔'' وہ اپنے انکل کو ڈراوے بھی دے رہا تھا اور اس سے التجائیں بھی کر رہا تھا لیکن بھاٹیہ نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر منوہر نے کوشش کی کہ وہاں سے فرار ہو جائے لیکن چوکیدار پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس نے اس کی اس کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

''اسے دفتر میں لے چلو۔ میں پولیس کو وہیں بلالوں گا۔'' اچاریہ نے چوکیدار کو حکم دیا اور پھر کیتھرائن کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم کیسا فیل کر رہی ہو سسٹر! ڈیوٹی جاری رکھ سکتی ہو یا میں کسی اور نرس کو کال کروں؟''

''ناؤ آئی ایم فیلنگ بیٹر سر...... آپ کسی کو کال نہ کریں۔ میں ڈیوٹی پوری کر لوں گی۔'' کیتھرائن نے اسے جواب دیا۔ اب وہ کافی سنبھل چکی تھی۔

''او کے مسٹر فاروق! آپ بھی اپنے روم میں جا کر ریسٹ کریں۔ اگر پولیس والوں نے خواہش ظاہر کی تو آپ کو ان کے سامنے بیان دینے کی زحمت اٹھانی پڑے گی۔'' کیتھرائن کے جواب سے مطمئن ہو کر وہ فاروق سے مخاطب ہوا۔

''شیور'' فاروق نے مختصر جواب دیتے ہوئے

مسکرانے کی کوشش کی۔ سر کا درد جسے وہ وقتی طور پر فراموش کر چکا تھا‘ اس سارے ہنگامے کے دوران مزید شدت اختیار کر چکا تھا۔ اس نے مناسب سمجھا کہ اچاریہ کے مشورے کے مطابق اپنے کمرے میں جا کر آرام کر لے۔ کمرے میں جانی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن اب فاروق کے اندر اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ اس کے چہرے پر لکھے سوالات کے جواب دے سکے چنانچہ خاموشی سے جا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ جانی نے بھی اس کا موڈ دیکھتے ہوئے کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے اس کی پائنتی بیٹھ کر پیر دابنے لگا۔ ان کے درمیان وقت دبے قدموں گزرنے لگا۔ تقریباً بیس منٹ بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور کیتھرائن اندر داخل ہوئی۔ وہ اپنا پھٹ جانے والا لباس بدل کر دوسرا یونیفارم پہن چکی تھی اور پہلے ہی کی طرح فرائض کی ادائیگی کے لیے مستعد نظر آ رہی تھی۔

”آر یو او کے مسٹر فاروق؟“ فاروق کے قریب پہنچ کر اس نے اس کا چہرہ دیکھا تو ماتھے پر ہاتھ رکھ کر فکرمندی سے پوچھنے لگی۔ درد برداشت کرنے کی جدوجہد میں اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی تھی اور کیتھرائن نے اس تبدیلی کو فوراً محسوس کر لیا تھا۔

”میرے سر میں بہت شدید درد ہو رہا ہے۔“ مزید ضبط کی کوشش کے بجائے فاروق نے اسے بتا دینا مناسب سمجھا۔

”اوہ...... یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔ میں ابھی ڈیوٹی ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔“ وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ چند منٹ بعد واپس آئی تو اس کے ساتھ ڈاکٹر تھا۔ اس نے پہلے فاروق سے اس کی کیفیت کے بارے میں سوالات کیے پھر کیتھرائن سے اس کی فائل مانگ کر اس میں درج ڈاکٹر فورڈ کی ہدایات کے مطابق ایک انجکشن تیار کرنے کا حکم دیا۔ کیتھرائن نے یہ کام بہت تیزی سے نمٹایا۔ انجکشن فاروق کے بازو میں لگا تو تھوڑی دیر بعد اسے آہستہ آہستہ آرام آنے لگا اور تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔

”دادا......“ بوجھل ہو جانے والی آنکھوں کو بند کرنے سے قبل اس نے اب تک حیران پریشان اپنے قریب کھڑے جانی کی سرگوشی سنی تو کھلے دروازے سے اندر داخل ہوتے ربن پر ایک نظر ڈالی اور پھر آنکھیں موند لیں۔ دوا مکمل طور پر اس کے اعصاب پر چھا گئی تھی اور اب اس کے لیے مزید آنکھوں کو کھلا رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

”کیا ہے رے تو اپنے کو چین لینے دے گا کہ نہیں۔ ایسے تو، تو اپنا سب کام دھندا چوپٹ کروا دے گا۔“ فاروق جانے کتنے گھنٹوں بعد ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آیا تو ربن اس کے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ فاروق نے ایک انگڑائی لی اور خود بھی اٹھ بیٹھا۔ اسے بیٹھتے دیکھ کر ہی ربن نے کھردرے لہجے میں اس سے یہ سب کہا تھا لیکن اس کھردرے لہجے کے پیچھے محبت کا جو دریا موجزن تھا اس سے فاروق اچھی طرح واقف تھا اس لیے بجائے برا ماننے کے ہنس دیا۔

”اب دھندیا باہر نکال رہا ہے اور رات تماشا لگا کر رکھ دیا تھا۔ ماں قسم اپن اتنا خوش خوش واپس آیا تھا کہ تیرے کو خوش خبری سنائے گا لیکن ادھر تو نے اپن کے ہاتھ پاؤں پھلا ڈالے۔ کیا ضرورت پڑی تھی تیرے کو ہیرو بننے کی؟ معلوم ہے نا کہ سر پر چوٹ لگی ہے۔ لفڑے میں کچھ الٹا سیدھا ہو جاتا تو تیرا کیا جانے کا تھا، پر اپنا تو سب کچھ الٹ پلٹ ہو کر رہ جاتا۔“ اسے ہنستے دیکھ کر ربن نے اسے ڈپٹا۔

”اب جانے دو نا دادا، جو ہونا تھا ہو گیا۔ میں کوئی جان بوجھ کر جھگڑے میں تھوڑی پڑا تھا۔ میں تو بس یونہی ٹہلنے کے لیے نکلا تھا کہ ادھر بھاٹیہ کے کمرے میں گڑبڑ کا احساس ہو گیا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ایک کمزور لڑکی کو مشکل میں دیکھ کر میں اس کی مدد نہ کرتا تو کیا کرتا۔ یہ سب تو میں نے تمہارے ساتھ رہ کر ہی سیکھا ہے نا۔“ اب وہ کسی لاڈلے بچے کی طرح ربن کو منا رہا تھا۔

”مطلب قصور اپن کا ہی ہے۔ اپن تیرے کو ایسا بنا دیا ہے کہ اپنا بھلا برا سوچے بغیر کسی بھی پھڈے میں جا کر کود پڑے۔“ ربن نے اسے گھورا۔

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“ وہ گڑبڑا سا گیا تو ربن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس مسکراہٹ کو دیکھ کر فاروق کی جان میں جان آئی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور ڈاکٹر پرکاش ایک نرس کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

”ہیلو ینگ مین! ہاؤ آر یو؟“ ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے دوستانہ انداز میں سوال کیا۔

”فائن۔“ فاروق نے مختصراً لیکن خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

”رات تو بھئی تم نے بڑا کارنامہ انجام دیا۔ سارے ہاسپٹل میں تمہاری بہادری کی دھوم مچی ہوئی ہے۔“ ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں کے پپوٹے پلٹ کر، معائنہ کرتے ہوئے سراہنے والے انداز میں کہا۔

”جی ہاں، اسی کارنامے کے بدلے بیٹھا نہار منہ

ڈانٹ کھا رہا ہوں۔''

اس نے شوخی سے ڈاکٹر کو بتایا تو وہ ہنس دیا اور ربن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''انہیں تمہیں ڈانٹنے کا پورا حق ہے۔ عملے کی ہزار تسلیوں کے باوجود یہ رات سے تمہارے پاس پلک جھپکائے بغیر بیٹھے ہیں۔ صبح سے میں خود کئی بار سمجھا چکا ہوں کہ تم ٹھیک ہو اور صرف دواؤں کے اثر کی وجہ سے سو رہے ہو لیکن ان کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔''

''مجھے پیٹ بھر کر ڈانٹ کھلائے بغیر ان کی تسلی ہو بھی نہیں سکتی تھی۔''

فاروق نے کسی بچے کی طرح منہ بسورا تو ڈاکٹر پرکاش قہقہہ لگا کر ہنس دیا پھر ذرا سنجیدگی سے بولا۔ ''ایسی ڈانٹ کھلانے والے بھی خوش نصیبوں کو ملتے ہیں۔ ویسے اب تمہیں چاہیے کہ ڈانٹ کے علاوہ بھی کوئی ہلکی پھلکی غذا لے لو۔ رات سے خالی پیٹ ہو۔ انرجی کی کمی تو خیر تمہیں محسوس نہیں ہو رہی ہوگی کہ ہم نے تمہارے ڈرپ لگا دی تھی لیکن تم جیسے جوان آدمی کے لیے سب سے اچھی بات یہی ہوگی کہ ان آرٹیفشل سورسز کے بجائے نیچرل سورسز سے انرجی گین کرو۔ گڈ ڈائٹ، گڈ ہیلتھ کے لیے بہت ضروری ہے۔'' اس کا معائنہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ہلکے پھلکے انداز میں نصیحت کرتا جا رہا تھا۔ البتہ ربن اس دوران بالکل خاموش رہا تھا۔ ڈاکٹر پرکاش نے کمرے سے نکلتے نکلتے اس کے شانے پر تھپکی دے کر ایک خاموش تسلی دی۔

''چل اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لے پھر کھانا نکالتے ہیں۔ وجے کے ہاتھ بجو نے تیرے لیے بہت کچھ تیار کر کے بھجوایا ہے۔ سب یونہی پڑا پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' ڈاکٹر نرس سمیت واپس چلا گیا تو ربن نے اس سے کہا۔ وہ فوراً ہی فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بستر سے اتر گیا۔ ربن نے اپنی جگہ سے ایک قدم یوں حرکت کی جیسے اسے سہارا دینا چاہتا ہو لیکن پھر رک گیا۔ یہی موقع تھا اپنی تربیت اور فاروق کی مضبوطی کو جانچنے کا۔ اس جانچ کے نتیجے میں اسے مایوسی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا۔ فاروق مضبوطی سے قدم جماتا ہوا کمرے سے ملحقہ باتھ روم میں چلا گیا۔ وہاں سے تازہ دم ہو کر واپس آیا تو دیکھا کہ کیتھرائن کمرے میں موجود ہے۔ اس نے اس وقت نرسوں والے مخصوص یونیفارم کے بجائے گلابی رنگ کا ایک لمبا پھول دار اسکرٹ پہن رکھا تھا جس میں وہ زیادہ کم عمر خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ فاروق کو آتے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرائی اور پھر اپنے ہاتھوں میں موجود پھولوں کا گلدستہ اسے تھمایا۔ گلدستے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا گیٹ ویل سون کا کارڈ بھی منسلک تھا۔

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟'' فاروق تھوڑا سا جھینپ گیا۔

''ایک نرس کی حیثیت سے تو واقعی نہیں تھی لیکن اس وقت میں آن ڈیوٹی نہیں ہوں اور ایک دوست کی حیثیت سے آپ کی مزاج پرسی کے لیے آئی ہوں، اس لیے اتنا تکلف چلتا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں فاروق کی بات کا جواب دیا تو اور بھی زیادہ خوب صورت لگنے لگی۔ اس کے بعد اس نے خود ہی ٹفن سے کھانا نکال کر لگانا شروع کر دیا۔ یقیناً فاروق کی عدم موجودگی میں ربن نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ لوگ کھانے کی تیاری کر رہے ہیں اس لیے اس نے کھانا لگانے کی ذمے داری اپنے سر لے لی تھی۔ وہ خود بھی ایک چھوٹے سے ٹفن میں اس کے لیے چند سینڈوچز تیار کر کے لائی تھی۔ انڈے میں دودھ اور شہد کی آمیزش کر کے اس میں ڈبل روٹی کے ٹکڑوں کو ڈبو کر سنہری رنگت میں تلا گیا تھا۔ فاروق نے اس کے اصرار پر ایک سینڈوچ اٹھا کر چکھا تو شکل اور خوشبو کے علاوہ ذائقے کے اعتبار سے بھی سینڈوچ خوش ذائقہ نکلا۔ اس کی صلاح پر ربن نے بھی چکھ کر دیکھا تو تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ ان دونوں کی تعریفیں سن کر کیتھرائن کے چہرے پر خوشی کے رنگ دوڑ گئے۔ انہوں نے بہ اصرار اسے بھی اپنے ساتھ کھانے میں شامل کر لیا تھا اور اب وہ سب یوں مل جل کر بیٹھے تھے جیسے ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔ لیے دیے رہنے والی کیتھرائن کا یہ نرم نرم سا روپ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''آپ نے بڑی زحمت اٹھائی مس کیتھرائن۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ بہت زیادہ تھکی ہوئی تھیں۔ آپ کو چاہیے تھا کہ ڈیوٹی آف کرنے کے بعد اطمینان سے آرام کرتیں لیکن آپ ان چکروں میں پڑ گئیں۔'' فاروق نے کھانے کے درمیان ایک بار پھر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''پلیز شرمندہ مت کریں۔ میں نے بالکل بھی زحمت نہیں اٹھائی۔ ہاسٹل سے جا کر میں نے پہلے خوب ریسٹ کیا پھر یہ سینڈوچز تیار کیے تھے۔ انہیں بنانا کچھ ایسا خاص مشکل نہیں ہے۔ دس پندرہ منٹ میں ہی تیار ہو جاتے ہیں۔ گلدستہ بھی میں نے ہاسپٹل کے باغ سے پھول توڑ کر تیار کیا ہے اس لیے اس کے لیے بھی مجھے کچھ زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔'' وہ احتجاجی انداز میں بتانے لگی۔

''ارے، یہ اتنا خوب صورت گلدستہ آپ نے خود تیار کیا ہے؟ مجھے تو بالکل بھی گمان نہیں ہوا کہ یہ خود سے تیار کیا

کیا ہوگا۔ اسے دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے کہ کسی بہت ماہر شخص نے بنایا ہے۔ پھولوں کے انتخاب اور سجاوٹ دونوں میں ہی بہت زیادہ سلیقہ نظر آرہا ہے۔''

فاروق نے بڑی بے ساختگی سے تعریف کی تو وہ جھینپ سی گئی اور محجوب سے لہجے میں بتانے لگی۔''میں نے جس مشنری اسکول میں ایجوکیشن حاصل کی ہے، وہاں ہمیں ایسے چھوٹے موٹے ہنر بھی سکھائے جاتے تھے اس لیے میں اس فن سے تھوڑی بہت واقف ہوں۔ آپ کے پاس آنے سے پہلے میں مسٹر بھاٹیہ کا شکریہ ادا کرنے گئی تھی اور انہیں بھی ایک گلدستہ پیش کیا تھا۔ انہیں بھی وہ بہت پسند آیا۔''

''آپ کو مسٹر بھاٹیہ کا شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟'' فاروق نے منہ بنا کر پوچھا۔

''ضرورت تو تھی۔ یہ ان کا بڑا پن ہے کہ انہوں نے اپنے بھتیجے کے خلاف گواہی دے کر مجھے اور آپ کو پولیس والوں کے الٹے سیدھے سوالوں سے بچالیا۔ اگر وہ ایسا کرنے کے بجائے منوہر کا ساتھ دیتے تو پولیس منوہر کا ہم پر لگایا گیا الزام تسلیم کرنے میں دیر نہیں لگاتی۔ مسٹر بھاٹیہ جس پوزیشن کے آدمی ہیں ان کی بات کوئی رد نہیں کرسکتا۔ آپ نے بھاٹیہ ٹیکسٹائل مل اور دوسری ایسی کئی چیزوں کے بارے میں تو ضرور سن رکھا ہوگا۔ وہ بہت پیسے والے آدمی ہیں اور ان کے بڑے بڑے عہدے داروں اور سیاست دانوں سے تعلقات ہیں۔'' اس نے مرعوب سے انداز میں اسے بھاٹیہ کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کیا تو اب تک خاموش بیٹھا ربن بھی بول اٹھا۔

''یہ ٹھیک بولتی ہے رے۔ بھاٹیہ سچ مچ بڑی اونچی پارٹی ہے۔ اپن خود بھی اس سے ملنے کا سوچ رہا تھا۔'' ربن ایک دادا تھا جو اپنے بنائے ہوئے اصولوں پر بے شک چلتا تھا لیکن اپنی دنیا میں قدم جمائے رکھنے کے لیے اسے ایسے سرمایہ داروں کی بھی ضرورت تھی چنانچہ وہ موقع سے فائدہ اٹھانے کے موڈ میں نظر آرہا تھا۔

''مسٹر بھاٹیہ نے تو خود آپ لوگوں سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ پہلے میں آپ لوگوں سے معلوم کرلوں پھر انہیں لے جاؤں گی..... بے چارے معذور ہیں۔ وہیل چیئر کے بغیر اِدھر اُدھر نہیں آجاسکتے۔'' کیتھرائن نے انہیں بہت کام کی اطلاع دی۔ ربن کے لیے یہ ایک اچھا شگون تھا کہ بھاٹیہ خود ان سے ملنے کی خواہش رکھتا تھا چنانچہ فوراً ہی بولا۔

''اس کو اِدھر لانے کا تکلیف مت کرو۔ اپن خود اُدھر اس کے پاس جا کر اس سے مل لے گا۔ اپن کو معلوم ہے کہ وہ چل پھر نہیں سکتا۔ سال پیچھے اس کی موٹر کے ایکسیڈنٹ کی خبر چھپی تھی اخبار میں۔ خبر میں تھا کہ حادثے میں اس کی ٹانگ اس بری طرح کچل گئی تھی کہ جان بچانے کے لیے ڈاکٹروں کو کاٹنی پڑی۔ اس کے بعد سے ہی وہ سالا وھیل چیئر پر آگیا ہے۔'' اس کی معلومات خوب تھیں اور شاید اپنے باخبر رہنے کی عادت کی بنا پر ہی وہ ہمیشہ کامیاب بھی رہتا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں مسٹر بھاٹیہ کو بتادوں گی کہ آپ خود ان سے ملاقات کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔'' گفتگو کے دوران ان تینوں نے کھانا کھالیا تھا۔ کیتھرائن نے سلیقے سے برتن سمیٹنے شروع کردیے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے کچھ دیر بعد ہی وہ وہاں سے رخصت ہوگئی۔ اسے نائٹ شفٹ میں ڈیوٹی دینے کے لیے دوبارہ اسپتال آنا تھا اس لیے اپنی رہائش گاہ جا کر کچھ دیر اور آرام کر لیتی تو اس کے لیے مناسب رہتا۔ اس کے رخصت ہونے کے فوراً بعد ہی گولو اور مجو وجے کے ساتھ چلے آئے۔ اڈے کے لوگوں میں وہ دونوں ہی فاروق سے ملنے کے لیے سب سے زیادہ بے قرار تھے اس لیے ربن نے وجے کے ہاتھوں انہیں ملاقات کے اوقات میں بلا بھیجا تھا۔ گولو خوب بھینچ کر فاروق سے گلے ملا اور چھو چھو کر دیکھتا رہا کہ اسے کہاں کہاں چوٹ آئی ہے۔ اس کے مقابلے میں مجو کا انداز ذرا شرمایا ہوا تھا۔ فاروق نے اسے خود سے گلے لگایا۔ پھر ان کے درمیان گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ باتوں باتوں میں فاروق کو خیال آیا کہ کل سے راموا استاد کی شکل دکھائی نہیں دی ہے، وہ اس کے بارے میں استفسار کرنے لگا۔

''ارے آپ کو نہیں معلوم فاروق بھائی، راموا استاد تو اُدھر مجو دادا کی گدی پر بادشاہ بنا بیٹھا ہے۔ بابا نے کل رات مجو کا واٹ لگا دیا اور سالے کا وہ حال کیا کہ اب دوبارہ بمبئی میں اس کی صورت دکھائی نہیں پڑے گی۔'' گولو فوراً ہی جوش سے بول پڑا۔ فاروق نے سوالیہ نظروں سے ربن کو دیکھا۔

''رات تیرے کو یہی خوش خبری سنانے کی تھی پر اُدھر جو لفڑا کھڑا تھا، اس میں سنانی رہ گئی۔'' ربن نے منہ بناتے ہوئے اسے جواب دیا پھر اس کے اصرار پر پوری تفصیل سنا ڈالی۔ بیچ میں گولو بھی بڑھ چڑھ کر لقمے دیتا رہا اور دونوں داداؤں کی لڑائی کا قصہ تو اس نے یوں سنایا جیسے اس کا آنکھوں دیکھا حال ہو حالانکہ وہ موقعے پر موجود ہی نہیں تھا اور اس کی معلومات کا ذریعہ کل ربن اور راموکے ساتھ مجو

دادا کے اڈے پر جانے والے افراد تھے۔ ان افراد میں سے ہی اس نے ہر ایک سے یہ قصہ الگ الگ کرید کرید کر اتنی تفصیل سے سنا تھا کہ کسی چشم دید گواہ سے بھی زیادہ معلومات کا ذخیرہ جمع کر لیا تھا اور اب ان معلومات سے فاروق کو مستفید کر رہا تھا۔ فاروق نے بھی پوری دلچسپی سے یہ قصہ سنا۔ اسے خوشی ہوئی کہ بجو کو ضرورت سے زیادہ ڈھیل دینے کے بجائے ربن نے اس کا کانٹا ہی نکال دیا۔ وہ آدمی اپنی فطرت کے اعتبار سے ایسا تھا ہی نہیں کہ اسے مزید ڈھیل دے کر سدھرنے کا موقع دیا جاتا۔ اس کی فطرت کتے کی دم کی سی تھی جو سو سال نلکی میں رکھنے پر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔ اس نے دل کی گہرائی سے ربن کو اس کامیابی پر مبارک باد دی۔

''تیرے کو معلوم ہے اپن کو چوکی گدی کا لالچ نہیں ہے۔ اگر ایسا شوق ہوتا تو ایک ایک کر کے بمبئی کے سارے داداؤں کو للکار ڈالتا۔ اپن بڑا بول نہیں بولتا، پر اس سچ کو کون انکار کر سکتا ہے کہ ابھی اکھا بمبئی میں ایسا کوئی دادا نہیں ہے جو چاقو بازی میں ربن کے سامنے ٹھہر سکے۔ اپن اڈے کی چوکی کو بڑی ذمے داری سمجھتا ہے۔ دادا کو اوپر نیچے، دائیں بائیں، آگے پیچھے سب دیکھنے کا رہتا ہے اور ہوتا تو دادا بھی انسان کا بچہ ہی ہے نا۔ اکیلا کتنے علاقوں کی چوکی سنبھال کر چاروں کھونٹ ڈھنگ سے نگاہ رکھ سکتا ہے۔ ابھی ادھر بجو کے اڈے پر راموکو بٹھا کر آیا ہے پر ادھر اپنے اڈے کا بھی تو دھیان رکھنا ہے نا۔ ٹھیک ہے ادھر سارا پرانا آدمی ہے، پر پرانے آدمی کے سر پر سے بھی نگرانی ختم کر دو تو چھ آٹھ دن میں سالا سب چوپٹ ہو جاتا ہے۔ تو اگر ادھر اسپتال میں نہیں پڑا ہوتا تو اپن تیرے کو ادھر کی چوکی پر بٹھاتا، پر تو تو میرے کو تنگ کرنے کو مانگتا ہے۔ یہاں اسپتال کے بستر پر پڑ گیا ہے اور مجھے بھی اپنے ساتھ باندھ لیا ہے۔ وہ بے چارہ راموا کیلا کدھر کدھر دیکھے گا۔''

اس کی مبارک باد کے جواب میں ربن نے ایک بار پھر اس کی اچھی خاصی گوشمالی کر ڈالی۔ اصل میں وہ فاروق کو دوسری بار پڑنے والے اس دورے کے بعد مزید ڈر گیا تھا اور یہ بات اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اسے فی الحال جولیٹ کے معاملات سے بالکل الگ رکھنا بہت ضروری ہے لیکن ایسا کب تک ممکن ہو سکے گا، یہ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا اور اسی پریشانی میں وہ بار بار جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرنے لگتا تھا۔

''میں کب اسپتال میں رہنا چاہتا ہوں۔ میں تو خود پہلے دن سے کہہ رہا ہوں کہ اڈے پر چلتے ہیں، وہاں سب کے درمیان رہ کر میری طبیعت خود بخود ہی سنبھل جائے گی اور پھر مجھے بیماری بھی کیا ہے۔ ایک ذرا سر میں درد ہی تو اٹھتا ہے، وہ تو اپنے کولو کی مالش سے بھی ٹھیک ہو جائے گا۔'' فاروق نے بجھے ہوئے لہجے میں اپنا مطالبہ دہرایا۔

''زیادہ مت بول۔ بڑا آیا اڈے پر سب کے بیچ رہ کر سنبھل جانے والا۔ ادھر وہ سارے لندن امریکا سے ڈاکٹری کی ڈگریاں لے کر آئے ہیں نا جو اسپتال سے اچھا تیرا علاج کر دیں گے۔ اپن تیرے کو صاف بول رہا ہوں کہ جب تک ڈاکٹر اجازت نہ دے، اُدھر سے ہلنے کی بات بھی مت کرنا۔'' اس نے ایک بار پھر فاروق کو ڈپٹ دیا۔

''فاروق بھائی کو ایسے مت ڈانٹو بابا، دیکھو تو بے چاروں کا چہرہ کتنا سا ہو گیا ہے۔ اب تم نے انہیں کچھ کہا تو اپن رونے لگے گا۔'' کولو سے یہ صورتِ حال برداشت نہیں ہوئی اور فوراً ہی ربن کو ٹوک دیا۔ ایک وہی تو تھا جو ایسی جرأت کر سکتا تھا۔ اس کے ٹوکنے پر ربن سنبھل گیا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ وہ ضرورت سے زیادہ شدید ردِعمل کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

''چل تو کہتا ہے تو معاف کر دیتا ہوں۔'' وہ اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے مسکرایا پھر گولو اور بجو کو اڈے واپس جانے کے سلسلے میں ہدایات دینے لگا۔ اس کے حکم پر وہ دونوں دل نہ چاہتے ہوئے بھی اسپتال سے روانہ ہو گئے۔

''کیا بات ہے دادا! کوئی پریشانی ہے کیا؟ تم مجھے الجھے الجھے سے لگتے ہو؟'' ان دونوں کے جانے کے بعد فاروق نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اپن کے سو دھندے ہیں جن میں اپن الجھا ہی رہتا ہے۔ اب دیکھ اس بھاٹیہ سیٹھ سے ملنے جانے کا ہے۔ معلوم تو ہو کہ اسے کیوں اپن سے ملاقات کا شوق ہو رہا ہے۔'' ربن نے بڑی ہوشیاری سے گفتگو کا رخ بدل ڈالا۔

''میں بھی ساتھ ہی چلتا ہوں۔'' فاروق نے بستر سے پاؤں نیچے لٹکائے۔ ''بہت لمبی نیند لے کر اٹھا ہوں، اب دوبارہ لیٹنے کو دل نہیں چاہ رہا۔ ایسے کمرے میں اکیلا رہ کر کیا کروں گا۔ اچھا ہے ذرا بھاٹیہ سے گپ شپ میں وقت اچھا گزر جائے گا۔''

''ٹھیک ہے آجا۔'' ربن نے اسے اجازت دے دی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے بھاٹیا کے کمرے تک پہنچ گئے۔ بھاٹیہ تکیوں کے سہارے بستر کے سرہانے سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جوس کا گلاس تھا اور وہ کالے کوٹ میں ملبوس اپنے کسی

ملاقاتی سے بات کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے ان دونوں کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور بستر پر بیٹھے بیٹھے ہی دونوں سے باری باری مصافحہ کرنے کے بعد اپنے ملاقاتی سے بھی متعارف کروانے لگا۔

''یہ مسٹر رائے چند ہیں۔ میرے قانونی مشیر۔ میں نے اپنی دل پر بات چیت کرنے کے لیے انہیں بلایا تھا..... اور وکیل صاحب' یہ وہی دونوں حضرات ہیں جن کا ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔'' اس نے باری باری دونوں فریقین کو ایک دوسرے سے متعارف کروایا۔

''اگر تم مصروف ہے سیٹھ تو اپن بعد کو آجائے گا۔ تم پہلے اپنا ضروری کام نمٹا لو۔'' ملاقاتی کا وکیل کی حیثیت سے تعارف ہونے پر ربن نے بھاٹیہ کو پیشکش کی۔

''ارے نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وکیل صاحب روانہ ہی ہونے لگے تھے۔'' بھاٹیہ نے جواب دیا۔

''جی ہاں وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں اپنا کام نمٹا کر بس واپس ہی جانے والا تھا۔ آپ حضرات پورے اطمینان سے یہاں بیٹھ سکتے ہیں۔'' وکیل نے بھی بھاٹیہ کی تائید کی اور اپنے کھلے ہوئے بریف کیس میں کچھ کاغذات ترتیب سے رکھنے کے بعد وہاں سے روانہ ہو گیا۔ وکیل کے جاتے ہی ایک نرس کمرے میں آگئی اور ان دونوں کو وہاں بیٹھے دیکھ کر ٹھٹکی۔

''تم ابھی باہر ہی رہو سسٹر۔ وکیل کی طرح یہ بھی میرے بہت اہم ملاقاتی ہیں اور میں کچھ دیر تنہائی میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' بھاٹیہ نے اسی رعب سے نرس کو حکم دیا جو یقیناً انسانوں کی خدمات حاصل کرنے والوں کا خاصا ہوتا ہے۔ اس کا حکم سن کر نرس فرمانبرداری سے باہر نکل گئی۔

''یہ نرس میں نے اسپیشلی اپنے لیے ہائر کر رکھی ہے لیکن منوہر اپنی موجودگی میں اسے میرے روم میں رکنے نہیں دیتا تھا۔ میں خود بھی اہم ملاقاتوں کے وقت اسے باہر بھیج دیتا ہوں۔ بہت اوبیڈینٹ لڑکی ہے۔'' بھاٹیہ نے انہیں آگاہ کیا۔ صورت کے اعتبار سے وہ نرس اچھی خاصی گئی گزری تھی۔ شاید اسی وجہ سے منوہر اس کی کمرے میں موجودگی کو پسند نہیں کرتا ہوگا۔ اس بات کا اندازہ ان دونوں نے خود ہی لگا لیا۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' نرس کے بارے میں فراہم کی گئی معلومات پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے کے بجائے فاروق نے مہذبانہ انداز میں اس کی خیریت دریافت کی۔

''اپنا تو عرصے سے جلنے بجھنے والی بتی کی طرح حساب چل رہا ہے۔ ابھی دیکھو تو روشن، ابھی دیکھو تو تاریک۔ پل پل میں حالت بدلتی ہے اور آئے ون کا ہاسپٹل آنا جانا لگا رہتا ہے۔ آپ بتائیے کہ آپ کا کیا حال ہے۔ سسٹر کیتھرائن بتا رہی تھی کہ رات طبیعت خاصی بگڑ گئی تھی۔'' فاروق کو بہت جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بھاٹیہ اس سے پوچھنے لگا۔ یہ نگاہیں اس نحیف و نزار بوڑھے کی نگاہوں کے مقابلے میں بہت مختلف تھیں جن میں کل فاروق نے بے بسی اور مجبوری دیکھی تھی۔ یہ ایک ٹھیٹ کاروباری آدمی کی نگاہیں تھیں جو سودا کرنے سے پہلے سامنے والی پارٹی کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لینے کی خواہش مند تھیں۔

''جی ہاں، تھوڑا سا سر میں درد ہو گیا تھا لیکن اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کیتھرائن کی زبانی علم میں آیا تھا کہ آپ ملاقات کے خواہش مند ہیں تو ہم نے مناسب سمجھا کہ آپ کو زحمت دینے کے بجائے ہم خود یہاں چلے آئیں۔'' فاروق نے سابقہ لہجے میں ہی تہذیب سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''آہ کیتھرائن...... پریٹی گرل، کل اگر تم نہ آتے تو منوہر اس کا جیون برباد کر دیتا۔'' بھاٹیہ نے ایک سرد آہ بھری اور مزید بولا۔ ''مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ منوہر اس حد تک بگڑ چکا ہے کہ میری نظروں کے سامنے بے شرمی کا کھیل کھیلنے کی کوشش کرے گا۔''

''نیم پر گلے میں پٹا نہیں ڈالو تو ایسا ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔'' ربن نے پہلی بار گفتگو میں دخل دیا تو بھاٹیہ اچھل سا گیا اور پل بھر کے لیے اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''ٹھیک بول رہے ہو دادا لیکن یہ خون کے رشتے کی کشش ہی الگ ہوتی ہے۔ آدمی کو اندر سے کمزور کر دیتی ہے اور وہ جان کر انجان بننے کی غلطی کر بیٹھتا ہے۔ منوہر میرے مرے ہوئے بھائی کی نشانی ہے۔ یہ صرف چودہ سال کا تھا جب میرا بھائی ہارٹ اٹیک سے مر گیا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد میں نے ہی منوہر کو پالا۔ میری اپنی بس ایک بیٹی ہے اس لیے منوہر کو میں نے بھتیجے سے زیادہ بیٹے کی محبت دی۔ میں سوچتا تھا کہ بڑے ہونے پر دونوں کو آپس میں بیاہ دوں گا۔ بیٹی گھر میں رہ کر راج کرے گی اور بھتیجا اپنے اور میرے بزنس کو سنبھالے گا۔ اس خواہش میں، میں منوہر کو وقت سے پہلے ہی اختیارات دیتا چلا گیا۔ اس نے

اپنے پتا کے حصے کا کاروبار خود سنبھالنے کا مطالبہ کیا تو میں نے یہ سوچ کر کہ اچھا ہے، وہ کاروباری گر سیکھ لے گا، اس کی بات مان لی۔ تھوڑا سا یہ خیال بھی من میں تھا کہ کہیں انکار کرنے پر وہ یہ نہ سوچے کہ چچا نے اس کے حق پر قبضہ کرلیا ہے۔ منوہر کے تیور بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ میں اپنے تجربے سے اسے فائدہ پہنچانے کے لیے بزنس کے بارے میں جب پوچھ گچھ کرتا تو اسے ناگوار گزرتا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ میں اس کی نگرانی کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔ مجبور ہو کر میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور نتیجے میں چند سال میں وہ سارا بزنس ٹھپ کر بیٹھا۔ سب گنوانے کے بعد میرے پاس آکر رویا دھویا تو میں نے یہ سوچ کر گلے لگا لیا کہ اپنے ہی اپنوں کو سہارا دیتے ہیں۔ یہ ٹھوکر کھا کر آیا ہے اگر میں اسے سہارا نہیں دوں گا تو کون سنبھالے گا۔ وہ بھی بڑی فرمانبرداری سے میرے انڈر کام کرنے لگا۔

''اڑتے اڑتے مجھ تک خبریں پہنچتی تھیں کہ منوہر شراب اور عورتوں کے چکر میں پڑا رہتا ہے۔ ان خبروں پر میں نے کان نہیں دھرا کہ سارے ہی پیسے والوں کے لڑکے یہ سب کرتے ہیں۔ اپنی جوانی میں، میں خود کسی سے کم نہیں تھا۔ بیاہ ہوا تو سنبھل کر چلنے لگا۔ منوہر کے بارے میں بھی سمجھتا تھا کہ داماد بنا کر ناک میں نکیل ڈال لوں گا لیکن اس بار میری اپنی بیٹی نے مجھے مایوس کیا۔ وہ صاف بولی کہ اسے منوہر سے بیاہ نہیں کرنا کیونکہ وہ اپنے کسی یونیورسٹی فیلو کو پسند کرتی ہے اور اگر میں نے اس کی پسند کو سویکار نہیں کیا تو وہ اپنا قانونی حق استعمال کرتے ہوئے اس سے کورٹ میرج کرلے گی۔ وہ کورٹ میرج کرتی تو سوسائٹی میں میرا ہی نام بدنام ہوتا اس لیے میں نے خود اسے اس کے یونیورسٹی فیلو سے بیاہ دیا۔ وہ مڈل کلاس۔۔۔۔ اور ایک سرکاری دفتر میں چھوٹا موٹا افسر تھا۔ بیاہ پر میں نے بیٹی کو دہیج تو خوب دیا لیکن صاف بتا دیا کہ پراپرٹی میں ایک دھیلا اس کے نام نہیں کروں گا۔ بیٹی اور جوائی دونوں نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ وہ دونوں ہفتہ دس دن میں مجھ سے ملنے بھی آتے رہے۔ میرا جوائی میری بہت عزت کرتا تھا لیکن مجھے شک تھا کہ وہ مجھے رام کرنے کے لیے ایسا کرتا ہے کہ ایک دن اس کی شرافت سے متاثر ہو کر میں اپنی پراپرٹی بیٹی کے نام۔۔۔ کردوں گا۔ ہوسکتا ہے میرا شک ٹھیک نہ بھی ہو لیکن مجھے اسے آزمانے کا موقع نہیں ملا۔ بیاہ کے ایک سال کے اندر میرے جوائی کا ٹرانسفر لدھیانہ ہوگیا اور ٹرانسفر کے ٹھیک ڈیڑھ ماہ بعد کسی نے دفتر سے گھر آتے ہوئے اسے قتل کردیا

کس نے؟ یہ بھی پتا نہیں چل سکا۔ میری بیٹی بملا ودھوا ہو کر واپس میرے پاس آگئی۔ منوہر کا کہیں بیاہ نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے چاہا کہ اب ان دونوں کو آپس میں بیاہ دوں لیکن بملا راضی نہیں ہوئی۔ اس کا کہنا تھا کہ مرے ہوئے پتی کی محبت کے علاوہ بھی وہ منوہر جیسے اوباش کو اس لائق نہیں سمجھتی کہ اسے اپنا پتی بنائے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ پیسے والوں میں ایسی برائیاں ہوتی ہیں اور وہ اپنے مرے ہوئے مڈل کلاس پتی سے منوہر کی عادتوں کا موازنہ نہ کرے لیکن اس بے وقوف لڑکی کو کچھ سمجھ نہیں آیا۔ الٹا وہ ایک کالج میں لیکچرار کی نوکری کرکے کالج کے ہاسٹل میں ہی رہنے لگی۔ گھر صرف چھٹیوں میں آتی ہے۔ جب کار ایکسیڈنٹ میں میرا ایک پاؤں کٹا تو بملا اس روز میرے ساتھ ہی موٹر میں بیٹھی تھی۔ اس کی لک اچھی تھی کہ اس کی طرف کے دروازے کا لاک ٹھیک سے نہیں لگا تھا اس لیے جب ایکسیڈنٹ ہوا تو دروازہ کھل گیا اور وہ کھلے دروازے سے باہر جا گری۔ گرنے سے اسے چوٹیں تو بہت آئیں لیکن پھر بھی بچت ہوگئی۔ ڈرائیور بے چارہ البتہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ پولیس کی تفتیش سے پتا چلا کہ گاڑی کے بریکس فیل ہوئے تھے۔۔۔۔۔ کیسے؟ یہ پولیس بھی پتا نہیں چلا سکی۔ بملا نے شک ظاہر کیا کہ اس کے پیچھے منوہر کا ہاتھ ہوسکتا ہے لیکن میں نہیں مانا۔ ایکسیڈنٹ کے بعد منوہر نے دن رات جس طرح میری خدمت کی تھی، میرے من میں اس کے خلاف کوئی برائی آ ہی نہیں سکتی تھی۔ ویسے بھی وہ جب سے لوٹ کر میرے پاس آیا تھا کبھی میرے ساتھ اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی، کبھی میرے حکم کو نہ ٹالا تھا۔ یہ تو میری اپنی بیٹی تھی جو ہر بار میری نافرمانی کرتی تھی۔ ایکسیڈنٹ کے بعد بھی وہ میری مرضی کے خلاف واپس اپنی جاب پر چلی گئی۔ میرے من میں اس کے لیے بہت غصہ تھا اور میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ منوہر سے بیاہ کرتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے میری پراپرٹی میں سے ایک پیسا نہیں ملے گا۔

''منوہر کی غلط حرکتوں کی خبریں ملتی رہنے کے باوجود میں نے اپنی پراپرٹی اس کے نام کرنے کا سوچ لیا تھا لیکن یہ بات بس میرے اور میرے وکیل کے بیچ تھی۔ جانے کیوں میں نے اس بات کو چھپایا لیکن اس چھپانے سے ہی منوہر مجھ پر کھل گیا۔ ایکسیڈنٹ کے بعد سے میری صحت مسلسل خراب رہنے لگی تھی حالانکہ میں ڈاکٹرز کی ایڈوائس پر بہت اچھی ڈائٹ لے رہا تھا۔ دوا اور غذا کا جب صحت پر اچھا اثر پڑتا نظر نہ آیا تو ڈاکٹر نے میرے کچھ ٹیسٹ کروائے

جس سے معلوم ہوا کہ مجھے سلو پوائزن دیا جارہا ہے۔ ایسا کون کررہا ہے، پتا چلانا آسان نہیں تھا۔ یہ منوہر کی حرکت بھی ہوسکتی تھی اور بملا بھی کسی ملازم کو لالچ دے کر ایسا کروا سکتی تھی۔ جب بات روپے پیسے کی ہو تو خون کے رشتوں کا بھی کوئی اعتبار نہیں رہتا۔ میں نے پولیس میں بھی رپورٹ نہ کروائی کہ جگ ہنسائی ہوتی، بس احتیاط کرنے لگا۔ ان ہی دنوں مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ بملا اپنی سہیلی کے ساتھ شاپنگ پر جاتے ہوئے ایک تیز رفتار موٹر کے نیچے آنے سے بال بال بچی ہے۔ یہ اطلاع مجھے اس کی سہیلی ہی نے دی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر عین وقت پر وہ بملا کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹ نہ لیتی تو موٹر اسے کچل کر چلی جاتی کیونکہ موٹر چلانے والا جس انداز سے اسے چلا رہا تھا، اس سے یہی لگتا تھا کہ وہ من میں بملا کو کچلنے کا ارادہ لے کر ہی سڑک پر نکلا ہے۔ ایک پتا کی حیثیت سے اس خبر نے مجھے پریشان کیا لیکن ساتھ ہی یہ شک بھی من میں آیا کہ اگر بملا مجھے سلو پوائزننگ کروا رہی تھی تو اسے یہ بات پتا چل گئی ہوگی کہ آج کل میں کھانے پینے کے معاملے میں بہت احتیاط کرنے لگا ہوں اور اس نے خود کو شک سے صاف ظاہر کرنے کے لیے جان بوجھ کر خود پر قاتلانہ حملے کی کہانی مجھ تک پہنچائی ہو۔

''منوہر کو بھی میں اب شک کی نظر ہی سے دیکھنے لگا تھا لیکن اس کے خلاف بھی مجھے کوئی کلیو نہیں ملا۔ البتہ تمام احتیاط کے باوجود شدید ڈپریشن کی وجہ سے میرے کمزور دل پر جو اثر پڑا، اس نے مجھے ہاسپٹل ضرور پہنچا دیا۔ منوہر ہمیشہ کی طرح اب بھی میری خدمت کررہا تھا لیکن پرسوں اتفاق سے رات میں سوتے ہوئے آنکھ کھلنے پر میں نے دیکھا کہ وہ میری دوا کی بند شیشی کے ڈھکن میں سرنج سے کچھ انجیکٹ کررہا ہے۔ مجھے ثبوت مل گیا کہ کون مجھے قتل کرنے کی کوشش کررہا ہے لیکن میں نے منوہر پر کچھ ظاہر نہیں کیا۔ میں اس کو کسی اور طرح سے ہی سزا دینے کا سوچ رہا تھا کہ کل رات کیتھرائن والا کیس ہوگیا۔ رات شاید منوہر نے ضرورت سے زیادہ پی لی تھی اور شراب نے دماغ پر چڑھ کر اس کے ہوش چھین لیے تھے جو وہ میرا لحاظ بھی نہ کر سکا بلکہ الٹا مجھ سے بھی ایسی بکواس کر گیا جس سے اس کا ارادہ کھل کر میرے سامنے آگیا۔ اب یہ بھی اتفاق تھا کہ کیتھرائن کی مدد کے لیے بھگوان نے مسٹر فاروق کو یہاں بھیج دیا۔ مسٹر اچاریہ سے میری اچھی جان پہچان ہے۔ انہوں نے ہی مجھے آپ لوگوں کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتایا اور مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ منوہر کو سزا دینے کے لیے مجھے جن افراد کی تلاش تھی، وہ خود مجھ تک پہنچ گئے۔'' بھاٹیہ نے اپنی طویل کہانی کے اختتام پر جو جملے کہے وہ خاصے چونکا دینے والے تھے۔ یعنی وہ جانتا تھا کہ اس وقت وہ بمبئی کے ایک دادا سے ملاقات کررہا تھا اور اس ملاقات کے پیچھے اس کی کوئی غرض بھی چھپی ہوئی تھی۔

''اپنے کو معلوم تھا سیٹھ کہ تم کسی کام کے واسطے ہی اپنے کو ملنے کا مانگتا ہے۔ کام تم نے اپنے کو بول دیا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ کیا، کب، کدھر اور کیسے ہونے کو مانگتا ہے؟'' ربن کا انداز بالکل پروفیشنل تھا اور ایک حساب سے اس وقت وہ ایک بزنس میٹنگ میں ہی مصروف تھا۔

''اپن اس نمک حرام کو اچھی طرح سبق دے کر خلاص کرنے کو مانگتا ہے۔ وہ بھی بہت جلدی۔ ابھی وہ تھانے میں ہے لیکن اس کا کوئی فکر نہ کرو، کل ہی اس کا بیل ہو جائیں گا اور پھر تم اپنا کام کرنے میں آزاد ہوگا۔'' اس نے ربن کے انداز میں ہی اسے جواب دیا اور پھر تفصیل سے بتانے لگا کہ وہ اپنے نمک حرام بھتیجے کو کس طرح کے انجام سے دوچار کرنا چاہتا ہے۔ فاروق آٹھ سال سے ربن کے ساتھ تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ بدمعاشوں کی دنیا میں اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے ربن ''شریف'' لوگوں کے لیے کون کون سی خدمات بامعاوضہ انجام دیتا ہے پھر بھی اسے بھاٹیہ کی انتقام کے شعلوں سے بھڑکتی خواہش سننے کے لیے خود پر جبر کرنا پڑا۔ ربن نے فوراً ہی اس کی کیفیت کو محسوس کر لیا، سو اس کا شانہ تھپکتے ہوئے نرمی سے بولا۔

''تو تھک گیا ہوگا۔ جا، جا کر اپنے کمرے میں آرام کرلے۔ اپن سیٹھ کی بات سن کر ابھی ادھر آتا ہے۔'' اس کی طرف سے ملنے والی یہ اجازت فاروق کے لیے ایک نعمت تھی چنانچہ وہ فوراً ہی وہاں سے اٹھ گیا اور بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

''کھانا کھالو ڈیڈ۔'' جولیٹ نے دلیے سے بھرا ہوا پیالہ جوزف کے سامنے رکھا اور خود بھی اس کے مقابل بیٹھ گئی۔ جوزف اب پہلے سے بہتر تھا اور اپنی سکتہ زدہ کیفیت سے نکل آیا تھا لیکن اب بھی وہ زیادہ بات چیت نہیں کرتا تھا اور اگر جولیٹ کوئی جواب طلب بات کہتی تو اس کا مختصر جواب دے دیتا۔ کھانے پینے سے بھی اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی بس جولیٹ کے اصرار پر تھوڑا بہت چکھ لیتا تھا۔ اس وقت بھی جولیٹ نے دلیے کا پیالہ اس کے سامنے رکھا تو اس نے کوئی دلچسپی نہیں لی اور اپنی ہی کسی سوچ میں گم بیٹھا رہا۔

اسے اس کیفیت میں دیکھ کر جولیٹ خود حرکت میں آئی اور چمچہ بھر کر دلیا اس کی طرف بڑھایا۔

''منہ کھولو ڈیڈ۔'' جوزف نے فرمانبرداری سے منہ کھول دیا۔ جولیٹ ایک کے بعد دوسرا اور تیسرا چمچہ اس کے منہ میں ڈالتی چلی گئی۔

''تم نے پولیس کے سامنے اس کا نام کیوں نہیں لیا جولی؟'' تیسرے چمچے کے بعد جوزف نے بہت اچانک اس سے سوال کیا۔ اس کے سوال میں کسی شخص کا نام نہ ہونے کے باوجود جولیٹ سمجھ گئی کہ وہ کس کے بارے میں پوچھ رہا ہے چنانچہ پل بھر کے ٹھٹکے ہوئے ردعمل کے بعد جواب میں بولی۔

''نام لینے سے کچھ نہیں ہونے والا ڈیڈ۔ وہ جس اسٹیٹس کا آدمی ہے پولیس میرے نام لینے پر بھی اس کے اگینسٹ کچھ نہیں کرے گی۔ پھر کیا فائدہ ہے ایسی بیکار بات منہ سے نکالنے کا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ایک بار پھر دولت سے انسان کا رائٹ ہار جائے گا۔'' جوزف کے لہجے میں گہری تلخی تھی۔

''انسانوں کے رائٹس تو گاڈ نے بنائے ہیں ڈیڈ لیکن یہ جو زمین پر خدا بن کر پھرتے ہیں، انہوں نے جینے کے سارے رائٹس اپنے نام کر لیے ہیں۔ ہم جیسوں میں سے تو بس کوئی کوئی ہی اتنی ہمت کر سکتا ہے کہ ان سے اپنے ان رائٹس کو چھین سکے۔'' تلخ حقیقت کو بیان کرتی جولیٹ جوزف کی تلخی کی گہرائی کا اندازہ نہیں کر سکی تھی۔

''تم ان کوئی کوئی میں سے ہو یا......؟'' جوزف کا ادھورا سوال بھی مکمل تھا۔

''اس کوئسچن کا آنسر تمہیں وقت دے گا ڈیڈ۔ ابھی یہ سب باتیں چھوڑو اور دلیا کھاؤ۔'' وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اس لیے جوزف نے صرف اس کی معتدل آواز سنی۔ آنکھوں میں بھڑکتے شعلے نہیں دیکھ سکا۔

''پتا نہیں اپنے پاس کتنا وقت بچا ہے۔'' اس کا جواب سن کر جوزف دھیرے سے بڑبڑایا پھر اس کے ہاتھ سے دلیا کھانے لگا۔ طبیعت کی نقاہت کی وجہ سے ڈاکٹر نے ابھی اسے ہلکی پھلکی غذا پر رکھنے کی ہی ہدایت کی تھی اور خدشہ ظاہر کیا تھا کہ زیادہ مقوی غذا اس کے لیے ہضم کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اپنی عزیز بیوی کی زندگی میں کھانے پینے کے بے حد شوقین جوزف کو حقیقت میں اب کسی ذائقے سے کوئی غرض نہیں رہی تھی اور وہ صرف جولیٹ کی خاطر تھوڑا بہت زہر مار کر لیتا تھا۔

''میں کل سے دفتر دوبارہ جوائن کر لوں گی۔ جو کچھ ہوا سو ہوا لیکن مجھے اس جاب کی ضرورت ہے۔'' خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد جولیٹ نے اسے اطلاع دی۔

''ہاں، یہ پیٹ بڑی ظالم چیز ہے۔ آدمی کے دل پر کچھ بھی گزر رہا ہو لیکن اس کو بھرنے کے واسطے ہاتھ پاؤں چلانا ہی پڑتے ہیں۔'' جوزف کو وہ وقت یاد آ گیا تھا جب جوزفین ملازمت کی خاطر بمبئی چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کے اپنے لیے زندگی کی ساری رونقیں دم توڑ گئی تھیں لیکن وہ اپنے گھر کا چولہا جلائے رکھنے اور ماں کے علاج کے لیے تگ و دو کرنے پر مجبور تھا حالانکہ اس کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر بس جوزفین کے پیچھے روانہ ہو جائے۔ اسی کی طرح اس کے سامنے بیٹھی جولیٹ کے دماغ میں بھی بہت سی سوچیں تھیں لیکن دونوں ہی نے ایک دوسرے سے اپنی اپنی سوچوں کو نہیں بانٹا اور مشینی سے انداز میں کھانے اور کھلانے کا سلسلہ جاری رہا۔

دلیے کا آدھا پیالہ کھانے کے بعد جوزف نے اس کا ہاتھ روک دیا۔ اس نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا اور برتن واپس کچن میں رکھ کر آنے کے بعد جوزف کو اس کی دوائیں کھلانے لگی۔ دوا کھانے کے تھوڑی دیر بعد جوزف پر غنودگی طاری ہونے لگی تو وہ اسے بستر پر لٹا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب وہ اپنے بستر پر لیٹی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔

چند دنوں کے اندر اس کی زندگی میں بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ سب سے بڑی اور تکلیف دہ تبدیلی تو یہ تھی کہ اس کا چھوٹا سا گھر ماں کے وجود سے خالی ہو گیا تھا۔ اس ماں کے وجود سے جو اس گھر کی اصل رونق تھی۔ جس کا سلیقہ اور ہنر محدود وسائل میں بھی ان کی زندگیوں کو منظم رکھے ہوئے تھا اور جس کی خوش اخلاقی کے سب معترف تھے۔ آس پڑوس کی عورتیں کتنی بار اس کے سامنے اس بات کا اظہار کر چکی تھیں کہ وہ جوزفین جیسی عورت کی محلے میں کمی کو شدت سے محسوس کر رہی ہیں۔ اسے ان عورتوں کی سچائی پر کوئی شک نہیں تھا لیکن جب ان میں سے کوئی ٹوہ لینے والے انداز میں اس پر گزری بپتا سننے کے لیے سرگوشیوں میں سوال کرتی تھی تو اس کا دل بے ساختہ ہی اپنی ماں کی مہربان آغوش کو ڈھونڈنے لگتا تھا جہاں چھپ کر وہ دنیا والوں اور ان کے سوالوں سے بچ سکے لیکن وہ جانتی تھی کہ اب اسے کبھی اس آغوش کی پناہ نہیں مل سکتی اور اب اسے خود ہی جینے کی راہ نکالنی تھی۔

جو اس پر گزر چکی تھی اس کے بعد اگرچہ اسے زندگی سے اتنی دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن وہ کم سے کم اس وقت تک

جینا چاہتی تھی جب تک اس کا مجرم کیفرِ کردار کو نہیں پہنچ جاتا۔
دوبارہ دفتر جوائن کرنے کے فیصلے کے پیچھے بھی یہی خواہش چھپی ہوئی تھی۔ دفتر کے خیال کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں عارف کا خیال جاگا۔ اپنے گھر واپس آنے پر اس نے عارف کو یہاں دیکھا تھا لیکن اس کے بعد وہ دوبارہ اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ غلام چاچا کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کے بے ہوش ہونے پر اسپتال جانے کے لیے سواری وہی لے کر آیا تھا اور پھر ان کے ساتھ اسپتال تک بھی گیا تھا لیکن اس کے بعد سے تو اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔ اس کا یہ غیاب خاصا معنی خیز تھا اور اس کا ایک مطلب یہ بھی لیا جاسکتا تھا کہ وہ اس پر گزرنے والے حادثے کے بعد اس کے لیے قابلِ قبول نہیں رہی ہے لیکن ساتھ ہی دل میں امید کی ایک ننھی سی کرن بھی تھی جو برسوں کی اس رفاقت نے جلائے رکھی تھی جسے وہ اور عارف دونوں محبت کا نام دیتے تھے۔ وہ محبت اسے عارف کو بہت سی رعایتیں دینے پر مجبور کرتی رہی تھی اور اب بھی وہ خود کو مختلف تاویلیں دے کر قائل کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ اگر عارف دوبارہ پلٹ کر نہیں آیا تو اس کا سبب اس کی کوئی مجبوری رہی ہوگی۔ اس کے گھر میں کوئی مسئلہ ہوگا۔ دفتر میں کام کی زیادتی ہوگی، وہ بیمار ہوگیا ہوگا وغیرہ وغیرہ لیکن اندر سے دل سہما ہوا ہی تھا جیسے حقیقت کو خوب جانتا ہو اور اس حقیقت کو سامنے آنے کے لیے بس ایک رات کی مسافت ہی تو باقی رہ گئی تھی۔

رات گزرنے کے بعد وہ صبح جب دل میں کچھ عزائم لیے گھر سے نکلی تو اردگرد کا منظر پہلے ہی کی طرح ہونے کے باوجود اسے سب کچھ بدلا بدلا سا لگا۔ وہ پتلی سی گلی جسے وہ سر اٹھا کر بڑے اعتماد سے پار کرتی تھی، آج بہت طویل ہوگئی تھی۔ گلی میں کھیلتے بچے اسے اجنبی سے لگ رہے تھے اور ہر روز اس کے دفتر جانے کے اوقات میں اپنے دروازے کے آگے جھاڑو لگانے کا معمول انجام دینے والی للیتا موسی کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر اترنے والی حیرانی بھی اجنبی تھی۔ اس قدر اجنبیت کے بیچ کسی شناسائی کی تلاش میں اس کی نظروں نے خودبخود ہی اس دروازے تک کا سفر طے کیا جہاں فاروق اس کے انتظار میں ہر روز کھڑا ہوتا تھا لیکن اس جگہ کی ویرانی بھی اس کے لیے مایوسی لے کر آئی اور.....

بے ساختہ ہی ایک تلخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر دوڑ گئی۔ دلدار آغا کی کوٹھی پر گزری ایک رات نے اسے ایک غنڈے کے معیار سے بھی نیچے گرا دیا تھا۔ اس تلخ خیال سے بھری وہ گلی کے نکڑ سے گزرنے لگی تو اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ وہاں بیٹھا فقیر بھی نظر نہ آیا۔

''فقیر کو ایک سکہ دیتی جا۔'' فقیر نے خود ہی ہانک لگا کر اسے روکا تو وہ اسے نظر انداز کر کے آگے نہ بڑھ سکی اور پرس سے ایک سکہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ فقیر نے اس کے ہاتھ سے سکہ لے کر معائنہ کرنے کے انداز میں اپنی آنکھوں کے سامنے کیا پھر بولا۔ ''کھرے، کھوٹے کی پہچان کے لیے تجھے ابھی بہت وقت چاہیے۔ خیر کوئی بات نہیں، ایک دن یہ پرکھ بھی سیکھ ہی لے گی۔ ابھی تو جا کر اسے آزمالے جس سے تجھے کچھ نہیں ملنے والا۔'' اس نے سکہ اپنے کاسے میں بے نیازی سے رکھتے ہوئے سر نیہوڑا لیا۔

جولیٹ نے محسوس کیا کہ آج فقیر کے لہجے میں غصے یا تلخی سے زیادہ اس کے لیے ہمدردی ہے۔ اس ہمدردی پر اسے غصہ آنے لگا۔ یعنی وہ اتنی قابلِ رحم ہوگئی تھی کہ نکڑ پر بیٹھنے والا یہ فقیر بھی اس پر ترس کھا رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہ آیا تو وہ پیر پٹختی ہوئی اس فقیر کے پاس سے ہٹ گئی۔ جھنجلاہٹ کا یہ احساس دفتر پہنچنے پر بھی اس پر طاری رہا تھا۔ دفتر میں اس کے ساتھی اس سے جوزفین کی موت پر تعزیت کرتے رہے۔

''ہم افسوس کے لیے آپ کے گھر آنا چاہتے تھے لیکن عارف نے کہا کہ آپ کے والد کی طبیعت بہت خراب ہے اور آپ ان کی تیمارداری میں مصروف ہیں۔ ایسے میں ہمارا ملاقات کے لیے جانا آپ کے لیے زحمت کا باعث بن سکتا ہے، سو ہم گھر پر نہیں آئے۔ اب کیسی طبیعت ہے آپ کے والد کی؟'' ایک کولیگ نے اس سے تعزیت کرتے ہوئے کہا تو اس نے چونک کر عارف کی طرف دیکھا۔ دفتر آنے کے بعد عارف نے اس سے رسمی ہیلو ہائے کے سوا کوئی بات نہیں کی تھی اور مسلسل اپنے کام میں مصروف رہا تھا۔ جولیٹ کو لگا تھا کہ اس کی یہ مصروفیت اصل میں اسے نظر انداز کرنے کی ایک تدبیر تھی لیکن اب عارف کی طرف سے دیے گئے اس فیور پر وہ ذرا مختلف انداز میں سوچ رہی تھی۔ ان لوگوں کو اس کے گھر آنے سے روک کر ایک طرح سے عارف نے اس پر احسان کیا تھا۔ اگر وہ لوگ گھر تک آتے تو یقیناً اس داستان سے بھی واقف ہوجاتے جسے وہ بس خود تک محدود رکھنا چاہتی تھی۔ عارف نے اس کی اس خواہش کو بنا کہے سمجھا تھا تو اسے اچھا لگا تھا۔

''وہ اب پہلے سے بہتر ہیں۔ صدمہ بہت بڑا ہے اس لیے انہیں مکمل طور پر سنبھلنے میں وقت تو لگے گا لیکن اب بھی انہوں نے کسی نہ کسی طرح خود کو تھوڑا بہت سنبھال لیا ہے۔'' عارف کے چہرے پر سے نظریں پلٹاتے ہوئے اس نے

اپنے کولیگ کو جواب دیا۔

''بھگوان انہیں حوصلہ دے۔'' اس کے کولیگ نے دعا کی صورت اپنے خلوص کا اظہار کیا اور اس کی عارف پر موجود توجہ کو محسوس کر کے آہستہ سے بولا۔ ''عارف بھی آج کل بہت ڈسٹرب نظر آرہا ہے۔ کسی کولیگ سے ڈھنگ سے بات نہیں کرتا۔ کوئی زیادہ چھیڑنے کی کوشش کرے تو جھنجلا جاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ خود کو زیادہ سے زیادہ کام میں مصروف ظاہر کرے۔''

ظاہر ہے اسے جولیٹ اور عارف کے درمیان تعلق کی نوعیت کا اندازہ تھا اسی لیے بطورِ خاص اسے یہ معلومات فراہم کی تھیں۔ جولیٹ نے بلاتبصرہ اس کی بات سنی۔ وہ اندازہ کرسکتی تھی کہ عارف کے اس رویے کے پیچھے اس کے ساتھ پیش آنے والا حادثہ ہے۔ وہ اسے چاہتا تھا اور اس کا اس حادثے سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ وہ خود بھی عارف کے رویوں کا تجزیہ کر کے توجیہات سوچتی رہی۔ دفتر میں اس کے دن کا بیشتر حصہ لوگوں کی تعزیتیں وصول کرتے ہوئے گزرا۔ رندھاوا نے بھی اس سے افسوس کا اظہار کیا اور پیشکش کی کہ وہ چاہے تو دو تین دن مزید چھٹی کرسکتی ہے۔ جولیٹ نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ میسر وقت میں وہ اپنے ادھورے رہ جانے والے کاموں کو دیکھتی رہی۔ اسی طرح دفتر میں اس کی ڈیوٹی کا وقت ختم ہوگیا۔ اپنا سامان سمیٹ کر رکھتے ہوئے وہ کن انکھیوں سے عارف کو بھی دیکھتی رہی۔ وہ بھی اپنا کام سمیٹ رہا تھا۔ سب سمیٹ کر رکھنے کے بعد وہ اس کی میز کے قریب آن کھڑا ہوا۔

''چلو۔'' اس کے اس ایک لفظ نے ہی جولیٹ کو خوش کر دیا۔ پورے دن کی خاموشی کے بعد عارف کی زبان سے نکلنے والا یہ ایک لفظ اس کے لیے زندگی کا پیغام تھا۔ معمول کے مطابق وہ دونوں ایک ساتھ دفتر سے باہر نکلے لیکن عارف بس اسٹاپ کا رخ کرنے کے بجائے اس سے بولا۔

''آؤ، وہاں سامنے والے ریسٹورنٹ میں تھوڑی دیر رک کر چائے پیتے ہیں۔ مجھے تم سے کچھ باتیں بھی کرنی ہیں۔'' اس کی پیشکش تو اچھی تھی لیکن جولیٹ کو اس کا لہجہ ضرورت سے زیادہ گمبھیر محسوس ہوا۔ بہرحال وہ خاموشی سے اس کے ساتھ سڑک پار کر کے ریسٹورنٹ میں چلی گئی۔ ایک میز کے گرد کرسیاں سنبھالنے کے بعد عارف نے بیرے کو چائے کا آرڈر دیا اور خود کسی سوچ میں گم ہوگیا۔

''کچھ بولو، اتنے خاموش کیوں ہو؟'' جولیٹ کو اس کی خاموشی سے وحشت ہونے لگی۔

''یہی تو سمجھ نہیں آتا کہ کیا بولوں۔'' اس کا لہجہ بہت تھکا ہوا تھا۔

''جو بھی تمہارے دل میں ہے بول دو۔ میں اتنا کچھ سہہ چکی ہوں کہ اب کسی بات سے فرق نہیں پڑنے والا۔'' اس نے ایک تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ عارف کا حوصلہ بڑھایا۔

''مجھے ایک دوسرے دفتر میں ملازمت مل گئی ہے۔ پہلی سے میں وہاں جوائن کرنے والا ہوں۔'' عارف نے اسے اطلاع دی اور رک کر بیرے کے چائے کے برتن میز پر سجانے کا انتظار کرنے لگا۔

''یہ تو اچھی خبر ہے۔ یقیناً یہاں سے اچھی مراعات مل رہی ہوں گی تب ہی تم نے دوسری جگہ جوائن کرنے کا سوچا ہوگا۔'' بیرے کے وہاں سے ہٹ جانے پر جولیٹ نے اس سے کہا اور خود پیالیوں میں چائے بنانے لگی۔

''اس جاب کے لیے مجھے بمبئی سے باہر جانا ہوگا۔'' عارف نے اسے بتایا۔

''کہاں؟'' پل بھر کے لیے جولیٹ کا ہاتھ رکا پھر اس نے خود کو سنبھال کر تحمل سے پوچھا۔

''کلکتے۔'' عارف نے بتایا۔

''تو کیا پرابلم ہے۔ کلکتہ کوئی اتنا زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ ہم فون اور لیٹرز کے ذریعے ایک دوسرے سے کونٹیکٹ میں رہ سکتے ہیں۔ چھٹیوں وغیرہ میں تمہارا گھر والوں سے ملنے کے لیے بمبئی بھی آنا جانا لگا رہے گا۔ تھوڑا سا وقت نکال کر مجھ سے بھی مل لیا کرنا۔'' اسے لگا کہ عارف کو اس سے دور جانا کھل رہا ہے، سو اسے تسلی دینے لگی۔

''نہیں، میں تم سے نہیں ملوں گا۔ میں تم سے دور جانے کے لیے ہی تو یہ ملازمت تبدیل کر رہا ہوں۔'' عارف نے بالکل اچانک اس کی سماعتوں میں دھماکا کیا تو وہ کئی لمحوں تک صُمٌ بکمٌ بیٹھی رہ گئی۔

''میں اپنے اس فیصلے کے لیے تم سے معذرت چاہتا ہوں لیکن میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں اتنے اعلیٰ ظرف کا مالک نہیں ہوں کہ اب بھی تمہیں قبول کرسکوں۔ مجھے معلوم ہے کہ بہت احتیاط کے باوجود بھی لوگوں کو آہستہ آہستہ تمہارے اغوا کا علم ہو جائے گا۔ بات میرے گھر تک پہنچی تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ وہ لوگ ایک کرسچین لڑکی کو تو اپنی بہو کے طور پر قبول کر سکتے ہیں لیکن ایک اغوا شدہ لڑکی کے لیے ان کے پاس کوئی گنجائش نہیں ہوگی کیونکہ میرے والدین کو خود بھی اپنی چار چار بیٹیاں بیاہنی ہیں اور ہماری

سوسائٹی میں ایسے گھروں کی لڑکیوں کے لیے رشتے نہیں آیا کرتے جہاں پہلے سے ہی کوئی بدنام عورت موجود ہو۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟ غیرت مندی کے علاوہ یہ میری معاشرتی مجبوری بھی ہے کہ اب میں تم سے اپنے تعلق کو قائم نہیں رکھ سکتا۔'' وہ برسوں کے تعلق کو لمحوں میں توڑ گیا تھا۔

''او کے، اب میں چلتی ہوں۔'' یہ جولیٹ کے ضبط کی انتہا تھی کہ اس نے عارف کا فیصلہ سننے کے بعد کسی جذباتی ردعمل کا اظہار نہیں کیا اور پورے حوصلے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ عارف اپنی جگہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس پر ایک آخری نظر ڈال کر وہ تلخی سے مسکرائی اور پلٹ کر ریسٹورنٹ سے باہر جانے والے راستے کی طرف چل دی۔ پیچھے میز پر پیالیوں میں موجود سنہری چائے جوں کی توں پڑی ٹھنڈی ہوتی رہی۔ جہاں انسانوں کے دلوں میں پلتے برسوں کے جذبات لمحوں میں ٹھنڈے ہو جائیں، وہاں چائے کی پیالی کے ٹھنڈا یا گرم ہونے سے کیا فرق پڑنے والا تھا۔

''کھرے کھوٹے کی پہچان کے لیے ابھی تجھے بہت وقت چاہیے۔'' ریسٹورنٹ سے نکل کر وہ یونہی سڑک کے کنارے پیدل چلی جارہی تھی جب اس کے ذہن میں فقیر کا کہا ہوا فقرہ گونجا۔

''ابھی تو جا کر اسے آزما لے جس سے تجھے کچھ نہیں ملنے والا۔'' اس بے حیثیت سے فقیر نے کتنے یقین سے دعویٰ کیا تھا۔ اس وقت وہ اس کی بات سمجھ نہیں سکی تھی لیکن اب بہت کچھ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکا تھا۔ وہ فقیر تو عرصے سے اسے اس طرح کی تنبیہات کر رہا تھا لیکن وہ ہی اس کی باتوں کو دیوانے کی بڑ کی جان کر اہمیت نہ دیتی تھی۔ اکثر انسان کو لوگوں کی حقیقت سمجھنے میں بہت دیر لگ جاتی ہے۔ اس نے بھی آج بہت تاخیر سے اپنی زندگی میں شامل دو کرداروں کے اصل چہرے دیکھے تھے اور اسے افسوس تھا کہ اتنی دیر کیوں لگی۔ اپنی پرکھنے کی صلاحیت کو دل ہی دل میں کوستی وہ اپنے محلے میں پہنچی تو اس کی نگاہوں نے... بے ساختہ ہی بڑی بے قراری سے اس فقیر کو کھوجنا چاہا لیکن وہ اپنی مخصوص جگہ پر موجود نہیں تھا۔

''کل صبح اس سے ضرور بات کروں گی۔'' وہ دل میں ارادہ باندھتی ہوئی گھر کی طرف بڑھ گئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کل صبح تو کیا اب وہ آنے والی کسی بھی صبح گلی کے نکڑ پر اس فقیر کو بیٹھا ہوا نہیں دیکھ سکے گی۔ اگلی صبح اس نے دفتر جانے سے قبل فقیر کے دنیا سے گزر جانے کی خبر سنی اور اس امر پر حیران رہ گئی کہ اپنی زندگی کے دو کرداروں کو اس نے اس

کترنیں

1۔ عاجزی سے جھکنا انسان کو اونچا کرتا ہے۔ معاف کرنا عزت بڑھاتا ہے اور خیرات دینا مال و دولت میں ترقی پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔

2۔ اس شخص کی ہم نشینی سے گریز کرو جو دوسروں کے عیوب تمہارے سامنے ظاہر کرے۔ کیونکہ ایسا کرنے والا آپ کے عیوب کو دوسروں کے سامنے ظاہر کر کے تمہاری تذلیل کا باعث بھی بن سکتا ہے۔

3۔ کامیابی کا زینہ بہت ساری ناکامیوں سے بنا ہے۔

4۔ آدمی کی قابلیت اس کی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔

5۔ جلد بازی کا نتیجہ اکثر ناکامی کی صورت میں نکلتا ہے۔

6۔ معاف کرنے میں جلدی کرنا انتہائی شرافت کی علامت ہے۔

7۔ بہادر کا ہاتھ کبھی کمزور پر نہیں اٹھتا۔

8۔ دو طرح سے دیکھنے پر ہر چیز چھوٹی نظر آتی ہے 1۔ دور سے 2۔ غرور سے۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا۔ پاک پتن شریف

وقت جانا تھا جب وہ اس کی زندگی سے نکل چکے تھے۔

☆☆☆

آج وہ اپنی طبیعت میں کافی بہتری محسوس کر رہا تھا۔ صبح سے سر میں درد کی کوئی لہر نہیں اٹھی تھی۔ ڈاکٹر نے بھی اس کی طرف سے اطمینان کا اظہار کیا تھا اور امید دلائی تھی کہ چند دنوں میں اسے اسپتال سے فارغ کر دیا جائے گا۔ آج اڈے سے بھی کئی لوگ وقتاً فوقتاً اس سے ملاقات کے لیے آتے رہے تھے اور اس کا وقت خاصا اچھا گزرا تھا۔ اڈے سے آنے والوں میں سے ہر ایک کی زبان پر ربن دادا کی شاندار فتح اور مجو کی ذلت آمیز شکست کا ذکر تھا۔ وہ خوشی خوشی سب کی باتیں سنتا رہا۔ ربن خود کل سے غائب تھا لیکن اڈے کے ساتھیوں کو اس کے پاس آنے کی اجازت دے کر اس نے اپنی غیر موجودگی کی تلافی کر دی تھی۔ اب بھی ساتھیوں کا ایک گروپ اس سے رخصت ہوا تو رامو اور نانا چلے آئے۔

''ہاں بھئی شیر جوان، اب اور کتنے دن تک تیرے کو ہاسپٹل میں رہنے کا ہے؟'' نانا نے اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے بے تکلفی سے پوچھا۔

''میں تو ابھی یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں لیکن کوئی اجازت نہیں دیتا۔ آپ ہی دادا سے میری سفارش کر دیں نا۔'' فاروق نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''تیرا دادا سفارش ماننے والا بندہ نہیں ہے۔ سالا چاروں کھونٹ دیکھ کر چلتا ہے اور اسے سب معلوم رہتا ہے کہ کب کیا کرنے کا ہے۔ تیرے کو بھی وہ دیکھ بھال کر ہی ہاسپٹل چھوڑنے کی اجازت دیں گا۔'' نانا نے زور سے ہنستے ہوئے کہا پھر وہ اور رامو اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ رامو نے بتایا کہ بجو کے اڈے کے لوگ اس سے بھرپور تعاون کر رہے ہیں پھر بھی وہ محتاط ہے اور ان لوگوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے جو اس کے لیے مسئلہ بن سکتے ہیں۔ گفتگو کے دوران ہی اس بات کا ذکر بھی نکلا کہ بجو کے بعد ربن، ولیم کا مزاج پوچھنے کا بھی ارادہ رکھتا تھا لیکن ولیم کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ان دنوں ہندوستان میں نہیں تھا اور بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے پیشِ نظر اپنی فیملی کو واپس انگلستان چھوڑنے گیا ہوا تھا۔

''جانے دو نا استاد۔ انتقام لینا اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔'' فاروق نے رامو کو مخاطب کرکے اس سے کہا۔

''کیا ضروری ہے اور کیا نہیں، اس کا فیصلہ کرنے والا تو دادا ہے، پر اپن بھی اتنی بات سمجھتا ہے کہ اپنے سے پنگا لینے والوں کو سبق دینا اچھا رہتا ہے۔ آگے دوسرے ہوشیار ہو جاتے ہیں کہ ادھر پنگا لینے سے پہلے سو بار سوچنے کا ہے۔ تجھے پتا ہے کہ اپنا دھندا تو چلتا ہی اسی ''گڈول'' پر ہے۔ اپن اپنے دشمنوں کو چپ چاپ شما کرتے رہے اور کسی کو کچھ نہیں بولے تو اپنا تو سارا بزنس ہی ٹھپ ہو جائیں گا۔'' رامو کی بات نے اسے خاموش کروا دیا۔

یہ حقیقت تھی کہ ان کا وجود اس رعب اور دبدبے کی وجہ سے ہی قائم تھا جس کا اظہار وہ وقتِ ضرورت کرتے رہتے تھے۔ پرسوں بھاٹیہ سیٹھ نے بھی تو اسی ''گڈول'' کی وجہ سے ربن اور اس سے اپنے کمرے میں ملاقات کی تھی اور ایک اہم کام سپرد کیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ بھاٹیہ کے اس کام کا کیا ہوا۔ ربن کے غیاب سے تو یہی لگ رہا تھا کہ وہ اس کام پر لگ چکا ہے۔ یک دم ہی اس کا دل اچاٹ ہونے لگا۔ ان کا حصہ ہونے کے باوجود جانے کیوں وہ ابھی تک پوری طرح اس سب کا عادی نہیں ہو سکا تھا۔ رامو اور نانا نے اس کے رویے میں پیدا ہونے والی تبدیلی کو محسوس کیا اور طبیعت کی خرابی پر محمول کرتے ہوئے اسے آرام کرنے کا مشورہ دے کر جلد وہاں سے روانہ ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد وہ بستر پر دراز ہوا تو نظر سرہانے کی میز پر رکھے اخبار پر پڑ گئی۔ اخبار صبح سے آیا رکھا تھا لیکن اسے اس کا مطالعہ کرنے کی فرصت نہیں مل سکی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اخبار اٹھا لیا اور یونہی سرخیاں پڑھتے ہوئے فرنٹ کے بعد اخبار کا پچھلا صفحہ دیکھا۔ وہاں ایک خبر نے اسے چونکا دیا...... خبر تھی۔ ''مشہور بزنس مین رام بھاٹیہ کے بھتیجے منوہر بھاٹیہ کی تشدد زدہ لاش جوہو کے ساحل پر دریافت۔ پولیس قاتلوں کے بارے میں کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکی۔'' خبر میں تفصیلات بھی شامل تھیں لیکن اس نے پڑھنے کے بجائے اخبار ایک طرف ڈال دیا۔ بھاٹیہ تگڑی اسامی تھا اس لیے ربن نے اس کا کام بھی بہت تیزی سے نمٹایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ منوہر کوئی اچھا آدمی نہیں تھا اور اس کی نمک حرامی کی جو سزا بھاٹیہ نے تجویز کی تھی، وہ بھی شاید غلط نہیں تھی پھر بھی اس کے دل پر بوجھ سا آ گیا تھا۔ یہ وہ بوجھ تھا جو ہر حساس انسان ایسی کوئی خبر پڑھ سن کر بے اختیار ہی محسوس کرتا ہے اور اس کے بس میں نہیں ہوتا کہ کسی کے اس طرح مارے جانے کو لاکھ حق سمجھتے ہوئے بھی خود کو افسردہ ہونے سے روک سکے۔ وہ بھی دل گرفتہ سا اپنی جگہ آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ اس کے ساتھ اس کی دیکھ بھال کے لیے رکا ہوا شیدو اسے سوتا سمجھ کر باہر نکل گیا۔ اصل میں اسے سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی اور اسپتال کے کمرے میں سگریٹ پینے کی اجازت نہیں تھی۔ شیدو کو کمرے سے نکلے مشکل سے پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

''یس۔'' اس نے لیٹے لیٹے ہی دستک کا جواب دیا۔ یہاں اسپتال کے عملے اور اڈے کے ساتھیوں کے علاوہ بھلا اور کون آنے والا تھا۔ اس کی طرف سے اجازت ملنے پر دروازہ کھول کر دو ہستیاں آگے پیچھے چل کر اندر داخل ہوئیں تو وہ بے ساختہ ہی بستر پر اٹھ بیٹھا۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ اس سے ملاقات کے لیے دو نقاب پوش چہرے یہاں آسکتے ہیں۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیے

پچپاس سالہ ریمنڈ ایک بڑے ہال کی پچھلی دیوار سے ہٹ کر لگی میز کے پیچھے اپنی کرسی پر آکر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ کاؤنٹر کی طرح بنی میز کی دراز کا تالا کھول کر اس نے چابیوں کے تین چار بڑے بڑے گچھے نکالے اور میز کی ایک سائڈ پر لگی کیلوں پر لٹکا دیے۔ جیب سے باریک کمانی کی نظر والی عینک نکالی اور اپنی ستواں کھڑی ناک کے پھندے پر ٹکالی۔ ریمنڈ گھٹے ہوئے جسم اور ٹھگنے قد کا درمیانی شخصیت کا مالک تھا جس کے سر کا درمیانی حصہ بالوں سے قدرے خالی تھا اور کسی دریا میں ڈیلٹا کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ باقی ماندہ بالوں کو اس نے رنگا ہوا تھا۔ اس کی چھوٹی آنکھوں پر لگی عینک اس کی شخصیت کو عجیب بنا دیتی تھی جس کا اسے بھی احساس تھا۔ عینک لگا کر اس نے قریب پڑے رجسٹر میں رکھے کچھ کاغذات نکالے اور ان کا مطالعہ کرنے لگا۔

اس بڑے ہال میں اس کی میز سے کچھ آگے چار پانچ اور بڑی میزیں .... جوڑ کر بچھائی گئی تھیں جن کے گرد کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہال کی دیواروں کے ساتھ چاروں طرف بڑی اور اونچی الماریاں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں جن کے

دشمنوں کی فہرست میں ٹاپ پر آنے والے ہرجائی صنم کا ماجرا

انسان عمر کی چاہے جس منزل پر پہنچ جائے... وفا میں دغا ملے تو دل ہرجائی محبوب کی اس خطا کو معاف کرنے کے لیے ہرگز راضی نہیں ہوتا... وہ بھی ایک لمبا سفر طے کرنے کے باوجود اس چوٹ کی کسک آج بھی محسوس کرتا تھا جس نے اس کی روح کو گھائل کر دیا تھا... اور پھر جوش انتقام میں اس نے جو بھی قدم اٹھایا اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا نکلنا تھا۔

ہٹ لسٹ

علی اختر



ریکس میں بے شمار کتابیں موجود تھیں۔ یہ مقامی کالج کی لائبریری تھی جس کا ریمنڈ انچارج تھا۔ کالج میں مخلوط تعلیمی نظام تھا۔ طلبا و طالبات لائبریری کھلتے ہی ہال میں آجاتے اور خاموشی کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کرنے لگتے یا پھر ایشو ہوئی کتابیں واپس کرتے اور نئی کتابیں نکلوا لیتے۔

ریمنڈ نے ایک اچٹتی سی نظر ہال پر ڈالی اور قریب پڑی کتابوں کو رجسٹر میں پڑی لسٹ سے ملانے لگا۔ کتابوں کا یہ نیا اسٹاک ابھی کل ہی آیا تھا۔ اسٹاک چیک کرتے کرتے اچانک اس کی نظریں ایک تحریکی ناول ''انکل ٹامز کیبن'' (Uncle Tom,s Cabin) پر رک گئیں۔ یہ ہیرٹ بیچر اسٹووز (Heart Beecher Stove) کا لکھا ہوا تھا۔ اس نے سرسری نظر سے اس کے مندرجات کو دیکھا۔ اس میں انسانی اسمگلنگ کے بہیمانہ اقدام کی بھیانک تفصیلات تھیں جنہیں پڑھ کر انسانی سرشرم سے جھک جاتا ہے۔ معا اس کے منہ سے نکلا۔ ''اوہ مائی گاڈ...... کیا ہم اتنی نچلی سطح پر بھی جاسکتے ہیں۔ ہم جو انسانیت پر کسی طرح کا بھی ظلم برداشت نہ کرنے کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں، اپنے افعال اور کردار میں کس قدر چھوٹے ہیں۔'' اس نے ناول کو ایک طرف رکھ لیا تاکہ وقت ملنے پر اس کا آرام سے مطالعہ کرسکے۔ ابھی وہ اس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ایک آواز آئی۔

''ہیلو ریمنڈ......!'' اس نے نظریں اٹھائیں۔ یہ اس کا اسسٹنٹ پال تھا۔

''تم پھر لیٹ ہو پال......'' ریمنڈ نے کتابوں کو ترتیب سے رکھتے ہوئے کہا۔

''سوری ریمنڈ......'' پال نے مختصر سا جواب دیا اور کتابوں کے اندراج والا رجسٹر اٹھا کر اپنی نشست پر جا بیٹھا۔

''وجہ پوچھ سکتا ہوں......؟'' ریمنڈ نے پوچھا۔

پال نے اپنی نشست پر بیٹھتے ہی سوچا تھا کہ آج پھر اس بوڑھے ریمنڈ کو بات کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ میں اس منحوس کے ایک سوال کا جواب دوں گا تو یہ مجھے پھانسنے کے لیے اگلا سوال کر ڈالے گا۔ یہ منحوس مجھے پھانسنے کے لیے روز کوئی نہ کوئی پھندا تیار رکھتا ہے۔ کیا مصیبت ہے۔ اچھا ہے حکومت آدمیوں کو پچاس سال کے بعد ہی ریٹائرڈ کردیا کرے۔ ایسے سنکی اور منحوس لوگوں سے تو چھٹکارا مل جاتا۔ خاموش بیٹھے پال کے ذہن میں یہ خیالات اپنے آپ ناچنے لگے تھے۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے پال......'' ریمنڈ نے اپنا سوال دہرایا۔

''جی۔ وہ آتے ہوئے ایک دوست مل گیا تھا۔ باتوں باتوں میں دیر ہوگئی۔''

''دوست تھا...... یا تمہاری وہی منحوس سہیلی فلورا...... یہی نام ہے نا اس کا......''

''دھت تیرے کی...... آخر بُوجھ ہی لیا نا......'' پال نے دل ہی دل میں اس پر پھر لعنت بھیجی۔

''دیکھو پال...... میں نے دنیا دیکھی ہے۔ میں ایک دو بار تمہاری اس سہیلی سے مل چکا ہوں۔ اس کا یوں تیزی سے آنکھیں گھمانا اور بات بات پر انداز بدلنا، مجھے اچھا نہیں لگا۔ وہ بہت تیز طرار لڑکی ہے۔ تمہیں دھوکا دے جائے گی۔ ان عورتوں کا اعتبار نہیں۔ یہ زندگی کے کسی موڑ پر...... کسی مقام پر بھی تم کو دھوکا دے سکتی ہیں اور وہ تمہاری فلورا...... لگتا ہے، لالچی بلی ہے۔ جتنی دیر تک تمہارے پاس دولت ہے، تمہاری ہے...... وہ تم سے چوہے اور بلی کا کھیل، کھیل رہی ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے...... اب بھی وقت ہے اس سے بچ جاؤ......'' ریمنڈ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں ریمنڈ...... فلورا اس طرح کی لڑکی نہیں ہے......'' یہ کہتے ہوئے پال نے ایک بار پھر سوچا۔

''میں جانتا تھا...... میں جانتا تھا، پال تم یہی کہو گے۔ یہ میرا تجربہ ہے۔ کیا تم میرے تجربے کو جھوٹ کہو گے۔'' ریمنڈ نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

'اب یہ بوڑھا کھڑوس مجھ سے بحث کرے گا۔ ایک تو انسان جب چالیس سال سے اوپر چلا جاتا ہے تو اسے اپنے تجربات سنانے کا شوق چڑھ جاتا ہے اور یہ بوڑھا تو پکا کمینہ ہے۔' پال نے سوچا۔

ریمنڈ اس کو خاموش دیکھ کر دوبارہ نئی آنے والی کتب کو ادھر ادھر کرنے لگا۔ چند لمحوں کی خاموشی پا کر پال ایک بار پھر سوچنے لگا۔

'اب یہ بوڑھا کون سے نئے محاذ کھول کر مجھ پر حملہ کرے گا۔ یہ آج اسٹوڈنٹس کو کیا ہوا۔ آج وہ بھی تو کتابیں دینے اور لینے نہیں آرہے......' اس کی سوچوں کے درمیان ہی ایک بار پھر ریمنڈ کی آواز ابھری۔

''میں جو کہہ رہا ہوں، اس کے متعلق فرصت میں سوچنا۔ ابھی تم نوجوان اور جذباتی ہو۔'' تب ریمنڈ نے پھر سے سوچا۔

'یہ بوڑھا...... اس طرح نہیں ہٹے گا۔ اسے پٹری سے اتارنا ہی ہوگا۔' معاً اسے شرارت سوجھی۔ اس سے پہلے کہ ریمنڈ دوبارہ اسے کوئی بات کہتا، پال نے بات پلٹ دی۔

''تمہاری وہ بلی...... کیا نام تھا بھلا اس کا ریمنڈ......! ہاں شاید لوسی تھا...... وہ کیسے مری تھی؟''

''چھوڑو اسے...... اپنے کام سے مطلب رکھو۔'' ریمنڈ نے سرد مہری سے جواب دیا۔

''پھر بھی......؟'' پال جیسے اپنا بدلہ لینے پر تلا ہوا تھا۔

''تمہیں پہلے بھی بتایا تھا۔ میں نے اسے زہر دیا تھا۔ اسی حرکت کی سزا میں آج تک بھگت رہا ہوں مگر آج کے واقعے سے اس کا کیا تعلق ہے......'' ریمنڈ نے اداس لہجے میں پوچھا۔

''ایک معصوم اور پالتو جانور پر اس قدر ظلم...... پولیس کیس بھی ہوسکتا تھا۔'' پال سنجیدگی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں ہوسکتا تھا...... وہ جو میری بیوی نینسی تھی۔ اس واقعے نے اس نے بھی مجھے بلیک میل کرنا چاہا تھا۔ پتا ہے...... وہ کہتی تھی کہ یا تو مجھے آزاد کردو ورنہ اس جرم میں جیل جانے کے لیے تیار ہوجاؤ...... بہت چالاک تھی وہ......'' ریمنڈ دھیرے دھیرے سے بولا۔

''پھر تم نے اپنی بیوی کو آزاد کردیا۔ بڑے بزدل نکلے۔ پولیس کو بھگت لیتے......'' پال نے ہنس کر کہا۔

''مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ شاید تم نے ٹھیک کہا۔ میں واقعی بزدل نکلا۔'' ریمنڈ نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔ پال اپنی فتح پر مسرور تھا۔

☆☆☆

نینسی انشورنس کے ایک دفتر میں ریسپشنسٹ تھی۔ ریمنڈ اور نینسی کی شادی کو پورے دو سال ہوچکے تھے مگر ابھی تک قدرت نے ان کی جھولی نہیں بھری تھی۔ پھر ایک دن اچانک وہ کام سے واپس آتے ہوئے اپنی گود میں بلی کا پالتو بچہ اٹھا کر گھر لے آئی۔ اس وقت ریمنڈ بھی کالج سے واپس آچکا تھا۔ سارا دن کام کر کے وہ ذہنی اور جسمانی طور پر تھک چکا تھا۔ ریمنڈ نے آتے ہی فریج کھولا مگر اس میں کھانے کو کچھ بھی نہ رکھا تھا۔ وہ ابھی اس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ نینسی خوش خوش اندر داخل ہوتے ہی اونچی آواز میں بولی۔

''ریمنڈ...... ریمنڈ...... کہاں ہو؟ دیکھو ہمارے گھر میں مہمان آیا ہے۔''

وہ بلی کے اس بچے کو اٹھائے اس سے بے حد پیار کر رہی تھی۔

''مجھے بھوک لگی ہے۔ کھانے کو کچھ بناؤ گی یا میں باہر سے لے آؤں؟'' ریمنڈ نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''بہتر ہے بازار سے لے آؤ...... اور دیکھو آتے ہوئے ''اسپنسر کیش اینڈ کیری'' سے اس ننھے مہمان کے لیے بھی فوڈ لیتے آنا......'' نینسی نے مسرت سے کہا۔

اس کے اس رویے سے ریمنڈ کا دل جل گیا۔ ''پتا نہیں کہاں سے اٹھا لائی ہے، یہ بلی کا بچہ......!'' وہ جاتے ہوئے بڑبڑایا۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو نینسی ابھی تک اسے اپنی گود میں لیے کبھی چوم اور کبھی پچکار رہی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ اور بھی جل گیا۔

''ریمنڈ...... پوچھو گے نہیں، یہ تحفہ مجھے کس نے دیا ہے؟'' نینسی نے بھرپور جذبات سے پوچھا۔

ریمنڈ اس کے سوال سے اور بھی زچ ہوگیا۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ بولا مگر دل میں سوچنے لگا۔

''بھاڑ میں جاؤ...... تم اور تمہارا یہ تحفہ......''

''یہ جیک نے مجھے لا کر دیا ہے۔ تم تو جانتے ہو جیک کو...... ارے وہی...... ملوایا تو تھا تمہیں۔ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ بڑا خیال رکھتا ہے۔ پتا نہیں اسے میری پسند کا پہلے سے کس طرح علم ہوجاتا ہے۔'' نینسی بلی کے بچے کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔

'میں جانتا ہوں اس باگڑ بلے کو...... ہر کائیاں مرد کی طرح وہ تمہیں پھانسنے کی کوشش کررہا ہے اور جب کوئی مرد کسی عورت کو لبھانے میں مصروف ہو تو وہ ایسے چونچلے کرتا ہی ہے۔' ریمنڈ نے من ہی من میں سوچا۔

''ریمنڈ...... میں ویک اینڈ پر اس کے لیے ایک پنگوڑی (Baby Crib) لے کر آؤں گی۔'' نینسی نے اسے آگاہ کیا اور پھر وہ آہستہ آہستہ دیدہ و دانستہ طور پر اس سے گریزاں ہونے لگی۔ ریمنڈ نے بارہا دیکھا کہ جب بھی اس نے نینسی کو اپنا کوئی کام کہا، وہ اس کے بجائے لوسی کو گود میں اٹھا کر اسے پیار کرنے لگتی۔ پورا ایک سال ریمنڈ نے اسی انتظار میں گزار دیا کہ شاید نینسی اپنے ابتدائی طور طریقوں پر لوٹ آئے مگر اس کا انتظار...... انتظار ہی رہا۔ اس روز پہلی بار ریمنڈ نے بڑی تلخی سے نینسی کو کہا۔

''نینسی...... میں دیکھ رہا ہوں کہ تم مجھ سے زیادہ بلی کے اس بچے میں دلچسپی لے رہی ہو......؟''

''ویسے ریمنڈ دیکھو...... یہ بڑا ہوکر اور بھی زیادہ خوب صورت ہوگیا ہے۔ جیک کہہ رہا تھا، یہ اپنی عمر کے ساتھ ساتھ اور بھی خوب صورت ہوتا جائے گا۔ جیسے تم خوب صورت ہوتی جارہی ہو۔ سچ ریمنڈ...... باتیں بنانا تو کوئی جیک سے سیکھے۔'' نینسی نے ہنستے ہوئے کہا۔ تو ریمنڈ اندر ہی اندر جل بھن گیا

اور سوچنے لگا۔

'اس کا مطلب ہے جیک بہت ہوشیار ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی بیوی کے اعصاب پر چھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ نینسی اس کے ہاتھوں سے نکل جائے۔ اسے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔' یہ سوچ کر شاید پوری زندگی میں پہلی بار اسے احساس ہوا کہ زندگی کی راہوں پر چپ چاپ گزرنے سے راستے میں پڑے پتھروں سے نہیں بچا جاسکتا...... اور نہ ہی زندگی میں آنے والے مصائب اور مشکلات کی کھائیاں تمہیں معاف کر سکتی ہیں۔ ان کے لیے تمہیں خود ہی بچنا ہوگا۔

لوسی اب اس قدر طاقتور ہو چکی تھی کہ وہ سارے گھر میں چھلانگیں مارتی پھرتی تھی۔ نینسی نے اس کے کھیلنے کے لیے بے شمار کھلونے لاکر کمرے میں رکھے ہوئے تھے۔ ننھی ننھی ربڑ کی گیندیں، ربڑ کا ہلکا لیکن خوب صورت فٹ بال...... اسی طرح کے بچوں والے اور کھلونے...... لوسی بلی تھی۔ نر بچہ نہیں تھا۔ وہ جیسے ہی نینسی کی آواز یا اس کے پیروں کی چاپ سنتی، بھاگ کر اس کی طرف جاتی اور نینسی بھی فوراً اسے اپنی گود میں بھر لیتی۔ وہ اسے پچکارتی۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی عورت اپنے ننھے بچے کو پچکارتی، چومتی اور پیار کرتی ہے۔

اس روز ویک اینڈ تھا اور نینسی گھر پر تھی۔ ریمنڈ گھر کے چھوٹے سے باورچی خانے میں اپنے اور نینسی کے لیے چائے بنا رہا تھا۔ معاً باہر دروازے کی بیل بجی...... نینسی کے سینڈلز کی کھٹ کھٹ سنائی دی جیسے وہ دروازے کی طرف جا رہی ہو۔

ریمنڈ خاموشی کے ساتھ چائے بنانے میں مصروف تھا کہ تھوڑی دیر بعد نینسی کی آواز آئی۔

''ریمنڈ ڈیئر...... چائے کا ایک کپ اور بنا لینا...... جیک آیا ہے......''

''منحوس کا بچہ...... ہمارا ویک اینڈ خراب کرنے آپہنچا ہے......'' ریمنڈ بڑبڑایا۔

اس نے چائے کا پانی اور بڑھا دیا۔ جب وہ چائے کی ٹرے پکڑے کمرے میں داخل ہوا تو جیک نینسی کے ساتھ اس طرح چپکا بیٹھا تھا، جیسے وہی اس کا خاوند ہو۔ ریمنڈ کو دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھا اور ہنستے ہوئے ریمنڈ سے چائے کی ٹرے پکڑنے لگا۔ ''ہائے ریمنڈ......'' جیک نے اس کی طرف ٹرے پکڑنے کو ہاتھ بڑھائے۔

''ہے جیک...... بیٹھو...... بیٹھو...... میں دیتا ہوں......'' ریمنڈ نے کھسیانی سی ہنسی ہنس کر کہا۔

''ادھر سے گزر رہا تھا...... سوچا تم لوگوں سے ملتا جاؤں۔'' جیک اب نینسی سے ہٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ ریمنڈ نے دزدیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر سوچا۔

'کس قدر بدمعاش ہے۔ سمجھتا ہے۔ میں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اسے ہر حال میں اپنے رستے سے ہٹانا پڑے گا۔'

چائے پینے کے کچھ دیر بعد جیک چلا گیا۔ اس روز زندگی میں پہلی بار دونوں کے درمیان اسی بات پر بھرپور جھگڑا ہوا۔ نینسی غصے سے چیخنے لگی تھی اور وہ ہذیانی انداز میں بار بار کہہ رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں ریمنڈ...... تم جیک سے جلتے ہو...... تم اسے بدمعاش اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہو مگر میں تمہیں بتا دوں۔ وہ میرا بڑا اچھا دوست ہے۔ اس قدر اچھا کہ اگر وہ مجھے کہے تو میں اس کے لیے تمہیں بھی چھوڑ سکتی ہوں۔''

'اوہ مائی گاڈ...... تو معاملہ یہاں تک جا پہنچا ہے۔' ریمنڈ نے سوچا۔

اس روز کے بعد وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہنے لگے تھے۔

☆☆☆

سرد مہری کی اِک فضا طاری ہوگئی تھی۔ جیک والے واقعے کے بعد دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے الگ ہو کر رہ گئے تھے۔ نینسی کام سے فارغ ہو کر آتی تو لوسی پہلے سے اس کی منتظر ہوتی۔ پھر وہ اس کے چونچلوں میں لگ جاتی۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ کمرے کے اس کونے کی طرف بھی نہیں گئی تھی جس طرف مختلف انواع کے موضوعات پر لکھی ہوئی کتابیں ریکس میں پڑی تھیں۔ کسی زمانے میں نینسی اور ریمنڈ نے مل کر گھر کے اس کونے میں کتابوں کے ریکس بنوائے تھے۔ رات کو وہ ایک آدھ گھنٹے کے لیے مشترکہ طور پر ان ریکس کے قریب پڑی میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ جاتے اور اپنی اپنی پسند کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد سو جاتے۔ ریمنڈ نے یہ عادت نینسی کی پسند پر اپنائی تھی کیونکہ نینسی کو شروع سے ہی کتابیں پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔

پھر وقت کے ساتھ ساتھ نینسی کا شوق بدلنے لگا۔ پہلے اس کی دلچسپیوں کا مرکز جیک بنا اور پھر لوسی ان دونوں کے درمیان آگئی۔ اس روز کے واقعے نے ریمنڈ اور نینسی کے درمیان ایک دراڑ سی ڈال دی تھی۔ ریمنڈ فطری طور پر اتنا بہادر نہ تھا کہ وہ کوئی انتہائی قدم اٹھاتا مگر اپنی زندگی کی راہیں استوار رکھنے کے لیے جیک سے جان چھڑانا بھی ضروری تھا۔

☆☆☆

تھامس اس کا بچپن کا دوست تھا۔ وہ ایک ساتھ ہی ایک اسکول میں پڑھتے بھی رہے تھے۔ پھر جب بڑی

کلاسوں میں آئے تو مضامین کی تبدیلی کی وجہ سے ان کی راہیں بھی جدا ہوگئیں۔ یوں وہ جب پڑھائی سے فارغ ہوئے تو ریمنڈ کالج میں لائبریرین لگ گیا جبکہ تھامس ادویات بنانے والی ایک فیکٹری میں اچھے عہدے پر فائز ہوگیا۔ نینسی کے جارحانہ رویے سے ریمنڈ بے حد پریشان تھا۔ ایک روز کچھ سوچ کر وہ تھامس سے ملا تو تھامس نے اسے مشورہ دیا۔

''بہتر تو یہ ہے کہ تم نینسی کو آزاد کر دو۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، میں جیک کے لیے میدان کھلا چھوڑ دوں......؟'' ریمنڈ نے پوچھا۔

''تو اور کیا چاہتے ہو......؟'' تھامس نے استفسار کیا۔

''میں اسے سسک سسک کر مرتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ جس طرح اس نے میری زندگی میں زہر گھولا ہے، اسی طرح میں بھی اس کی موت چاہتا ہوں......'' ریمنڈ نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

''ساری عمر جیل میں گزارنے کا ارادہ ہے کیا؟'' جیک نے ہنس کر پوچھا۔

''میں تم سے مذاق کی توقع نہیں کرسکتا۔ میں تم سے مدد لینا چاہتا ہوں۔'' ریمنڈ نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں کیا کرسکتا ہوں تمہارے لیے......؟'' تھامس نے پوچھا۔

''مجھے زہر کی ضرورت ہے جو مجھے تمہارے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا۔'' ریمنڈ نے اسی انداز میں جواب دیا۔

''گویا تم اپنے ساتھ مجھے بھی پھنسوانے کا منصوبہ بنا رہے ہو......'' تھامس نے تشویش ظاہر کی۔

''تمہیں علم ہے، میرے اندر بہت سے دوستوں کی کوتاہیوں کا ایک سمندر ہے۔ جو نہ تو کبھی اچھلا ہے اور نہ ہی کبھی ان باتوں کے کنارے بھیگے ہیں......'' ریمنڈ نے وثوق سے کہا۔

''یہ تو پکی بات ہے......'' تھامس نے تصدیق کی۔

''تو پھر کیا تم اپنے دوست کے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتے۔'' ریمنڈ نے دوبارہ پوچھا۔

''سوچنے دو......'' تھامس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

''میں کب لینے آؤں......؟'' ریمنڈ نے پوچھا۔

''آج کے بعد کبھی بھی......'' تھامس نے جواب دیا۔

پھر اس کے تیسرے دن تھامس نے ایک شیشی میں زہر اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''ریمنڈ...... ایک بار پھر سوچ لو...... اگر کوئی جرم کرتے پکڑے گئے تو میرا نام تمہارے اس جرم میں شامل نہیں ہوگا۔''

''میں اتنا بچہ بھی نہیں ہوں...... اپنا بوجھ اٹھانے کی مجھ میں ہمت ہے......'' ریمنڈ نے جواب دیا۔

☆☆☆

ریمنڈ کا پہلا شکار لوسی تھی۔ زہر لے کر آتے ہوئے وہ سب سے مہنگے کیش اینڈ کیری میں گیا اور وہاں سے لوسی کی من پسند خوراک خریدی اور لے کر سیدھا گھر آگیا۔ گھر کی دو میں سے ایک چابی ریمنڈ کے پاس بھی۔ گھر کا دروازہ کھولا تو اس نے دیکھا، لوسی اس کی کتابوں والے ریک سے کتنی کتابیں نیچے گرا چکی تھی اور ایک کتاب کے کچھ اوراق بھی اس نے کھیلتے ہوئے پھاڑ ڈالے تھے۔ ریمنڈ کا غصہ اور بڑھ گیا۔ وہ ابھی اندر داخل ہی ہوا تھا کہ اپنی پسندیدہ خوراک کی خوشبو سونگھتے ہوئے لوسی اس کے اردگرد منڈلانے لگی۔

''ٹھہرو...... ابھی تمہارا بندوبست کرتا ہوں۔'' ریمنڈ غصے میں بڑبڑایا۔

اس نے کتابیں اٹھا کر ...... دوبارہ ریک میں رکھیں اس کی خوراک کی پیکنگ کھولی اور جیب سے زہر کی شیشی نکال کر اس پر دو چار قطرے زہر کے ڈالے اور انہیں لوسی کے برتن میں رکھ دیا۔

''مجھے ہر وہ چیز بری لگتی ہے جو نینسی کو میرے علاوہ پسند ہو۔ گڈ بائے لوسی......'' ریمنڈ بڑبڑایا۔

ابھی تک نینسی اپنے کام سے واپس نہیں آئی تھی۔ اپنا کام کرنے کے بعد اس نے دوبارہ دروازہ لاک کیا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ گھر سے باہر نکل کر وہ ایک قریبی پارک میں چلا گیا۔ اس نے آج صرف اسی کام کے لیے چھٹی کی تھی۔ وہ بلا مقصد ادھر ادھر گھومتا رہا۔ وہ بار بار اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھ رہا تھا۔ نینسی کی چھٹی کا وقت...... پارک میں گھومتے ہوئے بلا ارادہ وہاں بنی ٹک شاپ پر چلا گیا۔ ابھی نینسی کے گھر واپس آنے میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتے ہوئے سوچا اور پھر درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی وہ چند قدم ہی دور گیا ہوگا کہ اس کی نظریں سامنے کا منظر دیکھ کر پھیل گئیں۔

درختوں کے اس کنج میں نینسی اور جیک بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

''اوہ نو......'' اس کے منہ سے نکلا۔

ریمنڈ نے دونوں ہاتھوں سے ایک بار پھر اپنی آنکھیں ملیں اور دوبارہ ادھر دیکھا۔ وہ سو فیصد نینسی اور جیک ہی تھے۔ اس کا کھولتا ہوا خون ایک دم اس کے دماغ کو چڑھنے لگا۔ ' آخر

وہی ہوا ناں...... جس کا ڈر تھا۔ اس نے سوچا۔ اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتا، نینسی نے کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا اور پھر وہ جلدی سے کھڑے ہو گئے۔ پارک کی روش سے ہٹ کر جیک کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ دونوں اس میں بیٹھے اور گاڑی تیزی سے نکل گئی۔

''تو اس طرح مجھے دھوکا دیا جا رہا ہے۔'' ریمنڈ نے سوچا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی بائیک کی طرف آیا۔ وہ بھی گھر کی طرف چل دیا۔

بائیک کھڑی کر کے جب وہ اندر داخل ہوا تو اسے نینسی کی سسکیوں کی آواز صاف سنائی دی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اندر داخل ہوا تو نینسی بجلی کی سی تیزی سے اس پر جھپٹی۔ ریمنڈ اس کا یہ حملہ برداشت نہ کر سکا اور گرتے گرتے بچا۔ نینسی نے اس کے سینے پر تیزی سے مکے مارنے شروع کر دیے اور ساتھ ہی وہ رو رہی تھی۔

''ہوا کیا ہے......؟'' ریمنڈ نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''تم...... تم بہت ظالم ہو۔ تم نے میری لوسی کی جان لے لی ہے۔ تم نے اسے مار ڈالا ہے ظالم انسان...... تم جلتے تھے نا اس سے...... نفرت کرتے تھے تم......'' نینسی روتے ہوئے اونچی آواز میں کہہ رہی تھی۔

''کیا بکواس ہے......'' ریمنڈ نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔

''یہ حقیقت ہے......'' نینسی نے کہا۔ ''تم نے میری لوسی کو قتل کیا ہے۔ وہ دیکھو۔ اس کی کھلی آنکھوں میں تمہاری تصویر مجھے نظر آ رہی ہے۔'' نینسی نے غصے اور غم سے ملے جلے انداز میں کہا۔

ریمنڈ اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر آگے بڑھا تو اس نے دیکھا۔ لوسی کی آنکھیں کھلی تھیں اور اس کے منہ سے خون کی ایک پتلی سی لکیر باہر نکلی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی اس کی خوراک کا پیالہ اوندھا پڑا تھا۔ لگتا تھا لوسی نے مرنے سے پہلے ساری خوراک چٹ کر لی تھی۔

''تم جھوٹ کہہ رہی ہو۔ میں تو ابھی ابھی آفس سے آ رہا ہوں۔ یہ کیسے اور کیونکر ہوا......؟'' ریمنڈ نے اپنا دفاع کرتے ہوئے کہا۔

''جھوٹی میں نہیں ہوں، تم ہو۔ تم فراڈ ہو ریمنڈ...... ظالم اور شکی مزاج ہو......'' نینسی نے روتے ہوئے کہا۔

''تو تم کون سی پاکباز ہو......'' ریمنڈ نے بھی غصے سے جواب دیا۔

پھر اسی بات پر دونوں کے درمیان آدھی رات تک جھگڑا ہوتا رہا۔ دونوں طرف سے الزامات کی بوچھاڑ ہوتی رہی مگر جیت کسی کی نہیں ہو پا رہی تھی۔

''بہتر ہے میں یہ معاملہ پولیس کے آگے رکھ دیتی ہوں۔ خود ہی جھوٹ اور سچ سامنے آ جائے گا۔'' وہ اٹھ کر کمرے میں پڑے ٹیلی فون کی طرف بڑھی۔

ریمنڈ نے فوراً اسے روکا تو وہ غرائی۔

''میرے پاس میرا سیل بھی ہے۔'' نینسی نے اپنا پرس پکڑنے کی کوشش کی تو ریمنڈ نے بھاگ کر اسے بھی اچک لیا۔

''بہر حال تم جو مرضی کر لو ریمنڈ...... یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ تم نے لوسی کو زہر دیا ہے...... سیدھی طرح میری بات مان لو۔ ورنہ میں پولیس کو شکایت کر دوں گی۔'' نینسی نے سسکیوں کے درمیان کہا۔ ریمنڈ کو پھر اپنا جرم مانتے ہی بنی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو...... لوسی کو میں نے ہی زہر دیا ہے۔'' ریمنڈ نے ہذیانی انداز میں کہا۔

''میں پہلے ہی جان گئی تھی۔ اب میں تمہارے ساتھ ایک لمحہ بھی نہیں رہ پاؤں گی۔ تم جیسے ظالم انسان کے ساتھ ایک پل بھی نہیں گزار سکتی۔ ہاں البتہ ایک شرط ہے...... تم کل تک سوچ لو...... میں بھی سوچ لیتی ہوں۔ ایک سودا ہے جس کی بنا پر ہم دونوں اپنی زندگی آسانی سے گزار سکتے ہیں۔ ورنہ میں تو آزاد ہوں۔ تمہیں پولیس اس جرم میں سزا دے گی۔ بہتر یہی ہے کہ تم اس بارے میں سوچ لو۔ تم پولیس کے پاس جانا پسند کرو گے یا میری شرائط پر زندہ رہنا چاہو گے۔ کل مجھے بتا دینا۔ اب میں جا رہی ہوں...... کہاں...... اس کا مجھے بھی علم نہیں۔ بہر حال تمہارے پاس اب میں ایک لمحہ رہنا پسند نہیں کروں گی۔ تمہارے پاس کل تک کی مہلت ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے بیڈ سے اپنا پرس اٹھایا اور باہر نکل گئی۔

☆☆☆

وہ ساری رات اس نے کانٹوں پر گزاری تھی...... مختلف خیالات کی یلغار نے اس کی سوچوں کو مختل کر کے رکھ دیا تھا۔

''ریمنڈ! تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ یہی زہر تم نینسی پر بھی استعمال کر سکتے تھے۔ پھر اگر تمہیں سزا بھی ہو جاتی تو کوئی غم نہ ہوتا مگر تم نے پہلا ہاتھ لوسی پر مارا۔ انتہائی فضول آدمی ہو تم بھی...... دغا تو نینسی نے کی تھی۔ نینسی نے تمہیں دھوکا دیا تھا اور تم نے معصوم لوسی کی جان لے لی۔'' اس کے اندر سے آواز آئی تو وہ اور بھی پچھتاوے کی رسی سے جھول گیا۔

اسی طرح کی باتیں سوچتے سوچتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ معلوم نہیں وہ کون سا لمحہ تھا جب اس کی آنکھ کھلی۔

اسے لگ رہا تھا جیسے گھر کے مین گیٹ میں کسی نے چابی لگائی ہو۔ پھر دوسری بار ہلکی سی کلک کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ ریمنڈ نے بستر پر لیٹے لیٹے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ یہ نینسی تھی...... وہ آتے ہی دہاڑی۔

''قاتل اس قدر آرام سے نہیں سوتے ریمنڈ...... میں نے ساری رات جاگ کر یہ تصدیق کرلی ہے کہ تم ہی نے میری لوسی کو جان سے مارا ہے۔ تم جس کیش اینڈ کیری سے لوسی کے لیے خوراک لے کر آئے تھے، میں نے ان کی دکان کا ریپر ڈسٹ بن سے نکال لیا تھا۔ انہوں نے اسی تاریخ پر اسی ٹریڈ مارک کی خوراک کا دوسرا پیکٹ نکال کر میرے سامنے اپنے پالتو کتے کو کھلایا مگر اس کی موت تو واقع نہیں ہوئی۔'' نینسی ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔

ریمنڈ کو ایسے لگا جیسے اس کے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ نینسی کچھ دیر کے توقف کے بعد پھر بولی۔

''تم نے کیا سوچا ہے ریمنڈ...... میں اب کسی قیمت پر تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

ریمنڈ ایک بار پھر سوچوں میں ڈوب گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد نحیف سی آواز میں بولا۔

''جو تم چاہو......''

''تم مجھے آزاد کردو...... میں جیک کے پاس جارہی ہوں۔'' نینسی نے غصے میں کہا۔

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا، ہم الگ ہوکر بھی ایک ہی مکان میں رہ لیں۔ میں تمہارے بغیر......'' ابھی ریمنڈ کا جملہ مکمل نہ ہونے پایا تھا کہ نینسی دہاڑی۔

''ناممکن...... بالکل ناممکن۔ یہ تمہاری دوسری چال ہوسکتی ہے۔ میرا انتظار مت کرنا۔ میں اپنی چیزیں آفس ٹائم کے بعد لے جاؤں گی...... میں تمہیں پولیس میں بھی اسی شرط پہ نہیں لے جارہی کہ تم میرے اور جیک کی راہ میں دیوار نہیں بنو گے۔''

نینسی یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔ ریمنڈ کی طبیعت اس واقعے نے اور بھی نڈھال کردی تھی۔ وہ من ہی من میں نینسی کو گالیاں دیتا ہوا بستر چھوڑ چکا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔

''تو گویا تم نے فیصلہ کر ہی لیا۔ تم تو پہلے سے بہانہ ڈھونڈتی تھیں نینسی...... مگر میں تمہیں اس کی سزا ضرور دوں گا۔'' پھر معاً اس کے ذہن میں نینسی سے بدلہ لینے کی ایک اور ترکیب نے سر ابھارا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور کتابوں کے ریک کی طرف گیا۔ اس کے دل سے آواز آئی۔

''سامان میں تم اپنی پسندیدہ کتابیں بھی لے کر جاؤ گی۔''

اس سوچ کے آتے ہی اس نے زہر کی شیشی سے سارا زہر ایک پیالی میں انڈیلا اور دانت صاف کرنے والے برش سے نینسی کی پسندیدہ کتابوں کے صفحات پر پینٹ کردیا۔ جہاں جہاں زہر لگا تھا، وہ کاغذ گیلے ہوگئے تھے۔ اس نے گھر کے آتش دان کے قریب لے جاکر انہیں سکھایا اور پھر انہیں بند کر کے الماری میں رکھ دیا اور سوچا، تم اپنی پسندیدہ کتابوں کو لے جاکر جب بھی کھولو گی، انگلی سے اوراق پلٹو گی۔ تو یہ زہر تمہارے جسم میں سرایت کر جائے گا اور پھر تم اس زہر سے آہستہ آہستہ مر جاؤ گی...... تم جہاں بھی جاؤ گی، میری ہٹ لسٹ پر ہوگی۔' اپنے منصوبے پر پوری طرح عمل کرنے کے بعد وہ معمول کے مطابق اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ شام کو جب وہ گھر واپس آیا تو اس کے بیڈ پر ایک چٹ رکھی تھی۔ یہ نینسی کی تحریر تھی، لکھا تھا۔

''میں جیک کے ساتھ گھر چھوڑ کر جارہی ہوں۔ لوسی کو گھر لانا اور اس سے بے حد پیار کر کے تمہیں نظرانداز کرنا میرا اور جیک کا منصوبہ تھا۔ مجھے پتا تھا۔ تم مجھ سے بے حد پیار کرتے ہو۔ تم سے کسی اور طرح چھٹکارا حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے تمہیں نظرانداز کیا تو تم نے یہ انتہائی قدم اٹھایا۔ بہرحال اس کھیل میں تم ہار گئے اور ہم جیت گئے...... بدقسمت قاتل......''

ریمنڈ نے وہ کاغذ اٹھایا اور غصے میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے۔

☆☆☆

''میں بڑے دنوں سے یہ کتاب آپ کی الماریوں میں... ڈھونڈ رہی ہوں مگر مجھے مطلوبہ کتاب نہیں مل رہی۔ حالانکہ وہ کیٹلاگ بھی موجود ہے۔'' ایک بہت ہی مترنم اور کھنکتی ہوئی آواز ریمنڈ کے کانوں میں پڑی تو اس نے کتابوں کے اندراج والے رجسٹر سے سر اٹھایا اور ایک لمحے کے لیے حیران رہ گیا۔

وہی گوری سرخی مائل رنگت، اسی کی طرح نیلی آنکھیں۔ بھورے بالوں کی ایک آوارہ لٹ، اسی کی طرح اس کے ماتھے پر بھی جھول رہی تھی۔ وہی قیامت ڈھانے والا قد اور وہی قامت...... اس میں اور نینسی میں فرق تھا تو صرف اتنا کہ اس کے دائیں گال پر موٹا سا تل تھا۔

ریمنڈ نے اسے دیکھا تو اس کے منہ سے اچانک نکلا۔

''نینسی......!''

''میں کیرول ہوں......'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''مجھے دراصل اپنے ریسرچ ورک کے لیے اس کتاب سے مدد درکار تھی۔ میں کتنے دنوں سے......''

ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ پال اپنی کرسی سے اٹھ کر ان کے نزدیک آ گیا۔

''ہے پال......!'' آواز کی گھنٹیاں ایک بار پھر بجیں۔

''ہائے کیرول......'' پال یہ کہہ کر ریمنڈ کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہ کتنے دنوں سے اس کتاب کے لیے چکر لگا رہی ہے۔ ریک میں یہ اپنے نمبر سے غائب ہے...... شاید تمہارے علم میں ہو۔ کتاب کسی کو ایشو تو نہیں ہوئی۔ میں نے تو رجسٹر بھی چھان مارا ہے۔'' پال نے تفصیل سے بتایا۔

''یہ کتاب میرے پاس پڑی ہے۔ مس کیرول آپ کل لے جائیں......'' ریمنڈ نے جواب دیا۔

پانچ سال کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد ریمنڈ کے دل سے نینسی کی شکل وصورت اور آخری رویہ نہ نکلا تھا۔ نینسی سے انتقام لینے کی بات دھیرے دھیرے اس کے من میں پک چکی تھی۔ کیرول کی شکل میں ایک بار پھر نینسی اس کی آنکھوں میں جاگ اٹھی۔ دوسرے روز وہ گھر سے مطلوبہ کتاب اٹھا لایا تھا۔ یہ نینسی کی بھی پسندیدہ کتاب تھی۔ کالج کھلنے کے دو تین گھنٹے بعد کیرول اپنی دوست کے ساتھ دوبارہ لائبریری میں آئی۔ وہ سیدھی ریمنڈ کی میز پر آ گئی تھی۔

ریمنڈ نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا اور کتاب اس کے آگے رکھ دی۔

''میں اسے کتنے دن اپنے پاس رکھ سکتی ہوں؟'' کیرول نے پوچھا۔

''کم از کم پندرہ دن...... ضرورت پڑی تو دوبارہ ایشو بھی ہو سکتی ہے۔'' ریمنڈ نے جواب دیا۔

وہ کتاب اپنے نام ایشو کروا کے چلی گئی۔ ریمنڈ اسے جاتے ہوئے بڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کی سوچوں میں ایک عرصے بعد پھر سے یورش ہونے لگی تھی۔

'نینسی! تم کسی بھی روپ میں میرے سامنے آ جاؤ...... میرا انتقام تمہیں معاف نہیں کرے گا۔' ریمنڈ نے سوچا۔

نینسی جب سے گھر چھوڑ کر گئی تھی، اس کی کوئی خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہے۔ وہ اپنا سارا سامان بھی لے گئی تھی مگر کتابوں کو اس نے ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔ ریمنڈ اس دوران میں نینسی کو اپنے طور پر ڈھونڈتا بھی رہا مگر وہ نہ ملنا تھی نہ ملی۔ ہاں البتہ کیرول نے یہی کتاب تین چار مرتبہ اپنے ریسرچ ورک کے لیے ایشو کروائی تھی۔ وہ جب بھی لائبریری آتی، اس کی کوئی نہ کوئی سہیلی اس کے ساتھ ہوتی۔

پھر کتنے دنوں تک ریمنڈ کو کیرول نظر نہ آئی۔ چوتھی مرتبہ ایشو کی گئی کتاب کی میعاد بھی پوری ہو چکی تھی۔ دن پر دن بیت گئے مگر کیرول کا کچھ پتا نہ تھا۔ ایک روز ریمنڈ نے پال سے پوچھا۔

''پال...... وہ کیرول کتاب لے کر گئی تھی۔ اس کا پتا کرو۔''

''وہ اچانک بیمار ہو گئی ہے اور آج کل گھر پر اپنا علاج کروا رہی ہے۔'' پال نے مختصر جواب دیا۔

''کیا ہوا اسے......؟'' ریمنڈ نے حیرانی سے پوچھا۔

''سنا ہے اسے معدے کا کوئی مسئلہ بن گیا ہے۔ اس کی سہیلی نے مجھے بتایا تھا۔'' پال بولا۔

''اچھی لڑکی تھی......'' ریمنڈ نے آہستہ سے کہا۔

کچھ دنوں کے بعد پتا چلا کہ کیرول اسی بیماری کی وجہ سے...... مرگئی ہے۔ ڈاکٹروں نے اس کے معدے کے ٹیسٹ لیے تھے۔ اس سے پتا چلا کہ کوئی اسے عرصے سے آہستہ آہستہ زہر دے رہا تھا۔

باتیں نکلیں تو آہستہ آہستہ کالج کی فضا میں بھی ان کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ کچھ دنوں تک یہ تذکرہ ہر لڑکے اور لڑکی کی زبان پر رہتا تھا۔ پھر خاموشی چھانے لگی اور سب بھول گئے کہ کیرول کون تھی...... ممکن تھا کہ یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا اگر اس دن پولیس انسپکٹر لیری کالج آ کر ریمنڈ سے پوچھ گچھ نہ کرتا...... پال بھی اس وقت نزدیک تھا۔

لیری، ریمنڈ سے پوچھ رہا تھا۔ ''تو پھر اس کتاب کے بوسیدہ اوراق پر زہر کس نے لگایا جس نے بڑی آہستگی کے ساتھ کیرول کے معدے پر اثر کیا اور وہ اس کی وجہ سے مر گئی......''

پال سن کر بہت حیران ہوا...... اس نے سوچا۔ 'کتاب کے اوراق پر زہر لگانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔' پھر اس شبہے میں ریمنڈ کو پولیس اسٹیشن لے جایا گیا۔ ریمنڈ نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا تھا اور اس نے اپنے بیان میں کہا تھا۔

''کیرول اس کی ہٹ لسٹ پر نہیں تھی۔ اس نے یہ سب اپنی بیوی نینسی کو سزا دینے کے لیے کیا تھا مگر وہ بہت کائیاں اور چالاک نکلی اور بچ گئی۔ پھر میں بھول چکا تھا کہ کتاب کے اوراق پر لگا ہوا زہر اتنے عرصے تک قائم رہے گا۔ کیرول نے کتاب مانگی تو میں نے گھر سے وہ کتاب لا کر دے دی......''

پھر اس جرم میں ریمنڈ کو سزا ہو گئی۔ پال کہتا ہے کہ جیل جانے سے قبل ریمنڈ نے کہا تھا۔ ''پال...... وہ دیکھو، لوسی کی کھلی آنکھوں میں میری جمی ہوئی تصویر نظر آ رہی ہے۔''

نیک نام

ملک صفدر حیات

عجیب منطق ہے انسان کی... جہاں انسانیت محبت کا درس دیتی ہے وہاں انسان ہی محبت کا سب سے بڑا دشمن دکھائی دیتا ہے... اگر حالات اور اپنوں کے مزاج اور خوشیوں کو سمجھتے ہوئے صحیح قدم اٹھایا جائے تو شاید اتنے برے انجام سے بچا سکے، جس میں کوئی جان سے جاتا ہے اور کوئی جان بچاتا پھرتا ہے۔ ہم محبت کو اپنی مرضی کے منظر میں فٹ کرکے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیتے ہیں جیسا کہ اس نے کیا جس کے خیال میں ذرا سی دیر کی دھند تمام عمر کی پردہ پوشی کرتی رہے گی مگر... قدرت کبھی جرم کو پناہ نہیں دیتی... جو بھی اور جیسا بھی انسان سے سرزد ہوتا ہے اسے ویسا ہی خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے... اور ملک صفدر حیات جیسے لوگ اس خمیازے کو عملی شکل دینے کے لیے پیدا کیے جاتے ہیں تاکہ لامحدود ہونے والی برائی کو حد کے قید خانے میں ڈال دیا جائے۔

محبت میں حد سے گزر جانے والے ایک عاشق نامراد کا قصہ

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آگ کہیں اور جل رہی ہوتی ہے اور دھواں کہیں اور سے اٹھتا دکھائی دیتا ہے۔ آج میں آپ کو جس کیس کی روداد سنانے جا رہا ہوں، اس میں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔

ان دنوں میں ضلع گوجرانوالہ کے تھانہ صدر میں تعینات تھا۔ وہ موسم سرما کے دن تھے۔ جنوری کا مہینا دبے قدموں اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا، یعنی اس کے ختم ہونے میں چند روز باقی تھے۔ وہ غالباً بیس جنوری کی تاریخ تھی۔ میں حسب معمول اپنے کمرے میں بیٹھا تھانے داری کر رہا تھا کہ شمشاد علی اے ایس آئی اور ایک کانسٹیبل ارشاد حسین مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ میں نے انہیں فوراً اپنے پاس بلا لیا۔

وہ دونوں گوجرانوالہ کی تحصیل وزیر آباد سے آئے تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے ان کی آمد کی غرض وغایت معلوم کی تو اے ایس آئی شمشاد علی نے بتایا۔ ''ملک صاحب! یہ گمشدگی کا معاملہ ہے جناب......!''

''کس کی گمشدگی؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''بندے کا نام سلیم ہے سرکار۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''سلیم پندرہ جنوری سے غائب ہے۔''

''آج بیس جنوری ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ سلیم پچھلے پانچ



دن سے لاپتا ہے لیکن......'' میں نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن آپ لوگ وزیر آباد سے سلیم کی تلاش میں یہاں آئے ہو جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گمشدہ بندے کا تعلق بھی وزیر آباد ہی سے ہے۔ میرے تھانے سے، اس کی تلاش یا گمشدگی کا کیا واسطہ؟''

''بہت گہرا واسطہ ہے ملک صاحب!'' شمشاد علی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔''یہ ٹھیک ہے کہ سلیم وزیر آباد کے ایک محلے نظام پورہ کا رہنے والا ہے اور وزیر آباد کے متعلقہ تھانے میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ انیس جنوری کو لکھوائی گئی تھی مگر ہماری تحقیق اور تفتیش کے مطابق سلیم آپ کے علاقے سے غائب ہوا ہے لہٰذا ہمیں آپ کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا۔''

''وزیر آباد کا رہائشی میرے علاقے سے غائب ہوا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔''یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی......؟''

''بات دراصل یہ ہے جناب......'' اے ایس آئی مجھے معاملے کی حقیقت سے تفصیلاً آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ ''سلیم وزیر آباد کا رہائشی ضرور ہے مگر وہ یہاں گوجرانوالہ کے انڈسٹریل ایریا میں واقع ایک ٹیکسٹائل ملز میں کام کرتا تھا۔ وہ ہفتہ وار چھٹی پر ہی اپنے اہلِ خانہ سے ملنے وزیر آباد جایا کرتا تھا۔ ہفتے کے باقی دن وہ ادھر ہی رہتا تھا۔ اس نے محلہ شریف پورہ کے ایک گھر میں رہائش اختیار کر رکھی تھی......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''پندرہ جنوری کو اسے وزیر آباد جانا تھا۔ جب وہ گھر نہیں پہنچا تو اس کے اہلِ خانہ کو تشویش ہوئی کیونکہ اگلے روز یعنی چھٹی کے دن اس کی منگنی، تایا زاد زرینہ سے ہونے والی تھی۔ سلیم کی عدم دستیابی کے باعث گھر میں افراتفری پھیل گئی۔ چھٹی کا دن جیسے تیسے اس کے انتظار میں گزارا گیا۔ اگلے روز یعنی سترہ جنوری کو سلیم کے گھر والوں نے گوجرانوالہ آکر فیکٹری سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ وہ چودہ جنوری کی دوپہر ہی کو فیکٹری سے روانہ ہو گیا تھا۔ اس صورتِ حال نے سلیم کے گھر والوں کی پریشانی کو بڑھا دیا۔ جب وہ چودہ جنوری بروز جمعہ فیکٹری سے روانہ ہوا تھا تو پھر وہ اپنے گھر وزیر آباد کیوں نہیں پہنچا تھا۔ فیکٹری والے اس حوالے سے کچھ بھی بتانے سے قاصر تھے۔ جب سلیم کے ورثا کی عقل جواب دے گئی تو کسی کے مشورے پر انہوں نے بدھ انیس جنوری کو وزیر آباد کے تھانے میں گمشدگی کی رپورٹ درج کرادی اور آج ہم تفتیش کے لیے وزیر آباد سے یہاں آئے ہیں۔''

''آپ لوگوں نے یہاں پہنچ کر کسی قسم کی کوئی کارروائی تو نہیں کی؟'' اے ایس آئی کے خاموش ہونے پر میں نے استفسار کیا۔

''جناب! ہم تو سیدھے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔'' شمشاد علی بڑی فرماں برداری سے بولا۔''یہ علاقہ آپ کے تھانے کی حدود میں آتا ہے۔ ہم آپ کے علم میں لائے بغیر کوئی کارروائی کس طرح کر سکتے ہیں۔''

یہ جس دور کا واقعہ ہے اس زمانے میں تھانوں اور نفری کی تعداد بہت کم ہوا کرتی تھی۔ گوجرانوالہ کا صنعتی علاقہ میرے ہی تھانے کی حدود میں آتا تھا۔

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ سیدھے میرے پاس چلے آئے۔'' میں نے ستائشی نظر سے باری باری شمشاد علی اور ارشاد حسین کی طرف دیکھا۔''فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کا گمشدہ بندہ سلیم میرے علاقے میں کہیں بھی موجود ہے تو میں اسے ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''بہت بہت شکریہ ملک صاحب!'' شمشاد علی جلدی سے بولا۔''ہمیں آپ سے ایسے ہی تعاون کی امید تھی۔''

''میں آپ لوگوں کی امیدوں پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔''آپ مجھے گمشدہ سلیم کے بارے میں سب کچھ تفصیل کے ساتھ بتائیں تاکہ میں اس کی تلاش کے لیے ایک مؤثر لائحہ عمل ترتیب دے سکوں۔''

اے ایس آئی نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھے حالات و واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔ میں اس کے بیان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں اور دورانِ مطالعہ آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

☆☆☆

جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا، گمشدہ نوجوان سلیم کا تعلق وزیر آباد کے ایک محلے نظام پورہ سے تھا۔ وزیر آباد کو ضلع گوجرانوالہ کی تحصیل کا درجہ حاصل تھا اور یہ دریائے چناب کے کنارے واقع تھا۔ وزیر آباد کی چھریاں اور چاقو پورے ملک میں مشہور تھے۔

سلیم کی عمر پچیس کے آس پاس تھی۔ وہ گندمی رنگت کا حامل ایک میانہ قد شخص تھا۔ اس کی فیملی وزیر آباد میں آباد تھی جبکہ وہ رزق، روزگار کے سلسلے میں گوجرانوالہ کے متعلقہ علاقے میں آیا ہوا تھا۔ گوجرانوالہ ہی کے ایک محلے شریف پورہ میں اس نے عارضی رہائش بھی اختیار کر رکھی تھی۔ محلہ شریف پورہ مذکورہ ٹیکسٹائل ملز سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس ملز کا نام ''اسٹار ٹیکسٹائل ملز'' فرض کر لیتے ہیں۔

سلیم اپنے والدین کا اکلوتا تھا۔ اس کا باپ شفیق کھیتی باڑی کے ذریعے اپنی روزی کماتا تھا۔ سلیم کی ماں کا نام حیات بی بی تھا۔ واقعات کے مطابق سولہ جنوری بروز اتوار سلیم کی اپنی تایازاد زرینہ کے ساتھ منگنی ہونے والی تھی۔ زرینہ محلہ نظام پورہ میں، اس کے پڑوس میں ہی رہتی تھی۔ زرینہ کا باپ یعنی سلیم کا تایا حنیف وزیر آباد کے مین بازار میں کپڑے کی دکان کرتا تھا جس سے اچھی خاصی گزر بسر ہوجاتی تھی۔ زرینہ کی ماں جنت بی بی ایک فربہ اور بیمار عورت تھی۔ زرینہ بھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور اپنی آنکھ بند ہونے سے پہلے جنت بی بی اس کو خوشی خوشی رخصت کر دینے کی خواہش رکھتی تھی۔

حاصل شدہ معلومات کے مطابق سلیم کو ہفتہ پندرہ جنوری فیکٹری سے چھٹی کر کے سیدھے اپنے گھر وزیر آباد پہنچنا تھا جہاں اگلے روز یعنی اتوار سولہ جنوری کو اس کی منگنی کا پروگرام طے تھا مگر وہ اپنے گھر نہیں پہنچ سکا تھا جبکہ فیکٹری والوں کا بتانا یہ تھا کہ وہ جمعہ چودہ جنوری کی دوپہر ہی کو چھٹی کر گیا تھا۔

میں نے یہ تمام تر معلومات اپنے ذہن میں محفوظ کیں اور وزیر آباد کے اے ایس آئی شمشاد علی سے پوچھا۔ ''تم لوگوں نے گمشدہ سلیم کے حوالے سے پوچھ تاچھ تو کی ہوگی۔ وہ اس کی گمشدگی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''ہم نے ہر زاویے سے، ان سے ڈھیروں سوال پوچھے ہیں۔'' شمشاد علی نے جواب دیا۔ ''مگر وہ اس سلسلے میں کچھ بھی بتانے سے قاصر ہیں۔''

''کیا پہلے بھی وہ کبھی اس طرح بغیر بتائے غائب ہوا تھا؟''

''نہیں جناب!'' اے ایس آئی نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''سلیم کے گھر والوں کے مطابق اس نوعیت کا واقعہ پہلی بار پیش آیا ہے۔''

''سلیم کی کسی سے دشمنی وغیرہ کے بارے میں وہ کیا کہتے ہیں؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

''جناب! سلیم کے بارے میں، ادھر وزیر آباد میں تو بہت اچھی اور تسلی بخش رپورٹ ہے۔'' شمشاد علی نے معتدل انداز میں بتایا۔ ''آج تک اس کا کسی کے ساتھ کوئی بڑا جھگڑا یا پھڈا نہیں ہوا.....''

''جب سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے تو پھر یہ بندہ کہاں غائب ہوگیا؟'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کہیں اسے کوئی حادثہ تو نہیں پیش آگیا.....؟''

''ہاں، ایسا ہوسکتا ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے تمام حالات آپ کو بتا دیے ہیں ملک صاحب۔ بندہ آپ کے تھانے کی حدود میں غائب ہوا ہے اس لیے اس کی تلاش اور بازیابی کے سلسلے میں بھی آپ ہی ہماری مدد کریں گے۔''

''بے شک! میں آپ لوگوں کی ضرور مدد کروں گا۔'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''یہ درحقیقت پولیس ڈیپارٹمنٹ سے تعاون ہوگا.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک اطمینان بخش سانس خارج کی پھر استفساریہ انداز میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگوں کے پاس سلیم کی کوئی تصویر وغیرہ ہوگی؟''

''اوہ.....!'' اے ایس آئی اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''میں بھی کیسا پاگل ہوں۔ سلیم کا فوٹو ساتھ لے کر آیا ہوں اور ابھی تک آپ کو دکھایا ہی نہیں.....''

پھر وہ اپنے تھیلے میں سے ایک ڈائری برآمد کرتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ''بالکل سلیم کی تصویر ہے جناب.....'' ڈائری میں سے اس نے ایک تصویر نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھیں ملک صاحب! اس تصویر میں سلیم بھی ہے۔''

میں نے مذکورہ تصویر اس کے ہاتھ سے لے لی اور بغور اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک پورٹریٹ فوٹو تھا جس میں دو افراد نظر آرہے تھے۔ ایک گھنگرالے بالوں والا اور کلین شیو اور دوسرا ڈاڑھی والا۔ میں نے تصویر کا معائنہ جاری رکھتے ہوئے اے ایس آئی شمشاد علی سے سوال کیا۔ ''ان میں سے سلیم کون ہے؟''

''وہ..... جس نے مونچھ ڈاڑھی منڈوا رکھی ہے۔'' وہ میری مشکل آسان کرتے ہوئے بولا۔ ''اسے کلین شیو رہنے کا بہت شوق ہے حالانکہ یار دوست اس حوالے سے اس کا مذاق بھی اڑاتے رہتے ہیں کہ..... جس کی مونچھ نہیں، اس کا کچھ نہیں..... وغیرہ وغیرہ۔''

"اور سلیم کے ساتھ یہ دوسرا داڑھی والا جوان کون ہے؟" میں نے اب کی بار اے ایس آئی شمشاد علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ سلیم کا کوئی دوست ہے۔" اس نے بتایا۔ "ادھر گوجرانوالہ ہی میں رہتا ہے۔ اس کا نام سلیم کے گھر والوں کو پتا نہیں۔"

"کوئی بات نہیں، میں خود ہی پتا لگالوں گا کہ یہ بندہ کون ہے اور سلیم کے ساتھ اس کی کس قسم کی دوستی تھی۔" میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر اے ایس آئی شمشاد علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

"مجھے ایک، دو دن تفتیش کے لیے دیں۔ اللہ نے چاہا تو میں سلیم کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے ملک صاحب!" شمشاد علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "سلیم کے گھر والے اس کی گمشدگی سے سخت پریشان ہیں۔"

"یہ تو بات ہی پریشانی کی ہے شمشاد علی!" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "اگر کسی کی بکری گم ہوجائے تو وہ پریشان ہوجاتا ہے، یہ تو پھر ایک جیتا جاگتا جوان جہان انسان ہے...... جس کی منگنی ہونے والی تھی۔"

"ہمارے لیے کیا حکم ہے ملک صاحب؟" شمشاد علی نے پوچھا۔ "اگر آپ ضرورت محسوس کریں تو ہم میں سے کوئی آپ کے پاس رک جاتا ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں شمشاد علی۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "تم دو دن بعد میرے پاس آجانا۔ اللہ نے چاہا تو میں تمہیں کوئی خوش خبری ہی سناؤں گا۔"

"انشاء اللہ جی...... انشاء اللہ!" وہ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"چلیں ٹھیک ہے جی......!" میں نے باری باری ان دونوں سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "وڑائچ صاحب کو میرا اسلام کہنا۔"

"اچھا جی...... ضرور کہوں گا۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

سفیان وڑائچ اس تھانے کا انچارج تھا جہاں سے اے ایس آئی شمشاد علی اور کانسٹیبل ارشاد حسین آئے تھے۔ انہیں رخصت کرنے کے بعد میں گمشدہ سلیم کے بارے میں سوچنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں حوالدار نبی بخش میرے پاس آگیا۔ اس نے شمشاد علی اور ارشاد حسین کے بارے میں پوچھا۔

"ملک صاحب! یہ ملازم کسی اور علاقے سے آئے تھے نا......؟"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے نبی بخش۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک گمشدہ بندے کی تلاش میں وزیرآباد سے یہاں آئے تھے۔"

میں نے اس کے بعد نہایت ہی مختصر الفاظ میں حوالات کے نگران نبی بخش کو وزیرآبادیوں کی آمد کی غرض وغایت سے آگاہ کیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔ "تو اس بندے کو تلاش کرنے کا مشن کب سے شروع کرنا ہے ملک صاحب؟"

حوالدار نبی بخش بہت ہی مستعد اور جوشیلا اہلکار تھا۔ اکثر معرکوں میں وہ میرے ساتھ رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں نیا عزم اور نئی ترنگ دیکھی تو زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "نیک کاموں میں تاخیر مناسب نہیں ہوتی نبی بخش۔ تم جلدی سے تیاری کرلو۔ ہم ابھی تھوڑی دیر میں نکلیں گے۔"

"پہلے کدھر کا رخ کرنا ہے ملک صاحب؟"

"اسٹار ٹیکسٹائل ملز!" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "آخری مرتبہ اس گمشدہ جوان سلیم کو جمعہ چودہ جنوری اسی فیکٹری میں دیکھا گیا تھا۔ حاصل شدہ معلومات کے مطابق سلیم چودہ جنوری کو دوپہر میں فیکٹری سے چھٹی کر کے گیا تھا۔ اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں، ہمیں اپنی تفتیش کا آغاز اسی فیکٹری سے کرنا چاہیے۔"

"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں سرکار۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "میں ابھی چند منٹ میں صنعتی علاقے کی طرف جانے کے لیے سواری کا بندوبست کرتا ہوں۔ آپ ذہنی طور پر تیار رہیں۔"

"میں اسی لمحے سے تیار ہوں......" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

حوالدار کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر فوٹو کے معائنے میں مصروف ہوگیا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے وہ دو افراد کا پورٹریٹ فوٹو تھا اور اے ایس آئی شمشاد علی کے مطابق سلیم کے ساتھ اس کا کوئی گوجرانوالیہ دوست تھا۔ تصویر میں یہ دونوں جوان خاصے خوش گوار موڈ میں نظر آتے

تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں میں گہری دوستی ہے۔
اگر میں اس نامعلوم اور بے نام ڈاڑھی والے جوان کو ڈھونڈ نکالتا تو اس کی مدد سے بہ آسانی گمشدہ سلیم کا سراغ لگایا جاسکتا تھا۔ میں چند لمحات تک سلیم اور اس کے دوست کے نقش و نگار کو اپنی یادداشت میں محفوظ کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر تصویر کو پلٹ دیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے ایک خوشگوار حیرت کا احساس ہوا۔

تصویر کے پیچھے اس فوٹو گرافر کی مہر ثبت تھی جہاں سے سلیم اور اس کے دوست نے اپنا یہ فوٹو بنوایا تھا۔ اس فوٹو گرافر کے اسٹوڈیو کا نام ''تصویر محل'' تھا اور ایڈریس ریل بازار کا درج تھا۔ ریل بازار، ریلوے اسٹیشن کے سامنے ہی واقع تھا۔ سلیم کی تلاش کے سلسلے میں اس فوٹو گرافر کو بھی ''چیک'' کیا جاسکتا تھا۔ تصویر زیادہ پرانی نہیں تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ فوٹو گرافر سلیم یا اس کے دوست کو بہ آسانی پہچان لے گا۔

سلیم تک رسائی کے لیے یہ ایک نیا راستہ مل گیا تھا لیکن سب سے پہلے مجھے فیکٹری جا کر معلومات حاصل کرنا تھیں۔ اس کے بعد ہی ان معلومات کی روشنی میں آگے قدم بڑھایا جاسکتا تھا۔

☆☆☆

جنوری موسم سرما کا جوبن شمار ہوتا ہے۔ یہ موسم عموماً اکتوبر کے اختتام سے شروع ہوکر مارچ کے آغاز تک چلتا ہے مگر جنوری میں یہ اپنی جوانی کی بہار دکھلا رہا ہوتا ہے۔ آج کل فضا میں ٹھنڈ رچی بسی تھی۔ دوپہر کے بعد میں حوالدار نبی بخش کے ساتھ اسٹار ٹیکسٹائل ملز پہنچ گیا۔ تھانے سے فیکٹری تک کا سفر ہم نے ایک تانگے میں طے کیا تھا۔ مذکورہ فیکٹری میرے تھانے سے لگ بھگ پانچ میل کے فاصلے پر شہر سے باہر صنعتی علاقے میں واقع تھی۔

آج کل تو گوجرانوالہ اچھا خاصا پھیل گیا ہے اور پتا ہی نہیں چلتا، کب شہر ختم ہوا اور کب صنعتی علاقہ (انڈسٹریل ایریا) شروع ہوا لیکن جب کا یہ واقعہ ہے اس زمانے میں آبادی خال خال ہی نظر آتی تھی۔

اسٹار ٹیکسٹائل انڈسٹری تک پہنچنے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ گوجرانوالہ کا صنعتی علاقہ مختلف مصنوعات کی فیکٹریوں سے بھرا ہوا ہے جن میں ٹیکسٹائل انڈسٹری کی تعداد غالب نظر آتی ہے۔ ہم اس وقت یونیفارم میں تھے لہٰذا ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ فیکٹری کے بابو (مالک) نے فوراً ہمیں اپنے کمرے میں بلالیا۔ یہ کمرا فیکٹری کا آفس تھا جہاں مالک کے علاوہ فیکٹری کا منشی بھی موجود تھا۔

آج کل جس پوسٹ پر جنرل منیجر یا اکاؤنٹنٹ اور کیشیئر وغیرہ کام کرتے ہیں، اس زمانے میں یہ تینوں پوسٹ ایک ہی اللہ کے بندے کے پاس ہوتی تھیں جسے عرفِ عام میں ''منشی'' کہا جاتا تھا۔ اسٹار ٹیکسٹائل ملز کے مالک کا نام معراج دین اور منشی کا نام عبدالجبار تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد بابو معراج نے ہماری خاطر تواضع کے لیے کوئی بندوبست کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہی تھا کہ میں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا۔
''کسی تکلف کی ضرورت نہیں بابو جی۔ ہم ابھی تھوڑی دیر پہلے کھانا کھا کر تھانے سے نکلے ہیں۔''
''یہ کیسے ہوسکتا ہے جناب!'' بابو معراج اپنایت بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ پہلی مرتبہ میرے پاس آئے ہیں۔ کچھ کھائے پیے بغیر کیسے جاسکتے ہیں۔''
''ہم جس مقصد سے یہاں آئے ہیں اگر وہ پورا ہوگیا تو میں سمجھوں گا، ہم یہاں سے آپ کی دعوت کھا کر جارہے ہیں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس وقت آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔''
''حکم کریں تھانیدار صاحب۔'' بابو معراج گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ کے کسی کام آکر مجھے خوشی ہوگی۔''
منشی جبار بھی سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں باقاعدہ گفتگو کا آغاز کرتا، نبی بخش اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور عام سے لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! آپ بابو جی سے بات چیت کریں جب تک میں گھوم پھر کر فیکٹری کی سیر کرلیتا ہوں۔''
بابو معراج اور اس کا منشی جبار الجھن زدہ نظروں سے حوالدار نبی بخش کو تکنے لگے۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... تم جاؤ۔''
میں نبی بخش کے طریقہ کار سے اچھی طرح واقف تھا۔ بابو معراج اور منشی جبار سے ''مذاکرات'' کے لیے دو افراد کی ضرورت نہیں تھی لہٰذا اس دوران میں نبی بخش فیکٹری کے دیگر ملازمین سے مل کر سلیم کی گمشدگی کے راز تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا جبھی میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔
نبی بخش آفس سے خارج ہوا تو میں دوبارہ بابو معراج کی طرف متوجہ ہوگیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے بتایا۔ ''بابو جی! آپ کی فیکٹری میں سلیم نام کا ایک بندہ کام کرتا ہے۔ میں اس کے بارے میں کچھ معلومات لینے آپ کے

پاس آیا ہوں۔''

''آپ اس سلیم کی بات تو نہیں کررہے جو وزیرآباد کا رہنے والا ہے؟'' منشی نے چونکتے ہوئے لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔

''جی بالکل، آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ سلیم اب نہ وزیرآباد میں ہے اور نہ گوجرانوالہ میں......''

''کک...... کیا مطلب......؟'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بابو معراج حیرت بھرے لہجے میں بول اٹھا۔

''مطلب یہ کہ......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں جس سلیم کا ذکر کررہا ہوں، وہ لاپتا ہوچکا ہے۔''

بابو معراج نے اپنے منشی کی جانب دیکھا اور الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔ ''تھانیدار صاحب کیا کہہ رہے ہیں...... کیا سلیم کام پر نہیں آرہا؟''

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! مجھے یہ تو پتا ہے کہ سلیم میری فیکٹری میں کام کرتا ہے مگر یہ خبر نہیں کہ وہ آج کل آرہا ہے یا نہیں......''

''ایسے معاملات کی خبر زیادہ تر فیکٹری کے منشی ہی کو رکھنا پڑتی ہے۔'' میں نے منشی جبار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''منشی جی! میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟''

''نہیں جناب! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''مجھے اچھی طرح یاد ہے، سلیم جمعے کے دن دوپہر کے بعد فیکٹری سے چھٹی کرکے گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا......''

''مطلب...... اس واقعے کو چھ، سات دن گزر گئے ہیں۔'' بابو معراج حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''آج جمعرات ہے اور کل جمعہ...... پورا ایک ہفتہ ہوگیا اسے غائب ہوئے......''

''میں سلیم کے لیے ''غائب'' نہیں بلکہ ''گمشدہ'' کے الفاظ استعمال کروں گا بابو جی۔'' میں نے بابو معراج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سلیم کو ہفتہ پندرہ جنوری کو اپنے گھر وزیرآباد پہنچنا تھا اور سولہ جنوری کو اس کی منگنی تھی لیکن جب وہ مقررہ دن گھر نہیں پہنچا تو اس کے گھر والوں کو تشویش ہوئی۔ پہلے انہوں نے اسے ادھر ادھر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جب ہر طرف سے ناکامی... کا منہ دیکھنا پڑا تو انہوں نے یہاں فیکٹری آکر بھی اس کے بارے میں پوچھا۔ انہیں بتایا گیا کہ وہ جمعے کی دوپہر فیکٹری سے چلا گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ مجبوراً اس کے گھر والوں نے وزیرآباد کے تھانے میں سلیم کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرادی۔ جب وزیرآباد کی پولیس سلیم کا سراغ لگانے میں ناکام رہی تو انہوں نے یہ کام میرے ذمے لگادیا اور...... میں اسی سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔''

''ان ساری باتوں کا مجھے بالکل علم نہیں۔'' بابو معراج ٹھہری سنجیدگی سے بولا پھر عبدالجبار کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''کیوں منشی جی! یہ کیا ماجرا ہے؟''

''سلیم کے گھر سے دو بندے منگل کو یہاں آئے تھے اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ گھر نہیں پہنچا۔'' منشی جبار وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے انہیں حقیقت سے آگاہ کردیا تھا۔ میری بات سن کر وہ خاصے مایوس ہوئے اور واپس چلے گئے تھے۔''

''منشی جی! کیا آپ کو اچھی طرح یاد ہے کہ جمعہ چودہ جنوری کے بعد آپ نے سلیم کو نہیں دیکھا؟'' بابو معراج کو اس معاملے میں لاعلم پاکر میں منشی جبار کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''جی...... میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''گھر والوں کے مطابق سلیم کو ہفتے کی رات گھر پہنچنا تھا۔'' میں نے بہ دستور منشی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ بتاسکتے ہیں کہ وہ ایک دن پہلے یعنی جمعے کی دوپہر کیوں چلا گیا تھا؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''میں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا سلیم نے مجھے بتایا تھا۔''

''اس نے آپ کو کیا بتایا تھا؟'' میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

''اس کی منگنی والی بات کا تو مجھے پتا تھا۔'' منشی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جمعے کی دوپہر کو وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ اسے ہفتے کے بجائے جمعے کو چھٹی دے دی جائے۔ وہ ایک دن پہلے گھر جانا چاہتا ہے۔ میں نے اس کی بات مان لی اور ایک سو روپے دے کر اسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ اس وقت بابو فیکٹری میں موجود نہیں تھے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ کہیں گم ہوجائے گا۔''

''یہ تو اس کے گھر والوں کو بھی پتا نہیں تھا۔'' بابو معراج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں منشی سے کہا پھر پوچھا۔ ''تم نے سلیم کو ایک سو روپے کس سلسلے میں دیے تھے؟''

''جناب! یہ اس کے اوور ٹائم کے پیسے تھے۔'' منشی نے جواباً بتایا۔ ''پچھلے کچھ عرصے سے وہ اوور ٹائم نہیں لے رہا تھا۔ کہتا تھا، منگنی کے موقع پر ساری رقم ایک ساتھ لے کر

جائے گا۔ اس نے مانگے، میں نے دے دیے۔"

اس زمانے میں کسی فیکٹری ورکر کی تنخواہ تیس سے ستر روپے ماہوار ہوا کرتی تھی۔ سو روپے تنخواہ کو ہینڈسم سیلری سمجھا جاتا تھا۔ منشی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق سلیم کی ماہانہ تنخواہ ساٹھ روپے تھی۔ یہ سو روپے اس کے علاوہ تھے جو اس نے اوورٹائم کرکے جمع کیے تھے۔

تنخواہ کے حوالے سے بیان کردہ رقم کا سن کر آپ کو حیرت تو ہو رہی ہوگی۔ آج کل اتنی رقم میں ایک شخص ڈھنگ سے ایک وقت کا کھانا بھی نہیں کھا سکتا۔ آپ کی سوچ اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر اس زمانے میں اتنی مہنگائی اور افراتفری نہیں ہوا کرتی تھی۔ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ سستائی کے اس دور میں ایک متوسط گھرانے کا مہینے بھر کا راشن پندرہ سے بیس یا زیادہ سے زیادہ پچیس روپے میں آجایا کرتا تھا۔

میں نے منشی جبار سے پوچھا۔ "آپ کا ذہن کیا کہتا ہے..... سلیم کہاں گیا ہوگا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب....." وہ جلدی سے بولا۔ "مجھے اس کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں۔"

"ممکن ہے اسے کوئی حادثہ پیش آگیا ہو۔" بابو معراج نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "دولت بہت بری چیز ہے۔ ہوسکتا ہے، کوئی جرائم پیشہ شخص اس کے پیچھے لگ گیا ہو....."

"اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں نکل گیا ہو۔" منشی نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔ "جب اس کا دل چاہے گا، واپس آجائے گا۔"

"یہ تو کسی قیمت پر نہیں ہوسکتا۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "یہ تو آپ کے بھی علم میں ہے کہ سلیم کی پچھلے اتوار کو منگنی ہونے والی تھی اور اس نے اپنی منگنی کے لیے اوورٹائم کی رقم بھی جمع کر رکھی تھی لہٰذا وہ فیکٹری سے چھٹی کے بعد وزیرآباد اپنے گھر کے سوا اور کہیں نہیں جا سکتا تھا۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ اور ہی آرہا ہے....." بابو معراج نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سلیم کے گھر والوں کے مطابق اسے ہفتے کو گھر پہنچنا تھا جبکہ اس نے جمعے کی دوپہر فیکٹری سے چھٹی کرلی تھی۔ یہ ممکن ہے کہ اس کے ذہن میں گھر جانے سے پہلے کوئی اور پروگرام ہو....."

"آپ کی بات میں وزن ہے بابو جی۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کے ذہن میں کون سا دوسرا پروگرام تھا، یہ تو وہی بتا سکتا ہے مگر وہ منظر سے غائب ہوچکا ہے۔ اب یہی ہوسکتا ہے کہ..... ان لوگوں سے پوچھ گچھ کی جائے جن کے ساتھ اس کا زیادہ اٹھنا بیٹھنا تھا۔"

"میں یہ کوشش کرکے دیکھ چکا ہوں۔" منشی جبار نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "منگل کے روز جب اس کے گھر سے بندے اس کا پوچھنے یہاں آئے تھے تو میں نے یہ کام کیا تھا لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ فیکٹری میں جن ملازمین کے ساتھ اس کی زیادہ بات چیت تھی، میں نے ان سے کئی سوالات کیے ہیں مگر ان میں سے کوئی اس کے پروگرام سے واقف نہیں۔ سب کو بس، اس کی منگنی کا علم ہے..... اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

"ہوں....." میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "مجھے پتا چلا ہے، وہ ادھر ہی کسی محلے میں رہتا تھا۔ ممکن ہے، وہاں کسی کو معلوم ہو کہ وہ کہاں گیا ہے۔"

یہ بات میرے علم میں آچکی تھی کہ سلیم گوجرانوالہ کے محلے شریف پورہ میں رہتا تھا لیکن میں نے ابھی دانستہ اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ منشی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ ایسا ہوسکتا ہے کہ وہاں کسی کو اس کے بارے میں پتا ہو۔ وہ ادھر قریب ہی محلہ شریف پورہ میں رہتا تھا۔ بلال مسجد کے قریب ہی وہ گھر ہے جہاں اس نے رہائش رکھی ہوئی تھی۔"

یہ ایک اور کام کی بات معلوم ہوگئی تھی۔ میں نے مزید پندرہ بیس منٹ تک منشی اور بابو معراج سے مختلف زاویوں سے سوالات کیے۔ موضوع سلیم اور اس کی گمشدگی ہی تھا لیکن اس سلسلے میں ایسا کوئی سراغ ہاتھ نہ لگ سکا جس کے سہارے میں اس تک رسائی حاصل کر پاتا۔ فیکٹری کو چھوڑنے سے پہلے میں نے ان ملازمین سے بھی پوچھ گچھ کی جو سلیم کے ساتھ فیکٹری میں کام کرتے تھے مگر نتیجہ صفر کے برابر ہی برآمد ہوا یعنی کوئی حوصلہ افزا بات معلوم نہ ہوسکی۔

میں نے وہ تصویر بھی سب کو دکھائی جس میں سلیم اپنے کسی ڈاڑھی والے دوست کے ساتھ موجود تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی اس باریش گوجرانوالیہ کو نہیں جانتا تھا۔ فیکٹری میں اپنی تفتیش مکمل کرنے کے بعد میں حوالدار نبی بخش کے ساتھ شریف پورہ کی جانب روانہ ہوگیا۔

شریف پورہ، گوجرانوالہ کے انڈسٹریل ایریا سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم جس تانگے میں بیٹھ کر فیکٹری آئے تھے اسی میں شریف پورہ پہنچ گئے۔ مسجد بلال کے پاس وہ گھر تلاش کرنے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

وہ ایک بیوہ اللہ رکھی کا مکان تھا جس کے دو پورشن تھے جن میں سے ایک میں وہ خود رہتی تھی اور دوسرا اس نے

کرائے پر دے رکھا تھا۔ میری دستک کے جواب میں ایک کرخمیدہ عورت دروازے پر آئی۔ اس نے آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ سر کے بال سفید اور عمر میرے محتاط اندازے کے مطابق ساٹھ سے متجاوز تھی۔ عینک کے باوجود بھی اس نے آنکھوں (پیشانی) پر ہاتھ کا چھجا بناتے ہوئے بیزاری سے پوچھا۔

''کون ہے......؟''

ایک بات واضح ہوگئی کہ عینک کے باوجود بھی اسے ٹھیک طرح سے نظر نہیں آتا تھا جبھی اس نے پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ ہم اس کے لیے اجنبی تھے لہٰذا اس کوشش کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''اماں! میں تھانہ صدر کا انچارج ملک صفدر حیات ہوں۔ ہم ایک ضروری کام سے تمہارے پاس آئے ہیں۔''

''ہائے ربا...... پولیس!'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ ''آج تک پولیس میرے دروازے پر نہیں آئی۔ اللہ خیر کرے...... معاملہ کیا ہے۔''

''اللہ تو اپنے بندوں پر خیر ہی کرتا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''معاملہ جو بھی ہے، یہاں گلی میں کھڑے کھڑے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کیا تمہارے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ ہے......؟''

''ہاں جی...... آپ اندر آجائیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

ہم اللہ رکھی کے گھر میں داخل ہوگئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم گھر کے صحن میں، دھوپ میں بیٹھے تھے۔ دھوپ میں اگرچہ وہ جون جولائی والی حدت نہیں تھی تاہم موسم کی مناسبت سے یہ نرم اور میٹھی دھوپ بھی خاصی سکون بخش اور خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔

''تھانیدار پتر......!'' اللہ رکھی اپنی کمر کو ٹٹولتے ہوئے بولی۔ ''رات سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے میں آپ لوگوں کی کوئی خدمت شدمت نہیں کرسکوں گی۔''

''ہم تم سے خدمت کرانے یہاں نہیں آئے اللہ رکھی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر تم میرے سوالات کا ٹھیک ٹھیک جواب دوگی تو میں سمجھوں گا تم نے پولیس کے ساتھ بھرپور تعاون کیا ہے۔''

''کچھ بتائیں تو سہی جی...... آخر یہ چکر کیا ہے؟'' وہ ٹٹولنے والے انداز میں بولی۔ ''آپ کس سلسلے میں تفتیش کر رہے ہیں؟''

''سلیم کے سلسلے میں!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ہائے میں مرجاواں......'' وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا ہوا ہے سلیم کو......؟''

''یہی پتا کرنے تو نکلا ہوں کہ سلیم کے ساتھ کیا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ تمہارا کرائے دار تھا...... نا؟''

''آپ سلیم کو کرائے دار تھا...... کیوں کہہ رہے ہیں تھانیدار جی؟'' وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''وہ میرا کرائے دار ہے۔ ابھی وہ اپنے گھر وزیر آباد گیا ہوا ہے۔''

''تمہاری بات اس حد تک تو ٹھیک ہے کہ وہ اپنے گھر گیا تھا۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ وہ وزیر آباد پہنچا نہیں......''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جی......!''

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں اللہ رکھی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی اس کی فیکٹری سے آرہا ہوں۔ فیکٹری والوں کے مطابق وہ پچھلے جمعے کو دوپہر کے وقت چھٹی کرکے گیا تھا۔ پیر کو اسے واپس آنا تھا اور آج جمعرات ہے۔ وہ ابھی تک لوٹا نہیں۔ اس کے گھر والوں نے ادھر وزیر آباد میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا رکھی ہے۔ وزیر آباد پولیس نے اسے وہاں ڈھونڈ لیا ہے مگر وہ ملا نہیں۔ ان کا خیال ہے، سلیم گوجرانوالہ ہی میں کہیں غائب ہوا ہے۔ میں اس کی تلاش کے سلسلے ہی میں نکلا ہوا ہوں۔''

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ وہ پچھلے جمعے کو یہاں سے گیا ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''جمعے کی صبح جب وہ فیکٹری جارہا تھا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ فیکٹری سے سیدھا وزیر آباد چلا جائے گا۔''

''اس نے اپنی واپسی کے بارے میں تمہیں کچھ بتایا تھا؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''جی ہاں، مجھے بھی پیر کے دن ہی واپس آنے کو کہا تھا۔'' اللہ رکھی نے جواب دیا۔

''جب وہ پیر کو واپس نہیں آیا تو تمہیں اس کی فکر نہیں ہوئی تھی؟''

''جی نہیں......'' اللہ رکھی نے نفی میں گردن ہلائی پھر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ منگنی کرنے گھر جارہا تھا۔ ایسے خوشی کے کاموں میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ میں اس کی طرف سے مطمئن تھی۔''

''دیر سویر...... ایک آدھ دن کی تو سمجھ میں آتی ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب تو کافی دن گزر

گئے ہیں اور سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ وہ اپنے گھر تو پہنچا ہی نہیں......''

''وہ کہاں جاسکتا ہے......؟'' وہ گہری فکرمندی سے بولی۔

''یہی جاننے کے لیے تو میں یہاں پہنچا ہوں۔''

''شاید صفدر کو اس کے بارے میں کچھ پتا ہو......'' وہ پُرخیال انداز میں بولی۔

''صفدر......!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''صفدر، سلیم کا بڑا گہرا دوست ہے جی۔'' اللہ رکھی نے بتایا۔ ''ادھر اس کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ دونوں نے مل کر میرے گھر کا ایک حصہ کرائے پر لیا ہوا ہے۔''

اللہ رکھی کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں، میں نے وہ تصویر نکال کر اسے دکھائی جو وزیر آبادی اے ایس آئی شمشاد علی نے مجھے دی تھی...... پھر پوچھا۔

''کیا اس فوٹو میں سلیم کے ساتھ صفدر ہی ہے؟''

اس نے بڑی باریک بینی سے مذکورہ فوٹو کا جائزہ لیا۔ یہ ''باریک بینی'' اس کی نظر کی کمزوری کے باعث تھی۔ چند لحات کے معائنے کے بعد اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''سلیم کو تو میں نے پہچان لیا ہے لیکن اس کے ساتھ جو ڈاڑھی والا ہے، پتا نہیں یہ کون ہے......!''

''تمہارا مطلب ہے، یہ صفدر نہیں؟'' میں نے اس کے ہاتھ سے تصویر واپس لیتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں جی...... صفدر کی ڈاڑھی نہیں۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اور اگر ڈاڑھی ہوتی بھی تو میں اسے پہچاننے میں غلطی کیسے کرسکتی ہوں۔ وہ میرے گھر میں رہتا ہے۔ روزانہ دو تین مرتبہ اسے دیکھتی ہوں۔ ہاں......'' لحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر سنجیدگی سے بولی۔ ''صفدر اس ڈاڑھی والے بندے کو ضرور جانتا ہوگا۔ آپ اس سے پوچھ کر دیکھیں۔''

''صفدر اس وقت کہاں ملے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تو وہ کام پر گیا ہوا ہے۔'' اللہ رکھی نے بتایا۔ ''شام کو واپس آئے گا۔''

یہ بات مجھے معلوم تھی کہ تصویر میں سلیم کے ساتھ نظر آنے والے ڈاڑھی والے بندے کا تعلق گوجرانوالہ ہی سے تھا۔ میں نے اللہ رکھی سے پوچھا۔

''صفدر کون سی فیکٹری میں کام کرتا ہے؟''

اگر صفدر بھی سلیم کے ساتھ اسٹار ٹیکسٹائل ملز میں کام کر رہا ہوتا تو بابو معراج یا منشی جبار میں سے کوئی ضرور اس کا ذکر کرتا۔ میں نے فیکٹری کے دیگر ملازموں سے بھی پوچھ تاچھ کی تھی لیکن کسی کی بھی زبان پر صفدر کا نام نہیں آیا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ صفدر کسی اور کارخانے میں کام کرتا تھا۔ اللہ رکھی کے جواب نے میرے ان خیالات کی تصدیق کردی۔

''کارخانے کا نام تو مجھے پتا نہیں جی...... پر یہ جانتی ہوں، وہاں سلور کے برتن بنتے ہیں اور...... یہ کارخانہ ادھر برف خانے کے ساتھ ہی ہے۔''

''بس، اتنا ہی کافی ہے۔'' میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''میں کارخانے جاکر صفدر سے ملاقات کرلیتا ہوں۔''

اللہ رکھی نے ابھی جس ''برف خانے'' کا ذکر کیا تھا، وہ اس طرف آتے ہوئے میں نے راستے میں دیکھا تھا۔ برف خانے سے مراد، برف بنانے والی فیکٹری تھی جو ان دنوں بند تھی۔ اس ٹھنڈے ٹھار موسم میں کسی کو برف کی طلب نہیں تھی۔ اس زمانے میں فریج کا استعمال عام نہیں ہوا تھا لہٰذا موسم گرما میں برف خانے خوب چلتے تھے۔ اللہ رکھی نے سلور کے برتنوں والے کارخانے کا ذکر کیا تھا۔ یہاں سلور سے مراد چاندی نہیں بلکہ ایلومینیم کے برتن ہیں۔ اس زمانے میں اس دھات کے برتن نئے نئے آئے تھے۔ ایلومینیم کے رنگ کی وجہ سے انہیں سلور کے برتن کہا جاتا تھا۔

میں رخصت ہونے لگا تو اللہ رکھی نے کہا۔ ''تھانیدار صاحب! اگر آپ کو سلیم کے بارے میں کچھ پتا چلے تو مجھے بھی ضرور بتائیں۔ پتا نہیں بے چارے کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ آپ نے تو مجھے پریشان کردیا ہے۔''

''ہاں اللہ رکھی...... یہ بات تو پریشانی والی ہی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ادھر وزیر آباد میں اس کے گھر والے پریشان بیٹھے ہیں اور ادھر ہم اس کی تلاش میں جگہ جگہ کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔ خیر......'' میں نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ تم بھی آس پاس نظر رکھنا۔ سلیم کے بارے میں کوئی بھی بات پتا چلے تو مجھے بتانا۔ میں کل پھر ادھر چکر لگاؤں گا۔''

''اچھا جی......!'' اس نے بس اتنا کہا اور ہمیں رخصت کرنے دروازے تک آئی۔

☆☆☆

برف خانے کے نزدیک برتنوں والا وہ کارخانہ تلاش کرنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا جہاں اللہ رکھی کے مطابق سلیم کا دوست صفدر کام کرتا تھا۔ ایلومینیم کے برتن تیار کرنے والا وہ کارخانہ پوری طرح جاگ رہا تھا۔ مطلب یہ کہ اس میں مشینوں کا اچھا خاصا شور سنائی دے رہا تھا۔

میں نے وہاں کے شفٹ انچارج عنایت شاہ سے ملاقات کی۔ عنایت شاہ سپروائزر قسم کا بندہ تھا اور فیکٹری میں کام کرنے والے تمام ملازموں کی اسے پوری طرح خبر تھی۔ عنایت شاہ نے ہمیں عزت و احترام کے ساتھ بٹھایا اور جب میں نے اپنی آمد کی غرض و غایت سے اسے آگاہ کیا تو اس نے بتایا۔

''تھانیدار صاحب! صفدر دوپہر تک تو کارخانے میں موجود تھا۔ اس کے بعد ہی چھٹی لے کر گیا ہے۔''

''چھٹی لے کر گیا ہے......'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کہاں گیا ہے وہ؟''

''یہ تو مجھے بھی پتا نہیں۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''کہہ رہا تھا، کوئی ضروری کام ہے۔ اب تو وہ کل صبح ہی کام پر آئے گا۔''

''ضروری کام......'' میں نے زیرِلب دہرایا۔

اللہ رکھی کے مطابق وہ کام پر گیا ہوا تھا اور اس کی واپسی شام کو ہونا تھی مگر وہ کسی ضروری کام کی خاطر آج دوپہر ہی کو فیکٹری سے نکل گیا تھا۔ پتا نہیں، وہ کس ضروری کام سے کہاں نکل گیا تھا۔

''بات کیا ہے تھانیدار صاحب!'' مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر عنایت شاہ نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''سب خیریت تو ہے نا......؟''

''خیریت نہیں ہے شاہ جی......!''

''کیا صفدر کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟'' میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس نے سوال داغ دیا۔

''صفدر کا تو مجھے پتا نہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''مگر اس کے دوست کے ساتھ یقیناً کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔''

''کون دوست؟'' اس کی الجھن دوچند ہو گئی۔

''میں سلیم کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''سلیم اور صفدر شریف پورہ میں، ایک بیوہ اللہ رکھی کے گھر میں کرائے دار کی حیثیت سے رہتے تھے۔''

''رہتے تھے......؟'' اس نے استعجابیہ انداز میں مجھے دیکھا۔

میں نے اس کی نگاہوں کا مفہوم فوراً سمجھ لیا اور اس کی الجھن دور کرتے ہوئے کہا۔ ''شاہ جی! ''رہتے تھے'' سے میری مراد یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک یہ دونوں اللہ رکھی کے کرائے دار تھے مگر پچھلے جمعے سے سلیم پراسرار طور پر غائب ہو چکا ہے۔ میں اسی کی تلاش کے سلسلے میں تفتیش کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہوں......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھ رہا ہوں، صفدر کو سلیم کی گمشدگی کے بارے میں ضرور کچھ پتا ہوگا اسی لیے میں اس سے پوچھ گچھ کرنے یہاں آیا ہوں۔''

''یہ تو مجھے پتا ہے جناب کہ صفدر اپنے کسی دوست کے ساتھ شریف پورہ میں رہتا ہے مگر اس کے دوست کی گمشدگی کا مجھے علم نہیں۔'' عنایت شاہ نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو اس کا نام تک معلوم نہیں۔ ابھی آپ کی زبانی پتا چلا ہے کہ صفدر جس بندے کے ساتھ رہتا تھا، اس کا نام سلیم ہے۔''

''ٹھیک ہے شاہ جی!'' میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''یہ بات ابھی اپنے تک ہی رکھنا۔ میں کل پھر ادھر آؤں گا اور صفدر سے پوچھ گچھ کروں گا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، وہ سلیم کی گمشدگی کے بارے میں ضرور کچھ جانتا ہوگا۔''

''کیا صفدر سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کرنا......؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ ''مطلب یہ کہ صفدر کو آپ کی آمد کے بارے میں بتاؤں یا نہیں؟''

''نہیں......'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ ''اسے بھی نہیں۔ اسے بالکل پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں اس سے ملنے آنے والا ہوں۔''

''ٹھیک ہے جناب! جو آپ کا حکم۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نے رخصت ہونے سے قبل عنایت شاہ سے دریافت کیا۔ ''یہ صفدر کردار کا کیسا بندہ ہے؟''

''ٹھیک ٹھاک ہے جی۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ کام کے معاملے میں وہ بالکل جن کی طرح ہے۔ قد چھوٹا اور کارکردگی بڑی۔ آپ دیکھ رہے ہیں، برتن بنانے کا کام کوئی آسان نہیں مگر جب وہ ڈیوٹی پر ہوتا ہے تو اس کی کسی حرکت سے بیزاری یا تھکاوٹ ظاہر نہیں ہوتی۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ انسان کو اسی طرح محنتی

اور جفاکش ہونا چاہیے۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''شاہ جی! آپ کو تو صفدر سے کوئی شکایت نہیں لیکن فیکٹری میں کام کرنے والے دوسرے ملازمین کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

شاید وہ میرے سوال کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ اس کی الجھن زدہ نظر کے جواب میں، میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''میرا مطلب یہ ہے شاہ جی کہ فیکٹری کے دوسرے ملازمین کے ساتھ صفدر کے کیسے تعلقات ہیں۔ کیا انہیں بھی صفدر سے کوئی شکایت نہیں؟''

''جی..... بالکل نہیں!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''آج تک صفدر کا کسی سے جھگڑا نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں، سب اسے پسند کرتے ہیں۔''

صفدر کی ذات کے حوالے سے میں نے شاہ جی سے محض اس لیے پوچھا تھا تاکہ اس کے مزاج اور عادات کا اندازہ لگا سکوں۔

ہم ایلومینیم کے برتنوں والے کارخانے سے نکل کر تانگے میں بیٹھے تو حوالدار نبی بخش نے کہا۔ ''ملک صاحب! شام ہونے والی ہے۔''

''ہاں، وہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اور سردی میں بھی اچھا خاصا اضافہ ہوچکا ہے لیکن..... میں سمجھا نہیں، تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''ملک صاحب! اللہ رکھی نے بتایا تھا کہ صفدر شام کو گھر آئے گا۔'' نبی بخش وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''کیوں نہ ایک مرتبہ پھر اللہ رکھی کے گھر کو چیک کرلیں۔ ہوسکتا ہے، صفدر ہمیں وہاں مل جائے۔''

حوالدار کی بات میں وزن تھا۔ میں نے کوچوان کو تانگا واپس موڑنے کو کہا۔ اگرچہ صفدر آج دوپہر کو کسی ضروری کام سے چھٹی لے کر کارخانے سے چلا گیا تھا لیکن اس بات کے امکانات کو رد نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ ضروری کام نمٹانے کے بعد واپس گھر آگیا ہو۔ اس وقت تو ہم اس کے گھر کے قریب ہی موجود تھے لہٰذا اسے دوبارہ چیک کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اگر وہ مل جاتا تو صبح دوبارہ ادھر آنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ..... ہونے والی بات ہوکر رہتی ہے۔ قدرت کے کارخانے میں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے اور اس ''مقررہ وقت'' میں بھی قدرت کی کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس امر میں بھی کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ جو بھی ہوتا ہے، انسان کی بھلائی اور بہتری کے لیے ہی ہوتا ہے۔ نصیب سے زیادہ اور وقت سے پہلے کسی کو کچھ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر..... اللہ رکھی کے گھر کا دوسرا پھیرا بھی ناکام ہی رہا۔ صفدر ابھی تک گھر نہیں پہنچا تھا۔ اب کل سے پہلے اس سے ملاقات ممکن نہیں تھی۔

ہمارا تانگا جی ٹی روڈ پر صنعتی علاقے سے تھانے کی ج... بڑھ رہا تھا۔ جب ہم ریلوے اسٹیشن کے قریب پہنچے ... نے کوچوان سے ریل بازار کی طرف چلنے کو کہا۔ میں ...لے ہاتھوں فوٹو والے معاملے کو بھی نمٹا لینا چاہتا تھا۔

''تصویر محل'' فوٹوگرافر کی دکان تلاش کرنے میں ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہ دکان مین ریل بازار ہی میں تھی۔ ''تصویر محل'' کے مالک خورشید بزمی نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ اس کی شکل اس دور کے ایک فلمی ہیرو سے بہت ملتی تھی۔ خورشید بزمی ایک خوش پوش اور نفیس انسان تھا۔

اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی پھر مجھ سے وہ فوٹو لے کر اپنے رجسٹر میں کچھ چیک کرنے لگا۔ اس کے انہماک سے سنجیدگی جھلکتی تھی۔

مذکورہ فوٹو کے پیچھے ''تصویر محل'' فوٹوگرافر کی مہر ثبت تھی اور لگ بھگ ایک سال پہلے کی تاریخ بھی درج تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق خورشید بزمی اسی تاریخ کی مدد سے اپنے رجسٹر میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ تین چار منٹ کے بعد میرا یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔

خورشید بزمی نے گردن اٹھا کر میری جانب دیکھا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''جناب! تصویر میں نظر آنے والے ان دونوں افراد کو میں ذاتی طور پر تو نہیں جانتا اور نہ ہی ان کے ناموں کے حوالے سے وثوق کے ساتھ کچھ کہہ سکتا ہوں البتہ ان کے بارے میں میرے رجسٹر میں صرف اتنی سی معلومات درج ہیں..... اصغر علی۔ محلہ کنگنی والا!''

''ہوں.....!'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

خورشید بزمی نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''سر! آخر معاملہ کیا ہے..... کوئی خطرناک بات تو نہیں؟''

''خطرناک بات ہے بھی اور نہیں بھی.....!'' میں نے تصویر کی پشت پر ''اصغر علی، محلہ کنگنی والا'' کے الفاظ درج کرتے ہوئے کہا۔ ''آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا ہے.....!''

''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس معاملے کے بارے میں کچھ پوچھ سکتا ہوں؟'' وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

''کوئی اعتراض نہیں ہے بزمی صاحب!'' میں نے

تصویر اس کے سامنے رکھتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔
وہ پوری طرح میری جانب متوجہ ہوگیا۔
میں نے سلیم کے چہرے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''اس بندے کا نام سلیم ہے۔ یہ وزیر آباد کا رہنے والا ہے اور ادھر انڈسٹریل ایریا کی ایک ٹیکسٹائل ملز میں کام کرتا ہے۔ اس نے شریف پورہ کے ایک گھر میں رہائش اختیار کر رکھی ہے جبکہ......'' میں نے تھوڑی دیر کے لیے رک کر ایک ٹھنڈی سانس خارج کی اور بات کو آگے بڑھانے کے لیے ڈاڑھی والے جوان کے چہرے پر انگلی رکھ دی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اس بندے کے بارے میں پتا چلا ہے کہ یہ سلیم کا گہرا دوست ہے اور ادھر گوجرانوالہ ہی کا رہنے والا ہے اور...... خطرناک بات یہ ہے کہ سلیم پچھلے جمعے کی دوپہر سے غائب ہے۔''

''اوہ......!'' خورشید بزمی نے متاسفانہ انداز میں ہونٹ سکیڑے اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''یہ تو واقعی خاصا تشویش ناک معاملہ ہے۔''

''میں اس وقت سلیم کی تلاش میں نکلا ہوا ہوں۔'' میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میری معلومات کے مطابق وہ گوجرانوالہ ہی میں کہیں غائب ہوا ہے۔ اگر میں کسی طرح اس ڈاڑھی والے بندے تک رسائی حاصل کراؤں تو مجھے یقین ہے، سلیم کا سراغ بھی مل جائے گا۔''

''جب کوئی ہمارے پاس تصویر بنوانے آتا ہے تو میں رجسٹر میں اس کا نام، تاریخ اور پتا ضرور نوٹ کرلیتا ہوں۔'' خورشید بزمی نے بتایا۔ ''اس سے مجھے بہت آسانی رہتی ہے۔ اگر کوئی گاہک اپنی وہی تصویر دوبارہ بنوانا چاہے تو سیریل نمبر کی مدد سے میں فوراً اس کا نیگیٹو ڈھونڈ لیتا ہوں۔''

''آپ کی یہ احتیاط اور پیشہ ورانہ ذمے داری اس وقت کام آرہی ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر میں غلطی پر نہیں تو ڈاڑھی والے اس جوان کا نام اصغر علی ہونا چاہیے اور اس کی رہائش یقینی طور پر کنگنی والا میں ہوگی؟''

''سر! میری دعا ہے کہ آپ کا اندازہ سو فیصد درست ہو۔'' خورشید بزمی خلوصِ دل سے بولا۔ ''اس طرح آپ کو اصغر علی تک پہنچنے میں زیادہ مشکل نہیں ہوگی۔ محلہ کنگنی والا کوئی زیادہ بڑا محلہ نہیں ہے۔''

''میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں بزمی صاحب!'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کنگنی والا میرا اپنی طرح دیکھا بھالا ہوا ہے۔ میں صبح ہی ادھر کا رخ کروں گا۔ آگے جو اللہ کی مرضی......!''

''اللہ نے چاہا تو آپ کو ضرور کامیابی ملے گی سر......!'' فوٹوگرافر نے پورے یقین سے کہا۔ ''میں آپ کے اور سلیم کے حق میں دعا کروں گا۔''

میں نے خورشید بزمی کا شکریہ ادا کیا اور اس کی دکان سے نکل آیا۔ جب ہمارا تانگا تھانہ صدر پہنچا تو اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔

☆☆☆

وہ بیس جنوری کی ایک ٹھنڈی ٹھار اور یخ بستہ رات تھی۔ میں گرم لحاف کے اندر دبکا آج دن بھر کی مصروفیات پر غور کررہا تھا۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ آج کا دن صرف اور صرف گمشدہ سلیم کا سراغ لگانے میں گزرا تھا۔ میں اس تک رسائی حاصل کرنے میں تو کامیاب نہیں ہوا تھا تاہم اس سلسلے میں چند اہم پیش رفت ہوچکی تھیں۔ مجھے امید تھی کہ کل معاملہ کسی نتیجہ خیز مرحلے میں داخل ہوجائے گا۔

میں نے ہمیشہ دو چیزوں پر بھروسا کیا ہے۔ نمبر ایک، قدرت کی حمایت اور مدد۔ نمبر دو، اپنی محنت۔ کسی بھی کیس کی تفتیش کے دوران میں، میں خلوص نیت کے ساتھ جی جان سے محنت اور کوشش کرتا ہوں اور نتائج کو اللہ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ میرے پروردگار نے آج تک مجھے کسی بھی محاذ پر شرمندہ یا ناکام نہیں کیا۔ میں قدرت کی اس نوازش اور عطا پر جتنا بھی شکر ادا کروں، کم ہے۔

جب تک فوٹوگرافر خورشید بزمی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، میرا پروگرام یہی تھا کہ صبح سب سے پہلے میں صفدر کے کارخانے جا کر اس سے ملاقات کروں گا مگر اب میں نے کل کے پروگرام میں تھوڑی تبدیلی کرلی تھی۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ تصویر میں سلیم کے ساتھ موجود ڈاڑھی والے بندے کا نام اصغر علی ہوگا اور وہ کنگنی والا میں رہتا ہوگا۔

موضع کنگنی والا میرے تھانے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اگر تھانے سے، جی ٹی روڈ پر سیدھے لاہور کی سمت جائیں تو کنگنی والا ایک، ڈیڑھ میل کے فاصلے پر پڑتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو سڑک کی دونوں جانب آباد تھا۔ میں نے اگلی صبح پہلے اصغر علی کو چیک کرنے کا فیصلہ کیا اور خود کو نیند کی وادی میں اتار دیا۔

جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے، قدرت کی چھوٹی

سے چھوٹی جنبش بھی مصلحت سے خالی نہیں ہوتی۔ اگلی صبح میں تیار ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا تو پتا چلا کوئی پہلے سے میرے انتظار میں بیٹھا ہوا ہے۔

میں نے اطلاع دینے والے کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''کون ہے......؟''

''جناب! ایک چھوٹے قد کا دبلا پتلا بندہ ہے۔'' کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ''اپنا نام صفدر بتایا ہے اس نے۔ وہ آپ سے ملنے آیا ہے۔''

''صفدر......!'' بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ ''اسے فوراً اندر بھیجو۔''

''صفدر'' کے نام پر میرے ذہن میں روشنی کا ایک تیز جھماکا ہوا تھا اور میرے دل نے گواہی دی تھی کہ یہ وہی صفدر ہوگا جو گمشدہ سلیم کا ہانڈی وال اور بیوہ اللہ رکھی کا کرائے دار تھا جبھی میں نے اسے فوراً اپنے پاس بلالیا تھا۔ کانسٹیبل نے اس کا نام بتانے کے ساتھ یہ بھی اضافہ کیا تھا کہ وہ چھوٹے قد کا دبلا پتلا بندہ ہے۔

کل برتنوں والے کارخانے میں جب میری ملاقات شفٹ انچارج عنایت شاہ سے ہوئی تھی تو اس نے بھی صفدر کی پستہ قامتی کا ذکر کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی عنایت شاہ نے اسے ''جن'' کا خطاب بھی دیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد صفدر نامی وہ بندہ میرے سامنے موجود تھا۔ میں نے کانسٹیبل کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے صفدر کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بڑی فرماں برداری سے میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

صفدر کی عمر پچیس سے تیس سال کے درمیان رہی ہوگی تاہم وہ قد کاٹھ کے اعتبار سے بیس سے زیادہ کا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے چند لمحات تک گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو تم وہی صفدر ہو جو سلیم کے ساتھ اللہ رکھی کے مکان میں کرائے پر رہتا ہے......؟''

''جی...... جی ہاں۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کل اللہ رکھی کے گھر آئے تھے اور کارخانے جا کر بھی میرے بارے میں پوچھا تھا۔''

''تم نہ تو گھر پر ملے اور نہ ہی کارخانے میں۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''عنایت شاہ نے مجھے بتایا تھا کہ تم دوپہر کے بعد کسی ضروری کام کا بتا کر کارخانے سے چلے گئے تھے۔ ایسا کون سا کام پڑ گیا تھا تمہیں...... یہ بھی بتاؤ کہ تم گئے کہاں تھے؟''

میرے تابڑ توڑ سوالات سے وہ گھبرا گیا پھر جلدی سے سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''جناب! آپ میری نیت پر شک نہ کریں۔ میں دراصل...... سلیم کی تلاش میں نکلا ہوا تھا......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اللہ رکھی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ سلیم کی تلاش میں اس کے گھر پوچھ گچھ کرنے گئے تھے اور جب میں گھر میں نہیں ملا تو آپ نے اللہ رکھی سے میرے کارخانے کے بارے میں پوچھا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ آپ کل دوبارہ...... یعنی آج میرے پاس آئیں گے۔ میں نے سوچا کہ خود ہی آپ کے پاس آجاتا ہوں۔ میں آج کارخانے بھی نہیں گیا اور سیدھا آپ سے ملنے آگیا ہوں۔''

''یہ تو تم نے بہت نیکی کا کام کیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر تم نہیں آتے تو میں ضرور تمہاری گردن دبوچنے شریف پورہ پہنچ جاتا۔''

''تھانیدار صاحب! میں سلیم کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آپ بھی اسی کو تلاش کر رہے ہیں۔ اس کا کچھ پتا چلا؟''

وہ سلیم کے حوالے سے الٹا مجھ سے مستفسر ہوا تو میں نے کہا۔ ''تم سلیم کے لیے کب سے پریشان ہو؟''

پریشانی اور فکرمندی اگرچہ اس کے چہرے سے مترشح تھی تاہم میں پھر بھی اسے گھیرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ میرے تند سوال کے جواب میں بولا۔

''پریشان تو میں پچھلے دو تین دن سے ہوں تھانیدار صاحب۔ وہ پیر کو واپس آنے کا کہہ کر اپنے گھر وزیرآباد گیا تھا مگر ابھی تک واپس نہیں آیا۔ کل میں اسی کی تلاش میں نکلا تھا۔''

''سلیم نہ تو اپنے گھر پہنچا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی پتا چل رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم اس کو ڈھونڈنے کہاں گئے تھے؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دیکھو......'' پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تنبیہی انداز میں اضافہ کیا۔ ''اگر تم نے مجھے کوئی چکر دینے کی کوشش کی تو یہ تمہارے حق میں بالکل اچھا نہیں ہوگا۔ سلیم کی گمشدگی کے حوالے سے مشکوک افراد کی فہرست میں تمہارا نام سب سے اوپر ہے۔ اگر تمہاری کوئی غلط بیانی میری پکڑ میں آگئی تو سیدھے جیل جاؤ گے......''

''تھانیدار جی...... سلیم میرا جگری یار ہے اور میں چاہتا ہوں، جلد از جلد اس کا پتا چل جائے۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''اس لیے آپ سے کسی جھوٹ اور فریب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ خوامخواہ میری نیت پر شک نہ کریں۔''

"نیت کا احوال صرف اللہ جانتا ہے اور پولیس کا کام شک کیے بغیر چلتا نہیں......" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "لہٰذا میں تمہاری ذات کو اس وقت تک شک کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہوں جب تک سلیم کا سراغ نہیں مل جاتا اور...... تم اس کی گمشدگی میں کسی بھی طور ملوث نہیں پائے جاتے......تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟"

"جی...... بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" وہ گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "آپ بے فکر ہو جائیں۔ ہر معاملے میں آپ کو میرے ہاتھ صاف ہی نظر آئیں گے۔"

اس کی بات وزن سے خالی نہیں تھی اور چہرے کے تاثرات سے بھی یہی لگتا تھا کہ وہ کسی قسم کی دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا تاہم مجھے تفتیشی عمل کو بھی مکمل کرنا تھا۔ میں نے چند لمحات تک اسے سوچتی ہوئی نظر سے دیکھنے کے بعد گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

"میرے بے فکر ہونے سے کام نہیں چلے گا صفدر۔ سلیم کو حسب پروگرام پیر کی صبح گوجرانوالہ پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن تین دن گزر جانے کے باوجود بھی وہ واپس نہیں آیا۔ تم اتنے دن تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے کیا کر رہے تھے۔ تمہیں کل ہی اس کی تلاش کا خیال کیوں آیا؟"

"جناب! وہ منگنی کرانے اپنے گھر وزیر آباد گیا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ایسے کاموں میں ایک آدھ دن کی دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ پیر اور منگل کے دن تو میں اس کی طرف سے زیادہ پریشان نہیں تھا۔ بدھ کو مجھے تشویش ہوئی کہ وہ کہاں رہ گیا ہے پھر کل صبح جمعرات کو میں اسے ڈھونڈنے نکلا تھا۔"

"کہاں...... تم سلیم کی تلاش میں کس طرف گئے تھے؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"پہلے میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ میں وزیر آباد جا کر اس کے بارے میں پتا کروں۔" اس نے بتایا۔ "لیکن یہ کام کسی چھٹی کے دن ہی ہو سکتا تھا چنانچہ پہلے میں نے اسے گوجرانوالہ ہی میں تلاش کرنے کا سوچا اور کل دوپہر میں کارخانے سے چھٹی کرنے کے بعد میں گوشی کے پاس چلا گیا تھا۔"

"گوشی...... یہ کون ہے؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"گوشی، سلیم کا دوست ہے جی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ادھر ہی زیبائش ملز میں کام کرتا ہے۔"

"زیبائش ملز" ایک ٹیکسٹائل فیکٹری تھی جہاں پر اعلیٰ درجے کا ریشمی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ یہ "زیبائش ملز" میرے تھانے اور کنگنی والا کے درمیان جی ٹی روڈ کے کنارے واقع تھی۔ سلیم بھی ایک ٹیکسٹائل ملز ہی میں کام کرتا تھا لہٰذا ان کی دوستی سمجھ میں آتی تھی۔ گوشی کے نام سے مجھے سلیم تک پہنچنے کا ایک نیا لنک مل گیا تھا۔

"کیا گوشی بھی وزیر آباد ہی کا رہنے والا ہے؟" ایک فوری خیال کے تحت میں نے سوال کیا۔

"نہیں جی......" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "گوشی کا گھر کارخانے کے نزدیک ہی ایک محلے میں ہے۔"

"کون سے محلے میں؟" میں نے پوچھا۔

اس علاقے میں جی ٹی روڈ کی دونوں جانب مختلف کارخانے اور فیکٹریاں تھیں جن کے عقبی حصے میں کہیں کہیں رہائشی آبادیاں بھی تھیں جو چھوٹے چھوٹے محلوں کی صورت میں تھیں۔ صفدر نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

"وہ کنگنی والا میں رہتا ہے جی......!"

صفدر کے جواب نے مجھے ایک بار پھر چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے پوچھا۔ "اس...... گوشی کا اصل نام کیا ہے؟"

میرا دھیان آپوں آپ اصغر علی کی طرف چلا گیا تھا۔ فوٹوگرافر خورشید بزمی نے سلیم کے ساتھی دوست کا نام اصغر علی بتایا تھا، جو کنگنی والا کا رہنے والا تھا۔ صفدر نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

"مجھے اس کے اصلی نام کا تو پتا نہیں جناب۔ بس، میں اسے گوشی کے نام ہی سے جانتا ہوں......"

"زیبائش ملز میں گوشی سے تمہاری ملاقات ہوئی؟" میں نے استفساریہ نظر سے اسے دیکھا۔ "وہ سلیم کے بارے میں کیا بتاتا ہے؟"

"گوشی سے میری ملاقات نہیں ہو سکی۔" وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ کل فیکٹری آیا ہی نہیں تھا۔ وہاں سے مجھے پتا چلا کہ اسے بخار ہے۔"

"تو تمہیں اس کے گھر عیادت کے لیے جانا چاہیے تھا۔" میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ "کنگنی والا زیبائش ملز سے زیادہ دور تو نہیں......"

"بات دور اور نزدیک کی نہیں تھانیدار صاحب۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ سلیم کے دوست گوشی کا گھر کنگنی والا میں ہے لیکن میں نے اس کا گھر نہیں دیکھا۔ گھر کیا...... میں نے تو گوشی کو بھی نہیں دیکھا۔"

"کیا......؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ صفدر کی بات سن کر میں اچھل پڑا تھا۔

''جی...... میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' وہ میری حیرت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بڑی معصومیت سے بولا۔ ''بس، سلیم کی زبان سے اس کا تذکرہ ہی سنا ہے۔ سلیم پہلے زیبائش ملز میں کام کرتا تھا۔ پھر ایک سال پہلے جب اسے وہاں سے نکال دیا گیا تو وہ اس فیکٹری میں آ گیا تھا جہاں ابھی کام کرتا ہے۔ گوشی اسی زمانے میں سلیم کا دوست بنا تھا۔ سلیم اکثر اس کا ذکر کرتا رہتا تھا لیکن میری کبھی گوشی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں اسی لیے کل گوشی سے ملنے آیا تھا کہ شاید اسے سلیم کے بارے میں کچھ پتا ہو مگر گوشی کل فیکٹری آیا ہی نہیں......''

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا عجیب اتفاق ہے کہ تم نے ابھی تک گوشی کی شکل بھی نہیں دیکھی......'' میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھہرو...... میں تمہیں گوشی کی شکل دکھاتا ہوں۔''

''جی...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں......'' وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے تکنے لگا۔ ''کیا آپ نے گوشی کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر رکھا ہے؟''

''ایسا ہی سمجھ لو......'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا اور میز کی دراز کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

دراصل، میں صفدر کو وہ فوٹو دکھانا چاہتا تھا جس میں گمشدہ سلیم اپنے ایک ڈاڑھی والے دوست کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ ابھی تک اس ڈاڑھی والے جوان کا نام نہیں معلوم ہو سکا تھا تاہم ''تصویر محل'' اسٹوڈیو کے مالک خورشید بزمی کے مطابق تصویر بنواتے وقت ایک سال پہلے رجسٹر میں اصغر علی، کنگنی والا لکھوایا گیا تھا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ سلیم کا ڈاڑھی والا دوست ہی ''اصغر علی آف کنگنی والا'' ہوگا۔ اب صفدر نے بتایا تھا کہ سلیم کا گوشی نامی کوئی دوست کنگنی والا میں رہتا تھا۔ گوشی کوئی باقاعدہ نام نہیں۔ عین ممکن تھا کہ اصغر علی کا نک نیم گوشی ہی ہو۔

میں نے مذکورہ تصویر میز کی دراز میں سے نکال کر صفدر کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم ان دونوں کو پہچانتے ہو؟''

''یہ تو سلیم ہے جناب......'' وہ تصویر پر نگاہ پڑتے ہی بول اٹھا۔ ''اور...... اور اس کے ساتھ جو دوسرا بندہ ہے، میں اسے نہیں جانتا...... کون ہے یہ؟''

''گوشی......!'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''جس سے ملاقات کرنے تم کل زیبائش ملز گئے تھے مگر وہ بخار کی وجہ سے کام پر نہیں گیا تھا۔''

''اچھا جی، تو یہ ہے گوشی......!'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اس بندے کو کبھی نہیں دیکھا اس لیے کیا کہہ سکتا ہوں جناب!''

''تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں صفدر۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''اب جو بھی کہنا ہے، یہ گوشی ہی کہے گا۔''

''کیا مطلب جی......؟'' اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

''تم نے اس بندے کو کبھی نہیں دیکھا نا......'' میں نے صفدر کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی تمہیں اپنے ساتھ زیبائش ملز لے کر جا رہا ہوں۔ جسے تم گوشی کہہ رہے ہو نا، اس کا اصل نام اصغر علی ہے۔''

''اچھا جی......!'' اس کی حیرت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ ''کیا آپ اس بندے سے مل چکے ہیں؟''

''ملا تو نہیں...... لیکن ابھی ملنے جا رہا ہوں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''اور گوشی...... میرا مطلب ہے، اصغر علی آج بھی کام پر نہ آیا ہوا تو......؟'' اس نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا تو میں نے جواب دیا۔

''تو کوئی بات نہیں...... ہم زیبائش ملز سے سیدھے کنگنی والا اس کے گھر جائیں گے اور اس سے پوچھیں گے کہ وہ سلیم کی گمشدگی کے بارے میں کیا جانتا ہے۔''

''ہاں جی......'' اس نے بڑی شدومد سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''یہ ٹھیک ہے۔''

یہ میرا اندازہ تھا کہ تصویر میں موجود ڈاڑھی والا وہ بندہ اصغر علی یا گوشی ہوگا لیکن یہ کوئی حتمی یا یقینی بات نہیں تھی۔ عین ممکن تھا کہ گوشی کوئی اور شخص ہو، اصغر علی کوئی اور...... فوٹو والا سلیم کا دوست کوئی اور۔

ویسے ایک بات تھی کہ میں نے جتنے وثوق کے ساتھ صفدر کے سامنے اصغر علی اور گوشی کا ذکر کیا تھا، اس سے اس کے ذہن میں یہ بیٹھ گیا تھا کہ گوشی ہی کا اصل نام اصغر علی ہوگا۔ اس کی سنجیدگی اور بے ساختگی کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ وہ سلیم کی گمشدگی میں کسی بھی طور ملوث نہیں تھا اور یہ کہ اس کی پہلی خواہش یہی تھی کہ میں جلد از جلد سلیم کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ وہ اپنے دوست کو دیکھنے کے لیے بڑا بے تاب دکھائی دیتا تھا۔

انسان کے سوچنے پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہے اور یہ

بھی کہ انسان اپنے دل میں کسی بھی نوعیت کی خواہش کو پال سکتا ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ خواہش پوری بھی ہو پاتی ہے یا نہیں۔ ان لمحات میں صفدر کی طرح میری بھی شدید خواہش تھی کہ میں پہلی فرصت میں سلیم تک رسائی حاصل کرلوں۔

یہ ایک میری اور صفدر ہی کی تمنا نہیں تھی بلکہ ادھر وزیر آباد میں سلیم کے گھر والے بھی یہی آس لگائے بیٹھے تھے کہ میں ان کے جوان جہان بیٹے کو ڈھونڈ نکالوں گا اور میں دل ہی دل میں اپنے پروردگار سے دعا کررہا تھا کہ سلیم جہاں بھی ہو، صحیح اور زندہ سلامت ہو۔

☆☆☆

میرا تھانہ جی ٹی روڈ پر شیخوپورہ موڑ کے قریب واقع تھا۔ یہ جی ٹی روڈ لاہور سے راولپنڈی کی طرف جاتا تھا بلکہ اب بھی جاتا ہے اگرچہ آج کل جدید نوعیت کی سڑکیں یعنی ''موٹروے'' بڑے احسن طریقے سے کام کررہی ہیں مگر جی ٹی روڈ (جنرل ٹرنک روڈ) کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ میں نے شیخوپورہ موڑ کا ذکر کیا ہے۔ دراصل اس موڑ پر، جی ٹی روڈ سے ایک سڑک نکل کر شیخوپورہ اور فیصل آباد کی طرف جاتی تھی۔ واضح رہے کہ شیخوپورہ اس زمانے میں ''قلعہ شیخوپورہ'' اور فیصل آباد ''لائل پور'' ہوا کرتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان ہی نہیں، جگہوں کے نام اور مقام بھی بدل جاتے ہیں۔

میں اس وقت صفدر کے ساتھ ایک تانگے پر سوار ہوکر تھانے سے ''زیبائش ملز'' کی طرف جارہا تھا۔ حوالدار یا کسی اور پولیس اہلکار کو میں نے ساتھ لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس تفتیشی کارروائی کے لیے میں اکیلا ہی کافی تھا۔

تھانے سے زیبائش ملز لگ بھگ ایک میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، جی ٹی روڈ کی دونوں جانب مختلف نوعیت کے کارخانے وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ تھانے سے جنوب کی سمت یعنی لاہور کی طرف جاتے ہوئے زیبائش ملز دائیں ہاتھ پر پڑتی تھی۔ ہم جلد ہی زیبائش ملز پہنچ گئے۔

زیبائش ملز ایک ٹیکسٹائل ملز تھی جس کے اندر کپڑا بننے والی مشینوں (پاور لومز) کی مخصوص ''کھٹا کھٹ'' گونج رہی تھی۔ میں فیکٹری کے دفتر میں داخل ہوگیا جہاں فیکٹری کے منشی قادر خان نے میرا استقبال کیا۔ میرے ساتھ صفدر کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے چونکا ضرور تھا تاہم اس سلسلے میں اس نے کوئی بات نہیں کی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد قادر خان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''حکم کریں سرکار! میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''میں آپ کے پاس خدمت کرانے نہیں آیا خان صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کے پاس گوشی نام کا کوئی بندہ کام کرتا ہے جس کا گھر گنگنی والا میں ہے...... میں اس گوشی سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''گوشی اس فیکٹری میں کام تو کرتا ہے جناب......'' وہ مجھ سے مخاطب تھا لیکن اس دوران میں وہ وقفے وقفے سے صفدر کو بھی دیکھتا جارہا تھا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کررہا ہو۔ ''لیکن اس وقت گوشی سے آپ کی ملاقات نہیں ہوسکتی۔ وہ دو دن سے فیکٹری نہیں آرہا۔ اسے بخار نے پکڑ رکھا ہے۔''

''ٹھیک ہے، تو پھر اس سے ملنے کے لیے مجھے گنگنی والا کا رخ کرنا پڑے گا۔''

''جی ضرور...... کیوں نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں یہاں سے کسی کو آپ کے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔ ویسے بات کیا ہے تھانیدار صاحب۔ آپ کس سلسلے میں گوشی سے ملنا چاہتے ہیں......؟''

میں نے اس کے سوال کو سردست نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو آپ کسی کو میرے ساتھ بھیجیں گے ہی لیکن اس سے پہلے ایک تصدیق ضروری ہے۔''

میں نے قادر خان کے سوال کا جواب نہ دے کر اس کی تشویش میں اضافہ کردیا تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے بولا۔

''کیسی تصدیق تھانیدار صاحب......؟''

میں نے اپنی جیب میں سے ''تصویر محل'' کی تیار کردہ تصویر نکال کر منشی قادر خان کے سامنے رکھ دی اور گمبھیر انداز میں سوال کیا۔

''کیا آپ ان بندوں کو جانتے ہیں؟''

''کیوں نہیں جناب......'' وہ تصویر پر نظر پڑتے ہی بڑے وثوق سے بولا۔ ''ان میں سے ڈاڑھی والا تو گوشی ہے اور دوسرا سلیم ہے۔''

''آپ سلیم کو کس حوالے سے جانتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

صفدر کی زبانی مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ سلیم نے کچھ عرصہ پہلے زیبائش ملز میں کام کیا تھا پھر اسے اس فیکٹری سے نکال دیا گیا تھا لیکن میں یہی حقیقت قادر خان کی زبان سے بھی سننا چاہتا تھا اسی لیے سلیم کے حوالے سے میں نے اس سے سوال کیا تھا۔

''سلیم سال، ڈیڑھ سال پہلے اسی فیکٹری میں کام

کرتا تھا۔'' قادر خان نے جواب دیا۔ ''گوشی کے ساتھ اس کی گہری دوستی تھی۔''

''پھر سلیم کو اس فیکٹری سے نکال دیا گیا تھا......؟''

''میرا خیال ہے، اسے نکالا نہیں گیا تھا بلکہ اس نے خود کام چھوڑا تھا۔'' منشی جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ''اسے انڈسٹریل ایریا کی کسی فیکٹری میں زیادہ اچھی نوکری مل گئی تھی۔''

یہاں پر تضاد پیدا ہو گیا تھا۔ سلیم نے صفدر کو اور صفدر نے مجھے بتایا تھا کہ سلیم کو زیبائش ملز سے نکالا گیا تھا جبکہ منشی قادر خان کا بیان تھا کہ وہ خود چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے سرِ دست اس معاملے میں الجھنا مناسب نہ سمجھا اور منشی سے پوچھا۔

''قادر خان! کیا گوشی کا اصل نام اصغر علی ہے؟''

''جی ہاں...... بالکل، اس کا نام اصغر علی ہی ہے۔''

اس نے جواب دیا پھر صفدر کی طرف دیکھتے ہوئے چونک کر مستفسر ہوا۔ ''تم گوشی کا پوچھنے کل بھی ادھر آئے تھے نا۔ میں نے تمہیں فیکٹری میں دیکھا تھا۔''

گویا، منشی کافی دیر سے جو بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا وہ اس کے ذہن میں نمایاں ہو گئی تھی۔ صفدر نے اس کے سوال کے جواب میں سر کو اثباتی جنبش دی تو وہ شاکی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تھانیدار صاحب! آپ نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔''

''کون سا سوال؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے پوچھا تھا، آپ گوشی سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''گوشی، سلیم کا گہرا دوست ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور سلیم پچھلے جمعے سے غائب ہے۔''

''اوہ......'' اس نے گہری سانس خارج کی۔ ''یہ تو بہت ہی تشویش ناک بات ہے۔''

''تشویش ناک بات ہے جبھی تو میں سلیم کو تلاش کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے سلیم کے تازہ ترین حالات سے آگاہ کر دیا۔

اس نے گہری سنجیدگی اور توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔

''سلیم کی گمشدگی کا سن کر بہت افسوس ہوا ہے تھانیدار صاحب۔ میں آپ کے ساتھ کسی کو بھیج دیتا ہوں۔ وہ آپ کو گوشی کے گھر تک پہنچا دے گا۔ ممکن ہے، گوشی کو سلیم کے بارے میں کوئی ایسی بات پتا ہو جس سے آپ کا کام آسان ہو جائے۔''

''یہ آپ کی مہربانی ہوگی۔'' میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ ''اور یہ بھی بتائیں کہ کیا پچھلے جمعے کو سلیم، گوشی سے ملنے یہاں آیا تھا؟''

''نہیں جناب......!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ جب سے اس فیکٹری کی نوکری چھوڑ کر گیا ہے، میں نے اسے نہیں دیکھا......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ممکن ہے، سلیم اور گوشی فیکٹری کے باہر کہیں ملتے ہوں، مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔''

''میں خود ہی پتا کر لوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تھانیدار صاحب! آپ نے تو کسی خدمت کا موقع ہی نہیں دیا۔'' منشی قادر بڑی اپنایت سے بولا۔ ''اگر آپ تھوڑی دیر رک جائیں تو میں آپ کے لیے مولوی کے کھوکھے سے گرما گرم کھانا منگواتا ہوں۔''

''اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں قادر خان!'' میں نے کہا۔ ''پہلے کام، پھر طعام...... میں سلیم والے معاملے کو نمٹا دوں۔ اس کے بعد بھی آپ کے پاس کھانا کھانے بھی آ جاؤں گا۔''

''وعدہ کریں......!'' وہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گیا۔

اس کے اخلاص اور اپنایت کے پیشِ نظر میں نے آئندہ اس کے پاس آنے اور کھانا کھانے کا وعدہ کر لیا پھر زیبائش ملز سے نکل آیا۔

میں نے صبح خاصا تگڑا ناشتا کیا تھا اور دوپہر کے کھانے یعنی لنچ میں ابھی کافی وقت باقی تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ قادر خان نے جب ''مولوی کے کھوکھے'' کے کھانے کا ذکر کیا تو بھوک کا احساس ہونے لگا تھا۔ ''مولوی کا کھوکھا'' درحقیقت ایک ایسا ہوٹل تھا جہاں کھانا، چائے، سگریٹ اور کھانے پینے کی دیگر اشیا مثلاً کولڈ ڈرنکس، دودھ، دہی، لسی اور بسکٹ وغیرہ بھی بہ آسانی دستیاب تھے۔ مولوی صاحب جب زیادہ ترنگ میں ہوتے تو پکوڑے اور جلیبی وغیرہ بھی تیار کر لیا کرتے تھے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم تانگے میں بیٹھ کر کنگنی والا پہنچ گئے۔ گوشی کا گھر کنگنی والا کے مغربی حصے میں واقع تھا۔ کنگنی والا کے مشرقی اور مغربی حصے کے درمیان جی ٹی روڈ رواں دواں تھی۔ تانگا سڑک سے نیچے اترا اور ہمارے

ساتھ آنے والے ''گائیڈ'' کی راہنمائی میں گورنمنٹ پرائمری اسکول کے عقب میں ایک گھر کے سامنے جاکر ٹھہر گیا۔ گائیڈ کے مطابق یہ گوشی کا گھر تھا۔ میں نے گائیڈ کو واپس جانے کی اجازت دے دی اور گوشی کے گھر کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

گاؤں دیہات اور چھوٹے علاقوں کی ایک مخصوص نفسیات ہوتی ہے۔ اگر یہاں پولیس کا ایک بندہ بھی کسی کا پوچھنے آجائے تو ایک عجیب سی سنسنی پھیل جاتی ہے۔ یوں ہی محسوس ہوتا ہے، کوئی بہت بڑا واقعہ ہوگیا ہے۔ لوگ جمع ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ جب تک دروازہ کھلا، گلی میں درجن بھر افراد اکٹھا ہو چکے تھے۔

دروازہ گوشی ہی نے کھولا تھا۔ میں پچھلے چوبیس گھنٹوں میں گوشی کو...... یعنی اس کی تصویر کو اتنی مرتبہ دیکھ چکا تھا کہ جیسے ہی وہ دروازے پر آیا، میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔

ہم پر نظر پڑتے ہی وہ چونک اٹھا۔ میں پولیس کی یونیفارم میں ملبوس تھا۔ میں اور صفدر دونوں اس کے لیے اجنبی تھے تاہم اس کے چونکنے کا سبب یقیناً میری وردی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات دکھائی دے رہے تھے۔

''گوشی ...... تمہاری طبیعت کیسی ہے؟'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''بخار اترا یا نہیں......؟''

میرے پوچھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں اس کی عیادت کرنے آیا ہوں لیکن وہ میری وردی کی وجہ سے خاصا بدکا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ بولا تو اس کی آواز بھی کپکپائی ہوئی تھی۔

''آپ......!''

''گوشی پتر! باہر کون ہے؟'' گوشی کے عقب میں ایک نسوانی استفسار بلند ہوا۔ ظاہر ہے، یہ اس کے گھر کی ہی کوئی عورت رہی ہوگی۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں گوشی۔'' میں نے اس کے خوف کو دور کرنے کی غرض سے کہا۔ ''میں اس علاقے کا تھانیدار ملک صفدر حیات ہوں اور تم سے چند ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔ کیا تمہارے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ ہے......؟''

اس سے پہلے کہ گوشی میری بات کے جواب میں کچھ کہتا، وہ عورت سامنے آگئی پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ہائے ربا...... پولیس......!''

اس ادھیڑ عمر عورت نے گوشی کو ''گوشی پتر'' کہہ کر مخاطب کیا تھا جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ گوشی کی ماں ہوگی۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں ان ماں بیٹے پر صورتِ حال واضح کی پھر کہا۔

''ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ معمول کی کارروائی ہے۔''

میری بات ان کی سمجھ میں آگئی لہٰذا میں اور صفدر گھر کے اندر پہنچ گئے۔ گوشی کی ماں کا نام رضیہ بی بی معلوم ہوا۔ رضیہ نے ہمیں گھر کی بیٹھک میں بٹھایا اور گھر کے اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔ گوشی کا باپ محمد حسین کام پر گیا ہوا تھا۔ وہ مٹی کے برتن بنانے والی ایک فیکٹری ''حجاز پاٹری'' میں کام کرتا تھا۔ حجاز پاٹری بھی جی ٹی روڈ پر ہی واقع تھی۔

گوشی اپنے والدین کی اکلوتی زندہ اولاد تھا۔ اس سے پہلے اس کے چار بھائی بہن پیدائش کے فوراً بعد انتقال کر گئے تھے اور گوشی کے بعد کوئی مزید پیدا نہیں ہوا تھا۔ اصغر علی گوشی اس وقت میرے پاس ہی موجود تھا۔ میں نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''تمہاری طبیعت تو اس وقت ٹھیک ہی لگ رہی ہے، پھر تم آج کام پر کیوں نہیں گئے؟''

''میں تو جانا چاہ رہا تھا لیکن اماں نے نہیں جانے دیا۔'' اس نے بتایا۔ ''کہتی ہے، ایک دن اور آرام کرلو......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''بخار تو اتر گیا ہے...... بس کمزوری باقی ہے۔''

''گوشی! یہ تو میں نے تمہیں بتادیا ہے کہ میں سلیم کے سلسلے میں تم سے ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔'' میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''امید ہے، تم میرے ساتھ پورا تعاون کروگے۔''

''سلیم کو ہوا کیا ہے جی......!'' وہ تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ابھی تک گوشی کو سلیم کی گمشدگی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''پچھلے جمعے کے روز سلیم نے دوپہر کے بعد فیکٹری سے چھٹی کی اور اپنے گھر وزیر آباد روانہ ہوگیا۔ وہ گھر نہیں پہنچا اور...... اور ابھی تک لاپتا ہے۔''

''کیا......!'' میرے انکشاف نے اسے اچھلنے پر مجبور کردیا۔ ''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں وہی تمہیں بتا رہا ہوں جو حقیقت ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''گوجرانوالہ میں سلیم کی

صرف دو افراد سے گہری دوستی تھی۔ ایک صفدر...... جو اس وقت تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے صفدر کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔ ''اور دوسرے تم ہو۔ صفدر، سلیم کی گمشدگی کے حوالے سے کچھ نہیں جانتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو......؟''

''میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ منگنی کرانے وزیر آباد جا رہا تھا۔'' وہ اضطراری انداز میں بولا۔ ''اور آپ کہہ رہے ہیں، وہ گھر پہنچا ہی نہیں۔''

''یہ میں نہیں کہہ رہا، سلیم کے گھر والے کہہ رہے ہیں۔'' میں نے وضاحت کرنے والے انداز میں کہا۔ ''وزیر آباد کی پولیس نے سلیم کو وہاں اچھی طرح ڈھونڈ لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے، سلیم گوجرانوالہ ہی میں کہیں غائب ہوا ہے۔ کل دوپہر سے میں سلیم کی تلاش میں گھوم رہا ہوں اور مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد تم تک پہنچا ہوں۔ مجھے امید ہے، تم پولیس کے ساتھ پورا تعاون کرو گے اور سلیم کی تلاش کے سلسلے میں مجھ سے بھرپور تعاون کرو گے۔''

''جناب! سچی بات تو یہ ہے کہ میں سلیم کی گمشدگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تو ابھی آپ سے پتا چلا ہے۔''

''تمہیں یہ تو معلوم ہے نا کہ...... وہ منگنی کرانے وزیر آباد جانے والا تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''جی...... یہ بات تو سلیم نے خود مجھے بتائی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

''سلیم سے تمہاری آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟'' میں نے اپنے سوالات میں تیزی بھرتے ہوئے استفسار کیا۔

''پچھلے جمعے کی شام کو جناب!'' گوشی نے بتایا۔

''پچھلے جمعے کی شام کو......'' میں نے اسی کے الفاظ دہرائے اور سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یعنی جس دن وہ فیکٹری سے چھٹی کر کے اپنے گاؤں کے لیے روانہ ہوا تھا؟''

''جی...... جی...... اسی دن۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''سلیم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے گھر جا رہا ہے۔''

''کیا سلیم تم سے ملنے آیا تھا یا تم اس کے پاس گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میں پچھلے جمعے کو ہونے والی تمہاری اور سلیم کی آخری ملاقات کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔''

''وہ میرے پاس آیا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے زیبائش ملز کے منشی قادر خان کے بیان کو چیک کرنے کی غرض سے پوچھ لیا۔ ''کیا تم لوگوں نے یہ ملاقات فیکٹری کے اندر کی تھی؟''

''جی نہیں......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''ہم مولوی کے کھوکھے پر بیٹھے تھے۔ چائے پی تھی اور گپ شپ کی تھی۔''

''ہوں......'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے، سلیم پہلے زیبائش ملز ہی میں کام کرتا تھا اور اسی دوران میں تمہاری دوستی ہوئی تھی۔ پھر سال، ڈیڑھ سال پہلے وہ صنعتی علاقے والی اسٹار ٹیکسٹائل ملز میں چلا گیا تھا۔''

''جی ہاں...... ایسا ہی ہوا تھا۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''زیبائش ملز چھوڑنے کے بعد بھی تم دونوں میں میل ملاقات کا سلسلہ جاری رہا تھا۔'' یہ بات میں نے اپنے طور پر کہی تھی۔ ''کبھی وہ یہاں آجاتا تھا اور کبھی تم وہاں چلے جاتے تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟''

''نہیں جی...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ میری بات کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ ''زیادہ تر وہی مجھ سے ملنے آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھار میں بھی اس کی طرف چلا جاتا تھا۔''

''ایک بات سچ سچ بتاؤ گوشی!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ''سلیم نے زیبائش ملز والی نوکری خود چھوڑی تھی یا اسے فیکٹری سے نکال دیا گیا تھا؟''

''فیکٹری والوں نے اسے جواب دیا تھا۔'' گوشی نے بڑے اعتماد کے ساتھ بتایا۔

قادر خان کے بیان کے مطابق سلیم نے اپنی مرضی سے فیکٹری چھوڑی تھی لیکن گوشی کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں گوشی سے پوچھا۔

''زیبائش ملز والوں نے سلیم کو کن وجوہات کی بنا پر فیکٹری سے نکالا تھا؟''

''مل میں دھاگے کی چوری کا ایک واقعہ پیش آیا تھا۔'' گوشی نے بتایا۔ ''اور شک سلیم پر تھا۔ جب اس نے چوری کا اقرار نہیں کیا تو اسے ملازمت سے فارغ کر دیا گیا تھا۔''

''تم کیا سمجھتے ہو......'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ''کیا سلیم واقعی دھاگے کی چوری میں ملوث تھا؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔'' وہ بڑے وثوق کے ساتھ بولا۔ ''میں اپنے دوست کو اچھی طرح جانتا ہوں۔

سلیم چور نہیں ہو سکتا۔''

''اس کا مطلب ہے، تمہاری فیکٹری کے اندر کوئی ایسا شخص موجود ہے جو سلیم سے دشمنی رکھتا ہے۔'' میں نے کرید کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور اس شخص نے کسی گہری سازش کے تحت سلیم کو پھنسانے اور فیکٹری سے نکلوانے کی کوشش کی تھی؟''

''جی ہاں...... میں بھی اسی انداز میں سوچتا ہوں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں ایسے کسی شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''قادر خان کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں تھانیدار صاحب۔''

''میں تمہارے منشی قادر خان کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ بندہ سلیم کو فیکٹری سے نکلوانے کی سازش میں ملوث ہو سکتا ہے؟''

''مجھے تو ایسا نہیں لگتا جناب۔'' وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ''قادر خان کی سلیم سے دشمنی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔''

''پھر قادر خان نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا......؟'' میں نے تیز آواز میں کہا۔

''کیسا جھوٹ جناب!'' گوشی کی حیرت الجھن میں بدل گئی۔

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں گوشی کو بتایا کہ منشی قادر خان کے مطابق سلیم خود اپنی مرضی سے کام چھوڑ کر گیا تھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسے چوری کے الزام میں فیکٹری سے برطرف کیا گیا تھا۔

گوشی نے بڑے انہماک سے میری بات سنی اور اس سے پہلے کہ وہ اس پر کوئی تبصرہ کرتا، رضیہ بی بی ایک ٹرے اٹھائے بیٹھک میں داخل ہوئی اور اس نے وہ ٹرے ہمارے درمیان ایک چھوٹی میز پر رکھ دی۔ مذکورہ ٹرے کے اندر تین پیالی چائے اور ابلے ہوئے انڈوں سے بھری ایک پلیٹ رکھی تھی اور ساتھ ہی کالی مرچ اور نمک بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''آج کافی زیادہ سردی ہے تھانیدار صاحب۔ گرما گرم چائے کے ساتھ گرما گرم انڈے بھی کھائیں۔''

وہ ہمیں بیٹھک میں چھوڑ کر اچانک گھر کے اندر غائب ہو گئی تھی۔ اب اس کے غیاب کا مقصد سامنے آ چکا تھا۔ وہ اس دوران میں چائے کے ساتھ ساتھ انڈوں کی

تیاری میں لگی ہوئی تھی۔
''رضیہ بی بی! اس کی کیا ضرورت تھی۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے خوامخواہ زحمت کی ہے۔''
''لو جی...... اس میں زحمت والی کیا بات ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''اتنی سردی میں آپ ہمارے گھر میں آئے ہیں۔ آپ کی خاطر کرنا تو میرا فرض ہے......'' وہ یکلخت خاموش ہوئی پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔
''تھانیدار صاحب...... سب خیر خیریت تو ہے نا......؟''
''اماں...... سلیم گم ہوگیا ہے۔'' میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی گوشی بول اٹھا۔
''ہیں......!'' رضیہ نے آنکھیں گھمائیں۔ ''کہاں گم ہوگیا ہے۔ ابھی تو اس نے شادی بھی کرنی ہے......''
''اس کی تو منگنی بھی نہیں ہوسکی اماں۔'' گوشی نے مزید بتایا۔ ''شادی تو بہت آگے کی بات ہے۔ تھانیدار اسی کو ڈھونڈتے ہوئے ادھر آئے ہیں۔ بتارہے ہیں، وہ گھر ہی نہیں پہنچا۔ شادی اور منگنی تو رہ گئیں ایک طرف......''
''گھر نہیں پہنچا......!'' رضیہ نے عجیب انداز میں میری طرف دیکھا۔ ''مگر یہاں سے تو وہ ٹھیک ٹھاک گیا تھا پچھلے جمعے کو......''
رضیہ کی بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ میں نے پوچھا۔ ''رضیہ بی بی! وہ کہاں سے ٹھیک ٹھاک گیا تھا؟''
''یہاں ہمارے گھر سے جی۔'' وہ سادگی سے بولی۔
''پچھلے جمعے کو وہ گوشی کے ساتھ ادھر آیا تھا اور اس نے بتایا تھا، وہ منگنی کرانے وزیر آباد جارہا ہے......''
میں نے سوالیہ نظر سے گوشی کی جانب دیکھا۔
''گوشی!'' میں نے کڑے لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم تو کہہ رہے تھے، پچھلے جمعے کو مولوی کے کھوکھے پر سلیم سے تمہاری آخری ملاقات ہوئی تھی؟''
''میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھانیدار صاحب۔'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے مولوی کے کھوکھے پر بیٹھ کر ہی گپ شپ کی تھی، پھر وہ میرے ساتھ گھر آگیا تھا۔''
مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گوشی مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کررہا ہو۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا، رضیہ بی بی بول اٹھی۔
''تھانیدار جی! میرے گوشی اور سلیم میں بڑی گہری دوستی ہے۔ وہ جب بھی اس سے ملنے آتا ہے، ادھر گھر کا بھی چکر لگالیتا ہے پر......'' اس کی آواز یکدم بوجھل ہوگئی پھر افسردہ لہجے میں کہا۔
''پر...... یہ جو آپ نے اس کی گمشدگی والی بات کی ہے نا...... اس سے مجھے بڑا دکھ ہوا ہے۔ میں نے کبھی گوشی اور سلیم میں فرق نہیں کیا تھا جی...... وہ بھی میرے لیے بیٹا ہی تھا۔''
رضیہ بی بی کے احساسات اور جذبات سلیم سے اس کی گہری انسیت کو ظاہر کرتے تھے۔ اس کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ سلیم اکثر و بیشتر ان کے گھر آتا رہتا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ میں بڑی باریک بینی سے گوشی کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا اس نے سلیم کے یہاں آنے والی بات دانستہ مجھ سے چھپائی تھی اور جب اس کی ماں نے اسی بات کا ذکر کیا تو وہ مضطرب دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کا رویہ شکوک و شبہات میں مبتلا کرنے والا تھا۔
میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور رضیہ بی بی سے کہا۔ ''تمہیں زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ! بہت جلد میں سلیم کو ڈھونڈ نکالوں گا......''
''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے جی۔'' وہ دعائیہ انداز میں چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی پھر اچانک اسے کچھ یاد آگیا اور اس نے جلدی سے اضافہ کیا۔ ''چائے اور انڈے پڑے پڑے ٹھنڈے ہورہے ہیں...... آپ ان سے نمٹیں، میں آپ کے لیے کچھ اور بھی لے کر آتی ہوں۔''
مجھے ''کچھ'' اور کی قطعاً کوئی طلب نہیں تھی لیکن اس کے باوجود بھی میں نے اسے جانے سے روکا نہیں کیونکہ ان لمحات میں، میں یہی چاہتا تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے چلی جائے۔ میں نے گوشی کے انداز میں جو پراسراریت دیکھی تھی، وہ اس بات کی متقاضی تھی کہ میں گوشی سے تنہائی میں چند باتیں کروں اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب بیٹھک میں رضیہ اور صفدر موجود نہ ہوں۔ رضیہ تو خود ہی چلی گئی تھی۔ میں نے صفدر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''صفدر! ذرا باہر گھوم پھر کر میلا دیکھو یا چاہو تو تم جا کر تانگے میں بیٹھ جاؤ۔ میں بھی تھوڑی دیر میں یہاں سے فارغ ہوکر باہر آرہا ہوں۔''
صفدر خاموشی سے اٹھا اور بے چون و چرا بیٹھک سے نکل گیا۔ گوشی میری اس کارروائی کو بڑے دھیان سے دیکھ رہا تھا۔ جب ہم دونوں کے سوا بیٹھک میں کوئی بھی موجود نہ رہا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
''گوشی! اب تو تم مطمئن ہونا......؟''
''جج...... جی......'' وہ الجھن زدہ سہمی ہوئی نظر سے

مجھے تکنے لگا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا تھانیدار صاحب......!''

''مطلب تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنگین لہجے میں کہا۔ ''تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ میں اب جو بھی سوال کروں، اس کا سیدھا اور کھرا جواب دو ورنہ......'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے گھورا پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ میں تمہیں اپنے ساتھ تھانے لے جانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔''

''آپ ڈرانے والی باتیں کیوں کر رہے ہیں تھانیدار صاحب......!'' وہ عاجزی بھرے انداز میں بولا۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا جناب۔ میں نے ابھی تک آپ سے ایک بھی جھوٹ نہیں بولا۔ آپ خوامخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔''

''جب تم نے کچھ نہیں کیا اور مجھ سے کوئی جھوٹ بھی نہیں بولا تو پھر اس قدر ڈر کیوں رہے ہو؟'' میں نے بہ دستور اسے تیز نظر سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''اور یہ شک والی بات تم نے کیا کردی۔ میں کس بات کے لیے تم پر شک کر رہا ہوں؟''

''وہ جی...... وہ جی...... مجھے ایسا لگا تھا، آپ سلیم کی گمشدگی کا ذمے دار مجھے سمجھ رہے ہیں۔'' وہ اٹک اٹک کر بولا۔

''تو کیا ایسا نہیں ہے؟'' میں نے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

''نن...... نہیں۔ بالکل نہیں۔'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''میں سلیم کی گمشدگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے آخری مرتبہ اسے زندہ اور صحیح سلامت دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے، مجھے کچھ پتا نہیں......''

''تم نے آخری بار سلیم کو جمعے کی شام دیکھا تھا۔'' میں نے اسے اپنے جال میں لاتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تم لوگوں نے مولوی کے کھوکھے پر بیٹھ کر گپ شپ کی تھی پھر وہ تمہارے ساتھ گھر آ گیا تھا اور...... وہ اس سے پہلے بھی یہاں آتا رہا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں جی...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔

''پھر تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی تھی؟'' میں نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔ ''یہ تو تمہاری ماں کی زبانی پتا چلا کہ وہ پچھلے جمعے کی شام تمہارے گھر بھی آیا تھا؟''

''ہم...... میں سلیم والے معاملے کو کھولنا نہیں چاہتا تھا۔'' وہ ڈرے سہمے لہجے میں بولا۔

''سلیم والے معاملے کو......'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''ایسا کون سا معاملہ تھا اس کا؟''

''اگر یہ بات آپ اپنے تک رکھیں تو میں بتاتا ہوں۔'' وہ محتاط لہجے میں بولا۔

میں نے اس کی زبان کھلوانے کی غرض سے نہایت ہی دوستانہ انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے...... جو کچھ تم مجھے بتاؤ گے، میں اس کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا۔ سمجھو کہ یہ بات کسی اہم راز کی طرح صرف ہم دونوں کے بیچ رہے گی۔''

اس کے چہرے پر کچھ اس طرح کے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ کوئی سنسنی خیز انکشاف کرنے جا رہا ہو۔ میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''تم ہر فکر سے بے نیاز ہو کر مجھ سے ہر قسم کی بات کر سکتے ہو۔''

''آپ اماں کو بھی نہیں بتائیں گے نا......؟''

میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''بالکل نہیں!''

''بات دراصل یہ ہے جناب کہ......'' وہ بڑی احتیاط کے ساتھ دھیرے دھیرے کھلنے لگا۔ ''سلیم، کنگنی والا کی ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا......''

اب آیا تھا، کہانی میں ایک جذباتی اور ولولہ انگیز موڑ۔ میرے رگ و پے میں ایک نئی توانائی سرایت کر گئی۔ میں نے اسے ٹٹولنے والی نظر سے دیکھا اور آواز دبا کر پوچھا۔

''گوشی! سلیم کس لڑکی سے محبت کرتا تھا؟''

''چندا سے......'' اس نے بتایا۔

''کون چندا......؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''چندا کا اصل نام خالدہ ہے جی۔'' گوشی نے جواب دیا۔ ''وہ ادھر کنگنی والا ہی میں رہتی ہے۔''

''تو سلیم جب بھی کنگنی والا آتا تھا، وہ چندا ہی کے چکر میں آتا تھا......؟''

''جی یہی بات ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہم تو کنگنی والا سے باہر بھی مل سکتے تھے۔ اس کے لیے سلیم کا یہاں آنا ضروری نہیں تھا۔''

''تو کیا پچھلے جمعے کی شام بھی سلیم چندا سے ملاقات کرنے کنگنی والا آیا تھا؟''

''جی ہاں...... آخری ملاقات کرنے۔'' اس نے پژمردہ لہجے میں بتایا۔

''آخری ملاقات......!'' میں نے شک زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کہیں تم یہ تو نہیں بتانا چاہ رہے کہ سلیم کی محبت کے جواب میں چندا اس سے پیار نہیں کرتی تھی۔ اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد سلیم نے اپنے تایا کی

لڑکی زرینہ سے شادی کا فیصلہ کرلیا تھا اور یہی بات بتانے کے لیے وہ آخری دفعہ چندا سے ملنے آیا تھا......؟''

''نہیں جناب...... ایسی کوئی بات نہیں۔'' اس نے میرے اندازے کی نفی کرتے ہوئے کہا۔ ''جتنی شدت سے سلیم، چندا کو چاہتا تھا، چندا کے دل میں بھی سلیم کی اتنی چاہت تھی اور وہ......''

''پھر......!'' میں اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''جب وہ دونوں ایک دوسرے سے اس درجے کی محبت کرتے تھے تو پھر سلیم نے اپنی تایا زاد سے منگنی کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟''

''اس کی وجہ چندا کی ماں بلقیس ہے جناب!''

''چندا کی ماں...... کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' میں نے گھور کر اسے دیکھا۔

''بلقیس، سلیم کو پسند نہیں کرتی تھی اور یہ بات اس نے کافی عرصے کے بعد بتائی تھی۔'' گوشی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اسی لیے سلیم نے چندا کی طرف سے مایوس ہوجانے کے بعد اپنی تایا زاد سے شادی کا فیصلہ کرلیا تھا اور پچھلے جمعے کو وہ یہی بات بتانے بلقیس کے پاس گیا تھا۔ اس کے بعد سلیم کے ساتھ کیا ہوا، مجھے کچھ خبر نہیں......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ واپس چلا گیا ہوگا۔ اس کی منگنی ہوگئی ہوگی اور وہ کسی وقت بھی مجھ سے ملنے یہاں آجائے گا لیکن اس کے بدلے آپ آئے اور وہ بھی سلیم کی گمشدگی کی خبر کے ساتھ......''

''یہ تو میں پتا کرلوں گا کہ بلقیس کے گھر میں سلیم کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن تمہاری ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے گوشی......!''

''میری کون سی بات آپ کو الجھا رہی ہے تھانیدار صاحب؟'' وہ سوالیہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے بتایا ہے کہ چندا کی ماں بلقیس سلیم کو پسند نہیں کرتی تھی اور یہ بات اس نے کافی عرصے کے بعد بتائی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا کیا مطلب ہوا......؟''

''جناب! زیبائش ملز میں سلیم سے میری دوستی ہوئی تھی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''پھر جب وہ میرے ساتھ کنگنی والا آنے لگا تو یہاں چندا سے اس کا تعلق قائم ہوگیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوگئے اور سلیم نے چندا کے گھر جانا شروع کردیا......''

''چندا کے گھر جانا شروع کردیا۔'' میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا بلقیس کو اس بات پر اعتراض نہیں ہوا؟''

''یہی تو سارا مسئلہ ہے جناب۔'' وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''چندا کا باپ نہیں ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اس کے باپ نذیر حسین کا انتقال ہوگیا تھا۔ یہ تین سال پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد چندا اور بلقیس ہی گھر کی دو فرد ہیں۔ جب سلیم کا چندا کے ساتھ نیا نیا سلسلہ شروع ہوا تو بلقیس کو ان کی محبت پر کوئی اعتراض نہیں تھا اسی لیے سلیم ان کے گھر بھی چلا جاتا تھا۔ اس دوران میں سلیم نے اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ دونوں ماں بیٹی پر خرچ کیا لیکن پھر اچانک چندا کی ماں نے آنکھیں پھیر لیں اور یہ اعلان کردیا کہ وہ سلیم کو سخت ناپسند کرتی ہے لہٰذا وہ چندا کا خیال دل سے نکال دے اور کبھی ادھر کا رخ نہ کرے۔''

''اس اتنی بڑی تبدیلی کا کوئی تو سبب ہوگا گوشی......؟'' میں نے اصراری انداز میں کہا۔ ''اور مجھے یقین ہے، وہ سبب تمہیں معلوم ہوگا۔''

میں نے گوشی سے یہ بات ایک خاص سوچ کے تحت کہی تھی۔ گوشی نے مجھے بلقیس کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، اس کی روشنی میں، میرے ذہن میں بلقیس کی شخصیت کا ایک مخصوص خاکہ سا بن گیا تھا۔ اس قسم کی ایک آدھ عورت ہر محلے میں موجود ہوتی ہے جو اپنی بیٹی کے ذریعے مختلف نوجوانوں کو بے وقوف بنا کر ان سے مال بٹور رہی ہوتی ہے یعنی ایک وقت میں ایک نوجوان۔ جب دیکھا کہ نوجوان کی محبت عروج تک پہنچ چکی ہے اور وہ اب شادی کے لیے بے چین ہورہا ہے تو اسے دودھ کی مکھی کے مانند نکال باہر پھینکا جاتا ہے اور کسی دوسرے نوجوان کو الو بنانے کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ سلیم کے معاملے میں بھی یہی ہوا ہوگا لیکن گوشی کے جواب نے میرے اندازے کی دھجیاں اڑا دیں۔

''جی ہاں۔ وہ سبب مجھے معلوم ہے۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''اور اس سبب کا نام ہے...... فضل کریم!''

''فضل کریم......!'' میں نے اسی کے الفاظ کو چبا کر ادا کیا۔ ''کیا یہ بھی سلیم کی طرح کا کوئی عاشق مزاج جوان ہے جسے چندا سے افلاطونی قسم کی محبت ہوگئی ہے؟''

''نہیں جناب......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''یہ کوئی دوسرا ہی چکر ہے۔''

''دوسرا چکر......'' میں نے تشویش بھری نظر سے گوشی کی طرف دیکھا۔''یہ تم کون سی کہانی سنا رہے ہو؟''

''فضل کریم ایک پکی عمر کا بندہ ہے جناب۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''اس کا بلقیس کے گھر میں آنا جانا ہے۔ چندا اسے ''چاچا جی'' کہتی ہے۔ یہ ساری گڑبڑ اسی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اسی کے کہنے پر بلقیس نے سلیم کی طرف سے رخ پھیرا تھا۔''

''کیا فضل کریم نامی یہ بندہ ان لوگوں کا رشتے دار نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جناب......'' اس نے جواب دیا۔''یہ تو کسی اور علاقے کا رہنے والا ہے۔ خود کو بلقیس کے گھر والے مرحوم نذیر حسین کا دوست بتاتا ہے۔ مجھے تو اس فضل کریم پر شک ہے جناب۔''

''کس قسم کا شک؟'' میں نے پوچھا۔''ذرا کھل کر بتاؤ گوشی؟''

''مجھے لگتا ہے، چندا پر اس کی بری نظر ہے۔'' وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔''اسی لیے اس نے سلیم کا راستہ کاٹنے کے لیے بلقیس کے کان بھرے ہیں۔''

''ہوں......'' میں نے معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرا۔''اس کا مطلب ہے، سب کو باری باری چیک کرنا پڑے گا۔''

''آپ کا جو دل چاہے، کریں جی۔'' وہ محتاط انداز میں بولا۔''لیکن میرا نام کہیں نہیں آنا چاہیے۔ مجھے یہیں کنگنی والا میں رہنا ہے۔ فضل کریم کوئی اچھا آدمی نہیں۔ وہ میرے لیے کوئی بھی مشکل کھڑی کرسکتا ہے۔''

''تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔''میری تفتیشی کارروائی سے تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اب ذرا یہ بتادو کہ فضل کریم کا تعلق کس علاقے سے ہے؟''

''مجھے جہاں تک پتا ہے، وہ کھیالی کا رہنے والا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کھیالی'' کنگنی والا سے جنوب مغرب میں واقع ایک گاؤں تھا اور کنگنی والا سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔

میں نے پوچھا۔''کیا یہ فضل کریم روزانہ بلقیس کے گھر آتا ہے؟''

''تقریباً روزانہ!'' اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

''عموماً وہ کس وقت بلقیس کے گھر آتا ہے؟''

''میں نے زیادہ تر اسے شام میں پارات میں آتے دیکھا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ رات کو دیر سے واپس جاتا ہے۔''

''ذرا سوچ کر بتاؤ، پچھلے جمعے کو فضل کریم بلقیس کے گھر آیا تھا۔'' میں نے سوالات کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے پوچھا۔ ''میں اس دن کی بات کر رہا ہوں جب تمہارا دوست سلیم اپنی محبوبہ چندا سے آخری ملاقات کرنے آیا تھا؟''

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا جناب۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''اس دن سلیم میرے ساتھ ہی گھر آیا تھا۔ تھوڑی دیر یہاں بیٹھنے کے بعد وہ چندا کی طرف چلا گیا تھا۔ میں بہت تھکا ہوا تھا اس لیے گھر سے باہر نہیں نکلا اور رات کا کھانا کھانے کے بعد جلدی سو گیا تھا۔''

''کیا سلیم، چندا کے گھر سے واپسی پر تم سے مل کر گیا تھا؟''

''نہیں جی......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''وہ جاتے ہوئے مجھ سے کہہ گیا تھا کہ واپسی پر وہ سیدھا شریف پورہ والے گھر جائے گا اور اگلے دن یعنی ہفتے کی صبح وہ وزیر آباد روانہ ہو جائے گا۔''

''یہ بلقیس اور چندا کنگنی والا میں کس طرف رہتی ہیں؟'' میں نے گوشی سے آخری سوال کیا۔

''آٹے والی چکی کے پاس۔'' اس نے جواب دیا۔ ''چندا کا باپ نذیر حسین اس چکی کا مالک تھا۔ جب تک وہ زندہ رہا، یہ چکی چلاتا رہا۔ اس نے اپنی مدد کے لیے ایک ملازم بھی رکھا ہوا تھا۔ نذیر حسین کی موت کے بعد کچھ عرصہ تو چکی بند رہی پھر بلقیس نے اسی ملازم کے ذریعے چکی کا کام شروع کرا دیا۔ ملازم کے پاس اس کام کا تجربہ تھا۔ اس نے اپنی مدد کے لیے ایک اور ملازم رکھا ہوا ہے۔ چکی کی آمدنی میں سے آدھا بلقیس کو ملتا ہے اور آدھا وہ شخص لے جاتا ہے جو کسی زمانے میں نذیر حسین کا ملازم ہوا کرتا تھا۔ اب اس کی حیثیت ٹھیکے دار کی سی ہے......''

ادھر گوشی کی بات ختم ہوئی، ادھر اس کی ماں بیٹھک میں داخل ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں ایک پیالہ اور چند پلیٹیں اٹھا رکھی تھیں۔ اس سامان کو وہ میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

''تھانیدار جی! میں آپ کے لیے گاجر کا حلوا لے کر آئی ہوں اور وہ بھی گرما گرم۔ تھوڑی دیر میں گوشی کا باپ بھی کارخانے سے آ جائے گا......'' وہ بولتے بولتے اچانک رکی پھر حیرت بھرے انداز میں بولی۔ ''وہ لڑکا کہاں گیا ہے جو آپ کے ساتھ آیا تھا......؟''

اس کا اشارہ صفدر کی جانب تھا۔ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ باہر جا چکا ہے اور میں بھی جا رہا ہوں۔ گاجر کا یہ گرما گرم حلوا تم گوشی کے باپ کو کھلانا...... بے چارہ تھکا ہارا کارخانے سے آئے گا۔ اسے گرم حلوے کی زیادہ ضرورت ہو گی۔''

وہ اصرار کرتی رہ گئی کہ میں تھوڑا بہت تو کھا کر جاؤں مگر گوشی کی زبانی جتنی سنسنی خیز معلومات مجھ تک پہنچ چکی تھیں، اس نے مجھے اندر اور باہر سے بے چین کر رکھا تھا۔ میں پہلی فرصت میں بلقیس کا انٹرویو کرنا چاہتا تھا لہٰذا گوشی کے گھر میں مزید رکنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا۔ چنانچہ میں نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ رضیہ بی بی کی پیش کش کو مسترد کیا اور اس کے گھر سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

اس وقت شام ہو رہی تھی جب میں بلقیس کے دروازے پر پہنچا۔ موسم سرما میں، خصوصاً جنوری کے مہینے میں پانچ بجے تک سورج غروب ہو جاتا تھا۔ یوں سمجھیں کہ چار بجے کے بعد شام کا سا سماں ہی ہوتا تھا۔ میں نے صفدر کو تانگے ہی میں بیٹھا چھوڑ دیا تھا۔ ہمارا تانگا چکی سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا تھا۔ رضیہ بی بی کی گرما گرم حلوے والی پیشکش کو ٹھکرانے کا مجھے افسوس تو ہوا تھا۔ میرے انکار سے یقیناً اس کا دل تو ٹوٹا ہو گا مگر میں مجبور تھا۔ فرض کی راہ میں، میں کسی چیز کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیتا تھا۔

گوشی کے گھر سے نکلتے وقت میں نے بڑے واضح انداز میں صفدر سے کہہ دیا تھا کہ اس کا کام ختم ہو چکا۔ وہ چاہے تو واپس گھر جا سکتا ہے لیکن اس نے میرے ساتھ ہی رہنے کو ترجیح دی تھی۔ اس کی دو بنیادی وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ سلیم کا سچا دوست تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد دستیاب ہو جائے۔ دوسرے اسے اس تفتیشی کارروائی سے مزہ آنے لگا تھا۔ سنسنی خیز دلچسپی اس کی آنکھوں اور چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

میری دستک کے جواب میں ایک عورت نے دروازہ کھولا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ چندا کی ماں بلقیس ہو گی۔ اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان نظر آتی تھی تاہم اس نے خود کو خاصا سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

دروازہ کھول کر اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ''کیا تم بلقیس ہو...... مرحوم نذیر حسین کی بیوی؟''

''جی...... جی ہاں......'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی پھر الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کون ہیں...... اور

میرے دروازے پر کیوں آئے ہیں...... میں نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ پولیس کو ہمارا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے۔''

اس دوران میں میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کر چکا تھا۔ گوشی نے بلقیس کے حوالے سے مجھے جو معلومات فراہم کی تھیں، ان کے مطابق وہ ایک شاطر عورت تھی لہٰذا اسے شکست دینے کے لیے کوئی گہری چال چلنے کی ضرورت تھی اور میں ان لمحات میں ایسے ہی طرزِ عمل کا فیصلہ کر چکا تھا۔

''میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں اس علاقے کا تھانیدار ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے دروازے تک آنے کا یہ مقصد نہیں کہ تم نے کچھ ایسا ویسا کر دیا ہے بلکہ میں تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو ایک خطرناک قاتل سے بچانے کے لیے یہاں آیا ہوں......''

''خطرناک قاتل......!'' اس کی آنکھوں اور چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے۔ ''یہ آپ...... کیا کہہ رہے ہیں......؟''

''میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں، اسے پوری توجہ سے سننے کی ضرورت ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور یہ باتیں گلی میں کھڑے کھڑے نہیں ہو سکتیں۔ کیا تمہارے گھر میں بیٹھ کر......''

''جی...... جی۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ''آپ اندر آجائیں تھانیدار صاحب!''

ایک منٹ کے بعد میں بلقیس کی بیٹھک میں اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر الجھن اور خوف کی ملی جلی علامات تھیں۔ اضطراری لہجے میں اس نے استفسار کیا۔

''آپ کس قاتل کی بات کر رہے ہیں تھانیدار صاحب؟''

میں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہا۔ ''اس خطرناک مجرم کا نام ہاشو خان ہے۔ وہ کرائے کا قاتل ہے اور کسی کی بھی جان لینے میں ایک لمحے کو نہیں ہچکچاتا۔''

''لل...... لیکن......'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ''ہم نے...... ہاشو خان کا کیا بگاڑا ہے...... وہ ہمیں کیوں نقصان پہنچائے گا؟ میں تو کسی ہاشو خان کو جانتی بھی نہیں۔''

''ہاشو خان بھی تمہیں نہیں پہچانتا۔'' میں نے اس کے خوف میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ کرائے کا قاتل ہے۔ جس شخص نے ہاشو خان کو یہاں بھیجا ہے، وہ تمہیں اور تمہاری بیٹی چندا کو اچھی طرح جانتا ہے۔''

''کون ہے وہ شخص......؟'' وہ سراسیمہ آواز میں بولی۔

''اس کا نام جمشید ہے۔'' میں نے اپنی پلاننگ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم جمشید کو بھی نہیں جانتی ہوگی۔ یہ جمشید سلیم کا بہت گہرا دوست ہے......''

''سس...... سلیم......!'' سلیم کا نام سن کر بلقیس کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ ''ہم...... میں...... کسی سلیم کو...... نہیں جانتی...... ہمارا کسی سلیم سے کوئی واسطہ نہیں...... آپ غلط جگہ پر آگئے ہیں تھانیدار صاحب۔''

بلقیس کی گھبراہٹ کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ سلیم کی گمشدگی کے راز سے واقف تھی۔ میں نے اسے مزید ڈرا کر سچ اگلوانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''بلقیس بی بی! میری ساری زندگی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں گزری ہے لہٰذا یہ تو سوچنا بھی نہیں کہ میں غلط دروازے پر آگیا ہوں۔ میری بات دھیان سے سنو...... سلیم نے اپنے دوست جمشید کو اپنے اور تمہاری بیٹی چندا کے تعلقات کے بارے میں سب کچھ بتا رکھا تھا۔ جمشید یہ بھی جانتا ہے کہ پچھلے جمعے کی شام سلیم تمہارے گھر آیا تھا اور اس کے بعد سے وہ غائب ہے۔ جمشید کو یقین ہے کہ تم لوگوں نے ہی سلیم کو گم کیا ہے۔ جمشید بہت خطرناک انسان ہے۔ اس نے اپنے ایک جاننے والے جرائم پیشہ شخص ہاشو خان کو تمہیں قتل کرنے کے لیے روانہ کر دیا ہے۔ یہ تو اچھا ہوا، مجھے اپنے ذرائع سے پتا چل گیا اور قاتل ہاشو خان سے پہلے میں یہاں آگیا ہوں......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں تم ماں بیٹی کا سچا خیرخواہ ہوں۔ میری موجودگی میں کوئی بڑے سے بڑا اور خطرناک سے خطرناک مجرم بھی تم لوگوں کا بال بیکا نہیں کر سکتا لیکن میں صرف ایک شرط پر تم لوگوں کی حفاظت کر سکتا ہوں۔''

''کک...... کون سی شرط......؟''

''تم مجھے ٹھیک ٹھیک بتا دو کہ......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے جمعے کی شام اس گھر میں سلیم کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''کک...... کچھ نہیں...... میں کسی سلیم...... کو...... نہیں جانتی......''

بلقیس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ بیٹھک کا اندرونی دروازہ کھلا اور کھلے ہوئے دروازے میں سے ایک خوب صورت اور جوان لڑکی اندر داخل ہوئی۔ وہ بلقیس سے گہری مشابہت رکھتی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی مشکل نہ ہوئی کہ وہ بلقیس کی بیٹی چندا تھی۔

''امی..... تھانیدار جی کو سب کچھ سچ سچ بتا دو۔'' چندا نے پرجوش انداز میں کہا۔ ''اگر تم نہیں بتاؤ گی تو پھر میری زبان کھل جائے گی۔''

تفتیشی اعتبار سے صورتِ حال میں اچانک ایک خوشگوار تبدیلی آگئی تھی۔ چندا کے انداز سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دروازے سے لگی میری اور بلقیس کی گفتگو سن رہی تھی اور اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اس کے سینے میں کوئی بہت گہرا راز چھپا ہوا ہے۔

''کیا تم چندا ہی ہو......؟'' میں نے اس دلکش لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی، تھانیدار صاحب......'' وہ جلدی سے بولی۔

''بیٹی! تم مجھے بتاؤ، حقیقت کیا ہے؟'' میں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اگر تم لوگوں کا کوئی قصور نہیں تو میں تمہیں ہر مصیبت اور آفت سے بچاؤں گا۔''

چندا کے ضبط کے سارے بندھن کھل گئے۔ بلقیس کے ''نہ نہ'' کرنے کے باوجود بھی اس نے مجھے پچھلے جمعے کو اس گھر میں پیش آنے والے واقعے سے تفصیلاً آگاہ کر دیا۔ میں یہاں اس کے بیان کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

چندا کو سلیم سے سچی محبت تھی اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر اس کا نام نہاد چاچا فضل کریم بھی اس پر دانت تیز کر رہا تھا۔ بلقیس کی پتا نہیں کون سی کمزوری فضل کریم کے ہاتھ میں تھی کہ وہ بے چون و چرا فضل کریم کی بات مان لیتی تھی۔ فضل کریم ہی کے ایما پر اس نے سلیم کو بھگانے کی کوشش کی تھی لیکن سلیم بھی اپنی ضد کا پکا تھا۔ پچھلے جمعے کی شام وہ بلقیس سے یہ کہنے آیا تھا کہ وہ اگر اب بھی اس کی اور چندا کی شادی کے لیے راضی ہو جائے تو وہ اپنی منگنی کا پروگرام کینسل کر دے گا جو کہ سراسر اس کے گھر والوں کی خواہش پر ہو رہی تھی۔ سلیم تو صرف اور صرف چندا ہی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

سلیم اور بلقیس کے درمیان بحث و تکرار جاری ہی تھی کہ فضل کریم آگیا۔ سلیم کو چندا کی زبانی فضل کریم کے عزائم کی خبر ہو چکی تھی اور وہ اس شخص سے نفرت کرنے لگا تھا۔ فضل کریم بھی سلیم کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس موقع پر سلیم اور فضل کریم میں بھی اچھی خاصی تلخ کلامی ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد سلیم غصے سے اٹھا اور گھر سے نکل گیا۔ اس کے پیچھے فضل کریم بھی یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

''بلقیس! اس خر دماغ پر تمہاری باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اب مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔''

اس کے بعد کیا ہوا، چندا کو کچھ معلوم نہیں تھا لیکن فضل کریم کی بدقسمتی کہ ابھی میں بلقیس کے گھر میں موجود تھا کہ وہ بھی وہاں آگیا۔ لوہا گرم تھا۔ میں نے کڑے انداز میں جب فضل کریم سے سلیم کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو وہ الٹا مجھے دھمکانے کی کوشش کرنے لگا۔ نتیجے کے طور پر میں زبردستی اسے اپنے ساتھ تھانے لے آیا۔

حالات و واقعات کی روشنی میں سلیم کی گمشدگی کا ذمے دار صرف اور صرف فضل کریم ہی نظر آتا تھا۔ میں نے اسے حوالدار نبی بخش کے حوالے کرتے ہوئے یہ تاکید بھی کر دی کہ صبح سے پہلے اس بندے کی زبان کھل جانا چاہیے۔

اگلی صبح حوالدار نے مجھے خوش خبری سنائی کہ فضل کریم بندے دا پتر بن گیا ہے اور وہ حلفیہ بیان ریکارڈ کرانے کے لیے تیار ہے۔ ''بیان ریکارڈ'' کرانے سے مراد ''بیان قلم بند'' کرنا ہے۔ میں نے اس کا ''اقرارِ جرم'' قلم بند کر لیا۔

واقعات کے مطابق پچھلے جمعے کی رات فضل کریم نے سلیم کا تعاقب کیا تھا اور ایک ویران مقام پر گھیر کر اسے قتل کر ڈالا تھا پھر اس کی لاش کو گندے نالے میں پھینک دیا تا کہ کسی کی اس پر نظر نہ پڑے۔ یہ نالا جی ٹی روڈ کے متوازی چلتا تھا۔

اگلے روز میں نے کوشش کر کے سلیم کی لاش کو ڈھونڈ نکالا۔ گندے نالے کے اندر پانی کا بہاؤ بہت سست رفتار تھا لہٰذا لاش کو جہاں پھینکا گیا تھا، وہ ادھر ہی پڑی تھی۔ جب کھیالی والوں کو پتا چلا کہ فضل کریم نے کنگنی والا میں کون سا کارنامہ انجام دیا ہے تو انہیں یقین نہ آیا۔ فضل کریم اپنے علاقے میں بڑا نیک نام تھا۔

انسان کو نیک نام سے زیادہ نیک کام ہونا چاہیے کیونکہ نام سے زیادہ انسان کا عمل اہم ہوتا ہے۔ بہادر علی نام رکھ لینے سے کوئی بہادر نہیں ہو جاتا۔ نام کی اپنی اہمیت ہے مگر عمل اور فعل کی برابری ممکن نہیں۔ آدمی کو صاحبِ کردار ہونا چاہیے۔ نام کو تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن اعمال اور افعال تو اپنی زبان سے بولتے ہیں۔

(تحریر: حسام بٹ)

زہریلی عورتیں

ابوزرتاب

دور حاضر نے اس قدر ترقی کی ہے کہ اب اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور سونے کے انداز تک منفرد ہوگئے ہیں۔ حتیٰ کہ محبت اور نفرت کے طریقوں میں بھی لوگوں نے جدت کی راہ ڈھونڈلی ہے لیکن... دور قدیم پر ایک نظر ڈالی جائے تو احساس ہوگا کہ ماضی میں لوگ انتقام کے کیسے کیسے انداز اپناتے تھے... عورت ویسے تو نفرت وانتقام میں سراپا ناگن بن جاتی ہے مگر ایسا اس وقت ہوتا ہے جب اس کا دل اور فطرت منتقم مزاج ہویا... اس کے ساتھ ناقابل برداشت ناانصافی سے کام لیا جائے۔ جبکہ اس کے تو انگ انگ میں زہر بھرا تھا اور نہ صرف وہ بلکہ اس محل کی ہر کنیز زہریلی بنادی گئی تھی... ایسا کیوں تھا... بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔

محبتوں کی چاشنی میں ڈوبے زہریلے رویوں اور انتقامی کارروائیوں کی عکاس

میں ایک لکھاری ہوں۔ اسی سلسلے میں جب مجھے ایڈیٹر کا خط ملا تو میں نے لکھا۔ ''اپنے بارے میں لکھنے کی فرمائش کر کے تم نے مجھے سخت مشکل میں ڈال دیا ہے۔ میں نے چند فرمائشی کہانیاں لکھی ضرور ہیں لیکن یہ کوئی جوتا تو ہے نہیں کہ ''میڈ ٹو آرڈر'' جھٹ پٹ تیار کر دیا جائے۔ اپنے خط میں تم نے اپنا پتا بھی نہیں دیا۔ لفافے پر پوسٹ آفس کی مہر دیکھ کر میں نے تمہارا ٹھکانا تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تمہارے لفافے پر شیخوپور ڈاک خانے کی مہر تھی۔



شیو پور کیا یہاں ہے؟ لیکن تم یہ مت سوچ لینا کہ میں تمہارا پتا تلاش کرکے تمہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔ تم نے اختصار سے جو لکھا ہے، میں نے تمہاری بات کو سمجھ لیا ہے۔ ہاں، یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہے کہ انتہائی مجبور ہو کر ہی تم نے مجھے یہ خط لکھا ہے کہ شاید میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں۔ خیر میں تمہارے کتنے کام آسکتا ہوں، مجھے نہیں معلوم۔

''تمہارا خط پڑھتے پڑھتے میرا ایک فائدہ ضرور ہوا ہے۔ برسوں پرانی کسی اور کی کہانی یاد آگئی۔ راجستھان کے ریگ زاروں میں گھومتے شکاریوں کو جب کہیں خوب صورت اور جوان لڑکی نظر آتی، اٹھا لیتے اور راجا کے محل میں لے آتے۔ انہیں محل میں کھانے کو اعلیٰ خوراک، قیمتی کپڑے لتے اور ہر طرح کا عیش و آرام دیا جاتا اور اگر کسی پر راجا کی خاص نظر پڑ جاتی تو اس کے تو دن ہی پھر جاتے۔ تمام دنیا کے عیش و آرام اور سہولتیں اس کے قدموں پر ڈھیر کردی جاتیں۔ دشمنوں سے بدلہ لینے اور انہیں تباہ کرنے کے لیے کچھ عورتوں کو زہر پر پالا جاتا اور جس سے بدلہ لینا ہوتا، اسے ان میں سے ایک عورت سونپ دی جاتی۔ بس ایک رات کی پھسلن اس کے لیے جی جان کا روگ بن جاتا اور دشمن ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور ہوجاتا۔ یہ شرتی بائی کی نہیں بلکہ ونالتا کی کہانی تھی۔

''ونالتا میری کوئی رشتے دار نہیں تھی۔ جب وہ بھی چھبیس برس کی تھی، اس کی زندگی میں ایسا ہی ایک بھیانک واقعہ ہوا تھا۔ سچ چھبیس برس کی عمر کا دکھ شاید بہت بڑا ہوتا ہے۔ تم نے لکھا ہے تم جس لڑکے کو پیار کرتی ہو، عمر میں وہ تم سے تین برس چھوٹا ہے یعنی تئیس سال کا ہے۔ تئیس کی عمر بھلا چھبیس کا درد کیا سمجھے، بولو۔

چھبیس برس کی ونالتا سے تئیس برس کے سجاے نے کہا۔ ''اصل میں پنکھ دیکھ کر ہی ہم مورنی پہچان لیتے ہیں میم صاحب۔''

ونالتا ایک دم سے بپھر گئی۔ ''تو پھر لیجیے، اب اور اچھی طرح پہچان لیجیے۔'' اتنا کہتے ہوئے نہ کوئی بات نہ چیت۔ اپنے پیروں سے چپل اتار کر اس نے سجاے کے گال پر تڑاتڑ جڑ دی۔ ونالتا کی چپل کے تلوے سجاے کے گال پر برستے ہوئے دو ٹکڑے ہوگئے۔

میڈیکل کالج کے تمام نرس، ڈاکٹر لڑکے لڑکیاں سب کے سب دوڑے ہوئے آئے۔ آپریشن تھیٹر کے سامنے بھیڑ جمع ہوگئی۔ سب پوچھ رہے تھے۔ ماجرا کیا ہے؟ یوں پٹائی کیوں ہوگئی۔''

ونالتا غصے سے ہنس رہی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اس کمبخت ڈاکٹر کے گال پر دو چار طمانچے اور جڑ دیتی۔ بھرپور سزا کے لیے مانو اتنی سی پٹائی کافی نہ ہو۔

میٹرن نے پوچھا۔ ''کیا ہوا تھا؟''

ونالتا نے سارا واقعہ بیان کردیا۔

☆☆☆

لیکن وہ بات ابھی رہنے دو۔ چھبیس کی عمر کا درد اور کوئی بھلے نہ سمجھے، شاید تم سمجھ سکو۔ پھر شاید تم محسوس کرسکو ونالتا رائے کی بے عزتی۔ اس روز تئیس برس کے نوجوان سجاے نے سچ مچ کوئی غلطی کی تھی یا نہیں، اس کا بھی فیصلہ شاید تم خود ہی کرلوگی لیکن وہ قصہ بھی بعد میں بتاؤں گا۔

تم نے لکھا ہے تئیس سال کا ایک نوجوان تمہارے ساتھ گھر گرہستی بسانا چاہتا ہے۔ کیا ہوا اگر وہ تم سے تین سال چھوٹا ہے؟ گھر بسانے کے لیے کیا کسی خاص عمر کی ضرورت ہوتی ہے؟ نہیں، کسی بھی عمر میں گھر بسایا جاسکتا ہے۔ خاص کر تئیس کی عمر میں بخوبی گرہستی شروع کی جاسکتی ہے۔ تئیس کی عمر کو نہ کبھی تھکان آتی ہے نہ نیند۔ یہ عمر تو امنگوں اور جذبوں سے بھرپور ہوتی ہے۔

اچھا چلو تمہیں شروع سے ہی بتاتا ہوں۔ بہت سال پہلے ایک بار میں اوکھا پورٹ گیا تھا۔ راجستھان کی سرحد کے پار بھارت کا بالکل آخری سرا۔ بحر ہند کے ساحل پر بسی ہوئی بندرگاہ۔ جہاں اس پار کے مچھیرے، ملاح خرید و فروخت کرنے جاتے ہیں۔ اپنا سودا بیچ کر وہاں کی خریداری سے لدے پھندے یہ پھر اپنے دیش لوٹ آتے ہیں۔ وہاں سے لایا ہوا سامان وہ یہاں بیچ لیتے ہیں۔ ان کا دھندا ہی یہی ہے۔ سمندر کے اس کنارے سے اس کنارے تک مچھیروں کی بستی ہے۔

ایشوری پرشاد پانڈے نے ہی بتایا تھا۔ ''چونکہ یہ بہت بڑا تیرتھ استھان ہے بابو صاحب اس لیے سیٹھ مہاجن لوگ یہاں آتے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی سب تو وہی مچھیرے ملاحوں کا کنبہ۔''

میں نے دریافت کیا۔ ''تمہارے یہاں...... یعنی اس طرف کوئی بنگالی نہیں ہے؟''

''بنگالی؟'' ایشوری پرشاد نے اپنے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ایک بنگالی بابو بھی رہتے تھے یہاں حضور! یہاں کے لائٹ ہاؤس میں نوکری کرتے تھے۔ تین سال ہوئے ان کی بھی بدلی ہوگئی۔ اس کے علاوہ اور ایک آدمی بھی......'' اچانک اسے یاد آگیا۔ ''حضور! ایک بنگالن

بھی رہتی ہے یہاں۔''

''کون؟''

''وہ بھی یہاں سے قریب تینتیس میل دور...... ڈاکٹر ہے۔''

''کوئی بنگالی ڈاکٹر...... ہزاروں میل دور سے اس اجاڑ بیابان گاؤں میں ڈاکٹری کرنے آئی ہے؟ یہ مچھیرے ملاح پیسے ویسے بھی دیتے ہیں؟''

ایشوری پرشاد نے ہی پیشکش کی۔ ''آپ کو میں وہاں لے جاسکتا ہوں حضور! ڈاکٹر ماں نے بڑا اسپتال بنوادیا ہے۔ یہاں ایک پیسا بھی خرچ نہیں ہوتا حضور۔''

''اچھا! نام کیا ہے؟''

''ونالتا...... ویسے لوگ انہیں ڈاکٹر ماں کہہ کر پکارتے ہیں۔''

ونالتا...... بہت سالوں پہلے میڈیکل کالج کا حادثہ اچانک یاد آگیا۔ اس کا نام بھی ونالتا رائے تھا۔ یہ نام دنیا میں سب لڑکیوں کا تو ہوتا نہیں۔

میں نے دریافت کیا۔ ''اچھا ذرا ان کا حلیہ بتاؤ؟''

میں نے جس ونالتا کو دیکھا تھا، وہ بھی یہی کوئی چھبیس سال کی رہی ہوگی لیکن وہ کیا۔ آج کی بات ہے۔ میں ہر شام میڈیکل کالج جایا کرتا تھا۔ ٹوکو ماسی کے گلیڈ اسٹون کا آپریشن ہونے والا تھا۔ وہ ہر وقت لیٹی رہتی تھیں۔ میں ان کے لیے گھر سے کھانا لے جایا کرتا تھا۔ یہیں میں نے ونالتا کو پہلی بار دیکھا تھا۔

سفید پوشاک میں وہ ہاتھ میں تھرمامیٹر اور کندھے پر اسٹیتھو اسکوپ لیے اس کمرے سے اس کمرے میں دوڑتی گھومتی رہتی۔ معصوم سا چہرہ تھا اس کا۔

''کل چھبیس سال کی ہے تو کیا ہوا؟'' ماسی کہتیں۔ ''مریضوں کی بڑے پیار سے دیکھ بھال کرتی ہے۔''

ایشوری پرشاد بتانے لگا۔ ''یہاں کے مچھیرے ملاح ایک عجیب بیماری کا شکار رہتے ہیں۔ سو ڈاکٹر ماں نے اس کے علاج کے لیے اسپتال بنوادیا ہے۔ وہاں لوگوں کا ایک پیسا بھی نہیں لگتا۔ دیکھ بھال بھی بڑھیا۔ ڈاکٹر ماں مریضوں کی جی جان سے دیکھ بھال کرتی ہیں۔''

ویسے ونالتا کو لے کر کوئی کہانی گھڑنا مشکل ہے۔ ونالتا کی زندگی کی شروعات اور آخر بالکل سپاٹ...... کم سے کم اس وقت میرا یہی خیال تھا۔ مجھے لگا تھا کہ ونالتا کی زندگی میں موجود سوالوں کی طرح ان کے جواب بھی بے حد آسان اور سیدھے ہوں گے۔ سیدھی سپاٹ دھرتی کی طرح۔ شروع شروع میں تھوڑی بہت چڑھائی بھلے ہو لیکن آخر میں برابر۔ سوال چاہے جیسا ہو، اس کا جواب اگر مشکل نہ ہو تو اسے لے کر کوئی کہانی گھڑنا بھی عجیب لگتا ہے۔

اس روز بھی میں ٹھیک چار بجے اسپتال پہنچ گیا۔ وہی حالات، چاروں طرف مریضوں کے قطار در قطار بستر۔ امید سے بھری، مایوس آنکھیں۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی ماسی نے تیزی سے کہا۔ ''پتا ہے آج یہاں ایک عجیب واقعہ ہوگیا ہے۔''

میں نے ہی پوچھا۔ ''کون سا واقعہ؟''

ٹوکو ماسی نے کہا۔ ''ہمارے یہاں کی ایک نرس نے کسی ڈاکٹر کو جوتا جڑ دیا۔''

''کون سی نرس نے؟''

''ارے وہی...... وہ رہی۔''

اس وقت ونالتا کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ سر پر اسکارف، ہاتھ میں ٹمپریچر چارٹ۔ اس عورت کو دیکھ کر یہ بالکل نہیں لگتا تھا کہ وہ مرد کو جوتے بھی مار سکتی ہے۔ میں نے محسوس کیا سب چور نگاہوں سے اسے ہی گھور رہے ہیں۔

''اور وہ ڈاکٹر؟''

ڈاکٹر سبھاے مجھے کہیں نظر نہیں آیا لیکن آس پاس میں اس سرے سے دوسرے سرے تک صرف وہی چہ چا، مہین سی کھسر پھسر۔ مانو گفتگو کے لیے کوئی چٹ پٹا موضوع مل گیا ہو۔ ٹوکو ماسی قریب مہینے بھر اس اسپتال میں رہی، بعد کی ساری کہانی انہوں نے ہی بتائی۔ سبھاے جب ونالتا سے ملا تھا، تب اس نے یہی بتایا تھا۔

سبھاے نے کہا۔ ''اب میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ آپ نے میرا بہت بڑا نقصان کردیا ہے۔''

ونالتا نے جواب دیا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے، میں بھی کیا کسی کو منہ دکھانے لائق رہ گئی ہوں؟''

''آپ خیر عورت ہیں، اگر گھر سے باہر نہ بھی نکلیں تو بھی کام چل جائے گا لیکن میں......''

☆☆☆

کس کے دروازہ کھٹکھٹانے پر اس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے سبھاے کو دیکھ کر بھونچکا رہ گئی۔ کچھ پل تک اس کے منہ سے مانو آواز ہی نہیں نکلی۔

جن دو افراد کے درمیان صبح سویرے ایسا بھیانک جھگڑا ہوچکا ہوگا۔ وہ دن بعد ہی وہ لوگ بھلا اتنی آسانی سے کیسے بات چیت کرسکتے ہیں؟ خیر جن لوگوں کو انسانی نفسیات کے بارے میں ذرا بھی ادراک ہوگا، وہ لوگ ان کی دوستی پر ہرگز حیران نہیں ہوں گے۔

آپس میں ایک دوسرے سے معافی مانگنے کے بعد پہلے سجاے نے ہی اپنی طرف سے بات چیت کی پہل کی۔
''اچھا اب میں چلوں......؟'' اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
اچانک ونالتا نے پوچھا۔'' آپ میرا ایک کام کردیں گے؟''
سجاے ٹھٹک گیا، اس نے پلٹ کر ونالتا کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی۔'' کام......کون سا کام؟''
''میری بیس دن کی تنخواہ باقی ہے۔آپ لادیں گے؟''
''کیوں! آپ خود بھی تو لا سکتی ہیں؟''
''میں نے نوکری چھوڑ دی ہے۔'' پل بھر چپ رہنے کے بعد اس نے اگلا جملہ جوڑا۔'' جو حادثہ ہوگیا، اس کے بعد میرا وہاں نوکری کرنا مناسب نہیں تھا۔''
سجاے کچھ نہ بول سکا۔تھوڑی دیر بعد جب اسے ہوش آیا تب اس نے سرد لہجے میں کہا۔'' لیکن نوکری تو میں نے بھی چھوڑ دی ہے۔اب میں بھی کالج نہیں جاتا۔''
اب ونالتا کے چونکنے کی باری تھی۔ایک آدھ پل کی خاموشی کے بعد اس نے پھر کہا۔'' آپ کا کیا،آپ نے ڈاکٹری تو پاس کر ہی لی ہے نا......کہیں اور نوکری کرلیں گے۔''
''اسی لیے تو معافی مانگنے آیا ہوں۔''
''معافی مانگنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔میری بھی تو کم غلطی نہیں تھی۔اصل میں اس روز صبح سے میرا دل ٹھیک نہیں تھا۔اوپر سے گھر کا دو مہینے کا کرایہ سر پر چڑھ گیا تھا...... مجھ جیسوں کی حالت کا آپ صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔''
سجاے وہاں دھم سے بیٹھ گیا۔'' آپ کو بھی شاید میری حالت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ ہو۔ پتا ہے، اس واردات کے بعد سے میں اپنے گھر ہی نہیں گیا۔''
''تب آپ دو دن تک رہے کہاں؟''
''سڑک پر، پارک میں...... اخباروں میں یہ خبر چھپ جانے کے بعد کسی دوست کے گھر جانے میں شرم آئی۔''
اچانک وہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا۔'' اچھا اب میں چلوں۔''
''جایئے گا کہاں؟''
''یہ نہیں معلوم، اب تو نہ گھر جا سکتا ہوں نہ ہاسٹل۔''
''پھر......؟''
''مجھے پتا ہے ڈاکٹری پاس کر چکا ہوں، بھوکوں نہیں مروں گا لیکن اس وقت میرے ہاتھ میں اگر تھوڑے سے بھی پیسے ہوتے تو کہیں اور چلا جاتا آج ہی۔''
سجاے نے جانے کے لیے قدم اٹھایا۔ ونالتا خاموش نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ سجاے جب نیچے بالکل آخری سیڑھی تک اتر گیا تب اس نے آواز دی۔'' سجاے جی، ذرا سنیے۔''
سجاے نے نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔
''آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟''
وہ دوبارہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ونالتا دروازے پر ہی کھڑی تھی۔اس نے کہا۔'' آپ میری ایک بات مانیں گے؟''
''کون سی بات؟''
ونالتا نے فوراً اپنی ایک چوڑی اتار کر سجاے کو جبراً تھماتے ہوئے کہا۔'' یہ گلٹ نہیں خالص سونا ہے۔ممکن ہے آپ کے کام آجائے۔''
سجاے سچ مچ حیران رہ گیا۔اس کی زبان پر مانو تالا پڑ گیا ہو۔ ونالتا نے دوبارہ کہا۔''عمر میں آپ مجھ سے چھوٹے ہیں، لینے میں اعتراض نہ کریں۔''
''اس سے تو بہتر تھا آپ مجھے دو جوتے اور مار لیتیں۔ یہاں تو کوئی دیکھ بھی نہیں رہا۔ میں یہ بھی برداشت کرلیتا لیکن......''
ونالتا کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔''مان لیجیے یہ سچ بھی ہو۔میں تو کسی طرح کھوج کھاج کر اپنے لیے کوئی نہ کوئی نوکری ڈھونڈ ہی لوں گی لیکن آپ کی عمر کچی ہے۔راستہ لمبا ہے، ابھی تو بہت کچھ ہونا ہے۔''
''چھوڑیے...... لیکن آپ یہ چوڑی واپس لے لیجیے۔'' چوڑی ونالتا کے ہاتھ پر رکھ کر اس نے جانے کے لیے قدم اٹھایا۔
ونالتا نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔''سنیے، میں آپ سے التجا کرتی ہوں اسے لے لیجیے۔''
سجاے نے حیرت سے ونالتا کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔اس لڑکی کو اس نے پہلے بھی کتنی بار دیکھا تھا لیکن آج پہلی بار اس کے چہرے پر مانو کوئی نئی زبان لکھی تھی۔ سجاے نے اس بار ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے اس نے سوال کیا۔'' آپ چاہتی ہیں یہ چوڑی میں لے لوں؟''
''میں آپ سے عمر میں بڑی ہوں۔ آپ کو میری بات ماننا ہی پڑے گی۔'' اور اس کے منہ پر ہی اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیا تھا۔

☆☆☆

ایشوری پرشاد ہی بتاتا رہا۔''اس نہار گڑھ میں اس

بنگالی ڈاکٹر بابو کے آنے تک لوگ بیمار پڑنے پر ٹونا ٹوٹکا کرتے۔ دیوی دیوتاؤں کی منتیں مانتے اور جو لوگ پیسے والے تھے، وہ وید حکیم جی سے علاج کرواتے۔''

ایشوری پرشاد ناٹو کوئی قصہ سنا رہا ہو۔''نہار گڑھ چھوٹا سا شہر ہے تو کیا ہوا؟ یہاں کا راجا بالکل خاندانی بادشاہ تھا۔ راجا کی تین رانیاں تھیں۔ ہر رانی کی خدمت کے لیے تیرہ داسیاں الگ۔

''ہاں تو کسی ایک صبح اسی اجمیر اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کوئی چھوکرا سا ڈاکٹر اترا۔ ساتھ میں کوئی سوٹ کیس نہ بوریا بستر۔ ہاں چہرے سے تئیس، چوبیس کی عمر کا اندازہ ضرور ہوتا تھا۔''

☆☆☆

جب میں اجمیر میں تھا، اس کہانی کا تھوڑا بہت حصہ سدانند بابو سے بھی سن چکا تھا۔''ارے صاحب! وہ جو راجستھان نام کی جگہ دیکھ رہے ہیں نا، جس کا کہیں ٹھور ٹھکانا نہیں، اسے یہاں ضرور پناہ مل جاتی ہے۔''

سدانند بابو نے یہاں بنگالی مٹھائیوں کی دکان کھول رکھی ہے۔ اگر کوئی بنگالی اجمیر شریف آتا ہے تو اس کا اس دکان پر آنا لازمی ہے۔ سدانند بابو ہی بتا رہے تھے، نہار گڑھ کے راج محل میں بیاہ تھا۔ سندیسہ دینا اور رس گلوں کا ذمہ مجھ پر۔ اس پر سے یہ حکم بھی جاری کیا گیا کہ منجھلی رانی کو رس گلا بنانا بھی سکھانا ہوگا۔ وہاں جا کر دیکھا شاہی وید حکیم بھی بنگالی ہے۔ کم سن عمر لیکن میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ میں نے پوچھا۔''آپ یہاں؟''

ہاں یہ بہت سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ایک چھوکرا سا ڈاکٹر اسٹیشن سے سیدھا میرے یہاں آدھمکا۔ اس وقت میں دکان بند کرنے جا رہا تھا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے دریافت کیا۔''یہاں کسی دھرم شالا کا پتا بتا سکتے ہو؟''

میں نے پوچھا۔''آپ آ کہاں سے رہے ہیں؟''

''کلکتہ سے۔''

''آپ کے ساتھ اور کون کون ہے؟''اس کی خاموشی سے میں سمجھ گیا، وہ اکیلا آیا ہے لہٰذا تیرتھ، یاتری تو ہرگز نہیں ہے۔

میں نے دوبارہ پوچھا۔''آپ کرتے کیا ہیں؟''

''میں ڈاکٹر ہوں۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ڈاکٹری کرنے کے لیے بنگال چھوڑ کر یہاں کیوں؟ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے پوچھا۔''پاس میں کچھ روپے پیسے بھی ہیں یا بالکل ٹھن ٹھن گوپال ہو؟''

''نہیں...... پیسے ہیں۔''

لیکن میں فوراً تاڑ گیا، یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ گانٹھ میں پیسے ہوتے تو چہرے کی رنگت کچھ اور ہوتی۔ شاید گھر سے گہنے وغیرہ چرا کر بھاگ آیا ہے۔ یہاں تو ایسے جانے کتنے چھوکرے آتے ہیں۔ میں بھی تو ایک روز اپنی ماں سے جھگڑ کر اس ریتیلے دیش میں بھاگ آیا تھا۔ ممکن ہے یہ بھی میری طرح ہی کوئی بھگوڑا ہو۔ میرے ہاتھ میں مٹھائی کی ٹرے تھی۔ اسے بغل والے مکان میں دینا تھا۔ میں نے کہا۔''تم ذرا بیٹھو میں آتا ہوں۔''

''تھوڑی دیر بعد میں واپس لوٹا۔ بھلا کتنی سی دیر ہوئی تھی؟ یہی کوئی دو یا تین منٹ، دکان میں آ کر دیکھا۔ چاروں طرف بھائیں بھائیں سناٹا۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔ لگتا ہے میری پوچھ گچھ کے ڈھنگ سے اُسے کچھ شک ہو گیا۔ دکان سے باہر نکل کر میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ دور دور تک مجھے اس کا کوئی اتا پتا نہیں ملا۔

''ہاں تو صاحب! نہار گڑھ کے راج محل میں اس سے دوبارہ ملاقات ہوگئی۔ نہار گڑھ اسٹیٹ کوئی ایسی ویسی ریاست نہیں ہے۔ شہر چھوٹا ہے تو کیا ہوا؟ نہار گڑھ کے راجا خاندانی بادشاہ تھے۔ راجا کی تین رانیاں، ہر رانی کے لیے تیرہ تیرہ داسیاں، لاؤ لشکر، کھوجا، راج کمار لال جی صاحب، لال جی بھائی، بالکل شاہی تام جھام۔ ایسے خاندانی بادشاہ کی نیک نظر میں پڑنا کیا آسان بات ہے؟''

میں نے سوال کیا۔''ڈاکٹر نے اس راجا کو کیسے پٹالیا؟''

''ڈاکٹر نے بتایا تھا منجھلی رانی یشودہ بائی سخت بیمار تھیں۔ راج وید کا علاج بھی چل رہا تھا لیکن بیماری دور ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ رانی بالکل مایوس۔ ادھر میں اجمیر سے پیدل پاؤں بھٹکتا ہوا نہار گڑھ آ نکلا۔ راج محل کے پائیک برق انداز یعنی غلام چاکر، دکانوں پر سودا سلف خریدنے آتے یا پھر راستے میں گھومتے پھرتے مل جاتے۔ ان کی زبانی یہ خبر سن کر میں نے دعویٰ کیا کہ میں یشودہ بائی کا علاج کر سکتا ہوں۔

''لیکن رانی صاحبہ کو دیکھوں کیسے؟ راجا کے اندر محل میں گھسنے کون دے گا؟ بادشاہ کی مہر یعنی نشانی چاہیے۔ راجا نہ سہی کم سے کم دل کشا سہنا کی مہر چاہیے۔

''دل کشا سہنا تھا۔ اندر محل کا خاص خواجہ۔ اندر محل کا خاص پہرے دار۔ ہر طرف اس کی عزت۔ رانی صاحبہ سے

لے کر بڑی رانی لال بھائی، باندی، نوکرانی تک کو اندر محل سے باہر آنے کے لیے دل کشا سہنا کی مہر یعنی اجازت لینی پڑتی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''تب کیا ترکیب لڑائی؟''

انہی لوگوں نے بتایا۔ '' آپ ریذیڈنٹ صاحب سے ملاقات کیجیے۔''

''ریذیڈنٹ صاحب نے راجا صاحب کے نام ایک خط لکھ کر دے دیا۔

''اب راجا صاحب سے ملاقات ہونا بھی اتنا تو آسان نہیں تھا۔ راجا آخر راجا ٹھہرا۔ راجا دل جیت سہنا بہادر۔ درباری، تابعدار، ملازموں کا کہنا ہے کہ بحر ہند سے لے کر دور ہمالیہ تک ان کی سلطنت پھیلی ہوئی ہے۔ نہار گڑھ کے مغرب کے راجا حکمت سہنا بہادر نے مغل سلطنت کے خلاف بغاوت کر کے خود شہنشاہ اکبر سے اپنی بہادری کے لیے شاباشی حاصل کی تھی لیکن اب بہادری دکھانے کا موقع ہی نہیں آتا۔ ضرورت پڑنے پر اب راجا صاحب ریذیڈنٹ صاحب یا بڑے لاٹ صاحب کے ساتھ کبھی کبھار شکار پر ضرور چلے جاتے ہیں۔

''ہاں تو منجھلی رانی کی بیماری کی وجہ سے وہ بھی اداس رہا کرتے۔ ریذیڈنٹ صاحب کی چٹھی پڑھ کر انہیں کوئی اعتراض نہیں رہا۔ مہر لگا کر انہوں نے تابعدار کو حکم نامہ تھما دیا لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ ڈاکٹر جب مریض کو دیکھ کر لوٹے تب اس سے راجا کی نشانی واپس لے لی جائے۔ جتنے دن بیماری ٹھیک نہیں ہوتی اسے اندر محل میں جانے کے لیے نشانی عطا کی جائے، واپسی میں لے لی جائے۔

''اندر محل میں داخل ہونے کے لیے مجھے بھی مہر دکھانی پڑی۔ خواجہ دل کشا سہنا نے کافی غور سے اس نشانی کی جانچ پرکھ کی۔ اس کے بعد منجھلی رانی کے محل میں لے گیا۔

''اسی طرح تین روز گزر گئے۔ ڈاکٹر کو تین بار اندر محل میں جانا آنا پڑا۔ علاج چلتا رہا۔ رانی صاحبہ کی ساری دوائیں اجمیر سے منگوائی گئیں۔ ڈاکٹر نے دل کشا سہنا کو اچھی طرح سمجھا بھی دیا۔ اس کے بعد راجا کی نشانی دکھا کر اسے شاہی خزانے سے روپے بھی دلوا دیے گئے لیکن ابھی تک کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔

''اچانک جیسے دھماکا ہوا۔ راجا صاحب کے پاس خبر پہنچی کہ نئے بنگالی ڈاکٹر نے رانی صاحبہ کو صحت یاب کر دیا ہے۔ اسے راجا صاحب کے عام دربار میں طلب کیا گیا۔''

☆☆☆

سدا نند بابو نے ہی بتایا۔ '' صاحب! اسی کو کہتے ہیں مقدر کا سکندر۔ یہ معمولی سا چھوکرا ممکن ہے اپنی ماں کی چوڑیاں چرا کر بھاگ آیا ہو۔ یہاں آکر ایک دم سے شاہی معالج بن گیا۔ پرانے شاہی وید کی چھٹی ہوگئی۔ ان سے صرف جاگیر نہیں چھینی گئی۔ راجے رجواڑے کا معاملہ ٹھہرا۔''

میں نے اس ڈاکٹر سے پوچھا۔ '' آپ نے تو ڈاکٹری پاس کی ہے نا؟ آپ کو نوکری کی کیا کمی؟ اتنے دنوں میں آپ بنگال میں کوئی نوکری نہیں ڈھونڈ سکے؟''

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''اصل میں کسی وجہ سے اپنے دیش میں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔ اس لیے لاچار ہو کر آنا پڑا اور نہ......''

میں نے پھر پوچھا۔ ''کیوں کیا ہوا تھا؟''

ڈاکٹر چپ رہا۔ ادھر راجا صاحب نے اس کے لیے ایک بڑی حویلی بنوادی۔ حویلی کے سامنے لمبا چوڑا باغ صرف راج سے ٹھاٹ باٹ ہی نہیں راج محل کی عورت بھی۔

سدا نند بابو نے دوبارہ باتوں کی کڑی جوڑ دی۔ ''تو پھر سنیے۔''

☆☆☆

ہاں وہ نہایت عجیب و غریب اتفاق تھا۔ کم سے کم ہماری آنکھوں کے لیے وہ اتفاق ہی تھا۔ نہار گڑھ کے علاقے میں بھی یہ لمبی داستان بن گئی۔ نہار گڑھ کا راجا عیش کرتا تھا۔

کام دھام کے بجائے ہر وقت صرف عیاشیوں میں ڈوبا رہتا۔ تبھی تو میں گیا تھا رس گلے بنانے اور انعام میں اینٹھ لایا ہیرے کی پانچ انگوٹھیاں۔ ہاں تو صاحب...... ہوتے ہوتے معاملہ یہاں تک آپہنچا کہ وہ ڈاکٹر راجا صاحب کا بہت زیادہ دلارا ہو گیا۔ چاہے کوئی بیماری ہو یا نہ ہو، ڈاکٹر صاحب کو جب تب طلب کیا جاتا۔ اندر محل میں بڑھیا شربت بنا ہے۔ بلاؤ ڈاکٹر صاحب کو۔ ادھر ڈاکٹر کو بھی بھلا کیا کام۔ شاہی ڈاکٹر تو ہو ہی گئے۔ تین ہزاری جاگیر کا بھی مالک بن گیا۔ راجا کے حکم پر حضور کے دربار میں حاضری دینا ہی تو شاہی ڈاکٹر کا اصل کام ہے لیکن ان دنوں بھی جب وہ فرصت میں ہوتا یا ریگستان کی تپتی ہوئی راتوں میں جب وہ اپنے کمرے میں اکیلا لیٹا ہوتا یا نیند نہ آنے پر بے چینی سے کروٹیں بدل رہا ہوتا، تب اسے کسی کی بے طرح یاد آتی۔

سہاسے نے کہا تھا۔ '' سنو! کسی نہ کسی روز تمہارا ادھار ضرور چکا دوں گا۔ اس وقت اس وعدے کے علاوہ میں اور کچھ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔''

ونالتا نے کہا۔ ''اسے ادھار کیوں مانتے ہو؟ مان لو میں نے تمہیں دے دیا ہے۔'' اس روز سجاے اس کی باتوں پر خوب ہنسا تھا۔

ونالتا نے پوچھا تھا۔ ''اب کیا یہ بھی یاد دلانا ہوگا کہ خط برابر لکھتے رہنا۔''

سجاے نے پہنچ کر ایک خط بھی ڈالا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''راجپوتانے کے اس بنجر ریگستان میں ابھی تک کسی دیپ کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔ راستے راستے بھنے چنے پھانکتا ہوں اور صرف کنوئیں کے پانی کا آسرا بھروسا ہے۔ تمہاری چوڑی خرچ کرنے میں آج بھی ڈر لگتا ہے۔ بس اسے ہر وقت اپنے پاس رکھتا ہوں۔ اسی بہانے تم بھی کہیں میرے پاس...... بالکل قریب ہو، یہ تسلی بنی رہتی ہے۔''

اس خط میں کہیں بھی ونالتا سے چلے آنے کا ذکر نہیں تھا۔ ونالتا وہ خط کئی کئی بار پڑھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد خط کو آنچل میں باندھ کر اس نے چولہے پر چاول چڑھا دیے۔ چھبیس سال کی عورت اگر دل کی سچی بات لکھنے پر اتر آئے تو کہیں اس کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اسے کہیں نوکری نہیں ملی تھی لیکن اس نے لکھا۔

''ایک نئے اسپتال میں نوکری مل گئی ہے۔ کلکتے سے ذرا دور ضرور ہے۔ سو اگر وقت پر میرا خط نہ ملے تو تم پریشان نہ ہونا۔''

دوپہر کو کھانے کے بعد وہ زمین پر ہی پڑ گئی۔ ادنہہ سجاے تو دیکھنے آنہیں رہا لیکن راجستھان تو کلکتے میں نہیں، نہ ہی نہارگڑھ میں کلکتہ شہر۔

ڈاکٹر سجاے کی عمر ابھی کل تیس سال ہے۔ وہ بھلا چھبیس کی عمر کا درد کیا سمجھے؟ صبح سویرے نیند سے جاگ کر اس کا پہلا کام ہوتا... سجنا سنورنا، راج دربار میں جا کر راجا دل جیت سہنا بہادر کو کورنش کر کے بیٹھے رہنا۔ دربار ختم ہوتے ہی گھر لوٹ کر کسی طرح کھانا گلے سے نیچے اتار کر اسے فوراً راج محل کے تہ خانے کی ڈیوٹی کے لیے بھاگنا پڑتا۔ دوپہر کی گہری نیند کے بعد راجا جوا کھیلنے بیٹھتے۔ پہلے کوئی دوسرا ساتھی تھا، اب اس کی جگہ ڈاکٹر صاحب ہیں۔ کبھی راجے کے شاہی دوست دیوان رانی جی، وزیر پیش کار سبھی جوئے کے کھیل میں شامل ہوتے تھے لیکن اب صرف ڈاکٹر۔

راجا صاحب ایک روز ایکا ایکی پوچھ بیٹھے۔ ''تم جوا کھیلنا جانتے ہو ڈاکٹر؟''

سجاے نے جواب دیا۔ ''جانتا ہوں حضور۔''

ہاں کبھی سجاے بھی جوا کھیلا کرتا تھا۔ ان دنوں اسے اڈے بازی کا شوق جو چرایا تھا لیکن اب تو اپنی نوکری قائم رکھنے کے لیے جوا کھیلنا ضروری ہو گیا۔ یوں جوا کھیلتے کھیلتے ہی ایک دن اس کی زندگی میں عیاشی کے ڈھنگ بھی آپہنچے۔ اگر سجاے جوا نہ کھیلتا تو میں کہانی کار کی حیثیت سے شربتی بائی کی کہانی سے انجان رہ جاتا۔

وہ کہانی بھی سدانند بابو نے ہی سنائی تھی۔ ''صاحب! میں یہاں گیا تو تھا رس گلے بنانے لیکن سن آیا شربتی بائی کی کہانی۔''

☆☆☆

راجے رجواڑوں کے اندر محل کے قصے۔ اندر محل میں چاروں طرف گلابی اوڑھنی اور کنیزوں، باندیوں اور خدمت گاروں کی گھاگ نگاہیں۔ باہری دنیا کی کوئی خبر یہاں تک نہیں پہنچتی۔ یہاں زیادہ تر ایسی ہی عورتوں کی کہانیاں مشہور ہیں جو اسی محل کے اندر پیدا ہوئیں اور یہیں پر مر گئیں۔ تیج تہوار اور ہولی دیوالی پر یہاں شہر سے سیٹھ ساہوکار، زمیندار کی ٹھکرائنیں آتیں۔ تہوار کے بعد ان میں بعض ہی اپنی حویلی لوٹ پاتیں۔ جن پر خاص راجا صاحب کی نظر گڑ جاتی، وہ پھر کبھی واپس نہیں جاتیں۔ ایسے ہی جانے کتنی عورتوں کی اونچی چیخیں محل کے قید خانے میں دم توڑ گئیں۔ ویسے جس پر ایک بار راجا کی نظر گڑ گئی، اس کی زندگی کی کوئی خواہش ادھوری نہیں رہتی۔ اس کے لیے جانے کتنی کتنی کوششیں کی جاتیں۔ مہارانی کی خوشامد کرو، راج ماتا، پیش کار، پیشوا جی، ہر کسی کے تلوے چاٹو۔ سب سے زیادہ اندر محل کے اکلوتے پہرے دار خواجہ دل کشا سہنا کی آرزو منت کرو۔ شربتی بائی بھی ایسی ہی عورتوں میں سے ایک تھی لیکن پھر بھی ان سب سے کہیں بالکل الگ اور انوکھی۔

ویسے جوئے کے کھیل میں ہار زیادہ تر راجا صاحب ہی کی ہوتی۔ راجا صاحب ہار کر بھی خوش ہوتے۔ سدانند بابو نے مزید آگے کی کہانی بھی سنائی تھی۔

''بات یہ ہے صاحب، اس زمانے کے راجا مہاراجاؤں کے پاس ڈھیر ڈھیر کام کاج ہوتے تھے، سمجھوتے تھے، دوسرے راجواڑوں کے ایک دوسرے کے ساتھ دوستیاں تھیں لیکن آج کل کے راجاؤں کے پاس کون سا کام ہے؟ جب کوئی خوب صورت لڑکی ملی، اٹھا لاؤ۔ کسی کی بیوی اپسرا ہے پکڑ لاؤ۔ ہر راجا کا اندر محل ایسی ہی سیکڑوں ہزاروں عورتوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس اندر محل میں راجا صاحب ہی اکلوتے اکیلے مرد لیکن یہ سب بھی ہر وقت بھلا نہیں لگتا۔ اس لیے بیچ بیچ میں شکار دکار پر بھی جایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نہارگڑھ کے راجا صاحب کی عمر بھی بہت

کم ہے۔ تین تین رانیاں اور وہ رانیاں بھی راجا صاحب سے عمر میں کافی بڑی۔ مہاراجا صاحب کی عمر جب کل بارہ سال کی تھی تب بڑی رانی بیس سال کی تھیں۔ چھوٹی رانی صاحبہ تو تب آئی بھی نہیں تھیں۔ بیاہ کے وقت ہر رانی کے ساتھ جہیز میں آئی ہوئی تیرہ چودہ داسیاں وہ سب بھی جوان جہان۔ اس کے علاوہ اندر محل میں رانی کی سکھیاں، خدمت کے لیے ملی ہوئی لڑکیاں۔ خیر صاحب! مجھلی رانی کو رس گلا بنانا سکھانے کے لیے کئی بار اندر محل میں گیا لیکن کبھی کسی حسینہ کی ایک جھلک تک نہیں ملی۔ خواجہ صاحب کا قانون بے حد سخت تھا لیکن ڈاکٹر کی بات تو بالکل الگ تھی۔ ایک تو راج دید، اس پر سے راجا صاحب کا دلارا۔

کھیل میں ڈاکٹر نے راجا کو آگاہ کیا۔ ''حضور! آپ کا ہاتھی تو قید ہو گیا۔''

راجا صاحب نے پُرجوش آواز میں جواب دیا۔ ''تم بس دیکھتے رہو ڈاکٹر، تمہارے وزیر کی کیا درگت کرتا ہوں۔''

راج محل کی سطح سے بہت نیچے گڑا ہوا تہ خانہ...... اس لیے گرمیوں میں وہاں بڑا آرام رہتا ہے۔ اندر محل سے یہاں تک آنے کے لیے لمبی سرنگ۔ راجا صاحب اپنے ماتحت خدمت گاروں اور درباریوں کو سنا کر کہتے۔ ''اس ڈاکٹر کی عقل واقعی بڑی تیز ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس کے بعد کیا ہوا بتایئے نا؟''

سدانند نے کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد ہی تو شربتی بائی آئی۔ اس دن دوپہر سے ہی بازی بچھ گئی۔ ایک کے بعد ایک، چھ بار راجا صاحب ہار گئے۔ ساتویں بار بھی وہ ہارنے ہی والے تھے یعنی بازی مات ہونے والی تھی۔ اف اس کمبخت ڈاکٹر سے جیتنے کی کوئی ترکیب نہیں۔ ٹھیک اسی وقت عجیب واقعہ ہو گیا۔

''اس دن بھیانک گرمی تھی۔ تہ خانہ تھا تو کیا ہوا؟ چھت کی جلا دینے والی گرمی۔ باہر لو چل رہی تھی۔ چلچلاتی دھوپ میں سانس لینی مشکل ہو رہی تھی۔ پیاس کے مارے گلا سوکھ کر بالکل کاٹھ۔ ڈاکٹر کو پیاس لگ گئی لیکن اسے کسی طرح کے عرق یا نشیلے شربت کی حاجت نہیں تھی۔ اس نے صرف ایک گلاس پانی کی فرمائش کی۔

''راجا صاحب نے تالی بجائی۔ اس تالی کا مطلب خاص خاص لوگ ہی سمجھا کرتے تھے۔ تالیوں کی آواز پر سرنگ کی راہ سے آئی شربتی بائی۔ کھیل چھوڑ کر ڈاکٹر کی نگاہیں یک ٹک شربتی بائی پر گڑ گئیں۔ گلابی رنگ کا بوٹے دار گھاگرا، کمر پر چھوٹی چولی اور زری دار زعفرانی رنگ کی مہین اوڑھنی، سر پر سونے کا گھڑا اپنے دونوں نازک ہاتھوں میں تھامے ہوئے وہ کمرے میں آ کھڑی ہوئی۔ مانو وہ زمین پر چل کر نہیں پانی میں تیرتی ہوئی آئی ہو۔ پانی پی کر ڈاکٹر نے دوبارہ چال چلی لیکن اس دن دوبارہ کھیل جم نہ سکا۔ راجا صاحب ہکا بکا رہ گئے۔ ڈاکٹر پہلی بار ہار گیا۔

اٹھنے سے پہلے راجا نے سر پر پگڑی رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں ایک تحفہ دوں گا ڈاکٹر۔''

''تحفہ؟''

راجا صاحب نے سوال کیا۔ ''تم نے تو ابھی بیاہ نہیں کیا نا؟''

''نہیں۔''

''چلو اب تم بیاہ کرلو۔''

ڈاکٹر نے حیرت بھری آواز میں پوچھا۔ ''کس سے؟''

''شربتی سے تمہارا بیاہ کرے دیتا ہوں۔''

☆☆☆

ادھر میلوں دور کوئی لڑکی اسپتال میں ڈیوٹی کرتے کرتے اچانک گم صم ہو گئی۔ اتنی بڑی دنیا میں اس کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ اپنی ایک عدد سونے کی چوڑی دے کر اس نے کبھی کسی بھٹکے ہوئے راہ گیر کی مدد کی تھی شاید وہ بھی اب کسی نئی نوکری میں مست ہو گیا۔ ونالتا نے خط لکھا...... ''اس نوکری میں بالکل فرصت نہیں ملتی۔ وقت سے اگر خط نہ بھیجوں تو پریشان نہ ہونا۔ نئی نئی جگہ ہے۔ خوب دودھ پیا کرو اور اس دیش میں اصلی گھی بھی ضرور ملتا ہوگا۔ تم اپنے لیے گھی کا بھی انتظام کرلینا۔ آج کل بازار میں اچھی مچھلی آنے لگی ہے۔ تمہارے بغیر دل اداس رہتا ہے۔''

ہاں ونالتا کے خطوں میں چھبیس سال عمر کی تمام کمزوریاں بھی صاف ظاہر تھیں لیکن جب وہ انا کی قید میں بند ہوتی تو ایسا لگتا مانو آمنے سامنے کھڑے ہونے کے باوجود وہ کہیں اونچی جگہ پر کھڑی ہے اور اپنے سے نیچے زمین پر کھڑے انسان کو گھور رہی ہے۔

سہائے بھی اپنے خطوں میں لکھتا رہا۔ ''سنو تمہاری سونے کی چوڑی بیچنے کی اب ضرورت نہیں رہی۔ پھر بھی میں اسے ہر وقت اپنے پاس رکھتا ہوں۔ لگتا ہے جیسے تم بھی میرے قریب ہو...... بالکل دل کے قریب۔''

ونالتا ان خطوں کو بار بار پڑھتی۔ گھما پھرا کر کوئی نکتہ بھی نکالتی۔ کبھی کبھی تو کھانا بناتے ہوئے بھی ان خطوں کو کھول کھول کر پڑھتی رہتی لیکن اس نے تو آنے کے لیے کہیں ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ ممکن ہے ابھی تک وہ ٹھیک طرح سے پاؤں

بھی جمانہ پایا ہو۔ بلانے سے پہلے وہ چاہتا ہوگا اپنا گھر اچھی طرح سجا لے، سارا انتظام پکا کر لے۔ ونالتا کو جہاں تہاں تو نہیں رکھ سکتا نا۔ ادھر ونالتا خود اپنی زبان سے کیسے کہے کہ وہ آرہی ہے؟ لیکن اس نے بھی تو آنے کو نہیں لکھا..... کاش وہ لکھ بھیجتا تم جلی آؤ ونالتا۔ میں تمہارے لیے گھر سجائے بیٹھا ہوں۔ اب چھوڑو اپنی نوکری۔ میں تو ہوں ہی، اب میں تمہیں نوکری نہیں کرنے دوں گا۔

ادھر ونالتا آئے دن اسپتال بدلتی رہتی۔ کہیں اس کی پٹری ہی نہیں بیٹھتی تھی۔ کہیں ذرا سا اونچ نیچ ہوئی نہیں اور وہ جھٹ بلہ جھاڑ کر کھڑی ہو جاتی۔ ''دیکھیے، میں آپ لوگوں جیسی بے بس اور لاچار نہیں، اگر میں نوکری چھوڑ بھی دوں تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

جانے کتنے کتنے برسوں پہلے کا حادثہ ہے۔ یہ سنی سنائی کہانی دوبارہ یاد بھی نہیں آتی اگر آج تمہارا خط نہ ملا ہوتا۔

ویسے اصل کہانی اس ونالتا کے اردگرد ہی گھومتی ہے لیکن شربتی بائی کی کہانی کے بنا ونالتا کی کہانی پوری نہیں ہو سکتی۔

سرلا دی نے پوچھا۔ ''یہ سویٹر کس کے لیے بُن رہی ہو ونالتا باجی؟''

ونالتا کو سجھاے کا نام لیتے ہوئے شرم آئی، اس نے کہا۔ ''کوئی نہ کوئی تو آئے گا ہی، اسی کو تھما دوں گی۔''

سرلا دی نے لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''کسی کو آنا ہوتا تو ابھی تک آ ہی جاتا بہنا۔ ادھر ہم سب کی عمر تو ہر پل بڑھتی ہی جا رہی ہے۔''

کبھی کبھی سرلا باجی کہتی۔ ''تم راجپوتانہ جانے کی بات کر رہی تھیں، جاؤ گی نہیں؟''

ونالتا نے کہا۔ ''ارے ہٹ! وہ بھی یوں ہی کہہ دیا تھا۔''

اس کے بعد ونالتا پورا پورا خط شروع سے آخر تک پڑھ جاتی۔ نہیں، کہیں بھی یہ نہیں لکھا ہوتا۔ ''تم نوکری چھوڑ

کر چلی آؤ۔ اب تمہیں نوکری کرنے کی ضرورت نہیں۔''
اچھا ایک یہی بات وہ صاف صاف لکھتا کیوں نہیں؟

☆☆☆

''بنگال...... یہ کون سی جگہ ہے؟'' شربتی بائی نے پوچھا تھا۔

''یہاں سے بو...... ہ...... ت دور۔'' سجھاے نے سمجھایا۔

اس دوری کا اندازہ لگاتے ہوئے شربتی بائی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دور کے آدمی سے اسے بہت ڈر لگتا تھا۔ شربتی بائی کی آنکھوں میں بھی ڈر کی چھایا اتر آئی۔

جودھ پور، جے پور سے آنے والے ناتے رشتے داروں کا تانتا لگ گیا۔ اندر محل میں مہمانوں کی بھیڑ، راج پروہت نے منتر پڑھ کر ان کا بیاہ کروایا۔ بیاہ چاہے بنگالی رسم ورواج کی طرح ہو یا راجپوتی آن بان شان سے، بیاہ تو آخر بیاہ ہی ہوتا ہے نا۔

بیاہ، کھانا، سہاگ رات سبھی کچھ ہوا۔ راجا صاحب نے صرف ایک بار پوچھا۔ ''اپنے کسی ناتے رشتے دار کو مٹھائی نہیں بھیجو گے؟''

لیکن اس کا اس دنیا میں آخر ہے ہی کون جسے وہ مٹھائی بھیجے۔ جو لوگ اس کا بیاہ کرتے، وہ بھی تو ابھی زندہ ہیں لیکن سجھاے نے جب ان سے بھی واسطہ نہیں رکھا، اب ضرورت بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ راجا صاحب اکیلے ہی سو کے برابر ہیں۔

لیکن شربتی بائی نے سہاگ رات کے دن ہی اسے روک دیا تھا۔ ''نہ...... مجھے چھونا مت۔''

ابھی تو شروعات ہیں۔ شاید اسے شرم آرہی ہوگی لیکن وہ عورت راج گھرانے کے اندر محل میں پلی بڑھی اور بڑی ہوئی۔ جوانی کے تمام کھیل کھلواڑ اسے انگلیوں کے پور پر یاد ہونے چاہئیں۔ عورتیں کیسے پوری دنیا بھر کو جیت لیتی ہیں، اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ معمولی کسان کی بیٹی کیسے مہارانی سے بھی اونچا مقام حاصل کرلیتی ہے، اس کا بھی اسے تجربہ ہوگا۔

سہاگ رات کو اس رنگ اور روپ کی محفل میں شربتی بائی کا پاگل کردینے والا نشئی روپ آندھی طوفان کی طرح یک بارگی لہرا اٹھا تھا۔ سجھاے اس خوب صورت حسن کو جیتنے کے لیے پاگل ہوا تھا۔ جوا کھیلتے وقت وہ اسی طرح ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا۔ باہر ریگستان پر برستی ہوئی رات مانو کسی جادو منتر سے اور زیادہ نشیلی ہوگئی تھی۔ راجا صاحب کے حکم پر وہ کمرا سجاوٹ سے جگمگا اٹھا تھا اور اس پر عطر، عرق گلاب، پھول پاتی، کہیں کوئی کمی نہیں۔ انت پور کی عورتیں وداعی کا آخری گیت گا کر رخصت ہو چکی تھیں۔ محل کے باہر محفل کا مزہ ابھی باقی تھا۔ ہوا میں تیرتے ہوئے میٹھے گیت کی آواز اندر کمرے تک سنائی دے رہی تھی۔

شربتی بائی چیخ اٹھی۔ ''آپ کے پاؤں پڑتی ہوں بابو صاحب...... مجھے ہاتھ مت لگائیے۔''

''کیوں؟''

بیاہ کی پہلی رات، کسی بیاہتا کا ایسا عجیب وغریب رویہ آج تک کسی نے نہیں سنا لیکن وہ رات...... بس اسی طرح گزر گئی۔ ساری رات دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

ایک پلنگ کے اوپر اور دوسرا پلنگ کے نیچے زمین پر۔ رات کے تازہ کھلے پھول صبح مرجھا کر باسی پڑ گئے۔ عطر اور عرق گلاب کی تیکھی خوشبو بھی ریگستان کی ریت میں گھل مل کر جانے کب ہوا میں اڑ گئی۔

پو پھٹتے ہی شربتی بائی سرنگ کی راہ انت پور میں سما گئی اور سجھاے سامنے والے دروازے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

ان دنوں سجھاے کافی چھوٹا ہی تھا۔ جب اس کے باپو نے کہا۔ ''اب تم نوکری چاکری ڈھونڈ لو، اب میں تمہیں اور آگے نہیں پڑھا سکتا۔''

اس دن سجھاے نے حال ہی میں آئی ایس سی پاس کیا تھا۔ اس نے صاف جواب دے دیا۔ ''کلرکی میرے بس کی بات نہیں۔''

باپو نے ایک دم سے بھڑک کر کہا۔ ''تب پھر تمہارے جو دل میں آئے کرو لیکن اب مجھ میں تمہیں آگے پڑھانے کی ہمت نہیں۔''

اس نے کاکا لوگوں کے دربار میں فریاد کی۔ ان لوگوں نے بھی یہی رائے دی۔ ''بھئی ڈاکٹری پڑھنا کوئی آسان بات نہیں۔ صرف روپے ہی سے تو کام نہیں چلنے کا۔ اس کے لیے دماغ بھی چاہیے۔''

حالانکہ اس کے باپو اسے ڈاکٹر نہیں دیکھ پائے۔ ماں بھی بہت پہلے ہی چل بسی لیکن کاکا نے اسے ڈاکٹر بنتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد ہی تو اس کے ماتھے پر کلنک کا داغ لگ گیا۔ مارے شرم کے دیش چھوڑ کر بھاگ آنا پڑا۔ اب بنگال سے اس کا کوئی رشتہ تعلق ہی نہیں رہا۔ صرف ونالتا سے ہی تھوڑا بہت رشتہ بچا تھا لیکن وہ نالتا کو بھی یہ خبر کیسے دے سکتا ہے؟ ابھی اتوار کو ہی ونالتا کا خط آیا ہے، لکھا ہے۔

''نوکری نے بے حد پریشان کر رکھا ہے، بالکل

فرصت نہیں ملتی۔ سوچتی ہوں کسی اور اسپتال میں نوکری لے لوں۔ یہاں کی میٹرن مجھے پھوٹی آنکھ نہیں بھاتی۔''

رہنے دو...... دنا لتا کو اب نوکری میں ہی مصروف رہنے دو اور ..... سجاے بھی جہاں ہے، وہاں پڑا رہے۔ یہاں شربتی بائی ہے، راجا صاحب ہیں، اسے ڈر کس بات کا؟

☆☆☆

سجاے نے پوچھا تھا۔ ''تمہیں کیا مجھ سے ڈر لگتا ہے؟''

شربتی بائی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بوٹے دار گلابی گھاگرا، چھوٹی سی چولی اور زعفرانی رنگ کی مہین اوڑھنی میں اس نے خود کو اتنا خوب صورت اور جاذب نظر بنا رکھا تھا مانو چھونے سے بھی میلی ہو جائے گی لیکن سچ ہے شربتی بائی میلی نہیں ہوئی۔

اس نے سجاے سے صرف اتنا ہی پوچھا تھا۔ ''تم نے مجھ سے بیاہ کیوں کیا بابو صاحب؟''

''کیوں؟ تم سکھی نہیں ہو؟''

☆☆☆

راجا صاحب نہیں رہے۔ تینوں رانیاں بیوہ ہو گئیں۔ ریاست کی رنگت ہی بدل گئی۔ ڈاکٹر کا بھی پہلے جیسا رعب داب اور دبدبہ نہیں رہا۔ صرف جاگیر بچ گئی۔ خیر وہ تو خود راجا صاحب ہی اسے تین ہزاری سے پچاس ہزاری بنا گئے تھے۔ اس لیے تھوڑا بہت رتبہ بچا کھچا رہا۔

شربتی کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ اب تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ سجاے اسے انجکشن پر انجکشن دیے جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی ہے۔ ہر وقت بھاری بھرکم کتابیں کھولے بیٹھا رہتا۔ اتنا لمبا چوڑا ڈاکٹری کا کورس ہے۔ اتنی اتنی دوائیں ہیں۔ کیا اس روگ کا کوئی علاج نہیں ملے گا؟ کیا سچ میں یہ روگ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا؟ سجاے ہولے ہولے سے شربتی بائی کے زخموں پر مرہم لگاتا۔ کہاں اڑ گیا شربتی بائی کا وہ روپ سنگار؟ اب تو وہ اتنی لاچار ہو گئی ہے کہ اس کا ہاتھ منہ بھی دوسرے کو دھونا پڑتا ہے۔ شربتی بائی بس ہر پل بھیانک درد سے چھٹ پٹاتی رہتی۔

کبھی کبھی اس کی ادھ کھلی آنکھیں سجاے کے چہرے پر ٹک جاتیں۔ مانو سوال کر رہی ہیں۔ ''مجھ سے تم نے بیاہ کیوں کیا بابو صاحب؟''

لیکن سجاے اب کس سے کیفیت طلب کرنے جائے؟ جس سے جواب طلب کیا جا سکتا تھا، اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔ لال صاحبوں کے غصے کے شکار راجا صاحب قتل کر دیے گئے۔ اب صرف ان کی روح انت پور کے محل کنگوروں، بھول بھلیوں..... کوٹھری کپھاؤں، سرنگ کی پتلی والی گلی گلیاروں میں منڈلاتی رہتی ہے۔ ان کی پیاسی روح راج ماتا مہارانی، پیشواؤں، پیش کاروں کے کمروں میں... ہاہاکار کرتی ہوئی بھٹک رہی ہے۔

☆☆☆

رات کے ناچ گانے کی محفل میں شربتی بائی سے پھر ملاقات ہوئی۔ کل ایک دن میں ہی اس کا چہرہ بے حد کمھلا گیا تھا۔ اب وہ راج پرشادانت پور چھوڑ کر سجاے کی حویلی میں رہنے لگی تھی۔ راجا صاحب نے دونوں کے لیے ایک بڑی حویلی بنوا دی تھی۔ وہ پینٹنگ کمرے کی دیوار پر ٹانگ دی گئی

تھی۔ واقعی شربتی بائی بے حد خوب صورت لگ رہی تھی لیکن سبھاش نے محسوس کیا شربتی بائی اپنا چہرہ مانو جان بوجھ کر گھونگٹ میں چھپائے ہوئے ہے۔ ہاتھ پکڑتے ہی شربتی بائی نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے مت چھونا تم بابو صاحب۔''

''اپنی بیوی کو بھی نہیں چھو سکتا؟'' سبھاش کو اس کا یہ رویہ بہت عجیب لگا۔

شربتی بائی نے بتایا۔ ''نہیں، مجھے بڑا بھیانک روگ ہے بابو صاحب۔''

''روگ......؟'' سبھاش سچ مچ دو قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن شربتی بائی اگر بیمار ہے تو وہ بھی تو آخر ڈاکٹر ہے۔ ایسی کون سی بیماری ہے؟ کیسا روگ ہے؟ آج کل تو سبھی بیماریوں کی دوا موجود ہے۔ علاج بھی ہے۔ وہ اسے روگ سے چھٹکارا دلا سکتا ہے۔ بیماری سے کیا ڈرنا؟ لیکن ڈاکٹر مریض کو ہاتھ نہ لگائے، یہ کیسی بات؟

شربتی بائی نے کہا۔ ''مجھے چھونے سے میرا روگ تمہیں بھی لگ جائے گا بابو صاحب۔''

اب سبھاش نے سیدھے سیدھے ہی سوال کیا۔ ''ایسا کون سا روگ ہے؟''

شربتی بائی نے جواب دیا۔ ''تمہیں نیچا دکھانے کے لیے ان لوگوں نے مجھے تمہارے کھیل کی محفل میں بھیجا تھا۔ وہ لوگ تم سے بہت ناراض ہیں بابو صاحب۔''

''ناراض ہیں، بھلا کیوں؟''

''راجا صاحب جو تمہاری مٹھی میں تھے اس لیے......''

''اچھا؟ لیکن ان لوگوں نے مجھے نیچا کیسے دکھایا، ذرا یہ بھی تو سنوں۔''

''تم سے میرا بیاہ کروا کر انہوں نے تمہاری زندگی جو برباد کر دی۔''

''ارے بھئی تم سے بیاہ کر کے میری زندگی کیوں برباد ہونے لگی؟''

شربتی بائی نے جواب دیا۔ ''ہاں بابو صاحب، ہوگئی۔ میری زندگی تو خیر بالکل ہی تباہ ہو چکی ہے۔'' سارا قصہ سن کر سبھاش سن رہ گیا۔

شربتی بائی نے بتایا۔ ''مجھ جیسی ڈھیروں ڈھیر لڑکیاں ہیں بابو صاحب۔ کسی کو نیچا دکھانا ہو یا جڑ سے مٹانا ہو۔ ہمارے ذریعے انہیں بھر ما کر ان کی جوانی تباہ کر دی جاتی ہے۔''

''اور وہ لڑکیاں؟''

شربتی کے ہونٹوں پر پھیکی سی ہنسی کھنچ گئی۔ ''وہ سب اسی اندر محل میں ایک بھیانک درد سے تڑپتی ہوئی کوڑھ سے سڑ کر مر جاتی ہیں۔''

''راجا صاحب یہ سب باتیں جانتے ہیں؟''

شربتی بائی نے جواب دیا۔ ''اعلیٰ حضور کو سب باتوں کی معلومات ہیں۔ صرف میرے ہی بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ یہ بھی خواجہ دل کشا سہنا کا کرتوت ہے۔ لال صاحب کی سازش اور بڑی رانی چندراوتی کی صلاح سے یہ جال رچایا گیا۔''

☆☆☆

خیر یہ سب برسوں پرانی باتیں ہیں۔ اگلے دن بالکل صبح صبح ہی وہ راجا صاحب سے ملاقات کی اجازت مانگنے کے لیے دربار میں گیا تھا۔

مگر راجا سے ملاقات نہ ہو پائی۔ ریذیڈنٹ صاحب تشریف لائے۔ کچھ دن جانچ پڑتال چلی۔ اندر محل کی اونچی دیواروں سے ہو کر ڈھیروں پانی گزر گیا۔

اس دن پوری ریاست میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ جانے کتنی کتنی افواہیں اڑیں۔ جانے کتنی کتنی کہانیاں بنیں۔ کسی نے کہا۔ ''حضور! یہ لال جی صاحب کے کرتوت ہیں۔''

کسی نے کہا۔ ''اس میں رانی چندراوتی کی صلاح تھی۔''

کسی کا خیال تھا۔ ''اس میں دل کشا کا ہاتھ ہے۔''

ریذیڈنٹ صاحب کی رپورٹ پہنچی۔ نہار گڑھ کے کوتوال کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

☆☆☆

شربتی بائی نے پوچھا۔ ''میرے لیے آپ اتنی تکلیف کیوں اٹھا رہے ہیں بابو صاحب؟''

اب شربتی بائی زیادہ بات بھی نہیں کرتی۔ بس اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ٹکر ٹکر تاکتی رہتی۔ کبھی کبھی اس کے ہونٹوں کی گلابی پنکھڑیاں ہلکے سے کانپ کر رہ جاتیں۔ ''اس بیاہ کو بیاہ نہیں کہتے بابو صاحب۔ آپ مجھے بھول جائیے۔''

اس وقت سبھاش کی نگاہیں کسی کھلی کتاب پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس نے پوچھا۔ ''تمہیں بھوک لگتی ہے شربتی بائی؟''

کتاب پڑھتے پڑھتے اس کے دل میں پھر کوئی سوال جاگ اٹھا۔ وہ پوچھتا۔ ''دیکھو مجھ سے شرمانا نہیں، میں ڈاکٹر ہوں۔ جو جو پوچھوں سچ سچ جواب دینا۔''

ادھوری زندگی ...... ایسی ادھوری زندگی کا ذکر اسے موٹی موٹی ڈاکٹری کتابوں میں بھی نہیں ملا۔ جانے کہاں کہاں سے چن کر لائی گئی لڑکیاں۔ سب کی سب گاؤں کی بھولی بھالی کشوریاں، شاید کوئی کنوئیں پر پانی بھرنے آئی تھی۔ اس کے بعد اس کا اتا پتا ہی نہیں چلا۔ کوئی بے مطلب

ہی ایک دم سے لاپتا۔ اس کے بعد انہیں دل کشا سہنا کے ہاتھوں سونپ دیا جاتا۔ ان لڑکیوں میں جو ذرا زیادہ خوب صورت تھیں، انہیں چن لیا گیا اور ان کے جسموں میں اندیشے روگ کا زہر بھر دیا گیا۔

جب کسی کو نیچا دکھانا ہوتا یا کسی کی زندگی تباہ کر دینے کی ضرورت پڑتی تو ان کے پاس یہ لڑکیاں ایک آدھ رات کے لیے بھیج دی جاتیں۔ ان روایتی زہریلی عورتوں کے ساتھ رات گزارنے والا بعض اوقات دشمن تو جلد ہی ہلاک ہوجاتا تھا لیکن اسے ایسی بیماری لگ جاتی جس کا کوئی علاج دریافت نہیں ہوا تھا۔ یعنی صرف ایک اندھیری رات کی پھسلن اس بدقسمت دشمن کو زندگی بھر کے لیے ناکارہ کر دیتی اور وہ آخرکار ایڑیاں رگڑ رگڑ تا جان دے دیتا۔

☆☆☆

سالوں پرانی بات ہے۔ اس رات بھی راج محل کے بڑے دروازے پر پہرے دار اسی طرح کھڑا تھا۔ دل کشا خود ہاتھ میں مشعل لیے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔

''ذرا مکھڑا تو دیکھوں......''

مکھڑا دیکھ کر دل کشا سہنا مبہوت رہ گیا۔ ایسی دودھ جیسی رنگت والی لڑکی اور ایسا اتھاہ روپ۔

لڑکی دل کشا سہنا کو سونپ کر وہ دونوں اندھیرے میں کہیں غائب ہوگئے۔ لوہے کا دروازہ چرمرا کر دوبارہ بند ہوگیا۔ آگے آگے دل کشا سہنا پیچھے پیچھے وہ بچی۔ جانے کتنے محل دو محلے پار کر کے وہ دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ دل کشا سہنا نے کونے میں پڑی ایک کتاب اٹھائی۔ اس کے ورق الٹتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔

''چھوکری، تیرا نام کیا ہے؟''

''موہر بائی۔''

دل کشا سہنا نے نام لکھ لیا۔ اس کے بعد اسے بڑی رانی کے پاس لے گیا۔ کمرے میں مسند کے سہارے ادھ لیٹی ہوئی بڑی رانی صاحبہ حقہ گڑگڑا رہی تھیں۔ سامنے رکھا تھا پان دان۔

دل کشا سہنا کی آنکھیں سامنے چاروں طرف چپکی ہوئی تھیں۔ اس نے کمرے کے سامنے آکر آواز دی۔

''رانی جی۔''

چندراوت ونش کی بیٹی چندراوتی جی کی گمبھیر آواز سنائی دی۔ ''کون؟''

دل کشا سہنا ان کے سامنے جا کھڑا ہوا اور موہر کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''انہیں سلام کرو۔''

تندرستی وصحت مندی کا سنہری اصول

کسی بادشاہ نے اپنی سوانح حیات میں عرب کے ایک حکیم کا ذکر کیا ہے۔ کسی نے حکیم صاحب سے سوال کیا۔

''حکیم صاحب! انسان کو دن میں کتنا کھانا چاہیے؟''

حکیم نے جواب دیا۔

''انسان کو اٹھتیس تولہ کی مقدار کے برابر کھانا چاہیے جو اس کے لیے کافی ہوتا ہے۔''

لوگ یہ سن کر ہنس پڑے کہ کھانے کی اتنی کم مقدار انسان کو کیا طاقت دے سکتی ہے۔ حکیم صاحب نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا۔

''کھانے کی اتنی مقدار تجھے اٹھائے پھرے گی اور اگر اس سے زیادہ کھائے گا تو تجھے اس کو اٹھانا پڑ جائے گا۔ یعنی جو مقدار میں نے بتائی، وہ تجھے کھڑا رکھے گی اور اگر تو نے اسے بڑھا دیا اور پیٹو بن گیا تو پھر اس خوراک کا بوجھ تجھے اٹھانا پڑے گا۔''

شیخ سعدیؒ نے اس چھوٹی سی حکایت میں بہت بڑی بات بتا دی ہے کہ کھانا زندہ رہنے اور یادِ خداوندی کے لیے ہے نہ کہ زندگی کھانے کے لیے ہے۔

سبق: کم کھانا صحت مند اور تندرست رکھتا ہے۔

مرسلہ: ذیشان احمد طارق، پھالیہ

''یہ چھوکری کون ہے؟''

''نئی آئی ہے آج...... نام ہے موہر بائی۔''

بڑی رانی کی تیکھی نظریں موہر کو کچھ دیر گھورتی رہیں۔ سکھیوں اور باندیوں کی نگاہیں بھی اس لڑکی کے بھولے بھالے خوب صورت مکھڑے پر چپک گئیں۔ اچانک ہنسی کا کہرام مچ گیا۔ سب کی سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئیں۔

رانی صاحبہ نے کہا۔ ''ہائے کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی شربت جیسی صورت ہے۔''

یہاں کے راگ رنگ دیکھ کر موہر بائی بھونچکا رہ گئی۔ کہاں آگئی وہ؟ راجا کا محل دکھانے کا لالچ دے کر ان لوگوں نے اس کے باپو کو سو روپے پکڑا دیے اور اسے خرید لائے۔

ان لوگوں نے کہا تھا۔ ''تمہاری بیٹی سکھ سے رہے گی۔ بھائی! اچھا کھانا پینا ملے گا۔ آرام سے جیے گی۔ اس

کے بعد اگر کہیں راجا صاحب کی مہربان نظروں میں پڑ گئی تو سمجھو اس کی تقدیر ہی کھل جائے گی۔''

اس کے بعد وہ اسے بیل گاڑی میں بٹھا کر لے آئے لیکن یہ کہاں پہنچا گئے؟ وہ تو مانو کوئی پورے دیش میں آپڑی۔ اچانک رانی صاحبہ کی آواز سن کر اسے ہوش آگیا۔ ''ٹھنڈی شربت جیسی صورت ...... اسے ہم نے آج سے شربتی بائی نام دیا۔''

اب شربتی بائی انت پور میں اس محل سے اس محل میں گھومتی پھرتی نظر آنے لگی۔ ہولی کے دن رنگ کھیلتی پھرتی، شادی بیاہ میں مٹھائیاں کھاتی، دیوالی پر نئے کپڑے پہنتی، نوٹنکی تھیٹر دیکھتی، گانے سنتی، سوانگ دیکھتی۔ تیج تہواروں کے رس رنگ میں شامل ہوتی۔ جیسے باقی لڑکیاں رہتی تھیں، وہ بھی اسی رنگ میں رنگ گئی۔

☆☆☆

اس کے بعد ایک دن وہ جوان ہوگئی۔ دل کشا سہنا نے سمجھایا۔

''شربتیا جی، اب ہڑ دنگ مچانا چھوڑو۔ تم اب جوان ہوگئی ہو۔''

شاید جوانی ہی اس کے لیے کال بن گئی۔ اس کے پاؤں میں زری دار جوتیاں پہنا دی گئیں۔ ماتھے پر اوڑھنی کا پلہ لہرانے لگا، بالوں کی لمبی چوٹی، پاؤں میں پازیب، کانوں میں جھمکے، گلے میں ہار۔ وہ سر سے پاؤں تک لاد دی گئی۔ اس راج گھرانے کی یہی ریت ہے۔ اب جو پردہ نشین عورتیں بن گئی ہیں وہ بھی اسی طرح کہیں کہیں سے اٹھائی گئی تھیں۔ اب باہری دنیا سے ان کے سارے ناتے رشتے ختم ہو چکے ہیں۔ ان عورتوں کے لیے دنیا میں مرد صرف یہی راجا صاحب رہ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور کہیں کوئی مرد نہیں۔ یعنی اس دنیا میں راجا صاحب ہی اکیلے نر باقی سب مادہ۔ اتنی ساری ان گنت عورتوں کا جیون جوانی، مان سمان، سارا کچھ صرف اس مرد کے قربان چڑھ چکا ہے۔

لیکن اچانک شربتی بائی کی زندگی میں بدقسمتی کا سایہ منڈلانے لگا۔ ہولی کا تہوار، چاروں طرف جھاڑ فانوس، پھول پتے، لڈو مٹھائیوں کی بھرمار۔ تیوہاری پر ملے ہوئے نئے کپڑے جوتی، اوڑھنی گھاگرا، لوگ بھاگ کا آنا بھی شروع ہوگیا۔ دور بسے خاندانی گھرانے کے امیروں کو دعوت بھیجی گئی۔ خاندانی لوگ اپنے پورے کنبے، داس داسیوں، بہو بہنوں کے ساتھ تشریف لے آئے لیکن ہر کوئی شربتی بائی کو دیکھ کر اچکچا جاتا۔ سب ایک دوسرے سے سوال کرتیں۔ ''وہ کون ہے ری بہنا؟''

''شربتی بائی۔''

''سرو ناش روپ کی ایسی آگ راجا صاحب کی نگاہوں میں نہیں پڑنی چاہیے۔ اس روپ متی کو اگر یہاں سے ہٹایا نہیں گیا تو یہ عورت سب کی عزت اتار لے گی۔'' بڑی رانی چندراوتی نے دل کشا سہنا کو چوری چوری طلب کیا۔ ان میں کیا باتیں ہوئیں کوئی نہیں جانتا۔ کسی کو کانوں کان بھنک نہیں لگ پائی لیکن اس کے بعد اس دن کے علاوہ شربتی بائی کہیں دکھائی نہیں دی۔ شربتی بائی اس وقت محل کے شاہی اندھیرے قید خانے میں چپ چاپ بیٹھی تھی۔

☆☆☆

جانے کتنے برس گزر گئے۔ محل میں اس کام کے لیے اور بھی بہت ساری عورتیں تعینات ہیں۔ موتیا بائی، اختری بائی، گلابو بائی۔ ایسی عورتیں بہت دن نہیں جیتیں۔ پھر بھی انہیں تیار رکھنا پڑتا ہے۔ انہیں کھلانا پہنانا پڑتا ہے۔ انہیں بہترین ساز، پوشاک بھی دیتے ہیں۔

اس کے بعد دل کشا سہنا آتا ہے۔ اکثر کافی رات گئے وہ ہاتھ میں مشعل لیے آتا۔ دروازے کا تالا کھول دیتا۔ اس جھٹ پٹے اندھیرے میں کوئی تاریک جسم اندر داخل ہوتا۔ آتے ہی سانپ کی طرح اپنی کنڈلی میں کس لیتا۔ نشیلی رات کا رومانس گننے میں کل پانچ یا سات سیکنڈ لگتے۔ دل کشا اسے نکال کر، دوبارہ اپنے ساتھ واپس لے جاتا۔ اس کے بعد پھر وہی حرکت۔ اگلی رات پھر وہی اس کے اگلی رات بھی وہی۔ یعنی خون کی بوند بوند میں زہر اچھی طرح پھیل جائے۔ موتیا بائی، اختری بائی، گلابو بائی ہر عورت کی زندگی میں اسی طرح کا حادثہ ہو چکا ہے۔ شربتی بائی کی زندگی میں بھی یہی حادثہ دہرایا گیا۔

بڑے غازی کا مہاجن خاصا خاندانی امیر ہے لیکن اندر ہی اندر وہ طرح طرح کی سازشیں رچ رہا ہے۔ رتن گڑھ کے نواب کے یہاں جا جا کر نہار گڑھ کے راجا صاحب کی برائی کرتا ہے۔ زمین داری میں ... لوگوں پر حکومت کرتا ہے۔ اسے سبق دینا ہوگا۔ ریذیڈنٹ صاحب کے دربار میں درخواست بھیج کر اپیل عدالت تو خیر کریں گے ہی۔ اس مہاجن کے بچے کو سزا ابھی دینا ضروری ہے۔ سیٹھ جی کو دعوت دے کر بلایا گیا۔ جب رات گہرا گئی تو گلابو بائی کو حاضر کیا گیا۔ وہ رات مہاجن نے بائی کے ساتھ گزاری۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گلابو بائی کی تمام لالسا کا منا مہاجن

کے ہذ ماس مزا کے ریشے ریشے میں گھل گئیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے اندر گھر کر گئیں۔ اس کے بعد حد سے حد چار یا پانچ سال کی زندگی۔

ہاں تو راجا صاحب کے تمام دشمن اسی طرح سڑ گل کر ہلاک ہو جاتے۔

شربتی بائی صرف سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا کرتی اور کمزور سی آواز میں بار بار یہی سوال دہراتی۔ ''مجھ سے تم نے بیاہ کیوں کیا بابو صاحب؟ ہم لوگ شادی کے قابل نہیں ہوتیں۔''

لیکن اس بار بالکل الگ معاملہ تھا۔ راجا صاحب بھی نہیں جانتے تھے یہ تو دل کشا سہنا، بڑی رانی اور لال جی صاحب کی سازش تھی۔ کہاں کا بنگالی ڈاکٹر اپنی قابلیت اور ڈاکٹری کے سہارے تین ہزاری سے ایک دم سے پچاس ہزاری جاگیر تھیا بیٹھا۔ راجا صاحب کا یہ عالم کہ اب وہ اس کمبخت ڈاکٹر کے کہنے پر اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ تہ خانے میں روز جوئے کا اڈا بیٹھتا۔ اب راجا صاحب جب پانی لانے کے لیے تالی بجائیں، پانی پیش کرے گی شربتی بائی۔

دل کشا سہنا صبح سویرے ہی اچھی سی پوشاک دے گیا۔ تم تم، خوشبودار تیل پھلیل پہنچی کنگن نکلی، آج خوب سج سنور کر موہنی اپسرا کا روپ دھارنا ہوگا، جادو چلانا ہوگا۔ کھیل کا نشہ توڑ دینا ہوگا۔ کوئی عذر کوئی دلیل مانی نہیں جائے گی۔ ریاست کی بھلائی کے لیے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے نا۔ رونے کا بھی کوئی جواب نہیں ہوگا۔

شربتی بائی کو سجا سنوار کر مورت میں بدل دیا گیا اور اسے بغل والے کمرے میں تعینات کر دیا گیا۔ دل کشا سہنا نے سمجھایا تھا۔ ''راجا صاحب جب تین بار تالی بجائیں تو سمجھنا پانی چاہیے، دو بار تالی بجائیں تو عرق اور ایک بار تالی بجائیں تو تمباکو۔''

راجا صاحب نے تین بار تالی بجائی۔

☆☆☆

سدانند بابو نے اپنی کہانی جاری رکھی۔ ''اس کے بعد پھر ایک مرتبہ نہار گڑھ جانے کا موقع ملا تھا۔ اس بار بھی وہی رس گلے بنانے کی فرمائش، شربتی بائی کے بیاہ کے وقت جو رس گلے کھلائے گئے تھے بے حد مزے دار لگے۔ اس لیے پھر حکم ہوا سو صاحب جانا ہی پڑا۔ ان دنوں دلجیت سہنا قتل ہو چکے تھے۔ راج محل میں خواجہ دل کشا سہنا اور بڑی رانی کا راج پرساد، راج گدی پر بڑے راج کمار کو بٹھایا گیا تھا

لیکن اب اس بے چارے ڈاکٹر کی پہلی جیسی شان و شوکت نہیں رہی۔ ادھر ڈاکٹر بھی ایک غلطی کر بیٹھا۔ صاحب بڑی بھیانک غلطی تھی وہ۔ زندگی میں ایسی غلطی نہ کبھی کسی نے دیکھی، نہ سنی۔''

میں نے پوچھا۔ ''اور وناتا؟''

''وناتا کون؟'' سدانند بابو کے دماغ سے وناتا کا خیال بالکل ہی اتر چکا تھا۔ ''ہاں...... ایک عورت کو دیکھا تو تھا۔''

شربتی بائی نے جس دن سنسار سے وداع لی، سبھا ہے اس کا داہ سنسکار کر کے ندی کنارے سے سیدھا اپنی حویلی میں چلا آیا۔ اس دن جو اپنے کمرے میں گھسا، زندگی میں پھر بھی باہر نہیں نکلا۔ کب صبح ہوئی، کب شام، کب سارا نہار گڑھ نیند میں بے ہوش ہوا۔ اب اسے کوئی خبر نہیں۔ ہاں کبھی کبھی کسی کو اس کی جھلک مل جاتی۔ راستے کے کنارے کنارے جاتے لوگوں کی نظریں اکثر اس کے کمرے کی طرف اٹھ جاتیں۔ ڈاکٹر اپنے کمرے میں بیٹھا بیٹھا جانے کیا لکھنے میں ڈوبا رہتا۔ لوگ بیمار پڑے ہیں، دوا مانگنے آئے ہیں۔

انہوں نے نوکر سے پوچھا ہے۔ ''ڈاکٹر صاحب گھر میں ہیں؟''

''نہیں...... صاحب نے نوکری چھوڑ دی ہے۔'' جواب ملتا۔

☆☆☆

پڑھتے پڑھتے کافی رات گزر گئی۔ اچانک اس کی نگاہیں ایک صفحے پر بالکل پتھرا گئیں۔ جیسے وہ کسی گہرے دھیان میں ڈوب گیا ہو۔ شربتی بائی نے درد سے تڑپتے ہوئے دم توڑ دیا۔ ڈاکٹری بھی کسی کام نہیں آئی۔ دنیا کی کوئی دوا اس کا روگ دور نہیں کر سکی۔ ان دنوں شربتی بائی کی باتیں صرف آنکھوں میں سمٹ کر رہ گئی تھیں۔ آخری دنوں میں وہ بولنے کی طاقت بھی کھو بیٹھی تھی۔

کلکتہ، بمبئی، ایک سے ایک نئی دوا منگوا کر وہ شربتی بائی کو دیتا رہا۔ نئی نئی کتابیں خریدتا، پڑھ پڑھ کر ڈھیر لگاتا جا رہا تھا۔ ریگستان کی دھرتی میں مانو یہ کوئی انوکھا روگ ہے۔ اس سے پہلے اس روگ کے بارے میں کبھی کسی نے ذکر تک نہیں کیا۔

اس روز پورے گھر میں عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چاروں طرف ماتمی خاموشی۔ صرف پورب میں کھڑے کھجور کے درخت سے ٹکراتی ہوئی ہواؤں میں پتوں کی کھڑ کھڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ آسمان پر بھٹکتے ہوئے کسی اکیلے خاموش پنچھی نے اچانک اپنے پنکھ پھڑ پھڑائے اور الٹی سمت میں اڑ چلا۔ شربتی بائی جس کمرے میں لیٹی رہتی

تھی، آج وہ خالی پڑا تھا لیکن سبھاے کی اداس نگاہیں اس خالی جگہ کو گھورتی رہیں۔ اسے لگا پاس ہی کوئی سسکیاں بھر رہا ہے۔ بالکل وہی آواز۔

''تم نے مجھ سے بیاہ کیوں کیا تھا بابو صاحب؟'' وہ آواز دھیرے دھیرے پھر دور چلی گئی۔ جیسے پورا نہار گڑھ مانو پتھرا گیا ہو۔

☆☆☆

جھیل کے کنارے والے بنگلے میں کوئی نئے ریذیڈنٹ صاحب آئے ہیں۔ نئے صاحب راج پرشاد سے ان کے لیے نذرانے بھیجے گئے۔ راجا صاحب بھی نئے نئے، ریذیڈنٹ صاحب بھی نئے نئے لیکن بڑی رانی اب بھی زندہ ہے۔ خواجہ دل کشا سہنا بھی موجود ہے۔ راج پرشاد میں پلتے ہوئے وسوسے اور انہیں صاحب کی نظروں سے بچائے رکھنے کی وہی کوششیں۔ شربتی بائی نہیں رہی۔ ممکن ہے سوتیا بائی، اختری بائی اور گلابو بائی بھی سنسار سے وداع ہو چکی ہوں۔

سبھاے کتاب پڑھتے پڑھتے اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ ادھر کئی دنوں سے اس نے حجامت نہیں بنائی۔ کمرے میں ٹہلتا ہوا دیپک، وہ آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ آئینے میں گھورتا ہوا وہی چہرہ، شربتی بائی کی چھایا مانو پھر وہی سوال دہراتی ہوئی۔ ''تم نے مجھ سے بیاہ کیوں کیا بابو صاحب؟'' اس کیوں کا جواب ادھورا ہی رہ گیا۔ سبھاے کبھی جواب نہیں دے پایا۔

☆☆☆

تیس میل لمبا راستہ۔ بیل گاڑی جھکولے دیتی ہوئی چلتی رہی۔ جب چلا تھا رات کچھ باقی تھی۔ جنگلی کانٹوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے بھری پگڈنڈی سے گزر کر اب ہم نے پکی سڑک پکڑلی۔ دھوپ چھایا دن۔ سمندر کے کنارے کنارے نمک کی ڈھیریاں، سمندر کا پانی دھوپ کی روشنی میں چمک کر نظروں میں چبھ رہا تھا۔ ایشوری پرشاد ایک پر ایک کہانیاں سنائے جا رہا تھا۔

یہ سب جانے کتنے سالوں پرانی بات ہے۔ اب تو ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔ آج تمہارے خط کا جواب دیتے ہوئے سارا کچھ دوبارہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اجمیر کے سدانند بابو سے سبھاے کی پوری کہانی نہیں سن پایا۔ انہیں پوری کہانی شاید معلوم بھی نہیں تھی۔ رس گلے کا ایڈوانس معاوضہ پا کر جب وہ نہار گڑھ گئے تھے تب ڈاکٹر کو جیسا دیکھا تھا میرے سامنے جوں کا توں بیان کر دیا۔

اس کہانی کا شروع کا حصہ کلکتے میں ٹوکو ماسی نے سنایا تھا۔ اس کے بعد کچھ حصہ اجمیر میں سنا۔ ٹکڑوں ٹکڑوں میں سنے واقعات سے ایک آدھی ادھوری سی کہانی بن پائی۔ آج اس کا آخری حصہ سن رہا تھا۔ ونالتا رائے سے اس کے ونالتا ماں بننے کی کہانی۔

ایشوری پرشاد نے ہی بتایا۔ ''پیسے تو ڈاکٹر ماں لیتی نہیں۔ ڈاکٹر ماں کے اسپتال میں کسی کو پیسے نہیں دینے پڑتے۔''

حالانکہ یہی ونالتا بھی پیسے پیسے کے لیے کس قدر محتاج تھی۔ سرلا دی نے پوچھا تھا۔ ''ساری خرید و فروخت ہو گئی ونالتا دیدی؟''

''اب تو پیسے ہی نہیں بچے بہنا۔''

''اچھا سنو پہنچ کر خط ضرور ڈال دینا۔''

لیکن سرلا دی کے جاتے ہی اسے پھر کچھ یاد آ گیا۔ سبھاے کے لیے اس نے دھوتی خریدی ہے۔ دیوالی والے دن ہی وہ نہار گڑھ پہنچ جائے گی۔ ریل کے کرائے کے علاوہ اب اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں بچی۔ اچانک اسے کچھ یاد آ گیا۔ وہ دوبارہ بازار چل پڑی۔

''ذرا سیندور دیجیے گا ایک پیکٹ بڑھیا۔''

دکان دار کی نگاہ ایک بار ونالتا کی اجلی مانگ کی طرف اٹھ گئی۔ اسے پیکٹ تھماتے ہوئے وہ شاید حیرانی میں پڑ گیا تھا۔ سیندور کا دام لیتے ہوئے بھی کچھ پل ونالتا کی طرف تعجب بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ ونالتا نے گھبرا کر اچانک نگاہیں جھکالیں۔ اچھا کیا اس کے چہرے اور آنکھوں کا رنگ بھی سندوری ہو آیا تھا؟ کہیں سب بھانپ تو نہیں گیا۔

نہیں، اب کسی کے بلاوے کے انتظار میں وقت کو ٹالتے جانا غلط ہوگا۔ اب اور دیر کرنا شاید درست نہ ہوگا۔ چھبیس کی عمر اب چھتیس کی دہلیز پر پہنچ چکی ہے۔ رات کی ڈیوٹی کرتے ہوئے اب اسے اکثر نیند آ جاتی ہے۔ آج کل تو وہ دن دن بھر اونگھتی رہتی ہے۔ ویسے صرف آنکھوں پر ہی نہیں، دل پر بھی تھکان اتر آئی ہے۔ کہیں بھیانک اندھیرا پن محسوس ہوتا ہے۔ وہ اپنے کو بے حد لاچار، بے سہارا اور اکیلا محسوس کرنے لگتی ہے۔

ٹرین پر سوار ہونے کے بعد بھی وہ خود کو بار بار ٹٹولتی رہی۔ نہ...... اس نے کوئی قصور نہیں کیا۔ اس کی عمر چھتیس اور سبھاے کی تینتیس ہونے کو آئی۔ ممکن ہے کہیں سایہ بھی ہو لیکن تیکھی دھوپ کی تپش محسوس کرتے ہوئے سبھاے کے

دل میں کیا کبھی کسی سایہ دار پناہ کی چاہ نہیں جاگی ہوگی؟ کسی گھنی چاہ کی تلاش اسے بے چین نہیں کرگئی ہوگی؟ پھر اس نے خط لکھنا کیوں چھوڑ دیا؟ اس نے ونالتا کے کسی خط کا جواب کیوں نہیں دیا؟

مادھولال نے بنگالی لڑکی کو دیکھ کر پہلے کہا۔ ''ملاقات نہیں ہوگی۔''

ونالتا نے پوچھا۔ ''کیوں؟ سبھاے کیوں نہیں ملے گا؟''

''ڈاکٹر بابو کا حکم ہے۔''

ونالتا نے کہا۔ ''تم جاکر کہو ملاقات کیے بنا یہاں سے نہیں لوٹوں گی۔ میں بہت دور سے آرہی ہوں، کلکتے سے۔''

مادھولال نے پھر کہا۔ ''ڈاکٹر بابو کسی سے نہیں ملتے حضور۔ صرف دوائی کھاتے ہیں اور لکھتے رہتے ہیں۔''

''کیا لکھتے رہتے ہیں؟''

''ارے لکھ لکھ کر کاپیاں کی کاپیاں رنگتے رہتے ہیں۔ پورے گھر میں کاپیوں کا پہاڑ بن گیا ہے۔''

☆☆☆

ایشوری پرشاد کے ساتھ جس دن ڈاکٹر ماں کے اسپتال پہنچا، اس دن ونالتا نے مجھے کاپیاں بھی دکھائی تھیں۔ اس دن ونالتا کو بھی میں سالوں بعد دیکھ رہا تھا۔ سر کے سارے بال آج سفید ہوچکے ہیں۔ کوری ساڑی، سفید بلاؤز، اسپتال کے تمام مریضوں پر اس کی چوکنی نظر۔ سارے مریض ونالتا کو ڈاکٹر ماں کہہ کر بلاتے ہیں۔ دور دھوپ کی کرنوں میں چمکتا ہوا سمندر کا پانی۔ ونالتا کے ڈرائنگ روم سے نظر آتا ہوا سمندر کا پانی اور ڈاکٹر ماں کے چہرے میں کہیں کہیں ادھوری امید تھی۔ اس کا چہرہ بھی سمندر کی طرح گہرا، پُرسکون اور خاموش۔

ونالتا بتانے لگی۔ ''ڈاکٹر اپنا سارا تجربہ ان کاپیوں میں لکھ گئے ہیں۔ اس روگ کے بارے میں پہلے دن سے لے کر آخر تک کی چھوٹی سے چھوٹی باتیں۔ سب ان کاپیوں میں درج ہیں۔ میں نے ان کاپیوں کی جلد بنوا کر جرمنی بھیجی ہیں۔ ان لوگوں نے خط لکھ کر غور کیا ہے کہ ان کاپیوں کے ذریعے بہت سارے نئے نئے راز افشا ہوئے ہیں۔ دیکھیے نا یہ رہا وہ خط۔''

اس دوران ہمارا ناشتا بھی آگیا۔ میں نے غور کیا، اتنے دنوں بعد ونالتا نے قدرے ڈھنگ سے ناشتا کیا تھا۔

☆☆☆

جس روز وہ پہلے پہلے نہار گڑھ میں داخل ہوئی، اس دن بھی اس کا چہرہ مایوسی سے اٹا ہوا تھا۔

اسے دیکھ کر سبھاے نے کہا تھا۔ ''تم کیوں آئیں ونالتا؟''

ونالتا نے جواب دیا۔ ''مجھ سے بہت دیر ہوگئی جی۔ اب میں اور انتظار نہیں کرسکی۔ تمہارے بلانے کے انتظار میں رکے رہنا میرے لیے برداشت سے باہر ہوگیا تھا۔''

''لیکن میں تو......''

ونالتا نے اسے بیچ میں ہی روک دیا۔ ''نہ...... اب میں تمہاری ایک بھی بات نہیں سنوں گی۔ کلکتے سے آتے وقت میں اپنے ساتھ سیندور بھی لیتی آئی ہوں۔'' سبھاے کوئی عذر کرے، اس سے پہلے ہی ونالتا نے اس کا ہاتھ کس کر تھام لیا۔

سبھاے نے ایک بار کہنا بھی چاہا۔ ''مجھے مت چھوؤ ونالتا۔'' لیکن اس سے پہلے ہی ونالتا نے سبھاے کے ہاتھوں میں چٹکی بھر سیندور لگا کر اسے زبردستی اپنی مانگ میں رگڑ لیا۔ اس کے بعد اس کا پیر چھو کر ماتھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''سنو آج تم سے جبراً اپنی مانگ میں سیندور لگواتے ہوئے بھی مجھے کوئی شرم لاج نہیں آرہی۔ نہ...... اب شرمانے کا وقت رہا۔''

سبھاے کی انگلیاں اب دھیرے دھیرے جھڑنے لگی تھیں۔ پورے جسم میں زخم، زخموں سے رستا ہوا مواد۔ اب وہ آنکھوں سے ٹھیک طرح دیکھ بھی نہیں پاتا۔ کچھ دنوں بعد شاید کان بھی جواب دے جائیں لیکن اس دن سبھاے کی پلکوں کی کوروں میں ہنسی کی مہین سی ریکھا کھل اٹھی۔

اس نے صرف اتنا ہی پوچھا۔ ''تم اتنی دیر سے کیوں آئیں ونالتا؟''

ونالتا نے سبھاے کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''ہاں دیر ہوگئی لیکن آئی تو سہی۔ وہ تو کہو تقدیر اچھی تھی جو اور زیادہ دیر نہیں کی۔''

''لیکن سنو...... اس چٹکی بھر سیندور کے علاوہ ہم میں تم میں اور کوئی ناتا نہیں ہوگا۔''

''کون کہتا ہے نہیں ہوگا؟''

''نہیں...... سچ، اور کوئی ناتا نہیں ہوگا ورنہ اتنے دنوں کی میری ساری تپسیا جھوٹی پڑ جائے گی۔ شرتی بائی جس عذاب میں تڑپ تڑپ کر مری، میں خود بھی وہ تمام تکلیفیں جھیلتے ہوئے مرنا چاہتا ہوں۔ ہاں اگر ہوسکے تو میرے سارے لکھے ہوئے یہ کاغذ ملک میں اور بیرون ملک بھیج دینا۔ ممکن ہے وہ لوگ اب کسی اور شرتی بائی کو ایسی بھیانک موت مرنے سے بچالیں۔''

ایشوری پرشاد نے اپنی کہانی اسی طرح جاری رکھی۔

''اس کے بعد ڈاکٹر ماں نے پچاس ہزاری جاگیر بیچ کر اسپتال کھول لیا۔ عجیب مرض کے شکار جتنے مریض آتے ہیں، بنا کسی خرچے پانی کے ڈاکٹر ماں خود ان کے علاج کا بندوبست کرتی ہے۔ ویسے یہاں اور ڈاکٹر بھی ہیں۔ وہ خود بھی اس علم کو جانتے ہیں۔ جیسے انہوں نے سبھاے کی موت کے آخری دنوں تک جی جان سے سیوا کی تھی، اسی طرح اب وہ یہاں کے مریضوں کی سیوا میں دن رات جٹی رہتی ہے۔ بنگال کا خیال اب وہ جیسے بھول ہی گئی ہے۔ اب تو یہ راجپوتانہ ہی ڈاکٹر ماں کا اپنا دیش بن چکا ہے۔''

میں نے ایشوری پرشاد سے سوال کیا۔ ''لیکن شربتی بائی کا روگ ڈاکٹر کو کیسے لگ گیا؟''

''اس ڈاکٹر نے جان بوجھ کر وہ انجکشن اپنے جسم میں بھی چبھو لیے تھے۔''

''کیسے انجکشن؟''

''ارے اسی خاص مرض کے۔''

☆☆☆

آج جو تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں پتا نہیں تمہیں اس میں اپنی زندگی کے بارے میں کسی سوال کا جواب ملے گا یا نہیں لیکن ایک بات میں خود بھی آج تک نہیں سمجھ پایا جو آج اتنے دنوں بعد مجھے یاد آرہی ہے...... اس دن بیل گاڑی پر سوار ہو کر جب ہم ادکھا پورٹ سے چلے تھے۔ جب کانٹوں والے جھاڑ جھنکاڑ پار کر کے کچی سڑک سے گزرتے ہوئے میں نے ایشوری پرشاد سے یہ کہانی سنی تھی، تب خود اپنے دل سے یہی سوال پوچھا تھا۔ سبھاے نے شربتی بائی کے روگ کا انجکشن اپنی بانہہ میں کیوں لگایا؟ دنیا سے اس خطرناک ترین بیماری مٹانے کی کوشش تھی یا شربتی کا سارا روگ اپنے بدن میں چن کر کسی اور خوب صورت شربتی بائی کو پانے کے لیے؟ خیر چھوڑو...... اب سوال یہ ہے کہ میں نے یہ کہانی آخر کس کے بارے میں لکھی ہے۔ میرے لیے یہ ونا لتا شاید آج مشکل ہے......

''آخر اس کی نائیکا کون ہے؟ شربتی بائی یا ونا لتا؟ خیر لوگ باگ چاہے جو سوچیں، تمہیں بھی کیا اس بارے میں کوئی فکر ہے؟

''ویسے یہ کہانی اگر یہاں ختم ہو جاتی تو شاید بہتر تھا لیکن تب شاید یہ میری کہانی نہیں ہوتی۔ اس دن آتے وقت ونالتا نے کہا۔

''آپ لوگوں کو ایک چیز اور دکھانا چاہتی ہوں، چلیے دکھاؤں۔''

ونالتا ہمیں بغل والے کمرے میں لے گئی۔ ایشوری پرشاد اس وقت سمندر کنارے ہاتھ منہ دھونے چلا گیا تھا۔ یہ کمرا اور زیادہ صاف ستھرا اور سجا ہوا تھا۔ ونالتا نے کہا۔ ''یہ دیکھو، یہاں ڈاکٹر کی ساری چیزیں سجا کر رکھی ہوئی ہیں۔ یہ رہے ان کے جوتے، یہ کپڑے، یہ کرتہ، ان کا سارا کچھ یہاں سجایا ہوا ہے۔ ان کی کنگھی، چشمہ، نقلی دانت تک سج کر رکھ چھوڑے ہیں میں نے اور یہ رہی...... ڈاکٹر کی تصویر۔''

میری نگاہ دیوار پر ٹنگی ہوئی قدآدم پینٹنگ پر جا پڑی۔ سنہرے فریم میں سجی سجائی تصویر۔ ایک طرف ڈاکٹر سبھاے، سر پر پگڑی دولہا کے بھیس میں اور ان کی بغل میں شربتی بائی، زعفرانی اوڑھنی، گلابی گھاگرا، راجستھانی دلہن کا بھیس۔ سدانند بابو نے بھی تو اسی تصویر کا ذکر کیا تھا۔ یہ تصویر نہار گڑھ کے راجا صاحب نے اس کے بیاہ کے موقع پر تیار کروائی تھی۔

کچھ دیر کو میری نگاہیں اس تصویر پر جم گئیں۔

ونالتا نے پوچھا۔ ''مجھے پہچان رہے ہیں؟'' میں اچکچا گیا۔

ونالتا نے کہا۔ ''ڈاکٹر کی بغل میں...... یہ میں ہی تو کھڑی ہوں۔''

''ارے...... آپ تو بالکل پہچانی نہیں جاتیں۔''

ونالتا نے آہستہ سے کہا۔ ''ان دنوں میری عمر بھی تو کم تھی۔ اس عمر میں چہرہ بھی خوب صورت لگتا تھا، کافی گوری بھی تھی۔ راجا صاحب کو بے حد چاؤ امڈا۔ میں راجپوت عورتوں کے بھیس لباس میں تصویر اتروا دوں۔ اصل میں خود راجا صاحب نے ہی تو کھڑے ہو کر ہمارا بیاہ کروایا تھا۔''

میرے گلے تک ایک سوال ابھرا اور یہ پوچھنے کو دل چاہا۔ ''آپ شربتی بائی کو پہچانتی ہیں؟''

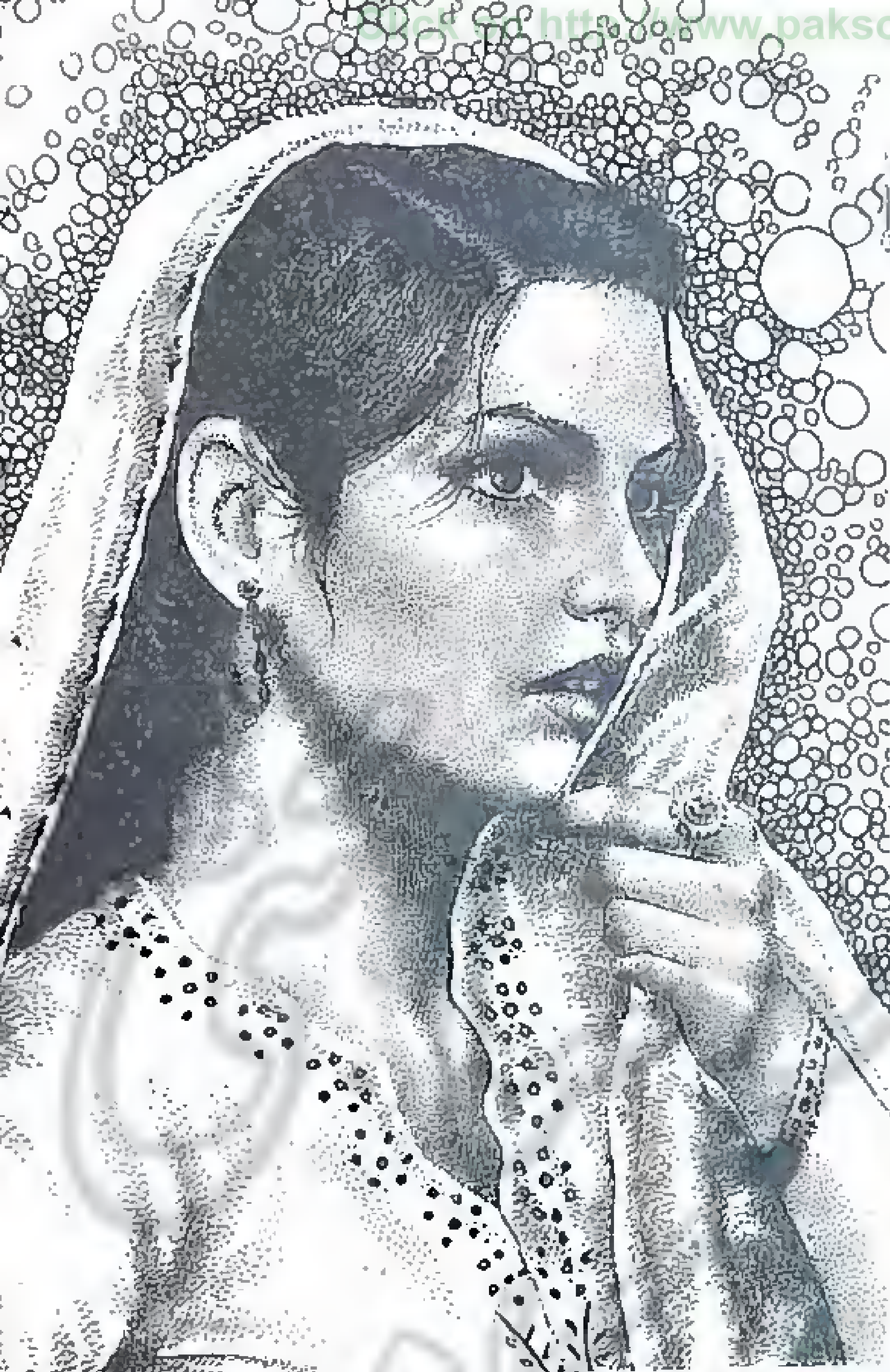
میرے چہرے کا بھاؤ دیکھ کر شاید اسے بھی اندازہ ہو گیا۔

اس نے بے حد بھروسے دار لہجے میں باتوں کی اگلی کڑی جوڑی۔ ''اس کے علاوہ ان دنوں ہم دونوں کی عمر بھی تو بہت کم تھی۔''

اس کی تیکھی نگاہیں میرے چہرے پر پڑ گئیں۔ مانو وہ مجھے اندر تک پڑھ رہی ہے لیکن اگلے ہی پل اس نے اپنے کو سنبھال لیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا عمر تھی؟''

''ان کی عمر چھبیس سال تھی اور میری تئیس......''



محفلِ شعروسخن

* مسٹر اینڈ مسز صفدر معاویہ...... ضلع خانیوال

اگر بے عیب چاہو تو فرشتوں سے نباہ کرلو
میں آدم کی نشانی ہوں خطا میری وراثت ہے

* مرحا گل، رمنا گل...... درابن کلاں

میرے لفظوں پر حاوی ہے تمہارے ہجر کا موسم
میری غزلیں میری نظمیں میرے اشعار روتے ہیں
دسمبر کی حسین شامیں جب زمین پر اترتی ہیں
میرے چھوٹے سے کمرے میں تیرے اقرار روتے ہیں

* اظہر حسین بیچار...... ہزاری، جتوئی

یہ قیام کیسا ہے راہ میں تیرے ذوقِ عشق کو کیا ہوا
ابھی چند کانٹے چبھے نہیں تیرے سب ارادے بدل گئے

* ریاض بٹ...... حسن ابدال

ہر چند کوئی خواب مکمل نہیں ہوا
دل اس کے باوجود بھی پاگل نہیں ہوا
اک عمر کی طویل مسافت کے باوجود
میں چل رہا ہوں میرا بدن شل نہیں ہوا

* ایم عمران جونانی...... رنچھوڑ لائن، کراچی

کچھ غزلیں کہیں، چند نظمیں اور اشعار ہوئے
دیکھ تیری فرقت میں جاناں ہم کیسے فنکار ہوئے

* فلک شیر ملک...... رحیم یار خان

کانپتے ہونٹوں پہ فریاد ہے جل جانے کی
دیپ بجھتے ہوئے کچھ راز دیا کرتے ہیں

* محمد حسان گل سیال...... روہڑی، ضلع سکھر

پوچھنے والے بہت ہیں میری حالت کے مگر
جس سے رازِ دل کہیں وہ رازداں ملتا نہیں

* سید عبادت کاظمی...... ڈیرہ اسماعیل خان

یہ ضد ہے ہماری کہ اسے چھین لیں سب سے
ہم اور زمانے سے تقاضا نہیں کرتے
گوشۂ تنہائی میں بھی رہ لیتے ہیں اکثر
ہم شہر کی گلیوں میں تماشا نہیں کرتے

* ظفر اقبال ظفر...... کامرہ شرقی

میں نے سمجھا تھا سمندر تم کو
تھا کا مطلب تو تمہیں آتا ہوگا؟

* ادریس احمد خان...... ناظم آباد، کراچی

اس آخری نظر میں عجب درد تھا منیر
جانے کا اس کے رنج مجھے عمر بھر رہا

* چوہدری محمد یعقوب...... خانیوال

کہا یہ میں نے، ڈرو خدا سے
ہمارے دل کو دکھا رہے ہو
وہ ہنس کے بولے چپ رہو نا
کوئی سنے گا تو کیا کہے گا؟

* عبداللہ فارانی...... کوٹ ادو

ریا کی گرد جمی ہے ہر ایک چہرے پر
ہر ایک شخص گداگر دکھائی دیتا ہے

❄ عبدالجبار رومی انصاری.....جھنگ سٹی، لاہور
نشاں مٹ گئے گلشن سے ان درختوں کے
جو موسموں کے تقاضوں کا بار اٹھا نہ سکے

❄ معراج محبوب عباسی.....ہری پوری، ہزارہ
آجا کہ ابھی ضبط کا موسم نہیں گزرا
آجا کہ ابھی برف پہاڑوں پہ جمی ہے
خوشبو کے جزیروں سے ستاروں کی حدوں تک
اس شہر میں سب کچھ ہے بس تیری کمی ہے

❄ عبدالغفار فردوس.....نواں شہر، ایبٹ آباد
میں بے بسی کی اک نشانی ہوں مجھے یاد مت کرنا
میں دریا کا پانی ہوں مجھے یاد مت کرنا
بکھر جائیں گے آنسوؤں کے یہ حسین موتی
میں درد کی کہانی ہوں مجھے یاد مت کرنا

❄ محمد اشفاق سیال.....شورکوٹ سٹی
جانے والوں کو نہ روکو کہ بھرم رہ جائے
تم پکارو بھی تو کب اس کو لوٹ آنا ہے

❄ محمد امین.....سیالکوٹ
دیکھنا دشت نظر میں وہ بھی منظر آئے گا
شام کی دہلیز پر دن کا گداگر آئے گا
سونپ دو اک دوسرے کو اپنے چہروں کے نقوش
بے حسی کا دور چل نکلا ہے گھر گھر آئے گا

❄ سید منور علی.....فیصل آباد
ویرانیاں گھروں کی اداسی میں رچ گئیں
آبادیوں کے خوف نے صحرا بسا لیا
شاید زمیں کا کرب گوارا نہ تھا اسے
اس نے پیمبروں کو بھی زندہ اٹھالیا

❄ کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی
لاکھ موجوں میں گھرا ہوں ابھی ڈوبا تو نہیں
مجھ کو ساحل سے پکارو کہ میں زندہ ہوں ابھی

❄ ناہید اختر.....اسلام آباد
کیا اس لیے تقدیر نے چنوائے تھے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

❄ زوہیب احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
سانسوں کے سلسلے کو نہ دو زندگی کا نام
جینے کے باوجود بھی کچھ لوگ مر گئے

❄ احمد جہانزیب.....راولپنڈی
نہ چھیڑو میرے زخم رہنے دو یوں ہی
کہ اس طرح میں لا دوا ہو نہ جاؤں
میں لمحہ ہوں، پل ہوں، اگر تم نہ آئے
تو صدیوں کا میں فاصلہ ہو نہ جاؤں

❄ مہتاب احمد.....حیدرآباد
بدل کر نام رہ رہ کر مری سوچوں کے رستے سے
مری خلوت میں آنا اور جانا کیا ضروری تھا
خود اپنی وحشتوں میں لمحۂ تسکیں کی خواہش میں
مرے احساس میں کانٹا چبھانا کیا ضروری تھا

❄ شمائلہ سکندر.....اسلام آباد
بچ کے دل جادۂ الفت سے کدھر جائے گا
تشنہ لب دشت کے آزار سے مر جائے گا
یاد تیری ہمیں مرغوب کبھی تھی ساقی
چڑھتا دریا تھا مگر اب یہ اتر جائے گا

❄ عتیق الرحمان، وارث علی.....فیصل آباد
کتنا مشکل ہے زندگی کی کہانی لکھنا
جیسے پانی سے پانی پہ پانی لکھنا

❄ اعجاز احمد راحیل، ماہی.....ضلع ساہیوال
کسی کا درد میں کہاں تک اپنے پاس رکھوں
جس کا ہو نشانی بتا کے لے جائے!

❄ سید محی الدین اشفاق.....فتح پور، ضلع لیہ
ہماری سادگی دیکھے زمانہ
بھروسا کررہے ہیں موسموں پر

❄ محمد اقبال.....کورنگی، کراچی
اب حد سے بڑھ گئی ہے وحشت مری طلب کی
مجھ کو تیرے جنوں نے مجنون کردیا ہے
تجھ سے ملے تھے جب تھا ٹھٹھرا ہوا دسمبر
یادوں نے اس ملن کو اب جون کردیا ہے

❄ محمد قدرت اللہ نیازی.....حکیم ٹاؤن، خانیوال
ہم نے دیے ہیں عشق کو تیور نئے نئے
ان سے بھی ہوجاتے ہیں گریزاں کبھی کبھی

❄ گل مروت، عادی خان.....لکی مروت
دور رہ کر بھی جو سمایا ہے مجھ میں
پاس والوں پہ وہ شخص کتنا اثر رکھتا ہوگا؟

❄ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... ہارون آباد
میں نے جن کے لیے راہوں میں بچھایا تھا لہو
ہم سے کہتے ہیں وہی عہد وفا یاد نہیں

❄ رعنا رضوی..... مانچسٹر، یوکے
یوں اڑے جاتے ہیں بھولی ہوئی یادوں کے ورق
دل کے ویرانے میں پت جھڑ کا سماں ہو جیسے

❄ وزیر محمد خان..... بٹل ہزارہ
تمہارے واسطے میں نے رکھے ہیں دو تحفے
دل ابتدا کے لیے جان انتہا کے لیے

❄ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی
دل میں عجیب طرح کی خوشیاں بکھر گئیں
وہ دل ربا سا شخص ہمیں جب کبھی ملا

❄ محمد جاوید..... تحصیل علی پور
وہ شخص میری لاش پہ آیا نہ رو سکا
اس کو مرے سکون کا کتنا خیال تھا

❄ محمود اختر..... سرگودھا
اک متاعِ دل وجان پاس تھی سو ہار چکے
ہائے یہ وقت کہ اب خود پہ گراں ہیں ہم لوگ

❄ فرحانہ عاصم..... ملتان
مصلحت ہوگی کوئی مجھ کو بھلا دینے میں
ورنہ احباب کو معلوم ہے میں زندہ ہوں

❄ راشد حبیب تابش..... جھپب، ضلع اٹک
ارادہ اس نے بچھڑنے کا کرلیا تھا مگر
ذرا سی بات کے کیا کیا جواز دیکھے گئے

❄ انعم کمال..... کراچی
جانی پہچانی تھی منزل اور سفر تازہ نہ تھا
راستے انجان نکلیں گے یہ اندازہ نہ تھا

❄ فرحان شیخ..... پاک کالونی، کراچی
جب تک سورج اور ہوا میں کوئی بیر نہیں
پیاسی ریت پہ دریا کا ہر نقش عبوری ہے

❄ امتیاز علی..... پھالیاں
بوجھی ہیں اس نے کیسے نظر کی پہیلیاں
وہ شخص تو بلا کا نظر ناشناس تھا

❄ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
عہدِ تو کا اس سے بڑھ کر سانحہ کوئی نہیں
سب کی آنکھیں جاگتی ہیں بولتا کوئی نہیں

❄ محمد راشد..... خانیوال
وقت کی قید نہیں گردشِ تقدیر نہیں
ٹلنے والے غمِ حالات میں ٹل جاتے ہیں

❄ مدحت..... کراچی
دل کے شیشے پر نہ لکھو راز کی باتیں کبھی
آنکھ کی کھڑکی کھلی ہے عکس باہر آئے گا

❄ ادریس خواجہ..... میانوالی
بڑھنے لگی ہے کیفیت اب اضطراب کی
باقی نہیں رہی ہے ضرورت حجاب کی

❄ خالد محمود..... فیصل آباد
خواہش کو پالنا کوئی آسان تو نہیں
اندیشہ ہے یہ روح کا نقصان تو نہیں

❄ زرمین..... اسلام آباد
کچھ نہ ہو رہتا ہے پھر بھی تری یادوں کا ہجوم
دل کسی حال میں بھی مرا نہ ویران رہا

❄ نعمان اعجاز..... سیالکوٹ
نہیں بہار مگر خواہشِ بہار تو ہے
خزاں کی رُت ہے مگر زندگی سے پیار تو ہے

❄ عارفہ جاوید..... بہاولنگر
ہر شاخ اس کی کہنے کو بے برگ ہی سہی
میرے لیے تو سایہ اسی اک شجر میں ہے

❄ اطہر حسین..... کراچی
خوشبو جیسے لوگ ہیں ہم
بس بکھرے بکھرے رہتے ہیں

کوپن برائے شمارہ جنوری 2016

محفل شعر و سخن

نام : --

پتا : --

بہت سے لوگوں کو اس بات پر شدید حیرت ہوتی تھی کہ اوون پرنس اتنی آسانی سے مشکل ترین کیس کیسے حل کرلیتا ہے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا اور اس کا شمار ملک کے بہترین سراغ رسانوں میں ہوتا تھا۔ وہ موسم سرما کا ایک سرد دن تھا اور میں نے ایک خاتون کو اس کے فلیٹ پر اس سے ملاقات کے لیے بلوایا تھا جب میں نے اس کی آمد کے بارے میں بتایا تو وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

مٹی کا چہرہ

ثمر عباس

قدرت نے روزگار پانے کے لیے چند اصول وضع کیے ہیں، جن میں سب سے زیادہ اہمیت ایمانداری کی ہے... مگر انسان اپنی کج روی سے باز نہیں آتا۔ اگر کم ملے تو گن گن کر اہم ضروریات پوری کرتا ہے اور اگر بے حساب ملے تو چن چن کر خواہشات کے پیچھے بھاگتا ہے... یہی حال اس مٹی کے پتلے کا تھا جسے مٹی میں ہی مل جانا تھا لیکن یہ بات بعد از مرگ دوسروں کو سمجھ آئی مگر اسے نہیں آئی۔

پراسرار واقعات کا ادراک... حقائق سے پردہ اٹھاتی کہانی



"آرنلڈ... تمہیں مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا یا کم از کم پہلے سے اطلاع ہی دے دیتے۔ تم میری مصروفیت کے بارے میں جانتے تھے اور تمہیں یہ بھی یاد دلا دوں کہ آج ہمیں رائل اوپیرا ہاؤس میں 'دی فلائنگ ڈچ مین' دیکھنے بھی جانا ہے۔"

"نو پرابلم۔ مجھے معلوم ہے کہ تم دس منٹ میں اس کا مسئلہ حل کر دو گے۔ اس میں آدھا گھنٹا اس کی کہانی سننے اور دس منٹ رسمی جملوں کے تبادلے کے بھی شامل کر لو تب بھی ایک گھنٹے میں تم فارغ ہو جاؤ گے۔ اس کے بعد بھی تمہارے پاس کھانا کھانے اور ڈراما دیکھنے کے لیے کافی وقت ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ نرم پڑتے ہوئے بولا۔ "کیا میں اس کا نام جان سکتا ہوں؟"

"مس وائٹ۔"

"تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"میں اس سے کبھی نہیں ملا۔ اس کے باپ کے ایک دوست نے مجھے اس کی کہانی کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ میرے بہترین گاہکوں میں سے ہے۔"

دروازے کی گھنٹی بجی تو اوون تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ وہ لڑکی واقعی بہت خوب صورت تھی۔ اس کے گال گلابی اور آنکھیں نیلی تھیں۔ اوون اسے دیکھ کر خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔

"مس وائٹ۔" اس نے بڑے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "ان سے ملو۔ یہ میرے دوست آرنلڈ اسٹاک ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔"

وہ میری جانب مڑی اور شکریہ ادا کرتے ہوئے بولی۔ "پاپا نے مجھے بتا دیا تھا اور میں آپ کی شکرگزار ہوں کہ آپ نے اس ملاقات کا اہتمام کیا۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں رسمی تکلفات میں پڑنے کے بجائے کام کی بات کرنا چاہیے۔" اوون بولا۔ "کیا تم مجھے اپنا مسئلہ بتانا چاہو گی؟"

اس لڑکی نے چند لمحے توقف کیا جیسے وہ اپنے ذہن میں واقعات کو ترتیب دے رہی ہو پھر اس نے اپنی کہانی بیان کرنا شروع کی۔

"دو سال پہلے میں نے سر جیمس کارڈنیٹس کے یہاں خادمہ کے طور پر ملازمت کی تھی۔ کبھی کبھی مجھے بوڑھے باورچی کے حصے کا کام بھی کرنا پڑتا جو اکثر بیمار رہا کرتا تھا۔ پریشانی اس وقت شروع ہوئی جب تین ماہ قبل سر جیمس واپس آئے۔ وہ ایک سال سے زیادہ عرصے تک اپنے بھائی کے ساتھ عراق میں کھدائی کرتے رہے۔ انہیں آثارِ قدیمہ سے گہرا لگاؤ تھا۔ حال ہی میں شائع ہونے والی معلومات نے ان کے تجسس کو ہوا دی جو بائبل کے عظیم طوفان سے متعلق تھی لیکن ایسا لگتا ہے کہ لوگ اس کے بارے میں پہلے بھی لکھتے رہے ہیں جو فارسی زبان میں تھا اور اسے سمجھنا بہت مشکل تھا، لہٰذا سر جیمس نے اپنے طور پر تحقیق کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے پاس وقت اور پیسے کی کمی نہ تھی لہٰذا وہ عراق چلے گئے اور میں ایک سال تک ان کی بیوی کلاڈیا کے ساتھ رہی جو کافی جوان اور خوب صورت تھی اور بڑے صبر کے ساتھ اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ بہ مشکل بائیس سال کی ہوگی جبکہ سر جیمس اس سے دگنی عمر کے تھے لیکن وہ بہت فعال تھے اور انہیں مہم جوئی پسند تھی۔ بہ ظاہر یہی لگتا تھا کہ دونوں کی جوڑی بالکل مکمل ہے اور ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔

"موسمِ خزاں میں سر جیمس کی واپسی ہوئی لیکن وہ کافی بدل چکے تھے۔ جسمانی طور پر تو ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی ایک پرکشش مرد تھے لیکن وہ بڑے محتاط اور چوکنا ہو چکے تھے اور انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی ان دیکھے دشمن سے خوفزدہ ہوں۔ جیسے کوئی ان کی تاک میں ہو۔ مجھے ان کی تحقیق کے نتائج کے بارے میں علم نہ ہو سکا کیونکہ انہوں نے اسے بالکل خفیہ رکھا تھا، البتہ اتنا ضرور معلوم ہوا کہ ان کے بھائی ولیم کو کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا پھر اکتوبر کے مہینے میں سر جیمس کو پے در پے کئی حادثات کا سامنا کرنا پڑا لیکن خوش قسمتی سے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

"اس کی ابتدا باغ میں واقع سائبان میں آگ لگنے سے ہوئی جو باغ کے عقبی حصے میں بنا ہوا تھا اور سر جیمس کبھی کبھار وہاں آرام کیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی وہ وہاں سو رہے تھے جب آگ لگی۔ انہیں گرمی محسوس ہوئی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ آئے، لیکن یہ معما حل نہ ہو سکا کہ سائبان میں آگ کیسے لگی؟ اگلے ہفتے وہ تقریباً ایک گاڑی کے نیچے آتے آتے بچے جب وہ کلاڈیا کے ساتھ ایک سڑک کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے، انہوں نے کسی کو نہیں دیکھا اور نہ ہی زمین پر گرے لیکن انہیں یوں لگا جیسے کسی ان دیکھی قوت نے انہیں دھکا دیا ہو۔ اس کے چند روز بعد جب وہ کلاڈیا کے ساتھ مقامی چڑیا گھر کی سیر کر رہے تھے تو اچانک ایک سانپ پھن پھیلائے ان کے سامنے آ گیا۔ سر جیمس بڑی تیزی سے ایک طرف کو ہو گئے اور انہوں نے پھرتی سے

اپنے آپ کو سانپ کے ڈسنے سے بچالیا البتہ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ پنجرے کا دروازہ کیسے کھلا رہ گیا تھا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ واپس آنے کے بعد اتنے کم وقت میں پے در پے حادثات کیوں رونما ہورہے ہیں۔ کہیں عراق میں کھدائی کے دوران کوئی عجیب واقعہ تو پیش نہیں آیا تھا لیکن میں کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کرسکی کیونکہ کلاڈیا اور اس کا شوہر خود بھی بہت پریشان نظر آرہے تھے پھر میں نے ایک روز اخبار میں مضمون پڑھا۔ یہ مڈل ایسٹ میں ہونے والی تحقیقات سے متعلق تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے عراق میں جو کارروائیاں کیں وہ بھی مشکوک تھیں۔

"جس جگہ کھدائی ہورہی تھی وہاں نصف شب کے قریب آگ لگ گئی جس نے سب کچھ تباہ کردیا۔ یہ ایک انتہائی خوف ناک حادثہ تھا جس میں نہ صرف قیمتی نوادرات کا نقصان ہوا بلکہ دو کارکن بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، مقامی انتظامیہ نے الزام لگایا کہ سرجیمس نے یہ آگ جان بوجھ کر لگائی تھی تاکہ یہ ظاہر ہوسکے کہ اس میں وہ اہم نوادرات بھی ضائع ہوگئے جنہیں وہ اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہے تھے اور انہیں پہلے ہی چھپادیا گیا تھا۔ اس کے دفاع میں کہا گیا کہ یہ الزامات ثابت نہ ہوسکے اور انتظامیہ نے محض اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کے لیے سرجیمس کو موردِ الزام ٹھہرایا تھا۔ یہ بھی سنا گیا کہ ایک بوڑھے عراقی نے روانگی کے بعد سرجیمس کو بددعا دی تھی کہ انہوں نے مقدس اشیا کی جو بے ادبی کی تھی، اس کا انہیں خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

آپ تصور کرسکتے ہیں کہ یہ سب جان کر میری کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔ میں سوچ رہی تھی کہ ایک بوڑھے فقیر نے انہیں بددعا دی اور اس کے فوراً بعد ہی حادثات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ایک دن جب میں ان کا کمرا صاف کررہی تھی تو میری نگاہ ایک فولڈر پر گئی جس پر بڑے حروف میں "سیلاب" لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور بولے۔ "اس میں ایسا مواد ہے جو کسی دوسرے طوفان کا سبب بن سکتا ہے۔"

اس شام انہوں نے مجھے اعتماد میں لے کر قدیم عراقی تہذیب کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں جنہیں میں غور سے سنتی رہی لیکن وہ جو کچھ کہہ رہے تھے میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ قدیم دیوی دیوتاؤں کے بارے میں بتارہے تھے۔ ان کی میز پر ایک پروں والا شیر اور ایک دوسری عجیب وغریب مخلوق رکھی ہوئی تھی جو میرے لیے پریشانی کا سبب تھی۔

"قدیم عراقیوں کا عقیدہ تھا کہ ہم سب مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔ تھوڑی سی مٹی لو۔ اسے کسی سانچے میں ڈھال لو اور اس میں روح پھونک دو۔ اس طرح روئے زمین پر ایک اور انسان جنم لے لے گا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ مسکرارہے تھے۔ میں نے شیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں اس پر مزید کام کی ضرورت ہے۔"

انہوں نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے میرے جملے سے محظوظ ہوئے ہوں۔

"کیا تمہیں اس مخلوق سے ڈر لگتا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہاں۔ تھوڑا بہت کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ یہ کچھ بڑا بن گیا ہے اور کافی بدنما ہے۔"

"اور یہ اڑتا بھی ہے۔" انہوں نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے جب پر ہیں تو اڑے گا بھی۔"

"ایک اڑنے والی مخلوق جو مٹی سے بنائی گئی ہے۔ بہت عجیب بات ہے۔ میں نے کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا۔" وہ عجیب سے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"اس کے بعد میں وہاں سے چلی آئی لیکن وہ میرے جملوں سے خوش ہوئے تھے جیسے اس طرح ان کے ذہن سے پریشانیاں دور ہوگئی ہوں۔ نہ جانے کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کچھ برا ہونے والا ہے اور بدقسمتی سے میرے اندیشے صحیح ثابت ہوئے۔

"رات نو بجے کے قریب یہ واقعہ پیش آیا۔ کلاڈیا سونے کے لیے چلی گئی تھی لیکن سرجیمس اپنی اسٹڈی میں کام کررہے تھے۔ اچانک ہی دروازے کی گھنٹی بجی۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی کہ رات کے اس پہر اس موسم میں کون آگیا۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ میں نے سیڑھیوں پر ایک شخص کو دیکھا جو بارش میں بھیگ رہا تھا۔ اس کے کوٹ کا کالر اوپر اٹھا ہوا تھا اور اس نے ہیٹ کو آگے کی طرف اتنا جھکا رکھا تھا کہ اس کی آنکھیں تک چھپ گئی تھیں۔ اس نے سرجیمس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس نے ملاقات کا وقت لے رکھا ہے تو وہ بڑبڑانے لگا۔ مجھے اس کے رویے پر حیرانی ہوئی لیکن میں نے اس سے باہر انتظار کرنے کے لیے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اسے مسٹر جیمس کی اجازت کے بغیر اندر آنے دیا تو کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ پیش آسکتا ہے۔ جب میں نے سرجیمس کو

مہمان کے بارے میں بتایا تو وہ طنزیہ انداز میں بولے کہ کیا مجھے مہمانوں کو بارش میں کھڑا رکھنے کی عادت ہے۔ میں نے ان کی بات کا برا نہیں منایا۔ جانتی تھی کہ وہ کبھی کبھی چڑچڑے ہو جاتے تھے۔ خاص طور پر اس وقت جب انہیں کوئی خاص کاغذ نہ مل رہا ہو۔

''میں نے اس اجنبی مہمان کو کمرے میں بٹھا دیا۔ اس وقت تک میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا لیکن جیسے ہی سرجیمس کمرے میں داخل ہوئے اور مہمان نے اپنا ہیٹ اتارا تو میں نے اس کے چہرے کی جھلک دیکھ لی اور بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔''

اس مرحلے پر مس وائٹ خاموش ہوگئی۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی اور جلد کی زرد رنگت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ابھی تک اس واقعے سے خوفزدہ تھی۔ ''میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنا وحشت ناک چہرہ نہیں دیکھا تھا۔'' اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ''اس کے نقش و نگار بھورے، کھردرے اور بے شکل تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ چہرہ مٹی سے بنایا گیا ہو۔ ایک غیر انسانی مخلوق جسے دیکھتے ہی رگوں میں خون جم جائے۔ میں دروازے کے کی ہول سے اندر کا منظر دیکھ رہی تھی اور سرجیمس کے لیے پریشان ہو رہی تھی لیکن وہ دونوں کمرے کے آخری کونے میں چلے گئے تھے اور بہت نیچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کی گفتگو نہ سن سکی۔ اس لیے ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

''تقریباً پندرہ منٹ بعد میں نے ایک آواز سنی۔ میں تیزی سے اس کمرے کی طرف گئی لیکن اس وقت تک مہمان مرکزی دروازے تک پہنچ چکا تھا اور میں دروازہ بند ہونے سے پہلے اس کی ایک جھلک ہی دیکھ سکی۔

''میں نے سوچا کہ سرجیمس سے بات کرلوں تاکہ مجھے یقین آجائے کہ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی ہے لیکن مجھے کچھ دیر پہلے ان کا ناراض ہونا یاد آگیا اس لیے یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ یہ ان کا معاملہ ہے، مجھے دخل اندازی دینے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے اسٹڈی میں ان کے قدموں کی آواز آرہی تھی اور وہ پُرسکون نظر آرہے تھے۔ لہٰذا میں بھی سونے کے لیے چلی گئی۔ اس وقت گیارہ بج رہے ہوں گے جب بارش رک چکی تھی لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اب کبھی اپنے مالک کو زندہ نہیں دیکھ سکوں گی۔

''اگلے روز علی الصباح میں ایک دھماکے کی آواز سن کر جاگ گئی۔ چند لمحے تو بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ خیال آیا کہ کہیں کوئی خواب نہ دیکھا ہو پھر سیڑھیاں اتر کر نیچے گئی۔

میں نے کوریڈور کے آخری سرے پر کلاڈیا کو شب خوابی کے لباس میں دیکھا۔ وہ زور زور سے اسٹڈی کا دروازہ پیٹ رہی تھی اور اپنے شوہر کا نام لے کر اسے پکار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ سرجیمس رات کو سونے کے لیے اپنے کمرے میں نہیں آئے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اگر وہ اپنے کسی پروجیکٹ میں مصروف ہوتے تو رات دیر تک اسٹڈی میں کام کرتے رہتے تھے لیکن وہ انہیں پورے گھر میں دیکھ چکی تھی اور اسٹڈی کا دروازہ اندر سے بند تھا۔

''اتنی دیر میں بوڑھا جارج بھی وہاں آگیا۔ اس نے جھک کر کی ہول میں سے جھانکا پھر تجویز پیش کی کہ ماسٹر کی سے دروازے کا تالا کھولا جاسکتا ہے لیکن یہ تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہوئی کیونکہ دروازے میں اندر چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ اب دروازہ توڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جارج بوڑھا ہو چکا تھا لیکن اس میں اتنی طاقت تھی کہ دروازہ توڑ سکے۔ تیسری کوشش میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

''ہم تینوں اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ سرجیمس اپنی میز پر اوندھے پڑے ہوئے تھے جو فرانسیسی کھڑکی کے ساتھ ہی رکھی ہوئی تھی جبکہ کھڑکی کا ایک پٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا اور ان کے ماتھے سے خون بہہ کر میز پر رکھے ہوئے بیڈ پر گر رہا تھا۔ کمرے میں کسی پاؤڈر کی ناگوار بو چھائی ہوئی تھی۔ کلاڈیا زور زور سے چلانے لگی۔ جارج نے اسے سنبھال لیا کیونکہ وہ بے ہوش ہونے والی تھی اور اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد وہ پولیس کو اطلاع دینے چلا گیا اور جاتے جاتے مجھے تاکید کی کہ مالکن کا خیال رکھوں اور ہو سکے تو اسے تھوڑی سی برانڈی پلا دوں۔ اس دوران کلاڈیا نے ایک رومال نکال لیا اور اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے بعد میں جارج کی ہدایت کے مطابق برانڈی لینے چلی گئی اور کلاڈیا کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی اپنے حلق میں بھی اتارلی کیونکہ اس وقت میں بہت کمزوری محسوس کر رہی تھی۔

''پولیس نے پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ تین آفیسر تھے اور ڈاکٹر بھی ساتھ آیا تھا۔ ان میں سے انسپکٹر چارلس اس خاندان کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ دراز قد اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ کام کے دوران وہ زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا لیکن اس نے دوپہر تک ابتدائی تفتیش مکمل کرلی۔ اس سے پہلے اس نے مجھ سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے گزشتہ شب آنے والے اجنبی مہمان سے متعلق میری

گواہی کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔
''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرجیمس نے خودکشی کی ہے۔'' اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''تمام شواہد اسی جانب اشارہ دے رہے ہیں۔ لاش کی پوزیشن، سر کا زخم اور ان کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور......''
''نہیں۔ انہیں اس اجنبی مہمان نے قتل کیا ہے جو گزشتہ رات یہاں آیا تھا۔''
یہ الفاظ اچانک ہی میری زبان سے ادا ہوئے۔ میں نے کلاڈیا اور جارج کے چہروں پر اضطراب کے آثار دیکھے لیکن پولیس آفیسر نے میری بات کا کوئی اثر نہیں لیا اور صرف اتنا کہا کہ اس نے میرا نکتہ سمجھ لیا ہے پھر اس نے بڑی وضاحت سے میرے ریمارکس کی تردید کرتے ہوئے کہا۔
''براہِ کرم سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ میں اس امکان کو رد نہیں کرتا لیکن ہمیں حقائق کو مدِنظر رکھنا ہوگا۔ ساڑھے سات بجے ایک دھماکا ہوا۔ سب لوگ اسٹڈی کی جانب بھاگے لیکن اس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ آپ لوگ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تو وہاں سرجیمس کی لاش ملی۔ تینوں گواہوں کا یہی کہنا ہے۔ اس کمرے میں کسی کے چھپنے کی گنجائش نہیں ہے اور تینوں گواہوں کا یہ کہنا ہے کہ جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں کوئی نہیں تھا پھر قاتل کہاں چلا گیا؟ وہاں سے نکلنے کا ایک ہی امکانی راستہ ہے۔ وہ فرانسیسی کھڑکی جس کا ایک پٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ قاتل اس کھڑکی کے ذریعے فرار ہوگیا ہوگا تب بھی دیگر حقائق اس کی نفی کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگوں نے باہر جاکر بھی دیکھا ہوگا۔ وہاں دس گز کے دائرے میں کیچڑ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اگر کوئی وہاں سے گزرا ہوتا تو اس کے قدموں کے نشانات ضرور ہوتے لیکن وہاں ایسا کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح کھڑکی یا کسی اور جگہ کوئی اور نشان نہیں پایا گیا۔ گزشتہ شام سات بجے کے بعد وہاں سے کوئی نہیں گزرا اس وقت تک بارش بھی تھم چکی تھی۔ اگر سرجیمس کو قتل کیا گیا ہے تو یہ کسی ایسے شخص کی حرکت ہوسکتی ہے جو اڑنا جانتا ہو۔''
انسپکٹر چارلس نے بڑے اعتماد سے صورت حال کی وضاحت کی لیکن اس کے ایک ساتھی نے جھجکتے ہوئے اس سے اختلاف کیا اور بولا۔ ''مجھے خدشہ ہے کہ سرجیمس نے خود کو ہلاک نہیں کیا۔ درحقیقت وہ ایسا کرہی نہیں سکتے تھے۔''
''یہ تم کیا کہہ رہے ہو ایوانس؟'' انسپکٹر چارلس نے تیزی سے کہا۔

یہاں سے تفتیش کا رخ تبدیل ہوگیا اور انسپکٹر چارلس نے اپنے ہی قائم کردہ مفروضے کو نظرانداز کرکے میرے بیان پر توجہ دینا شروع کردی۔ ''تم کہہ رہی ہو کہ اس شخص کا چہرہ مٹی کا تھا۔ یہ تو محض ایک خیال معلوم ہوتا ہے اور ایسی کہانیاں ہم کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں۔''
''میں نہیں جانتی کہ وہ واقعی مٹی تھی لیکن سرجیمس سے گزشتہ شام میری جو گفتگو ہوئی تھی، اس کے پیش نظر میرے ذہن میں پہلی بات یہی آئی۔ بہرحال وہ کوئی انسانی چہرہ نہیں تھا اور یہ بات میں حلفیہ کہہ سکتی ہوں۔''
''سرجیمس نے اس شخص کا استقبال کیا تھا؟''
''ہاں لیکن اس ملاقات کا اختتام جھگڑے پر ہوا تھا۔ اس کے بعد اچانک ہی وہ شخص چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے دروازہ بھی زور سے بند کیا تھا۔''
''اگر وہی شخص قاتل ہے تو وہ صبح دوبارہ آیا ہوگا کیونکہ ڈاکٹر نے تصدیق کردی ہے کہ موت کا وقت وہی ہے جب دھماکا ہوا تھا یعنی صبح ساڑھے سات بجے۔''
یہ کہہ کر انسپکٹر چارلس اپنی ٹھوڑی کھجانے لگا پھر ایک وقفے کے بعد بولا۔ ''یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان جھگڑا ہوا، ان میں سے ایک غصے کے عالم میں چلا گیا پھر وہ بدلہ لینے کے لیے دوبارہ آیا لیکن اس کے بعد کچھ واضح نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ اس نے جرم کیسے کیا؟ وہ کیچڑ عبور کرکے مکان میں کیسے داخل ہوا جبکہ وہاں اس کے قدموں کے نشانات بھی نہیں ہیں۔''
''یہ واقعی عجیب بات ہے۔ اس لیے بھی کہ اس شام میں اور سرجیمس ایسی ہی ایک مخلوق کے بارے میں باتیں کر رہے تھے جو مٹی کی بنی ہوئی ہو اور اڑ سکتی ہو۔''
''جب انسپکٹر وہاں سے رخصت ہوا تو اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ میں نے اسے سرجیمس کو ملنے والی بددعا اور اس کے بعد پیش آنے والے پراسرار واقعات کے بارے میں بھی بتا دیا تھا لیکن وہ اس سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرسکا۔ کلاڈیا کا کہنا تھا کہ ہر حادثے سے پہلے سرجیمس کو گتے کے ٹکڑے پر لکھا ہوا ایک پیغام موصول ہوتا تھا پہلی بار جب وہ آگ کے شعلوں میں گھر گئے تو اس سے پہلے انہیں جو پیغام ملا، اس پر لکھا ہوا تھا ''سورج بہت طاقت ور ہے اور تم اس سے انکار نہیں کرسکتے۔'' دوسری بار جب وہ سڑک کے حادثے میں بال بال بچے تو اس سے پہلے انہیں جو پیغام ملا وہ ایک ایسے منہ زور بیل کے بارے میں تھا جو خطا کاروں کو سزا دیتا ہے اور جب تیسری بار سانپ نے ان پر حملہ کیا تو اس سے

پہلے ملنے والے پیغام میں سانپوں کی دیوی کا ذکر تھا جو انصاف کرتی ہے۔

''جیسے جیسے تفتیش آگے بڑھتی گئی، یہ محسوس ہونے لگا کہ سرجیمس اس بددعا کا شکار ہوئے تھے لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ پیغام بھیجنے والا کون تھا اور انہیں کس نے قتل کیا اور ان سب سے بڑھ کر سرجیمس کی پراسرار تحقیق کے بارے میں بھی سوالات تھے۔ کیا انہوں نے سیلاب کے بارے میں کوئی نئی بات دریافت کی تھی۔ ان تمام واقعات سے اس کی تصدیق ہورہی تھی۔

قتل کے دس روز بعد پولیس کو ایک تالاب کی تہ سے چمڑے کا بڑا بیگ ملا۔ یہ تالاب سرجیمس کی رہائش گاہ سے زیادہ دور نہیں تھا، اس میں پتھر کی وہ گولیاں تھیں جن پر کبھی وہ پراسرار عبارت تحریر کی گئی تھی لیکن بدقسمتی سے پانی میں زیادہ عرصہ پڑے رہنے کے سبب وہ مٹ گئی۔

مس وائٹ نے اپنا بیان ختم کرکے ایک گہری سانس لی اور پرامید نگاہوں سے اوون کی طرف دیکھنے لگی۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی، البتہ کھڑکی سے بارش کے قطروں کی ٹپ ٹپ سنائی دے رہی تھی۔

''گویا عظیم سیلاب کے بارے میں پراسرار تحریر پانی میں دھل گئی۔'' اوون نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ تقریباً لیکن ایک شخص ایسا ہے جو اس معاملے پر روشنی ڈال سکتا ہے اور وہ ہے سرجیمس کا بھائی ولیم۔ وہ ان کے ساتھ عراق گیا تھا۔ پولیس نے اسے بہت تلاش کیا لیکن کوئی پتا نہیں چل سکا۔ اس کے علاوہ ایک اور بری خبر بھی ہے اور وہ یہ کہ سرجیمس کو آثار قدیمہ کی کھدائی سے بہت دلچسپی تھی لہٰذا اس کے اخراجات پورے کرنے کے لیے وہ مقروض ہوگئے۔ اگر ان کے تمام قرضوں کی ادائیگی کردی جائے تو ان کی بیوہ کے لیے کچھ نہیں بچے گا۔ خوش قسمتی سے انہوں نے ایک بڑی انشورنس پالیسی لے رکھی تھی۔ کلاڈیا اس حادثہ کے بعد ذہنی طور پر اتنی منتشر ہے کہ وہ اس صورتِ حال کو نہیں سمجھ سکتی۔ میں اسی لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔ اس قتل کو تین ہفتے ہوچکے ہیں لیکن ابھی تک تفتیش کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔''

جیسے ہی اس نے اپنی بات ختم کی، اسے چھینکیں آنے لگیں۔ اس نے اپنے پرس سے ایک کڑھا ہوا رومال نکالا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ یہ کوئی عام کیس نہیں ہے۔''

''کسی حد تک کہہ سکتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

بابا فرید گنج شکر علیہ الرحمۃ
کے حالات وافکار

☆ اے فرید! رب تعالیٰ کے بہت رنگ ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اس دنیا میں جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگ گیا، اسی کا روپ سچا روپ ہے۔

☆ اے فرید! رات کو عبادت کے لیے جاگنے والوں میں کستوری بٹتی ہے۔ لیکن سوئے ہوئے غافلوں کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ جن کی آنکھیں نیند سے بند ہیں، انہیں کوئی حصہ مل بھی کیسے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کی کستوری تو انہی کا انعام ہے جو راتوں کو جاگ جاگ کر ذکر وفکر الٰہی کرتے ہیں۔

☆ اے فرید! تن سمندر ہے اور خواہشات اس کی لہریں اور تیرنے والے ان لہروں میں بہت ہیں۔ بھلا ہجر وفراق کے مارے ہوئے اگر ایک آہ نہ کرتے تو پھر جیتے کیسے؟

مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ لاہور

''میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے اتنی حیران کن کہانی نہیں سنی۔ ایک مٹی کے چہرے والا قاتل، اڑنے والی مخلوق اور بوڑھے کی بددعا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہم ایک ہی نشست میں اس گتھی کو کیسے سلجھا سکتے ہیں۔ تم کیا کہتے ہو اوون؟''

''میں انسپکٹر چارلس کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ بہت زیادہ ذہین تو نہیں لیکن کھوجی اور باریک بین ہے۔ مجھے اس پر پورا بھروسا ہے اور یقین ہے کہ وہ بہت جلد اس کیس کو حل کرلے گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہارا اپنا کیا نظریہ ہے؟''

وہ میری بات کا جواب دیے بغیر مس وائٹ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''تمہاری کہانی انتہائی غیر معمولی ہے اور تم نے بہت تفصیل سے سب کچھ بیان کردیا ہے۔ اس کے باوجود میں تم سے دو چار سوالات مزید کرنا چاہوں گا۔''

''بالکل۔ آپ جو چاہیں پوچھ سکتے ہیں۔''

''تم گزشتہ ایک سال سے کلاڈیا کے ساتھ رہ رہی ہو۔ ہم عمر ہونے کی وجہ سے تمہارے درمیان بے تکلفی اور دوستی بھی ہے تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس کی نظریں کسی اور پر تو نہیں؟''

مس وائٹ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ اس کا کوئی محبوب تھا۔ البتہ حال ہی میں اس نے اپنے بچپن کے ایک دوست جولی کے ساتھ دوبارہ جان پہچان پیدا کرلی تھی جو کچھ عرصے کے لیے اپنے گاؤں میں رہنے آیا ہے۔ وہ کبھی کبھی اس کے ساتھ گھڑسواری کے لیے جایا کرتی تھی لیکن اس کے علاوہ......''

''بہتر ہوگا کہ تم اپنے جواب کو اس سوال تک ہی محدود رکھو۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے سر جیمس کے بھائی کی گمشدگی پریشان کر رہی ہے۔ یقیناً اس کا اس معاملے سے کوئی نہ کوئی تعلق ہے۔''

''تمہارا آخری نکتہ قابل غور ہے۔ تالاب سے بیگ کی برآمدگی ثابت کرتی ہے کہ نوادرات کی چوری والی بات درست ہے اور بلاشبہ اس میں دونوں بھائی ملوث تھے۔ عراقی حکام کا یہ شبہ بھی صحیح ہے کہ ان بھائیوں نے اپنی چوری کو چھپانے کے لیے آگ لگائی تھی۔ اب تمہارے خیال میں قاتل کون ہوسکتا ہے؟''

یہ کہہ کر وہ میری طرف طنزیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ میں نے جواب دینے میں کچھ وقت لگایا۔

''اگر اس نے یہ قتل خود نہیں کیا تب بھی اس کے پیچھے اسی کا ہاتھ ہے۔''

''ایسی صورت میں یہ کام کون کرسکتا ہے؟ مٹی کے چہرے والا وہ پراسرار آدمی جس نے مس وائٹ کو اتنا زیادہ پریشان کر دیا تھا؟''

''اس دن کے بعد سے مجھے روزانہ ڈراؤنے خواب آرہے ہیں۔'' مس وائٹ نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وہ وحشت ناک چہرہ اور اڑنے والا شیر مجھے روزانہ ہی خواب میں نظر آتے ہیں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے آرنلڈ؟'' اوڈن نے مجھ سے پوچھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ یہ سب کچھ میری سمجھ سے باہر ہے۔''

''کیا تم واقعی کچھ نہیں سمجھ سکے؟'' اوڈن نے کہا۔

''کیا؟''

''یہی کہ وہ پراسرار ملاقاتی کون تھا؟''

''میرا خیال ہے کہ اس شخص نے اپنے چہرے پر مٹی کا ماسک چڑھا رکھا تھا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''کیا تم اب بھی نہیں سمجھ سکے کہ وہ ملاقاتی کوئی اور نہیں بلکہ سر جیمس کا بھائی ولیم تھا۔''

پھر وہ مس وائٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''مجھے تمہاری گواہی پر شک نہیں لیکن تمہارا موازنہ درست نہیں۔ شاید تم پر وہاں کے ماحول اور تمہارے مالک کی پراسرار سرگرمیوں کا اثر غالب آگیا ہے۔ میرے دوست کو بھی یہ جان لینا چاہیے کہ تم نے جو چہرہ بیان کیا، وہ آگ میں جھلسا ہوا چہرہ تھا۔ وہ آگ جو دونوں بھائیوں نے کھدائی کے دوران لگائی تھی جس کے نتیجے میں ولیم کا چہرہ ہمیشہ کے لیے بدنما ہوگیا۔ اس سے زیادہ تفصیل میں نہیں جانتا لیکن یہ سمجھ سکتا ہوں کہ اس رات ولیم یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ چرائے ہوئے نوادرات کا سودا ہوگیا ہے۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان کسی بات پر بحث چھڑ گئی۔ لگتا ہے کہ ولیم نے اپنے بھائی سے اس سودے کے عوض کسی بڑی رقم کا مطالبہ کیا ہوگا کیونکہ زیادہ نقصان اسی کا ہوا تھا۔ وہ اپنے چہرے سے محروم ہوچکا تھا۔ جب اس کا مطالبہ نہیں مانا گیا تو وہ غصے کی حالت میں وہاں سے چلا گیا اور جاتے ہوئے وہ نوادرات قریبی تالاب میں پھینک گیا۔ مجھ سے یہ مت پوچھنا کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔ مجھے اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ملک سے باہر چلا گیا ہو۔''

ایک مختصر خاموشی کے بعد مس وائٹ نے کہا۔ ''مجھے اس بارے میں پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھا۔ میں بلاوجہ ہی اسے مٹی کا چہرہ سمجھ کر ڈرتی رہی۔''

''لیکن یہ سوال تو اب بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ سر جیمس کو کس نے قتل کیا؟'' میں نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہیں ذرا سا بھی اندازہ نہیں ہے؟'' اوڈن نے جواب دیا۔ ''جبکہ مشتبہ افراد کی فہرست کچھ زیادہ طویل نہیں۔''

''ہوں۔'' میں نے ہنکارا بھرا۔ ''مجھے کچھ سوچنے دو۔ اگر تمہارے اصول کا اطلاق کیا جائے تو جو سب سے کم پسندیدہ شخص ہوسکتا ہے وہ ہے جارج، وہ مالی کا کام بھی کرتا تھا اور جانتا ہوگا کہ قدموں کے نشان ڈالے بغیر کیچڑ میں سے کیسے گزرا جاسکتا ہے اور اسے ریوالور چلانا بھی آتا ہوگا۔''

اوڈن ہنستے ہوئے بولا۔ ''تم اس پراسرار اور بے معنی حل تک کیسے پہنچ گئے جبکہ حقیقت بہت سادہ سی ہے۔ اتنی سادہ کہ اسے ایک لفظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔''

''ایک لفظ میں۔'' مجھے غصہ آگیا۔ ''یہ ایک پیچیدہ کیس

ہے۔ تم اس کا حل ایک لفظ میں کیسے بیان کر سکتے ہو؟''
''بالکل اور مجھے اعتراف ہے کہ اس کا اشارہ بھی ہماری مہمان نے دیا ہے۔''
''میں نے۔'' مس وائٹ چونک پڑی۔ ''میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟''
اوون نے مینٹل پیس پر رکھے ہوئے مجسموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں بھی ان مجسموں کے درمیان رکھ دوں کیونکہ تم بھی انہی ہستیوں کی طرح پروقار ہو۔ تم نے جس شاندار طریقے سے اپنا رومال بیگ سے نکالا، اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ کیا تم یہ عمل دوبارہ دہرا سکتی ہو؟ شاید میرا دوست بھی اس سے متاثر ہو سکے۔''
مس وائٹ نے حیران ہوتے ہوئے اس کی فرمائش پوری کی تو اوون نے اس کے ہاتھ سے رومال لے لیا اور بولا۔ ''اسے رومال کہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک رومال کلاڈیا کے پاس بھی ہوگا جسے وہ اپنے آنسو پونچھنے کے لیے استعمال کرتی ہوگی۔ جب تم اس کے لیے برانڈی لینے کمرے سے باہر گئیں تو وہ اپنے شوہر کی لاش کے پاس اکیلی رہ گئی۔''
''تم چاہتے ہو کہ ہم یقین کرلیں کہ اس نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے؟'' میں حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''اور اس نے یہ کارنامہ ایک چھوٹے سے رومال کی مدد سے انجام دیا؟''
''کلاڈیا نے کسی کو قتل نہیں کیا جبکہ اس کی نیت ایسا کرنے کی تھی لیکن کوئی دوسرا اس سے بازی لے گیا۔''
پھر وہ مس وائٹ کی طرف مڑا اور اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ کلاڈیا اور اس کے بچپن کے دوست کے درمیان دوستی کے علاوہ کوئی اور تعلق نہیں تھا۔ کیا اس نے اپنے شوہر کو قتل کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا کہ وہ جوکی کے ساتھ محبت کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی یا اس کی نظریں اس بڑی انشورنش پالیسی پر تھیں جو مسٹر جیمس نے اپنی دولت اڑا دینے کے بعد لی تھی۔ شاید دونوں وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن جب اس نے بوڑھے عراقی کی بددعا کے بارے میں سنا تو اپنا منصوبہ ایک طرف کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس بددعا سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ لہٰذا اس نے وہ پراسرار پیغامات بھیجے اور ان حادثات کا بھی بندوبست کر دیا کیونکہ وہ مستقل اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ اسی لیے کسی کو اس پر شک نہیں ہو سکتا تھا۔ پیغامات بھیجنے کا مقصد سر جیمس کو خوفزدہ کرنا اور یہ جتانا تھا کہ بددعا اپنا اثر دکھا رہی ہے تاکہ جب اسے قتل کیا جائے تو سب یہی سمجھیں کہ سر جیمس کو بددعا نے مار ڈالا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس لیے وہ اپنے منصوبے پر عمل نہ کر سکی۔''
''تمہارا مطلب ہے کہ کسی اور نے سر جیمس کو قتل کر دیا لیکن وہ کون ہو سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''نہیں۔ سر جیمس نے خودکشی کی تھی۔ وہ ان دھمکی آمیز پیغامات اور پے در پے پیش آنے والے حادثات سے پریشان ہو گیا تھا۔ جب اس کا بھائی لڑ جھگڑ کر چلا گیا تو اس نے تنہائی میں بیٹھ کر آگ لگنے والے واقعات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ جو آگ اس نے کھدائی کی جگہ لگائی تھی۔ اس میں دو معصوم کارکنوں کی جان چلی گئی اور اس کے بھائی کا چہرہ ہمیشہ کے لیے بدنما ہو گیا چنانچہ اس نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
''جب کلاڈیا نے اس کی لاش دیکھی تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے شوہر نے جاتے جاتے اسے بہت بری چوٹ دے دی ہے اور خودکشی کر کے اس کا سارا منصوبہ تباہ کر دیا ہے کیونکہ خودکشی کی صورت میں اسے بیمہ کی رقم نہیں ملتی۔ جب اس نے اپنے آنسو پونچھنے کے لیے رومال نکالا۔ اس وقت تک وہ ذہنی طور پر بیمہ کی رقم سے محروم ہونے کے لیے تیار ہو چکی تھی لیکن جب تم برانڈی لینے کے لیے کمرے سے باہر گئیں تو اسے اچانک ہی ایک خیال آیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور رومال لے کر اپنے شوہر کے ریوالور پر اس کی انگلیوں کے نشانات صاف کر دیے پھر ریوالور کو بڑی احتیاط سے دوبارہ اس کے ہاتھ کے نیچے رکھ دیا۔ اس طرح یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ اس کے شوہر کے ہاتھ میں ریوالور نہیں تھا بلکہ کسی اور شخص نے فرانسیسی کھڑکی کے راستے اندر آ کر اسے قتل کر دیا۔ کیچڑ میں کسی کے قدموں کے نشانات کی عدم موجودگی نے اس کیس کو اور بھی الجھا دیا۔ اسی لیے پولیس ابھی تک ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔''
ایک طویل وقفہ خاموش رہنے کے بعد وہ میری طرف مڑا اور بولا۔ ''تم نے دیکھا آرنلڈ کہ ایک چھوٹے سے رومال سے بھی معجزے رونما ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ سادگی میں ہی سب کچھ ہے۔''
میں سر ہلا کر رہ گیا۔ سامنے کی بات تھی جو میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مس وائٹ تحسین آمیز نظروں سے اوون کی طرف دیکھ رہی تھی جو اپنے دعوے میں ایک بار پھر کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ مس وائٹ کے جانے سے پہلے وہ اس کیس کو حل کر دے گا اور ایسا ہی ہوا۔

پچیسویں قسط

محی الدین نواب

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوس قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادو باراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سمٹی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔




Downloaded From
Paksociety.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمعر و اور چاچی منی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہوکر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی، برباد کر کے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگادیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف بجّی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ جبکہ دوسری جانب سمیرا اور بجّی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ ماروی، چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہوگیا کہ مرینہ ماروی کو جام تمارو کے چودھری کے پاس لے جارہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبردآزما ہوتے ہوئے اس نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوگیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے گئے۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوا۔ جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ ماروی کا علاج ہوا مگر ماروی نے محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچانا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کوبوبو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آگئی۔ مراد مرینہ کے زیرِاثر آچکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کردیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ TMET افسر بن گئی تھی مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ممی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کبڈی بھی آگیا۔ ماروی کی یادداشت واپس آگئی تھی۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کر کے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجکشن لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر ممی سن کے بیٹے ایمان سے ہوگئی۔ مراد نے ایمان کو اپنی تمام باتیں بتادیں۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھٹکانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں میکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے میکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہوکر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آگیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہوگئی اور پاکستان آگئی۔ ادھر مراد... دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کر کے انڈیا پہنچ گیا اور میکی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا اور اسے اغوا کرلیا۔ تاہم بعد میں اسے چھوڑ دیا مگر میڈونا کو مرینہ سے بچانے کے لیے مراد اسے لے کر نکل پڑا لیکن مرینہ نے راستے میں اسے چھاپ لیا۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا مراد شدید زخمی ہوا جبکہ مرینہ کے بارے میں خیال تھا کہ وہ ماری گئی۔ ایمان علی اور میڈونا مراد کو محفوظ پناہ گاہ میں لے آئے۔ مرینہ زخمی حالت میں تھی۔ وہ ایک تانترک مہاراج

کی بستر چھایہ میں پہنچ گئی۔ وہ اس کا علاج کرنے لگا۔ ادھر مراد کا علاج مولانا اجمیری کر رہے تھے۔ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہو گئی۔ مراد اور مرینہ بابا اجمیری سے ملے اور انہوں نے بتایا کہ جب تک اس کی زندگی میں ایک عورت ہے وہ مزید نکاح نہیں کر پائے گا۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ڈاکٹر ممی سن نے مراد کی نئی شکل جو بنائی تھی، وہ اس کے لیے وبال بن گئی۔ وہ مرینہ سے نکاح پڑھانے کے معاملات طے کرنے گیا تاہم وہاں اسے موجودہ شکل میں دیکھ کر کچھ لوگ اسے اپنا رشتے دار سمجھنے لگے اور اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ مراد کی شادی کرنا چاہتے تھے تاہم وہ شادی نہ ہو سکی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کرا لیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوا دیا مگر وہ اس کا دیوانہ تھا اور دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے غباروں کے ذریعے ماروی تک اپنا پیغام پہنچانا چاہا اور کئی غباروں میں دو لفافے باندھ کر انہیں اڑا دیا۔ انڈین آرمی نے غباروں کو چیک کر کے انہیں آگے بڑھانے کا منصوبہ بنایا وہ اس کے ذریعے مراد اور ماروی تک پہنچنا چاہتے تھے اب وہ غبارے مغرب کی سمت جا رہے تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

مراد کا لکھا ہوا وہ خط سونیا اور عدیل کے درمیان تھا۔ انہوں نے ساتھ مل کر اسے پڑھا۔ پھر سونیا نے دوسری بار پڑھنے کے بعد اسے ایک طرف پھینک دیا۔

عدیل نے پوچھا۔ ''کیوں پھینک دیا؟''

وہ ناگواری سے بولی۔ ''یہ کم بخت مراد کون ہے؟ یہ شادی اور طلاق کو کھیل سمجھ رہا ہے۔ ماروی کو طلاق دے کر پھر اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے۔''

عدیل نے کہا۔ ''اسے کم بخت نہ کہو۔ تم نے پڑھا نہیں؟ وہ اپنی غلطی کو تسلیم کر رہا ہے۔''

وہ بولی۔ ''غلطی کو تسلیم کر لینے سے کیا وہ غلطی پھر غلطی نہیں رہے گی؟ اس پر جو سوکن لے آیا ہے، کیا وہ سوکن نہیں رہے گی؟ اگر وہ سچ مچ غلطی کو مان رہا ہے تو پہلے اس کی سوکن کو اپنی زندگی سے نکالے پھر اسے واپس آنے کو بولے۔''

عدیل نے کہا۔ ''شاید اس نے سوکن کو طلاق دے دی ہوگی تب ہی ماروی کو واپس بلا رہا ہے۔''

''یہ تو سراسر بے غیرتی ہے۔ وہ بے چاری کسی سے شادی کر کے عزت آبرو سے ہے اور وہ اسے بہکا رہا ہے کہ دوسرے شوہر سے طلاق لے کر پہلے کے پاس آجائے۔ اسے مرد بدلنے والی عورت بنا رہا ہے۔ تم بولو کیا ماروی ایسی بے حیا ہوگی؟''

''میں کیا جانوں۔ مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو؟''

''تم نہیں جانتے۔ عقل سے سمجھ تو سکتے ہو۔ کیا اپنی عورت کو گھر سے نکال کر دوسرے کے گھر بھیجنا بے غیرتی نہیں ہے؟ اب جبکہ وہ دوسرے شوہر کے پاس عزت سے ہے تو اسے پھر مرد بدلنے کی اور بے حیائی کی ترغیب کیوں دے رہا ہے؟''

''درست کہتی ہو۔ مراد پھر ایک بڑی غلطی کرنا چاہتا ہے۔''

وہ خط ایک طرف زمین پر پڑا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہم اسے جلا ڈالیں گے۔ اس گمراہ کرنے والے خط کو ماروی تک پہنچنے نہیں دیں گے۔''

''یہ مناسب نہیں ہوگا۔ ہم ان کے اندرونی معاملات کو نہیں جانتے۔ ہمیں کسی طرح کی روک تھام نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ ہمیں اس سلسلے میں اپنی رائے اور اپنا مشورہ دینا چاہیے۔''

''ہم انہیں کیسے مشورہ دیں گے؟''

''ماروی کے نام ایک چھوٹی سی پرچی لکھ کر اس لفافے میں رکھیں گے۔ اسے مشورہ دیں گے کہ موجودہ شوہر اس کی قدر کر رہا ہے۔ اس کے تمام حقوق ادا کر رہا ہے تو وہ بھی اس کی قدر کرے۔ مراد کے بہکانے میں نہ آئے۔ اس کے پاس واپس جانے کے لیے دوسری بار مطلقہ ہونے کی غلطی نہ کرے۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''زبردست آئیڈیا ہے۔ ہم اسے نیک مشورہ ضرور دیں گے۔'' سونیا فوراً ہی ماروی کے نام خط لکھنے بیٹھ گئی۔ عدیل لکھنے کے دوران میں مشورے دینے لگا۔

اس نے لکھا۔ ''بہن ماروی! میں نہیں جانتی تم کون ہو؟ کوئی بھی ہو مسلمان ہو اور میری بہن ہو۔ میں اس وقت اپنے محبوب اور ہونے والے مجازی خدا کے ساتھ بیٹھی یہ چند سطریں لکھ رہی ہوں اور اللہ سے دعا مانگ رہی ہوں کہ جو تمہارے ساتھ ہوا وہ کسی بھی شریف زادی کے ساتھ نہ ہو۔''

عدیل نے اسے گھور کر دیکھا پھر کہا۔ ''تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہوگا؟ کیا مجھے مراد سمجھا ہے؟''

''جو ہمارے پیچھے پیچھے مرادیں مانگتے رہتے ہیں، وہ شادی کے بعد مراد جیسے ہو جاتے ہیں۔''

''مجھ پر بھروسا نہیں ہے تو محبت کیوں کر رہی ہو؟''

''میں تو دل سے مجبور ہوں۔''

''میں بھی دل سے مجبور ہوں۔''

''تو پھر جھگڑا کیسا؟''

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ سونیا آگے لکھنے لگی۔ ''ایک باحیا

عورت جو اپنے شوہر کے سوا کسی کی تنہائی میں نہیں جاتی، اسے طلاق دے کر مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ آئندہ دوسرے مرد کی تنہائی میں جائے۔ یہ کیسا المیہ ہے؟ عورت کی کیسی... بدنصیبی ہے؟ مرد حضرات کا کچھ نہیں جاتا۔ عورت حیا سے جاتی ہے۔ تمہارے سابقہ شوہر مراد نے تمہیں طلاق دے کر دوسرے شوہر کے پاس جانے کے لیے بے حیا بنایا ہے۔ وہ شخص اس قابل نہیں ہے کہ تم پھر اس پر بھروسا کرو اور پھر اس کی زندگی میں جاؤ۔ اگر تمہارا دوسرا شوہر نیک اور صالح ہے تمہارا قدردان ہے تو خدا کا شکر ادا کرو اور اس کی قدر کرو۔ کبھی اسے چھوڑ کر پہلے کی طرف واپس آنے کی غلطی نہ کرو۔ وہ کس عقل سے سمجھ رہا ہے کہ یہ یونہی ہوا میں اڑتا ہوا تمہارے پاس آئے گا؟ ہم یہ دیکھ کر حیران ہیں کہ انڈین آرمی والوں نے بھی یہی کیا ہے۔ اسے بچکانا کھیل کے ذریعے آگے بڑھایا ہے تو یہ ہمارے ہاتھوں میں آیا ہے۔

''ہمارے سامنے بھی اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہم بھی اسے غباروں کے ذریعے آگے بڑھا رہے ہیں۔ ایسے وقت ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب دعائیں ہوا کے دوش پر آسمان تک پہنچ جاتی ہیں تو یہ خط بھی نامعلوم روحانی قوتوں کے ذریعے تمہارے ہاتھوں میں ضرور پہنچے گا۔ بہرحال ہمارا مشورہ قبول کرو۔ موجودہ شوہر کی قدر کرو اور طلاق دینے والے کو دور سے بھی سلام نہ کرو۔ فقط تمہاری بہن سونیا اور تمہارا بھائی عدیل۔''

عدیل نے اس خط کو شروع سے پڑھا۔ پھر کہا۔ ''آج گیس سلنڈر اور غبارے خرید کر لاؤں گا۔ پھر ہم دونوں لفافوں کو یہاں سے آگے بڑھا دیں گے۔''

پھر وہ تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد بولا۔ ''یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ انڈین آرمی کو ماروی سے اور ان دونوں لفافوں سے کیا دلچسپی ہے؟ میں نہیں مانتا کہ وہ بھارتی فوجی محبت اور انسانیت کے نام پر ایسا کر رہے ہیں۔ میرے اندر بے چینی سی ہے۔ عقل کہتی ہے کہ ماروی اور مراد کسی اور پہلو سے اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ دونوں کسی سیاسی یا عسکری معاملے میں مطلوب ہوں گے۔ وہ دونوں کہیں روپوش ہیں اور فوجی نادان نہیں ہیں۔ وہ کچھ سوچ سمجھ کر غبارے اڑا رہے ہیں۔''

وہ سونیا کو دیکھ کر بولا۔ ''ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔ ہم پولیس، فوج اور قانون کے چکر میں نہیں پڑیں گے۔ آج رات رازداری سے ان غباروں کو اڑا دیں گے۔''

وہ دن کے گیارہ بجے گیس سلنڈر اور غبارے خرید نے گھر سے نکلا تو اس نے پولیس کی گاڑیاں سڑکوں پر دوڑتی ہوئی دیکھیں۔ یہ بات پھیل رہی تھی کہ پچھلی رات کے کسی حصے میں بارہ درجن غبارے اس شہر میں آکر کہیں گرے ہیں۔ ان غباروں کے ساتھ دو لفافے بندھے ہوئے ہیں۔ جسے بھی وہ نظر آئیں، وہ فوراً قریبی تھانے میں اطلاع دے۔ اگر کوئی ایک ہزار ڈالرز حاصل کرنے کی خاطر ان غباروں کو اور لفافوں کو چھپائے گا تو وہ سخت سزا کا مستحق ہوگا۔

مقامی پولیس اور جاسوسوں کے ساتھ کچھ غیر ملکی بھی ان غباروں کو تلاش کر رہے تھے۔ عدیل نہیں جانتا تھا کہ انٹرپول اور غیر ملکی سی آئی اے کے سراغ رساں ماروی اور مراد تک پہنچنے کے لئے ہر اس جگہ پہنچ رہے ہیں جہاں سے وہ غبارے گزرتے ہیں۔

ویسے وہ محتاط ہو گیا تھا۔ اس نے سونیا سے کہا۔ ''ماروی اور مراد کے ساتھ صرف شادی اور طلاق والا معاملہ نہیں ہے۔ ان کے پیچھے کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہے۔ ان کے ساتھ جرم و سزا کا کوئی معاملہ ہے۔ میں گیس سلنڈر اور درجنوں غبارے خریدنے جاؤں گا تو پکڑا جاؤں گا۔ ان لفافوں کو فی الحال چھپا کر رکھو۔''

انہیں یہی کرنا تھا۔ وہ کوئی مصیبت مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ سونیا نے ان لفافوں کو اپنی الماری میں رکھ لیا لیکن دل میں بے چینی سی بھر گئی۔ وہ ماروی کے ساتھ نیکی کرنا چاہتی تھی۔ اپنا یہ نیک مشورہ اسے دینا چاہتی تھی کہ وہ محبوب کی منکوحہ بن کر رہے۔ پھر اپنا سکھ چین برباد کرنے کے لیے مراد کے پاس واپس نہ آئے اور وہ خواب بھی ذہن میں نقش تھا۔ ایک گھونگٹ آسمان سے اس کے سر پر اترا تھا اور ایک بزرگ نے فرمایا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ نیکی کرے گی تو اس کے اور عدیل کے درمیان کی رکاوٹیں ختم ہو جائیں گی اور وہ اس کی دلہن بن جائے گی اور وہ ماروی کے ساتھ نیکی کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''عدیل! کچھ کرو۔ مجھے ایسا لگتا ہے، تمہارے پیار کے دریا میں کچا گھڑا لے کر اتر گئی ہوں۔ یہ دنیا والے ہمیں ایک ہونے نہیں دیں گے۔ میں کچے گھڑے کے ساتھ ڈوب جاؤں گی۔''

''میری جان! میں تمہیں ڈوبنے نہیں دوں گا۔''

''تو پھر ماروی سے کسی طرح نیکی کرو۔ ان لفافوں کو ہمارے نیک مشوروں کے ساتھ آگے بڑھا دو۔''

اپنے شہر میں رہ کر نیکی کرنا مہنگا پڑ جاتا۔ اس نے اپنے تین قابلِ اعتماد دوستوں کو اس معاملے میں رازدار بنایا

پھر ان کے ساتھ پنڈی جا کر گیس سیلنڈر اور غبارے خریدے۔ پھر وہاں سے ایک ویران پہاڑی علاقے میں جا کر ان لفافوں کو ماروی کی نامعلوم سمت میں روانہ کر دیا۔

وہاں سے گھر واپس آیا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کے والدین سونیا کو بہو بنانے کے لیے راضی ہو گئے تھے جبکہ وہ اونچے اسٹیٹس والے تاجر ایک کمہار کے گھرانے سے کوئی تعلق بھی نہیں رکھنا چاہتے تھے۔

ایک کہاوت ہے کہ بنیے کا بیٹا کہیں گرتا ہے تو کچھ پانے کے لیے' اٹھانے کے لیے گرتا ہے۔ چناب کے ساحلی علاقے میں سونیا کے باپ کی وسیع و عریض زمین نئی فیکٹری قائم کرنے کے لیے بہت موزوں تھی اور ایک کاروباری ذہن رکھنے والے کے لیے لازمی ہو گئی تھی۔

وہ تاجر اس شرط پر راضی ہو گئے کہ سونیا وہ زمین اپنے جہیز میں لے کر آئے گی۔

رشتہ طے ہو گیا۔ سونیا نے کہا۔ ''مجھے آخری وقت کے لئے صرف دو گز زمین چاہیے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ مجھے خواب کی تعبیر مل رہی ہے۔ میں نے ماروی کے لئے ہوا میں نیکی کی ہے۔ مجھے اس کا صلہ مل رہا ہے۔ میرے سر پر آسمان سے گھونگٹ اتر رہا ہے۔''

☆☆☆

محبوب ایک طویل مدت سے ناکام ہوتا آرہا تھا۔ ماروی اسے دل سے چاہنے کے باوجود اس سے دور رہتی تھی۔ ایک بار اس کی دلہن بنتے بنتے بھی نہ بن سکی۔ اب پھر اسے شریکِ حیات بنانے کا راستہ ہموار ہو گیا تھا۔ وہ آزاد تھی اور محبوب سے منسوب ہونے کا آخری فیصلہ کر چکی تھی۔

ایسے میں مراد کی وہ تحریر اسے بہکانے اور بھٹکانے کے لیے جارہی تھی پھر کوئی گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ پھر وہ دیوانہ عاشق اس سے محروم ہو سکتا تھا۔ ماروی کو سمجھانا تھا کہ اب وہ محبوب کی رفاقت سے انکار کر کے غلطی نہ کرے۔

ایسے وقت سونیا نے اسے سمجھانے کی نیکی کی تھی اور جواباً اس کے ساتھ بھی نیکی ہو رہی تھی۔ وہ جلد ہی اپنے عدیل کی دلہن بننے والی تھی۔ دو پیار کرنے والیاں نیکیوں کے تبادلے سے اپنے اپنے محبوب کی ہونے والی تھیں لیکن پیار کی منزل آسانی سے کب ملتی ہے۔ وہ دو لفافے انٹرپول' سی آئی اے اور کئی معلوم اور نامعلوم دشمنوں کی نظروں میں پھر آ گئے تھے۔

ایک ملک سے دوسرے ملک' ایک ڈیپارٹمنٹ سے دوسرے ڈیپارٹمنٹس اور ایک کرمنل سے دوسرے کرمنلو تک فون کھڑکائے جارہے تھے۔ وہ لفافے جہلم شہر میں گم ہونے کے دو دنوں کے بعد سرحدی علاقے کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ فون پر ایک دوسرے سے کہا جارہا تھا کہ مراد اپنی تحریر کے ذریعے ماروی تک ضرور پہنچے گا اور اس کی تاک میں رہنے والے مجرموں کو اور قانون کے محافظوں کو بھی پہنچائے گا۔

انڈین آرمی والے پہلے رازداری سے ماروی تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن غباروں کے ذریعے ماروی تک لمبی دوڑ تھی۔ اس لیے سفارتی سطح پر انٹرپول اور سی آئی اے والوں کو رازدار بنانا پڑا۔ یوں رازداری آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

قانون کے محافظوں اور بدنام مجرموں کے درمیان دشمنی تو رہتی ہے۔ درپردہ رشوتوں کی لین دین کے باعث یا اپنے مفادات کی خاطر عارضی طور پر دوستی بھی ہو جاتی ہے۔ ایسی مصلحتوں کے باعث میکی براؤن' میکانو رابرٹ اور ماسٹر کو بوبو وغیرہ کو بھی معلوم ہو گیا کہ جو مراد اچانک روپوش ہو گیا تھا، وہ غباروں میں بیٹھ کر اپنی ماروی کی طرف جارہا ہے۔

عجیب مضحکہ خیز پوزیشن تھی۔ مجرم ہوں یا قانون کے محافظ، وہ ایسے نادان بچے بھی نہیں ہوتے کہ غباروں کے پیچھے دوڑتے چلے جائیں اور یہ یقین کرلیں کہ وہ کسی پتے ٹھکانے کے بغیر ماروی کی گود میں پہنچ کر تمام دوستوں اور دشمنوں کو مراد تک پہنچا دیں گے۔

قدرت کا تماشا یہ تھا کہ ہوا کا رخ بدلتا رہتا ہے۔ بدلتے ہوئے رخ کے مطابق غباروں کو بھی اپنی سمت بدلنی چاہیے تھی۔ لیکن وہ مغرب کی سمت ہی جارہے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا لیکن ایسا ہی ہورہا تھا۔

تمام دشمنوں اور قانون کے رکھوالوں کے درمیان یہ سوال چیخ رہا تھا کہ وہ غبارے ہوا کے رحم و کرم پر سمت کیوں نہیں بدل رہے ہیں؟ کیا وہ رات کے اندھیرے میں سمتیں بدلتے رہتے ہیں اور دن ہوتے ہی پھر مغرب کی سمت چل پڑتے ہیں؟

وہ سیدھے مغرب کی سمت یوں جارہے تھے جیسے ایک نادیدہ لکیر کھینچ دی گئی ہو کہ انہیں اسی لکیر پر آگے جاتے رہنا ہے اور سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یہ ماننا پڑ رہا تھا کہ وہ غبارے دائیں بائیں ٹس سے مس نہیں ہورہے ہیں۔ ضرور...... ہاں ضرور ماروی کے پاس جارہے ہیں۔

اب راز داری نہیں رہی تھی۔ الیکٹرونک میڈیا کے کئی چینلز سے وہ غبارے بھی بھی نظر آتے تھے۔ اخبارات میں ان کے متعلق چھوٹی بڑی پُر تجسس خبریں شائع ہو رہی تھیں۔

مرینہ اور مراد نے پہلی بار ٹی وی اسکرین پر ان غباروں کو اوران کے ساتھ بندھے ہوئے لفافوں کو دیکھا تھا تو حیران رہ گئے تھے۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ساری دنیا کی نظروں میں آجائیں گے۔ ان کے بارے میں کہا جارہا تھا کہ وہ اب سے گیارہ دن پہلے بھارتی آسمان پر دیکھے گئے تھے۔ انڈین آرمی نے انہیں کیچ کیا تھا۔ یہ شبہ ہوا تھا کہ بھارت دیس کے خلاف پیغام رسانی ہو رہی ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

یہ کہا جارہا تھا کہ مراد نامی ایک شخص نے اپنی مطلقہ بیوی ماروی کو تحریری پیغام بھیجا ہے۔ اس سے رجوع کرنا چاہتا ہے۔ انڈین آرمی نے ان دو لفافوں کو ایک ہفتے تک اپنے پاس روک رکھا تھا۔ پھر انہیں بارہ درجن غباروں کے ذریعے آگے بڑھا دیا تھا۔

مرینہ اور مراد اخبارات میں پڑھ رہے تھے۔ ٹی وی اسکرین پر دیکھ رہے تھے۔ جو کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے، وہ نگاہوں کے سامنے آرہا تھا۔

مرینہ نے کہا۔ ”میں اب بھی یقین سے کہتی ہوں کہ تم شرط ہار گئے ہو۔ وہ لفافے ماروی تک نہیں پہنچیں گے۔“

وہ بولا۔ ”تم دیکھ رہی ہو کہ پوری دنیا ان غباروں اور لفافوں میں دلچسپی لے رہی ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں۔ ماروی جہاں بھی ہے وہاں سے وہ بھی ان غباروں کو دیکھ رہی ہے۔ میرا اور اس کا نام لیا جارہا ہے۔ وہ ان لفافوں کو اپنی طرف آتے دیکھ رہی ہے۔ تم کہتی ہو، یہ وہاں تک نہیں پہنچیں گے۔ جبکہ یہ ماروی کے علم میں آچکے ہیں۔ صرف اس نے تحریر کو ہاتھوں میں نہیں لیا ہے اور آنکھوں سے دیکھ کر نہیں پڑھا ہے۔ تم دیکھ لینا کہ وہ جلد ہی پڑھ لے گی۔ میں شرط جیتنے ہی والا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”یہ تو ہمارا ذاتی معاملہ ہے کہ ہم میں سے کون جیتے گا اور کون ہارے گا۔ ہمارے تمام دشمن بھی ان غباروں اور لفافوں کو ایسے دیکھ رہے ہوں گے جیسے تمہاری شہ رگ تک پہنچنے ہی والے ہوں۔ بے شک وہ ہمارے نئے بہروپ میں ہمیں نہیں پہچانیں گے لیکن ماروی اور محبوب کی طرف سے اندیشہ ہے۔ وہ ان کے ذریعے ہمارا سراغ اس وقت لگا سکیں گے جب ماروی تمہاری تحریر کے جواب میں تم سے رابطہ کرے گی۔“

”میں نہیں سمجھتا ایسا ہوگا۔ وہ بھی سات پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ وہ میرے دشمنوں کی طرف سے اندیشوں میں مبتلا رہے گی۔ کبھی خود کو ظاہر کر دینے کی غلطی نہیں کرے گی۔“

پھر وہ زیر لب بڑبڑایا۔ ”ویسے یہ اچھا نہیں ہوا۔ راز داری نہیں رہی۔ خدا کرے میرے دل سے لکھی ہوئی تحریر اسے مل جائے۔ پتا نہیں وہ کیا ردِعمل ظاہر کرے گی؟ کچھ معلوم ہونے سے پہلے ہی رکاوٹیں پیدا کرنے والے دوربینیں آنکھوں سے لگائے غباروں کو تاک رہے ہوں گے۔“

دوسری طرف ماسٹر کو بوبو مراد کی طویل روپوشی کے باعث تشویش میں مبتلا تھا۔ اس نے فون پر بیٹے سے پوچھا۔ ”کہاں ہے وہ؟ بیس دن گزر چکے ہیں۔ مجھ سے کسی طرح کی ناراضگی نہیں ہے۔ پھر وہ مجھے ایک کال بھی کیوں نہیں کر رہا ہے؟“

بیٹے نے کہا۔ ”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اس کا مزاج بدل گیا ہے۔ وہ مجھ جیسے دوست سے اور آپ جیسے دریا دل محافظ سے چھپ رہا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ آپ ہر پہلو سے قابلِ اعتماد ہیں۔ اسے بیٹے کی طرح چاہتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ ایک فون کال کی محبت نہیں دے رہا ہے۔“

ماسٹر نے کہا۔ ”مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ تم نے کسی چینل سے ان غباروں کو دیکھا ہوگا؟“

”جی ہاں۔ اخباروں میں تصویر دیکھی ہے۔ اس نے ماروی کے نام کوئی پیغام بھیجا ہے۔ ماروی اور مراد کا نام جو نہیں جانتے تھے، وہ بھی جاننے لگے ہیں۔ آئندہ وہ زیادہ عرصے تک روپوش نہیں رہ سکے گا۔“

ماسٹر نے کہا۔ ”ان غباروں نے دہلی شہر سے پرواز کی ہے۔ یہ سب ہی جان گئے ہیں کہ وہ ابھی تک دہلی میں ہے۔ میرا دست راست چیپت راؤ اور بے شمار ماتحت اسے تلاش کر رہے ہیں۔ ایک بار اس سے رابطہ ہو جائے تو اسے سمجھاؤں گا کہ وہ مجھ سے چھپنے کی غلطی نہ کرے۔ اتنی بڑی دنیا میں صرف میں ہی اس کے برے وقت میں کام آؤں گا۔“

”میں مانتا ہوں۔ آپ اسے باپ کی محبت دیتے ہیں۔ کبھی مجھ سے رابطہ ہوگا تو میں بھی اسے سمجھاؤں گا۔ آپ کو یہ حقیقت بتا دوں کہ آخری بار جب اس سے فون پر بات ہوئی تو اس نے کہا تھا کہ اپنا نام، چہرہ اور شخصیت بدل کر جرائم کی دنیا سے نکل جائے گا اور کہیں امن وامان سے ایک عام شہری کی حیثیت سے زندگی گزارے گا۔“

”اگر اس نے ایسا سوچا تھا اور ایسا کر رہا ہے تو بہت

بڑی غلطی کررہا ہے۔ ایک مصنوعی چہرے کے پیچھے پوری زندگی نہیں گزار سکے گا۔''

''ماسٹر! آپ جانتے ہیں، وہ بہت ضدی ہے۔ ارادے کا پکا ہے۔ اپنے نئے چہرے کے پیچھے سے کبھی خود کو ظاہر نہیں کرے گا اور نہ کوئی اسے مراد علی منگی کی حیثیت سے پہچان سکے گا۔''

ماسٹر نے دعوے سے کہا۔''میں پہچان لوں گا۔ اسے پہچاننے کے لیے دہلی جانا ہوگا۔ نہ جانا پڑے تو اچھا ہے۔ اگلے چوبیس گھنٹوں تک انتظار کروں گا۔ وہ خود ہی رابطہ کرے گا تو اس کا شکریہ ادا کروں گا۔''

''ماسٹر! بہت مشکل ہے۔ آپ وہاں جاکر ناکام رہیں گے۔''

''میں ناکام ہونے والا کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔ پہلے کامیابی کا یقین کرتا ہوں پھر آگے بڑھتا ہوں۔ چوبیس گھنٹے کے بعد یہاں سے چلوں گا پھر... اگلے چوبیس گھنٹے کے بعد اس کے سامنے پہنچ جاؤں گا۔''

''تعجب ہے۔''بلّے نے کہا۔''میں یہ تماشا دیکھوں گا۔''

''مراد بھی دیکھے گا۔ میں نے اسے بیٹا کہا ہے۔ وہ دنیا کے کسی گوشے میں باپ سے چھپ کر نہیں رہ سکے گا۔''

اس نے بلّے سے رابطہ ختم کرکے چیپت راؤ کو فون پر مخاطب کیا۔''بولو راؤ! کوئی سراغ مل رہا ہے اس کا؟''

''نو ماسٹر! وہ اسی دہلی شہر میں ہے۔ یہ دل دکھانے والی بات ہے۔ ہم دن رات اس کے لیے سیکیورٹی فراہم کرتے رہے اور وہ ہم سے ہی چھپ رہا ہے۔''

''ہاں، میرا دل بھی دکھ رہا ہے لیکن میں اس کے مزاج کو سمجھتا ہوں۔ وہ ہمیں دشمن نہیں سمجھ رہا ہے۔ صرف جرائم کے ماحول سے دور رہنے کے لیے ہم سے دور ہوگیا ہے۔''

''اسے کم از کم آپ پر تو بھروسا کرنا چاہیے۔''

''ہاں۔ وہ مجھ پر اعتماد نہ کرکے میری توہین کررہا ہے۔ میں اسے سبق سکھاؤں گا۔''

''آپ کیا کرسکیں گے ماسٹر جبکہ وہ نظر ہی نہیں آرہا ہے؟''

''نظر آئے گا۔ وہ پاتال میں بھی چھپا ہوگا تو میرے سامنے نکل آئے گا۔ میں پرسوں کسی فلائٹ سے وہاں آؤں گا۔''

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ پہلی بار یہاں آئیں گے۔ میں سواگتم کہتا ہوں۔''

''وہ ہیرا ہے چیپت راؤ...! کوئی اس کی قیمت نہیں لگاسکتا۔ میں اس کی خاطر انڈیا تک سفر کروں گا۔ اسے جرائم کی دنیا سے جانے نہیں دوں گا۔ گاڈ نے اسے میرے کام آنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ وہ پرسوں دہلی شہر میں پھر سے پیدا ہوگا۔''

اس نے بہت بڑا دعویٰ کرکے فون بند کردیا۔ یہ ایک آدھ روز میں معلوم ہونے والا تھا کہ اس کا دعویٰ کہاں تک درست ہوگا؟ اگر واقعی وہ اسے ڈھونڈ نکالے گا تو مراد کا یہ خواب کہ جرائم کی دنیا سے نکل آئے گا، شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔

اس نے مراد کو بیٹا اسی لیے بنایا تھا کہ وہ میکی براؤن جیسے ناقابلِ شکست دشمن کو مات دے رہا تھا اور کامیابی کا سہرا اپنے ماسٹر کے سر پر سجا رہا تھا۔ دوسری خطرناک تنظیموں پر بھی مراد علی منگی کے باعث ماسٹر کا رعب اور دبدبہ طاری رہتا تھا۔

☆☆☆

سمیرا بڑی ذہانت سے اور دیانت داری سے اربوں روپے کے وسیع وعریض کاروبار کو سنبھال رہی تھی۔ محبوب کے جانے کے بعد بڑی سنجیدگی سے خاموش رہنے لگی تھی۔ اسے ارب پتی بیوی بنانے والا اس کی عزت کرتا تھا۔ اس سے محبت کرتا تھا لیکن عشق ماروی سے کرتا تھا۔

یہ صدمہ اسے اندر ہی اندر کھائے جاتا تھا کہ وہ ماروی کی جگہ کبھی نہیں لے سکے گی۔ اس کا شوہر اب تک اس کے پیچھے دوڑتا رہا تھا۔ اب اسے شریکِ حیات بنانے والا تھا۔ اس دیوانے کو اس کی منزل مل رہی تھی۔ وہ جو چاہتا تھا' اس کے مطابق اسے اس کی سوکن بنانے والا تھا۔

ماروی کے لیے سمیرا کے عجیب دوغلے جذبات تھے۔ وہ اس کی نیکیوں اور شرافت کو مانتی تھی۔ ماروی نے اس کے ساتھ اتنی نیکیاں کی تھیں، جن کا صلہ وہ کبھی دے نہیں سکتی تھی۔

وہ اس کی قدر کرتی تھی لیکن اسے اپنی ازدواجی مسرتوں کی دشمن سمجھتی تھی۔ اس کی زندگی میں محبوب کبھی اسے دل سے ازدواجی مسرتیں دینے والا نہیں تھا۔ آگے جاکر ماروی کے ہی ناز نخرے اٹھانے والا تھا۔

معروف تجلی نے آفس میں آکر اسے دیکھا۔ اب وہ محبوب کی غیر موجودگی میں اس کی کرسی پر بیٹھا کرتی تھی۔ دیکھا جائے تو محبوب اسے تختِ طاؤس پر بٹھا کر گیا تھا۔ وہ سلطنتِ محبوب کی سلطانہ تھی۔ اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ صرف شوہر ہوتے ہوئے بھی نہیں تھا۔

معروف نے پوچھا۔''کیسی ہو؟''

وہ بولی۔''بادشاہ کے بغیر ملکہ کیسی ہوگی؟ شاہ کی عدم موجودگی میں سلطنت کی باگ ڈور سنبھال رہی ہوں۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے میں انہیں یاد آ گئی تھی۔ انہوں نے کال کی تھی۔''

''کیا واقعی؟'' معروف نے چونک کر پوچھا۔ پھر اس کے سامنے میز کے دوسری طرف بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''کہاں ہے وہ؟ کب آ رہا ہے؟''

''لیبیا کے کسی علاقے سے فون کیا تھا۔ آج وہاں سے کہیں چلے جائیں گے۔ یہ نہیں بتایا کہ کس ملک میں مستقل رہائش ہے۔''

''میں یقین سے کہتا ہوں، وہ لندن میں رہتا ہے۔ یہ بتاؤ اس نے کیا کہا ہے؟ یہاں کب تک آئے گا؟''

''شاید کبھی نہیں آئیں گے۔ ماروی سے شادی کے بعد مجھے بلائیں گے۔ فون پر وعدہ کیا ہے۔ اپنا نیا چہرہ اور نئی شناخت صرف مجھ پر ظاہر کریں گے۔''

''یعنی یہاں تمہیں پورا کاروبار بھی سنبھالنا ہے اور وہاں اس کے ساتھ بھی رہنا ہے۔ یہ کیسے ہوگا؟ تم اس کے ساتھ مستقل نہیں رہ سکو گی۔ یہاں کے معاملات تمہیں اس سے دور کرتے رہیں گے۔''

''ہاں، وہ مستقل ان کے ساتھ رہے گی اور میں کبھی کبھی جاتی آتی رہوں گی۔ وہ دن رات ان کے تمام معاملات اور تمام جذبات سے وابستہ رہے گی۔ میں مہمان کی طرح وہاں رہ کر آ جایا کروں گی۔''

''یہ تو سراسر تمہاری حق تلفی ہو رہی ہے۔ اسے یہاں آ کر دونوں بیویوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔''

''وہ نام سے اور صورت شکل سے محبوب علی چانڈیو نہیں رہے۔ یہاں والوں کے لیے نہ وہ رہے، نہ میں ان کی بیوی رہی۔ ان کی موجودہ صورت اور شخصیت کے ساتھ ماروی ہی ان کی شریکِ حیات بن کر رہ سکے گی اور ماروی کی حیثیت اور حلیہ بھی بدل چکا ہوگا۔''

''پھر تو یہ کھلی حقیقت سامنے ہے کہ تم دولت اور کاروبار کو جیت رہی ہو اور شوہر کو ہار رہی ہو اور وہ تو شروع سے تمہارے شوہر کو جیت رہی تھی۔ کمال ہے، انجام کار اسے اپنا شوہر بنا کر اپنی جیت مکمل کر رہی ہے۔'' معروف نے سوال کیا۔ ''ذرا سوچو۔ دو سوکنوں میں نقصان کس کا زیادہ ہے؟''

سمیرا نے کہا۔ ''ماروی کا تو کوئی نقصان ہی نہیں ہے۔ نہ پہلے کبھی دولت اور جائداد کی طرف وہ مائل تھی، نہ آئندہ محبوب کی بیوی بن کر کوئی مطالبہ کرے گی۔ اسے ایک شوہر' ایک محبت کرنے والا سرپرست چاہیے تھا، وہ ملتا رہے گا۔ میں امیر کبیر ہو کر بھی اپنے شوہر سے محروم رہا کروں گی۔''

معروف نے کہا۔ ''عورت پھر عورت ہوتی ہے۔ وہ جب تک اپنے تمام حقوق حاصل نہ کرے، سکون سے رہ نہیں پاتی۔ دور اندیشی کے معنی ہیں' دور تک سوچو اور سمجھو۔ جب وہ محبوب کے بچوں کی ماں بنے گی تو تمام دولت' جائداد اور کاروبار اپنے بچوں کے نام کرنے کی ضد کرے گی اور اس کی ضد جائز ہوگی۔ ایک اور پہلو سے سوچو اگر تم ماں نہیں بن سکو گی، بانجھ ثابت ہو جاؤ گی تو محبوب کا تمام سرمایہ ماروی اپنے بچوں کے ذریعے حاصل کرے گی۔''

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ معروف نے کہا۔ ''ابھی جو کچھ ہے، تمہاری زندگی تک ہے۔ آخری سانس تک جتنا کھا پی کر عیش و عشرت سے رہ سکتی ہو رہ لو۔ اس کے بعد سب ماروی کا ہے۔ آج بھی وہ تمہارے مقابلے میں فاتح ہے۔''

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ ''میں کیا کروں؟ اس کی تعلیم' اس کی ذہانت اس کی پرسنالٹی میرے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ میرے آگے صفر ہے لیکن سوکن بن کر وہ سو فیصد ہو گی اور میں صفر ہوتی چلی جاؤں گی۔''

''دور اندیشی، میں نے کہا نا..... دور اندیشی سے کام لو۔ فوراً اپنا میڈیکل چیک اپ کراؤ۔ تمہارے ماں بننے کی تصدیق ہونی چاہیے اور تصدیق ہو یا نہ ہو۔ محبوب کی ٹیوب بے بی کو تم نے گورنس کے حوالے کر دیا ہے۔ اس بچی کو کلیجے سے لگائے رکھو۔ احتیاطاً اس ٹیوب بے بی کو بھرپور ممتا دے کر اس کے ذریعے جائداد اور کاروبار میں مضبوطی سے پنجے گاڑ دو۔ تم بزنس میں منافع کا گراف اوپر رکھنے کے لیے دن رات محنت کر رہی ہو۔ تمہیں دیانت دارانہ محنت کا بھرپور صلہ ملنا چاہیے۔ بعض حالات میں نقصان سے بچنے کے لیے خود غرض بننا پڑتا ہے۔ ماروی نے تم سے جتنی نیکیاں کی ہیں' انہیں تسلیم کرو۔ اس کی قدر کرو۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش نہ کرو کہ وہ بھی خود غرض ہے۔ جب مراد کی منکوحہ تھی تو اس نے اپنے اوپر کسی سوکن کو برداشت نہیں کیا۔ محبوب کو جیتنے کے لیے خود تمہاری سوکن بن رہی ہے۔''

سمیرا نے کہا۔ ''واقعی وہ اپنی غرض پوری کرنے کے لیے یہ بھول رہی ہے کہ مجھے ایسا ہی ناقابلِ برداشت صدمہ پہنچ رہا ہے' جیسا مرینہ کے سوکن بننے سے اسے پہنچ رہا تھا۔ وہ اپنی ضرورت پوری کرنے کی غرض سے مجھے تکلیف پہنچا رہی ہے۔''

''اپنی خواہشات اور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہر انسان خود غرض بن جاتا ہے۔ آئندہ تم بھی

خود غرض بن کر رہوگی تو اپنے شوہر کی رفاقت اور توجہ ماروی سے زیادہ حاصل کر سکوگی۔"

"یہی تو سوچ کر صدمہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محبوب کے ساتھ رہے گی۔ جب وہ مجھے بلایا کریں گے تب ان کے پاس جایا کروں گی۔"

"کوئی ایسی تدبیر ہو سکتی ہے جس پر عمل کر کے تم بھی محبوب کے ساتھ دن رات رہ سکو؟"

"ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ وہ محبوب علی چانڈیو بن کر یہاں رہیں گے۔ نہ میں اتنا بڑا بزنس چھوڑ کر وہاں ان کے ساتھ رہائش اختیار کر سکوں گی۔"

"ذہانت سے اور تدبیر سے انہونی' ہونی ہو جاتی ہے۔"

"ہاں، ہم سوچیں، دماغ لڑائیں، کوئی ٹھوس پلاننگ کریں گے تو میری بگڑی بن سکتی ہے۔"

"لنچ کا وقت ہے۔ بھوکے پیٹ دماغ کام نہیں کرے گا۔"

وہ اپنا فون اور پرس اٹھا کر کرسی سے اٹھاتے ہوئے بولی۔ "گھر چلیں۔ آپ کو پسندیدہ ڈش ملے گی۔"

وہ دونوں دفتری عمارت سے باہر آ کر کار میں بیٹھ گئے۔ وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے بولی۔ "پتا نہیں۔ ان پر ماروی کا نشہ کب تک طاری رہے گا؟ ہو سکتا ہے' بیوی بننے کے بعد محبوبہ والی اہمیت اور دیوانگی نہ رہے۔"

وہ بولا۔ "ہو سکتا ہے، چاہت اور دیوانگی اور بڑھ جائے۔ میں محبوب کو بچپن سے جانتا ہوں۔ یہ لکھ لو کہ وہ آخری سانس تک ماروی کے نشے میں رہے گا۔ ہمیں کچھ ایسی پلاننگ کرنی ہوگی کہ وہ اپنی کاروباری دنیا میں واپس آجائے۔"

وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولی۔ "وہ ماروی کے ساتھ ہی یہاں آئیں، بس کسی طرح آجائیں۔ پھر تو ایک ہی کوٹھی میں دونوں بیویوں کے ساتھ رہیں گے۔ اگر ہم دونوں کو ایک دوسرے سے دور رکھیں گے، تب بھی اسی شہر میں نگاہوں کے سامنے تو رہیں گے۔"

"ہاں، وہ اتنا انصاف پسند تو ہے کہ ہفتے میں دو یا تین دن تمہارے ساتھ گزارے گا۔ میں جانتا ہوں۔ وہ کبھی اخلاقی پستی کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔"

"خدا کرے ایسا ہو جائے۔ وہ کسی بھی طرح یہاں محبوب علی چانڈیو بن کر رہنے کے لیے راضی ہو جائیں لیکن مراد رقیب ہے۔ دشمن ہے۔ اس سے ماروی کو چھپا کر رکھنے کے لیے وہ خود اس کے ساتھ ہمیشہ چھپ کر رہیں گے۔

وہ میں ہوں

شرابی آدھی رات کو جھومتا جھامتا سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ کانسٹیبل نے اسے روک لیا اور پوچھا۔ "تمہارا نام؟"

"پتا نہیں....." شرابی نے جواب دیا۔

"تمہیں اپنا نام ہی نہیں معلوم......؟" کانسٹیبل نے غصے سے پوچھا۔

شرابی کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ "آپ ایسا کریں، شاہراہ نمبر 108 پر جائیں۔ گھر نمبر 84 کی گھنٹی بجائیں اور پوچھیں کہ ایڈورڈ گھر پر ہے۔ اگر نہ ہو تو سمجھ لیں کہ وہ میں ہوں۔"

پریشانی

ایک شخص نے اپنے ایک دوست کو بتایا۔ "میں نے شادی اس لیے کی تھی کہ شام کو گھر پہنچنے پر اکیلا پن مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا......"

"پھر اب......؟" دوست نے پوچھا۔

"اب دونوں...... یعنی گھر اور......!" اس نے جواب دیا۔

وجہِ شہرت

ایک روز مشہور موسیقار آرنلڈ شوبزگ کا ایک دوست اس سے ملنے کسی دوسرے شہر سے آیا۔ آرنلڈ دوست کو لے کر ٹہلنے نکلا۔ دوست نے دیکھا کہ محلے بھر کے بچے آرنلڈ کو بڑے احترام سے سلام کر رہے ہیں۔ اس نے تعجب سے کہا۔ "کمال ہے۔ یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ تم بہت مشہور ہو مگر تمہیں تو یہ بچے تک جانتے ہیں۔"

آرنلڈ مسکرا کر بولا۔ "درست ہے مگر اس کی اصل وجہ میرا بیٹا ہے جو شہر کی فٹ بال ٹیم کا ہاف بیک ہے۔"

چوروں کو پڑ گئے مور

نیویارک کے ایک بینک میں ڈاکو لوٹ مار میں مصروف تھے کہ ان کا ساتھی باہر سے سراسیمہ اندر آیا۔

"عجیب اندھیر ہو گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "جو کار ہم نے فرار کے لیے باہر کھڑی کی تھی، وہ کوئی چرا کر لے گیا۔"

مرسلہ۔ خالدہ نواز، منڈی بہاؤالدین (رکن)

یہاں نہیں آئیں گے۔''
وہ دونوں چپ رہ کر سوچنے لگے۔تدبیر سوچنے کے لیے چپ رہنا ضروری تھا۔سمیرا نے کوٹھی میں پہنچ کر ملازم کو کھانا لگانے کے لیے کہا۔معروف تجلی نے پوچھا۔''محبوب نے کیا کہا ہے؟ وہ کب تک تمہیں وہاں بلائے گا؟''
''جب ماروی ان کی منکوحہ بن جائے گی۔ ابھی وہ عدت کے ایام گزار رہی ہے۔وہ دونوں نئے بہروپ میں صرف میرے سامنے آئیں گے'میں یہاں سے تنہا جاؤں گی۔''
وہ بولا۔''عقل کہتی ہے کہ صرف ماروی کی خاطر اسے پوری زندگی چھپ کر نہیں گزارنی چاہیے۔اسے یہاں آنا چاہیے۔اس کے یہاں رہنے سے تم زیادہ سے زیادہ فائدے حاصل کروگی۔''
وہ سر جھکا کر سوچنے لگا پھر بولا۔''وہ یہاں سے کتنی رقم لے گیا ہوگا؟ اور ماروی کے ساتھ کب تک گزارہ کرے گا؟ کیا تم اسے رقم پہنچایا کروگی؟''
''محبوب نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی ہے۔ ویسے بات تو یہی سمجھ میں آتی ہے کہ آئندہ میں ہی ان کی ضرورتیں پوری کرتی رہوں گی۔''
''سمیرا! تھوڑی دیر کے لیے مان لو کہ ہم دونوں خودغرض اور بے ایمان ہیں۔ وہ ہم پر اندھا اعتماد کر رہا ہے۔اس کے کاروبار پر قبضہ جمانا'اسے اربوں روپے کی دولت اور جائداد سے محروم کردینا بہت آسان ہوگا۔''
''خدا نہ کرے کہ ہمارے دلوں میں ایسی بے ایمانی آئے مگر آپ فرض کرنے کو کہہ رہے ہیں۔چلیں میں مان لیتی ہوں۔آپ کی مدد سے پورے بزنس پر قبضہ جما سکتی ہوں اور ایسا نہ کرسکی تو تمام کاروبار کو مٹی میں ملا سکتی ہوں...... پھر؟''
وہ بولا۔''خدا ہمارا ایمان سلامت رکھے'ہمیں ایک دن مٹی میں ملنا ہے۔ہم ایسا نہیں کریں گے۔''
وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آکر میز کے اطراف بیٹھ گئے۔سمیرا نے پوچھا۔''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''
وہ اپنی طرف ایک پلیٹ سرکاتے ہوئے بولا۔''میں تھوڑی دیر کے لیے تمہیں بے ایمان بننے کو کہہ رہا ہوں۔''
وہ معروف کی طرف ایک ڈش بڑھاتے ہوئے بولی۔''چلیے بے ایمان بن گئی...... پھر؟''
''پھر آگے یہ ہوگا کہ محبوب کے جتنے ملکی اور غیر ملکی بینکوں میں اکاؤنٹس ہیں'ہم انہیں یہ کہہ کر فریز کرادیں گے کہ محبوب لاپتا ہے۔یہ شبہ ہے کہ دشمنوں نے اسے قیدی بنا کر رکھا ہے۔وہ کسی بینک تک نہیں آتا ہے۔اپنی وائف سمیرا کے ذریعے اپنے چیک کیش کراتا ہے۔''وہ لقمہ چباتے ہوئے بولا۔''تب قانون کے مطابق کہا جائے گا کہ محبوب خود کو ظاہر کرے۔نہیں کرے گا تو یہی سمجھا جائے گا کہ وہ دشمنوں کے شکنجے میں ہے۔''
سمیرا نے کہا۔''اور محبوب چہرہ اور اپنی شناخت بدل چکے ہیں۔یہاں نہیں آسکیں گے۔یہاں میرے شوہر محبوب علی چانڈیو بن کر آئیں گے تو ادھر نئے بہروپ والے ماروی کے شوہر بن کر نہیں رہ سکیں گے۔''
وہ سر ہلا کر بولا۔''وہ یہاں اصلی صورت کے ساتھ آئے گا تو محبوب کی حیثیت سے ماروی کا نہیں'صرف تمہارا شوہر کہلائے گا۔نکاح نامے کی رو سے ان کا رشتہ جائز... ہوگا۔روپ بہروپ کے باعث ماروی یہاں آکر محبوب علی چانڈیو کو اپنا شوہر نہیں کہہ سکے گی۔''
وہ بولی۔''بڑی الجھنیں پیدا ہوں گی۔''
''تم اس طرح الجھاؤ گی تو وہ اربوں روپے کے اکاؤنٹس کو اپنے ہاتھوں میں رکھنے کے لیے پھر سے محبوب علی چانڈیو بننے پر مجبور ہوجائے گا۔اب تک اسے اربوں روپے کی جائداد اور کاروبار کی پروا نہیں تھی۔وہ ماروی کی خاطر سب کچھ چھوڑ چکا تھا۔آئندہ اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے اسے عیش و آرام سے رکھنے کے لیے یہاں کی تمام ذمے داریوں کو سنبھالنا ہوگا اور سنبھالنے کے لیے لازمی ہوگا کہ ادھر تمہارا شوہر محبوب بن کر رہے۔ادھر ماروی کے پاس چھپ کر ملنے کے لیے جایا کرے۔ہماری حکمتِ عملی سے محبوب کے چہرے کے ساتھ تمہارا شوہر تمہیں مل جائے گا اور یہی شوہر ماروی سے چور کی طرح ملتا رہے گا۔آئندہ ماروی اور محبوب کے رشتے کو چور رشتہ بنائے رکھو گی تو ہمیشہ تمہارا پلڑا بھاری رہے گا۔''
وہ متاثر ہوکر بولی۔''بہت زبردست آئیڈیا ہے۔ آپ کی ذہانت کا جواب نہیں ہے۔اگر ہم اس تدبیر پر عمل کرتے ہوئے کامیاب ہوں گے تو میرا فائدہ ہی فائدہ ہے اور یہ محبوب سے کسی طرح کی بے ایمانی نہیں ہوگی۔''
معروف نے کہا۔''ہماری حکمتِ عملی سے وہ پھر محبوب کے چہرے کے ساتھ یہاں آکر کاروبار سنبھالے گا تو یہ ہماری دیانت داری اور وفاداری ہوگی لیکن محبوب کے نقطۂ نظر سے ہم مخالف اور بے ایمان سمجھے جائیں گے۔''
''کوئی بات نہیں۔خدا تو دیکھ رہا ہے کہ ہم جو کریں گے'ان کی بہتری کے لیے ہی کریں گے۔''

پھر وہ لقمہ ہاتھ میں اٹھا کر رک گئی۔ سوچنے لگی۔ معروف نے پوچھا۔ ''کچھ بولنا چاہتی ہو؟''

''ہاں۔ سوچ رہی ہوں' یہ کیسے ہوگا؟ سوال یہ ہے کہ ہم محبوب کو کیسے مجبور کریں گے کہ وہ پھر یہاں آکر اپنی پیدائشی شناخت کے ساتھ رہے؟''

''میں اور پلاننگ کروں گا۔ ذہن میں کھچڑی پکاتا رہوں گا۔ آئندہ میرا اور تمہارا طرز عمل ایسا ہوگا کہ محبوب قانونی طور پر یہاں آکر اپنا بزنس اور بینک اکاؤنٹس سنبھالنے پر مجبور ہو جائے گا۔''

وہ بولی۔ ''ہاں۔ وہ جو کاروبار کو اور دولت کو اہمیت نہیں دیتا تھا، اب ماروی کی خاطر پھر زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کے لیے یہاں آئے گا۔''

وہ لقمہ منہ میں لے کر چبانے لگی۔ آنے والی سوکن کو کسی بھی تدبیر سے چبانا ہی تھا۔ بڑی ہی سازشی محبت سے اسے کمتر اور خود کو برتر بنائے رکھنا تھا۔ وہ معروف تجّی کو بڑی احسان مندی سے بڑی عقیدت مندی سے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ہوا چلتی ہے تو دنیا چلتی ہے۔ ہوا کے چلنے سے ہی پیڑ پودے، انسان اور حیوان پھلتے پھولتے ہیں۔ ہوا صرف خوشبو کو دور تک نہیں لے جاتی۔ محبت نامہ' طلاق نامہ اور رجوع نامہ کو بھی دیار یار تک لے جاتی ہے۔

وہ غبارے افغانستان کے آسمان تلے محو پرواز تھے۔ کوئی نظر آنے والا تنکا ہو یا نادیدہ خوشبو یا بدبو ہو، سب ہی ہوا کے رخ پر جاتی ہیں۔ ہوا رخ بدلے تو وہ بھی اس کے ساتھ گھوم جاتی ہیں۔ صرف وہ غبارے تھے جو سمت نہیں بدل رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی دائیں بائیں دور تک جاتے تھے اس کے بعد پہلے کی طرح مغرب کی طرف ان کا رخ ہو جاتا تھا اور یہ سب ہی کے لیے حیرانی کی اور نہ سمجھ میں آنے والی حقیقت تھی۔ وہ غبارے ہوا کے رحم و کرم پر نہیں تھے۔ وہ مقدر کی لکیر پر چل رہے تھے اور مغرب کی سمت جاتے رہنے سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لندن تک جانے والے ہیں۔ ماروی کی انجانی کشش انہیں کھینچ رہی ہے۔ ایک پچھتانے والے شوہر کا یہ پیغام جا رہا تھا کہ طلاق دینا ایک مجبوری تھی۔ وہ مجبوری اب نہیں رہی ہے۔ اس لیے اسے چھوڑنے والا پھر پکڑنا چاہتا تھا، لہٰذا واپس آ جاؤ۔

ماروی کو چاچی اور سمیرا کے ذریعے معلوم ہو چکا تھا کہ مراد اسے طلاق دے چکا ہے۔ وہ خود کو مطلقہ تسلیم کر کے عدت کے ایام گزار رہی تھی۔ مراد کی طرف لوٹنے کا راستہ

بند ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود ہوا کی ہتھیلی پر جانے والا پیغام بچپن کی محبت کو تڑپا کر واپس لا سکتا تھا۔

محبوب اب تک بدنصیبی کا منہ دیکھتا آیا تھا۔ ماروی پھر ایک بار منہ پھیر کر مراد کے لیے پاگل ہو سکتی تھی۔ ویسے اس بار وہ محبوب کے بہت قریب تھی۔ اسے دور کرنے کے لیے مراد نہیں تھا، اور نہ ہی فون کے ذریعے وہ اسے بہکا سکتا تھا۔ بہکانے کے لیے وہ غباروں میں لٹک کر آ رہا تھا۔

افغانستان تو میدانِ جنگ بنا ہوا تھا۔ وہاں گولیاں چل رہی تھیں۔ بم برسائے جا رہے تھے وہ غبارے ابھی کابل کے آسمان پر تھے اور پل چرخی جیل کی سمت جا رہے تھے۔

پل چرخی دنیا کے خطرناک مجرموں کا جیل کہلاتا ہے۔ جب وہ مجرم قانون کی گرفت میں آتے ہیں تو ان کے ساتھ بھی ویسا ہی شیطانی سلوک کیا جاتا ہے۔ سر پٹخ پٹخ کر موت کی بھیک مانگتے ہیں اور انہیں مرنے بھی نہیں دیا جاتا۔ ایسا ہی ایک مجرم قلندر شاہ اس وقت ٹارچر سیل کی چھت سے الٹا لٹکا ہوا تھا۔ ایک پائپ کے ذریعے گرم کھولتا ہوا پانی اس پر اسپرے کیا جا رہا تھا اور وہ جیسے آگ میں جلتے ہوئے چیخ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ گرم ابلتے ہوئے پانی سے جسم کی کھال اتر رہی ہے اور صرف کھال ہی نہیں گوشت بھی ہڈیوں سے الگ ہونے والا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں تھا۔ اس پر الزام تھا کہ وہ کرائے کا قاتل ہے۔ بدنام زمانہ مجرموں کی جو تنظیمیں اسے منہ مانگا معاوضہ دیتی ہیں۔ وہ ان کے لیے کام کرتا ہے۔ اس نے امریکن آرمی کے دو فوجی افسروں کو ہلاک کیا تھا۔ آخری بار اسے بگرام ائربیس میں گرفتار کیا گیا تھا۔

پہلے اسے بگرام بیس کی ایک کال کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔ اس سے پوچھا گیا تھا کہ حریت پسندوں کے خفیہ اڈے کہاں کہاں ہیں اور وہ آئندہ کابل میں کیا کرنے والے ہیں؟ اس نے سیدھی سی بات کہہ دی تھی۔ ”مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جن دو افسران کو میں نے ہلاک کیا ہے وہاں تک حریت پسند جنگجو پہنچ نہیں پا رہے تھے۔ انہوں نے میری خدمات حاصل کی تھیں۔ میں نے ان کا کام کر دیا۔ تم بھی مجھے معاوضہ دو گے تو میں حریت پسندوں کے لیڈروں کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ یہی میرا پیشہ ہے۔“

مسلسل گرم پانی کے چھڑکاؤ نے اس کے بدن کو جیسے ہانڈی میں پکا دیا تھا۔ وہ نیم مردہ سا ہو گیا تھا۔ بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ وہ جب ہوش میں آیا تو اس نے خود کو ٹھنڈے اور ننگے فرش پر پایا۔ اب وہ چھت سے لٹکا ہوا نہیں تھا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کمزوری محسوس کی پھر اسی طرح چاروں شانے چت پڑا رہا۔ کال کوٹھری میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ وہ لباس سے محروم ہو کر کہاں برہنہ پڑا ہوا ہے۔

وہ پریشان ہو کر سوچ رہا تھا کہ موت یقینی ہے۔

امریکی افسران نے اسے دوسرے قیدیوں سے الگ رکھا تھا۔ اسے کال کوٹھری سے ٹارچر سیل میں پہنچایا جاتا تھا پھر دوبارہ اسے اسی کال کوٹھری میں لا کر پھینک دیا جاتا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ حریت پسندوں کے خفیہ اڈے کہاں ہیں۔ اگر جانتا اور امریکی افسران کو بتا دیتا، تب بھی یہ امید نہیں تھی کہ اسے زندہ چھوڑ دیا جاتا۔ اسے ہر حال میں مرنا ہی تھا۔

وہ انڈیا کے شہر ناگپور میں پیدا ہوا تھا۔ بچپن ہی سے جرائم سے بھرپور ماحول میں سانسیں لیتا رہا تھا۔ جوان ہونے تک انتہائی خطرناک فائٹر اور شوٹر بن گیا تھا۔ اب تک کئی جرائم پیشہ تنظیموں کے لیے کام کر چکا تھا۔

یہ ایک عجیب سی بات تھی کہ جرائم کی دنیا میں اسے مراد علی منگی جونیئر کہا جاتا تھا۔ گویا مجرموں کے لیے مراد علی منگی کا نام پانا ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ وہ قد اور جسامت میں مراد کی طرح تھا۔ چہرے کی ساخت ایسی تھی کہ دور سے مراد کا دھوکا ہوتا تھا۔ قریب سے دیکھنے پر چہرے کا ناک نقشہ مختلف ہو جاتا تھا۔

ریڈ الرٹ کے میکی براؤن اور دوسری اتحادی تنظیموں نے اسے مراد کے خلاف استعمال کیا تھا۔ میکی براؤن نے اسے پچاس ہزار ڈالرز پیشگی رقم کے طور پر ادا کیے تھے اور کہا تھا کہ اسے قتل کرو گے تو پچاس لاکھ ڈالرز تمہارے ہو جائیں گے۔

اس دن سے قلندر شاہ دو بار چھپ کر مراد پر حملے کر چکا تھا اور ناکام رہا تھا۔ کچھ مراد کی خوش نصیبی تھی اور کچھ قلندر شاہ کی کمزور پلاننگ تھی لیکن وہ بہت ضدی تھا۔ اس نے پورے یقین سے میکی براؤن کو کہا تھا۔ ”میں بھی مراد کی طرح چالاک اور پھرتیلا ہوں۔ وہ تیسری بار مجھ سے بچ کر نہیں جا سکے گا۔“

اس کے ذہن میں یہ بات پک رہی تھی کہ مراد کو ہتھیار سے نہیں، چالاکی اور مکاری سے مارا جا سکے گا۔ اس کا سب سے بڑا احمایتی اور سرپرست ماسٹر کو بو ہے۔ اگر اسے کمزور کر دیا جائے تو مراد بھی کمزور ہو جائے گا۔

مراد اور ماسٹر کو کمزور بنانے کے سلسلے میں وہ تدبیر

سوچنے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ بات ذہن میں نقش ہونے لگی کہ اسے مراد کا ہم شکل بن کر ڈبل رول پلے کرنا چاہیے۔ ایک طرف مراد کو اور دوسری طرف ماسٹر کو فریب دینا چاہیے۔ ماروی اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ وہ مراد بن کر ماروی کو ٹریپ کرے گا تو مراد گھٹنے ٹیک دے گا۔

پہلے یہ خیال بچکانا سا لگا کہ اپنا چہرہ گم کردے اور مراد علی منگی بن جائے پھر رفتہ رفتہ یہ منصوبہ بہت ہی جان دار لگا۔ وہ مراد بن کر صرف ماسٹر کو ہی نہیں، میکی براؤن کو اور اس کی اتحادی تنظیموں کو بھی دھوکا دے سکتا تھا اور مراد بن کر کئی گنا زیادہ معاوضہ حاصل کرسکتا تھا۔

یہ بات دماغ میں بیٹھ گئی کہ وہ مراد علی منگی کی زندگی گزارتے ہوئے جرائم کی دنیا میں اپنی دہشت طاری کرسکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ دولت کما سکتا ہے لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ وہ اپنے منصوبے پر عمل نہ کرسکا۔ ایسے ہی وقت کہتے ہیں کہ سامان سو برس کا، پل کی خبر نہیں۔ وہ افغانستان آکر حریت پسندوں کے دشمن امریکیوں کو ٹھکانے لگانے کے دوران پکڑا گیا تھا۔

لوگ اپنی زندگی میں بہت دور تک اچھلتے ہیں۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگلا لمحہ موت کا ہوتا ہے۔ وہ کال کوٹھری کی گہری تاریکی میں گویا جیتے جی اپنی قبر میں پڑا تھا اور یہ طے تھا کہ اگلا کوئی بھی لمحہ موت کا ہوگا۔ وہ لاکھ مجرمانہ ہتھکنڈے آزمانے کے باوجود پل چرخی کی آہنی دیواروں سے قیامت تک باہر نہیں جاسکتا تھا۔

اچانک کھٹکا سا ہوا۔ لوہے کا دروازہ شور مچاتا ہوا کھل گیا۔ باہر کی دھیمی سی روشنی اندر آئی۔ تین مسلح سپاہی آئے تھے۔ ایک نے اسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ''اے چل اٹھ۔ تجھے گولی مارنے کا آرڈر مل گیا ہے۔ باہر چل...''

وہ چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ ابلتے کھولتے ہوئے گرم پانی نے اس کے جسم کی کھال کو اور گوشت کو جیسے بھون کر رکھ دیا تھا۔ پھر بھی اس میں دم خم تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ سکتا تھا۔ ان کے ساتھ چل سکتا تھا لیکن اس نے کمزوری ظاہر کی۔ یوں کراہنے لگا جیسے بولنے کی بھی سکت نہ رہی ہے۔

دو سپاہیوں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ پھر اسے فرش پر گھسیٹتے ہوئے کال کوٹھری سے باہر لے آئے۔ وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ نیم وا آنکھوں سے آس پاس دیکھ رہا تھا۔

بس وہی آخری لمحات تھے۔ مرنا تو تھا ہی' اس لیے موت سے پہلے کچھ کر گزرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے سیڑھیوں پر سے کھینچتے ہوئے تہ خانے سے اوپر لے آئے' وہاں دائیں بائیں آہنی سلاخوں کے پیچھے بے شمار قیدی اسے دیکھ رہے تھے۔ سلاخوں کو جھنجوڑتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔ ایک قیدی کی سزائے موت پر احتجاج کررہے تھے۔ جیل کی انتظامیہ کو گالیاں دے رہے تھے۔

جیل کے اس حصے میں قیامت کا شور برپا تھا۔ وہ تین سپاہی ان سیکڑوں قیدیوں کے درمیان راہداری کے فرش پر اسے گھسیٹتے ہوئے لے جارہے تھے۔ ایسے ہی وقت قلندر شاہ نے یکبارگی اچھل کر دونوں سپاہیوں کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ تیسرے نے اسے زخمی کرنے کے لیے اس کے پیروں پر گولی ماری۔ وہ سپاہیوں کو جکڑتے ہی گھوم گیا تھا۔ گولی ایک سپاہی کو لگی۔ وہ دونوں قلندر شاہ پر حاوی ہورہے تھے۔ ایسے وقت ایک کو گولی لگی تو وہ گرنے لگا۔ قلندر نے اس سے گن چھین کر دوسرے کو گولی ماردی پھر اس کی لاش کو اپنے آگے ڈھال بنالیا۔

تیسرا کہیں سے چھپ کر فائر کرنے کے لیے وہاں سے بھاگ رہا تھا۔ قلندر نے اسے بھی مار گرایا۔ اس راہداری کے دائیں بائیں اور کئی مسلح گارڈز تھے۔ وہ دور سے فائر کرتے ہوئے اسے ہتھیار پھینکنے کو کہہ رہے تھے۔

اس کوریڈور میں چھپ کر فائرنگ کرنے کی جگہ نہیں تھی۔ اس لیے کوئی اس کے قریب نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے دو گولیاں چلائیں، وہ اس سپاہی کی لاش کو لگیں جس کے پیچھے وہ چھپا ہوا تھا۔ سیکیورٹی افسر نے جھنجلا کر کہا۔ ''گدھے کے بچے! یہاں سے زندہ کیسے جائے گا۔ باہر جانے کے چار آہنی دروازے مقفل رہتے ہیں۔ تو وہاں تک پہنچ نہیں پائے گا۔''

دوسرے افسر نے کہا۔ ''تیری بہتری اسی میں ہے کہ ہتھیار پھینک دے۔ تجھے گولی نہیں ماری جائے گی۔ ہمارے سامنے آکر خالی ہاتھ زمین پر اوندھے منہ لیٹ جا۔''

اس نے کہا۔ ''تم سب گدھے کی اولاد ہو۔ میری بہتری کی بات کررہے ہو جبکہ مجھے گولی مارنے کے لیے لے جارہے تھے۔ جب مجھے مرنا ہی ہے تو کیوں نہ تم سب کو موت کا مزہ چکھاتے ہوئے اس دنیا سے جاؤں۔''

وہ اس وقت برہنہ تھا۔ اس کے جسم کی کھال جلتے رہنے کے بعد سیاہ پڑ گئی تھی۔ وہ جن آہنی سلاخوں کے پاس تھا، وہاں کے قیدیوں نے باہر ہاتھ نکال کر مردہ سپاہی کو تھام لیا تھا۔ قلندر شاہ کے دونوں ہاتھ آزاد ہوگئے تھے۔ وہ دوسرے مردہ سپاہی کی پتلون اتار کر پہن رہا تھا۔

کئی قیدی اس سے کہہ رہے تھے کہ ان کے سیل کے لاک پر فائر کرے۔ تالا توڑ کر انہیں باہر نکالے۔ قلندر شاہ نے کہا۔ ''یہ غیر معمولی لاک ہیں۔ فائرنگ سے نہیں ٹوٹیں گے۔ خوامخواہ گولیاں ضائع ہوں گی۔ مجھے ابھی دیر تک زندہ رہنے کے لیے اور مقابلہ کرتے رہنے کے لیے زیادہ سے زیادہ بلٹس کو بچا کر رکھنا ہے۔''

وہ تمام قیدی باہر آنے کے لیے مچل رہے تھے۔ قلندر شاہ کو غصہ دکھا رہے تھے۔ اسے گالیاں دے رہے تھے۔ ان میں سے کچھ نے سلاخوں سے باہر ہاتھ نکال کر اسے پکڑ لیا۔ کہنے لگے۔ ''تالا توڑو۔ ورنہ ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔''

وہ سب اس سے گن چھیننا چاہتے تھے۔ اس نے ان کی سمت ایک ہوائی فائر کیا تو وہ فوراً ہی اسے چھوڑ کر پیچھے جا کر فرش پر بیٹھ گئے۔ قلندر شاہ پھر مردہ سپاہی کو ڈھال بنا کر ان قیدیوں سے دور ہو گیا۔

جیل کے تمام سپاہی اس کے دشمن تو تھے ہی' وہاں کے قیدی بھی دشمن ہو گئے تھے۔ وہ جان پر کھیلنے والا ان سب کی عداوتوں سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ یہ اچھی طرح یقین ہو گیا تھا کہ آخر میں مرنا ہی ہے۔ کہیں سے کوئی غیبی مدد حاصل ہونے والی نہیں تھی۔ دور کھڑے ہوئے سپاہیوں کو لوہے کی مضبوط ڈھالیں مہیا کی جا رہی تھیں۔ وہ سب ڈھال کے پیچھے رہ کر قلندر شاہ کی فائرنگ سے محفوظ رہ سکتے تھے اور قریب آ کر اسے گولیوں سے چھلنی کر سکتے تھے۔

اب اس کی شامت آ گئی تھی۔ زندگی مختصر ہو کر چند منٹوں کی رہ گئی تھی۔ ایسے وقت خدا کے سوا اور کون بچا سکتا تھا؟ یکبارگی جیل کے کسی حصے میں زوردار دھماکا ہوا۔ وہاں کے آہنی در و دیوار لرز گئے۔ جو کھڑے ہوئے تھے' وہ ڈگمگا کر گر پڑے۔ یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ باہر سے منظم حملہ کیا گیا ہے۔

اب سے پہلے منظم حملوں سے جیل توڑی گئی تھی اور کئی قیدی فرار ہو گئے تھے۔ اس وقت بھی جیل کے کئی حصوں سے مسلسل فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیل کا عملہ فون کے ذریعے ایک دوسرے کو اطلاع دے رہا تھا کہ حریت پسندوں نے حملہ کیا ہے۔ بم دھماکے سے بیرونی دروازے کو توڑ دیا گیا ہے۔ اب وہ فائرنگ کرتے ہوئے اندر گھس آئے ہیں۔

قلندر شاہ کی طرف آنے والے سپاہی رک گئے تھے۔ وہاں سے پلٹ کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے جا رہے تھے۔ ایسے وقت قلندر شاہ نے لگاتار تین گولیاں چلائیں۔ دو سپاہی وہاں سے بھاگتے وقت گرے۔ ایک زخمی ہوا، دوسرا مارا گیا۔

جیل کا وہ حصہ مسلح گارڈز سے خالی ہو رہا تھا۔ تمام اسلحہ بردار سپاہی گراؤنڈ فلور کی طرف حملہ آوروں سے نمٹنے چلے گئے تھے۔ قلندر شاہ دوڑتا ہوا مردہ سپاہی کے پاس آیا۔ اس کے بلٹس کی پیٹی اٹھا کر اپنی کمر سے باندھی۔ اس کی گن اور لوہے کی ڈھال کو اٹھایا۔ پھر سیڑھیوں سے اترتے ہوئے سپاہیوں پر گولیاں چلانے لگا۔

سیڑھیوں کے نیچے کھڑے ہوئے سپاہی دوطرفہ فائرنگ کی زد میں آ گئے تھے۔ گراؤنڈ فلور میں دوسری طرف سے حریت پسند گولیاں چلا رہے تھے۔ انہوں نے آہنی سلاخوں والے کئی دروازوں کو توڑ دیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو رہائی دلا کر انہیں اسلحہ دے رہے تھے۔ یوں ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔

قلندر شاہ ڈھال کے پیچھے چھپتا ہوا فائر کرتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف جانے لگا۔ حریت پسندوں کے کمانڈر نے اس کے جلے ہوئے برہنہ بدن کو دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''قلندر کو باہر لے جاؤ۔ اسے طبی امداد پہنچاؤ۔''

جو سزائے موت اٹل تھی، وہ ٹل گئی۔ اپنوں کا سہارا ملتے ہی اس نے تھکن اور کمزوری محسوس کی۔ اسے پچھلے چوبیس گھنٹوں سے بھوکا پیاسا رکھا گیا تھا۔ سونے بھی نہیں دیا گیا تھا۔ جب نیند آتی تو چابک مار کر اسے جگا دیا جاتا تھا۔

وہ دو حریت پسندوں کے ساتھ جیل سے باہر آ کر ایک گاڑی کے پچھلے حصے میں لیٹ گیا۔ اسے پھلوں کا جوس پینے کے لیے دیا گیا۔ اس سے کہا گیا کہ ہیڈ کوارٹر میں پہنچتے ہی اس کا علاج کرایا جائے گا۔ وہ گاڑی وہاں سے چل پڑی۔ گاڑی کا وہ پچھلا حصہ کھلا ہوا تھا۔ وہ چاروں شانے چت پڑا ہوا کھلے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ تب اس نے نیند بھری آنکھوں سے رنگین غباروں کو دیکھا۔ ان کی ہوا کم ہو گئی تھی۔ وہ نیچے آ رہے تھے۔

وہ چار پہیوں والی گاڑی تیز رفتاری سے جا رہی تھی اور وہ بغیر پہیوں والے غبارے بلندی سے پستی کی سمت اس کے قریب آ رہے تھے۔

آنکھیں نیند کے بوجھ سے بند ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے اتنا ہی دیکھا کہ دو پلاسٹک کے لفافے اس کے چٹان جیسے پھیلے ہوئے سینے پر آ کر ٹھہر گئے اور قوتِ پرواز کھونے والے بارہ درجن غباروں نے آ کر اس کے پورے وجود کو

ڈھانپ لیا۔ پھر سے ملنے والی نئی زندگی نے گویا اسے غباروں کا کفن پہنا دیا تھا۔ نیند نصف موت ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

☆☆☆

بشریٰ اور بیٹے نے کراچی میں ایک چھوٹا سا مکان خریدا تھا۔ حلال کی روزی حاصل کرنے کے لیے دو ٹیکسیاں خریدی تھیں۔ وہ ایک ٹیکسی خود چلاتا تھا دوسری ایک ڈرائیور کو چلانے کے لیے دی تھی۔ یہ سوچا تھا کہ توقع کے مطابق آمدنی ہوتی رہے گی تو اور دو چار ٹیکسیاں خرید لے گا۔ وہ دونوں سیدھے سادے پرامن شہریوں کی طرح زندگی گزارنے کی ابتدا کر چکے تھے۔ بشریٰ بہت خوش تھی۔ وہ خود کو مصروف رکھنے کی خاطر غریب بچوں کی تعلیم کے لیے ایک اسکول کھولنے والی تھی۔ جرائم کی دنیا سے نکلنے کے بعد وہ دونوں دلی آسودگی اور روحانی سکون محسوس کر رہے تھے۔

وہ کسی فکر و پریشانی کے بغیر، کسی طرح کے ذہنی دباؤ کے بغیر رات کو سکون سے گہری نیند سوتے تھے اور دن کو تازہ دم رہتے تھے اور ہر نماز کے بعد دعائیں مانگتے تھے کہ انہیں آخری سانسوں تک ایسی ہی شریفانہ زندگی نصیب ہوتی رہے۔

جہاں خیر ہو، وہاں شر پیچھے پیچھے آتا ہے۔ موقع پاکر دبوچ لینے کی تاک میں رہتا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات راستہ بدلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ دشمن ان کے سائے تک بھی پہنچ نہیں پائیں گے لیکن ماسٹر دشمن نہ ہونے کے باوجود آئندہ دشمنی پر مجبور ہونے والا تھا۔ اس نے پہلے مراد سے رابطہ کرنا چاہا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ ماسٹر جیسے مہربان سے چھپ رہا ہے۔ اس نے فون کی سم بھی بدل دی تھی۔ اپنے محسن سے آواز کا رابطہ بھی ختم کر چکا تھا۔

ماسٹر کے نقطۂ نظر سے وہ نمک حرام ہو گیا تھا کیونکہ ماسٹر اسے صرف کرائے کا شوٹر نہیں سمجھتا تھا۔ مراد نے برنارڈ کو اور میکی براؤن کی فیملی کے اہم افراد کو ہلاک کیا تھا۔ ماسٹر ان ہلاکتوں کے عوض اسے بھاری رقم ادا کرتا رہا تھا۔ وہ ان ادائیگیوں کے علاوہ اسے وقتاً فوقتاً بڑی بڑی رقوم دیا کرتا تھا۔ وہ جس ملک میں جاتا تھا۔ وہاں اس کے آنے جانے، رہنے سہنے اور کھانے پینے کے اخراجات ادا کرتا تھا۔ اس نے مراد سے صرف پیشہ ورانہ تعلق نہیں رکھا تھا بلکہ بڑے ہی جذباتی انداز میں باپ بیٹے کا رشتہ بھی قائم کیا تھا۔ وہ مراد کو اپنا بیٹا کہا کرتا تھا۔

ماسٹر کے ایسے جذبات کو ٹھیس پہنچی تھی۔ ابھی وہ مراد کو دشمن نہیں سمجھ رہا تھا۔ یہ کہہ رہا تھا کہ اولاد نافرمان ہو جائے تو اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرنا چاہیے اور وہ مراد کو جی جان سے واپس لانے کی بھرپور کوششیں کر رہا تھا۔

ماسٹر کے نظریے سے راہِ راست پر لانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ مراد کو پھر سے مجرمانہ زندگی گزارنے پر مجبور کرنے والا تھا۔ اس نے چمپت راؤ سے کہا تھا کہ مراد چوبیس گھنٹے کے اندر اپنی روپوشی ختم نہیں کرے گا اور اس سے فون پر رابطہ نہیں کرے گا تو وہ انڈیا آ کر اس کی گردن دبوچ لے گا۔

مراد کے متعلق یہ کبھی معلوم نہ ہوتا کہ وہ کس ملک کے کس شہر میں ہے۔ ان غباروں کے ذریعے سراغ مل گیا تھا کہ وہ دہلی میں ہے۔ دہلی انڈیا کا دارالسلطنت تھا۔ اس شہر میں ایک کروڑ سے زیادہ باشندے ضرور ہوں گے۔ ماسٹر نے دعویٰ کیا تھا کہ اس شہر میں پہنچتے ہی وہ مراد کی خفیہ رہائش گاہ تک پہنچ جائے گا۔ یہ ناممکن سی بات تھی۔ وہ ہزاروں میل دور سن سٹی سے آ کر دہلی جیسے انجانے شہر میں مراد کو ڈھونڈ نکالنے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ ویسے یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات جو کام بالکل ہی ناممکن دکھائی دیتا ہے، وہ ذہانت یا مکاری سے اچانک ہی آسان ہو جاتا ہے۔

چمپت راؤ نے حیرانی سے پوچھا تھا۔ ''ماسٹر! آپ یہاں دہلی آ کر مراد کو کیسے ڈھونڈ نکالیں گے؟''

ماسٹر نے کہا تھا۔ ''میں بہت آسانی سے اس چھپنے والے تک پہنچ جاؤں گا۔ تم ایک تربیت یافتہ ڈاگ حاصل کرو۔ وہ کتا مراد کی بو سونگھ کر مجھے اس کے گھر میں پہنچائے گا۔''

چمپت راؤ نے پھر حیرانی سے پوچھا۔ ''بو سونگھنے والے کتے کو پہلے مراد کے جسم کی بو سونگھوانی ہوگی۔ تب ہی وہ اس کی طرف لپکے گا۔ اور ہمیں اس کے پاس پہنچائے گا۔''

''یہی ہوگا۔ مراد کی جسمانی مہک میرے پاس محفوظ ہے۔''

ماسٹر نے جرائم کی دنیا میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ یہ سمجھتا تھا کہ چوروں، بدمعاشوں اور قاتلوں کی دنیا میں کسی پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ مراد پر بھروسا کرنے کے باوجود یہ سوچ تھی کہ کبھی وہ دھوکا دے گا، دشمنوں سے جا ملے گا، اسے نقصان پہنچا کر روپوش ہو جائے گا تو وہ کیا کرے گا؟ تب اس روپوش ہونے والے کی شہ رگ تک پہنچنے کا یہی ایک راستہ ہوگا۔ کتے اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔ جب وہ ماروی کے ساتھ سن سٹی کے مہنگے ہوٹل میں رہنے آیا تھا۔ تب ماسٹر کے حکم سے اس کے ملازم مراد کی اترن لانڈری میں

لے جاتے تھے۔ مراد کی ایسی تین اترن ماسٹر کے پاس محفوظ تھیں۔ وہ انہیں لے کر دہلی جانے والا تھا۔ دوسرے دن کی فلائٹ میں اس کی سیٹ کنفرم تھی۔ اس نے سوچا۔ بلا میرا تابع دار ہے۔ اسے میرے ساتھ دہلی میں رہنا چاہیے۔ بشریٰ بہت ہی تیز طرار ہے۔ مراد کے ساتھ مرینہ جہاں بھی چھپی ہوگی، بشریٰ اسے ڈھونڈ نکالے گی۔

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے بلے کے نمبر پنچ کیے۔ بشریٰ اور بلا نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ایک ہفتے بعد لندن جائیں گے، وہاں ماسٹر سے رابطہ کریں گے تو اسے یقین ہوگا کہ وہ دونوں وہیں روپوش ہوگئے ہیں۔ اس کے آدمی انہیں تلاش کرنے پاکستان نہیں آئیں گے۔

بشریٰ نے فون کی اسکرین کو پڑھ کر کہا۔ ''ماسٹر کال کررہا ہے۔ اچھی طرح سوچ لے۔ ہمیں ابھی سے روپوش ہونا ہے یا لندن جانا ضروری ہے؟''

بلے نے فون اٹھا کر کہا۔ ''لندن جانا ضروری ہے۔ ماسٹر کو وہاں دھوکے میں رکھا جائے گا۔ میں نہیں چاہوں گا کہ اس کا کوئی آدمی ہمیں تلاش کرنے پاکستان آئے۔''

اس نے فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ''لیولانگ مائی ماسٹر! بلا حاضر ہے۔''

ماسٹر نے پوچھا۔ ''کیا پاکستان میں ہو؟''

''ہاں، جلد ہی ہم لندن جائیں گے۔ پاکستان بہت ہی بیک ورڈ کنٹری ہے۔ ہم لائف انجوائے کرنے اور مستقل رہائش اختیار کرنے لندن جائیں گے۔''

''جیسا کہ تم جانتے ہو مراد بڑی رازداری سے خود کو چھپا رہا ہے اور یہ بڑے افسوس کی بات ہے بلکہ غصہ دلانے والی بات ہے کہ مجھ جیسے محسن اور ہم راز سے بھی چھپ رہا ہے۔ فون کے ذریعے بھی رابطہ نہیں کررہا ہے۔''

بلے نے کہا۔ ''مجھے بھی یہی صدمہ ہے۔ وہ مجھ جیسے جاں نثار دوست سے بھی چھپ رہا ہے۔ اس نے بچپن سے محبت کرنے والی ماروی کو چھوڑ دیا ہے اور اب مرینہ کے ساتھ کسی ملک میں ہے۔''

''ابھی وہ انڈیا کے شہر دہلی میں ہے۔ تم بشریٰ کے ساتھ کسی بھی پہلی فلائٹ سے وہاں جاؤ۔ میں بھی کل وہاں پہنچ رہا ہوں۔ اسے چوہے کے بل سے باہر نکالوں گا۔''

''بہت مشکل ہے ماسٹر! اس نے زبردست پلاننگ کے بعد روپوشی اختیار کی ہے۔ ہم دہلی شہر میں اسے پہچان نہیں سکیں گے۔''

''ہم آسانی سے پہچان لیں گے۔ صرف ایک بلڈ ہاؤنڈ اس کی بو سونگھتا ہوا ہمیں اس کے پاس لے جائے گا۔''

ماسٹر بتانے لگا کہ مراد کی ایک اترن اس کے پاس محفوظ ہے، اس کے ذریعے وہ آسانی سے مراد تک پہنچ سکیں گے۔ بشریٰ اور بلا اس کی باتیں سن رہے تھے۔ اگرچہ مراد سے اختلافات پیدا ہوگئے تھے لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ مراد ماسٹر کی گرفت میں آکر جرائم کی دنیا میں پھر لوٹ آنے پر... ہوجائے۔

بلے نے کہا۔ ''ویل ماسٹر! میں کل تک بشریٰ کے ساتھ دہلی جانے کی پوری کوشش کروں گا۔''

ماسٹر سے رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ دونوں کے ذہن میں یہ سوال تھا کہ ایسے وقت کیا کرنا چاہیے؟

کیا مراد کو پکڑنے اور بے نقاب کرنے کے لیے انڈیا جانا چاہیے؟ ماسٹر کا ساتھ دینا چاہیے؟

بشریٰ نے کہا۔ ''میں کہتی ہوں، مراد بھائی کو ماسٹر کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے۔''

بلے نے کہا۔ ''ہم ماسٹر کو روک نہیں سکیں گے۔ وہ ایک کتے کے ذریعے مراد کی لاعلمی میں اس کے سر پر پہنچ جائے گا۔''

''مراد بھائی نے یہ بہت بڑی غلطی کی ہے کہ ہم سے فون پر رابطہ نہیں رکھا ہے۔ ابھی رابطہ ہو جاتا تو ہم انہیں خطرے سے آگاہ کردیتے۔ وہ انجانے میں ماسٹر کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔ بلے...! ہم کیا کریں؟''

وہ اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ بلے نے کہا۔ ''ہمیں وہاں جانا ہوگا۔ ہم دعا کریں گے اور کوشش کریں گے کہ کسی طرح ماسٹر سے پہلے مراد تک پہنچ جائیں یا کسی طرح اس سے فون پر بات ہوجائے۔''

وہ اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''کچھ تو کرنا ہی ہوگا اور وہیں پہنچ کر ہم کچھ کرسکیں گے۔''

کیا تقدیر کے تماشے ہوتے ہیں۔ انہوں نے کراچی میں مکان خریدا تھا۔ ٹیکسیاں خریدی تھیں۔ رزق حلال حاصل کرنے کے لیے ایک پرامن شریفانہ زندگی کا آغاز کیا تھا لیکن آغاز ہوتے ہی ہوا کا رخ بدل گیا تھا۔

وہ دونوں چاہتے تو ماسٹر سے رابطہ نہ کرتے۔ اس سے چھپ کر رہتے۔ نہ انڈیا جاتے، نہ مجرموں کے معاملات میں پڑتے۔ اپنی سیدھی سادی زندگی گزارتے رہتے لیکن مراد بلا کا دوست اور محسن تھا۔ بشریٰ کا منہ بولا بھائی تھا۔ ان کی طرح جرائم کی دنیا سے نکل آیا تھا۔ یہ ان کا فرض تھا کہ اسے ماسٹر کی گرفت سے بچاتے۔ وہ اپنے محسن کو خطرے

سے دوچار ہونے کے لیے یونہی چھوڑ نہیں سکتے تھے۔

دوسری طرف درگا تھی۔ وہ چیپت راؤ کی دھرم پتنی بن چکی تھی۔ مراد کو دل کی گہرائیوں سے اپنا بھائی مانتی تھی۔ اس نے چیپت راؤ سے کہا۔ ''میں اپنے بھائی کو ٹریپ ہونے نہیں دوں گی۔ کیا بھول گئے کہ شملہ جاتے وقت بھائی نے میرے لیے اور میرے بچے کے لیے بھاسکر کے شوٹروں سے مقابلہ کیا تھا اور انہیں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو بھاسکر میرے بچے کو مجھ سے چھین کر لے جاتا اور وہ مجھے زندہ نہ چھوڑتا۔ میں اس وقت بھائی مراد کی دی ہوئی زندگی کی سانسیں لے رہی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''میں مانتا ہوں، مراد یاروں کا یار ہے۔ میں نے اس کے ساتھ رہ کر کئی بار دشمنوں سے مقابلہ کیا ہے۔ کبھی میں نے اسے سیکیورٹی دی ہے۔ کبھی وہ محافظ بن کر میرے کام آتا رہا ہے۔ لیکن درگا! میں بہت الجھن میں ہوں۔''

''الجھن کیا ہے؟''

''میں ماسٹر کا نمک کھاتا ہوں۔ اس سے نمک حرامی نہیں کروں گا۔ مراد تو دور کی چیز ہے، ماسٹر کے لیے میں اپنی جان بھی دے سکتا ہوں اور مراد جیسے دوستوں کی جان بھی لے سکتا ہوں۔''

''تو پھر اس سے دشمنی کرنے سے پہلے مجھے چھوڑ دو۔ میں اپنے بھائی کے دشمن کی پتنی بن کر نہیں رہوں گی۔''

''پلیز! ایسی باتیں نہ کرو درگا۔ تم میری جان ہو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو، میں تمہیں جان سے زیادہ چاہتا ہوں۔''

''میں تمہاری جان ہوں اور تم ماسٹر کے لیے اپنی جان دے سکتے ہو۔ یعنی اپنے باس کے لیے میری جان بھی لے سکتے ہو۔''

''فضول باتیں نہ کرو۔ ماسٹر کی وفاداری میں کبھی تمہاری جان سے کھیلنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''بھاسکر میرے بچے کا باپ ہے۔ وہ بچے کو مجھ سے چھین لینا چاہتا تھا۔ بھائی مراد کی مہربانی سے وہ ناکام رہا ہے۔ میں اپنے بھائی کا یہ احسان نہیں بھولوں گی۔ میں ابھی بچے کو لے کر جا رہی ہوں۔ اگر کل ماسٹر تمہارے ذریعے میرے بھائی کو ٹریپ کرے گا تو تمہاری زندگی میں کبھی واپس نہیں آؤں گی۔ اگر وہ ناکام رہے گا اور میرا بھائی اپنے نیک ارادوں کے مطابق مجرموں سے دور رہے گا، اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی تو میں تمہارے پاس واپس آجاؤں گی۔''

''تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔ کبھی نہیں جاؤ گی۔ کہیں نہیں جاؤ گی۔ میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔''

''تم مجھے زبردستی روک نہیں سکو گے۔ میں گھر گرہستی والی سیدھی سادی عورت نہیں ہوں۔ تمہارے اور بھائی کے آنے سے پہلے تنہا بھاسکر کے شوٹروں سے مقابلہ کرتی رہی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ مجھے روکو اور میں تم سے مقابلہ کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔''

وہ پریشان ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔ وہ بولی۔''ایک گھنٹے بعد یہاں سے جاؤں گی۔ اچھی طرح سوچ لو۔ بیوی سے محبت ہے یا ماسٹر کی وفاداری عزیز ہے؟''

وہ منہ پھیر کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مرینہ اور مراد بے خبر تھے۔ بڑے اطمینان اور سکون سے میاں بیوی کی زندگی گزار رہے تھے۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی لاعلمی میں کیسی سازشیں ہو رہی ہیں۔ مراد کا یہ اطمینان غارت ہونے والا تھا کہ اسے کوئی موجودہ بہروپ میں پہچان نہیں سکے گا۔ یہ بات اس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتی تھی کہ ایک کتے کے ذریعے اسے پہچان لیا جائے گا۔

موجودہ پُرامن زندگی گزارنے کے باعث وہ دشمنوں کو بھول گیا تھا۔ صرف ایک ہی رقیب اس کے دماغ میں سلگتا رہتا تھا۔ اگر ماروی کا پتا ٹھکانا معلوم ہوتا تو وہ پہلی فلائٹ سے وہاں پہنچ جاتا۔ اسے تلاش کرنا ایک مسئلہ تھا۔ وہاں اس عزم کے ساتھ جانا تھا کہ اس کی تلاش میں ساری عمر بھٹکتے رہنا ہے اور ماروی سے ایسی امید نہیں تھی کہ وہ خود کو ظاہر کر دے گی۔ کچھ بھی ہو۔ اس تلاش میں کامیابی ہو یا ناکامی' وہاں جانے کے لیے دل مچل رہا تھا۔ لیکن وہ جان محمد کے بہروپ میں تھا۔ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ مرحوم کا چالیسواں کیے بغیر جا نہیں سکتا تھا۔ اگر جاتا تو پھر چالیس دنوں میں واپس آنا پڑتا۔ اس لیے وہ صبر کر رہا تھا۔

دوسرے دن بشریٰ اور بلا کراچی سے اور ماسٹر کو بوڈ کوسن سٹی سے آنا تھا اور ایسے ہی وقت مرینہ اور مراد کو ائرپورٹ جانا پڑا۔ جان محمد کے چچا جدہ سے آنے والے تھے۔ وہ جان محمد کے رشتے داروں کے ساتھ ان بزرگ کے استقبال کے لیے ائرپورٹ آئے۔ معلوم ہوا کہ جہاز دو گھنٹے کی تاخیر سے آئے گا۔

پہلا جہاز کراچی سے آنے والا تھا۔ ماسٹر نے فون پر بلے سے کہا تھا کہ وہ ایک گھنٹے بعد دہلی پہنچنے والا ہے، لہٰذا وہ وہیں ائرپورٹ پر اس کا انتظار کرے۔ اس طرح سچویشن یہ بن گئی کہ وہ سب لوگ جس مراد کی تلاش میں آ رہے تھے، وہ خود ہی ائرپورٹ پہنچ گیا تھا۔

وہاں سب ہی انجانے میں ایک دوسرے سے سامنا کرنے والے تھے اور مزے کی بات یہ تھی کہ سامنا کرتے ہوئے بھی کوئی کسی کو پہچاننے والا نہیں تھا۔

سب سے پہلے مراد وہاں چھپت راؤ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس نے مرینہ سے کہا۔''وہ دیکھو۔ وہ جس نے دھوتی' کرتہ اور گاندھی ٹوپی پہنی ہوئی ہے، وہی چھپت راؤ ہے۔''

وہ اسے دیکھتے ہوئے بولی۔''ماسٹر کا یہ دستِ راست یہاں ضرور کسی اہم معاملے میں آیا ہے۔''

''اگر معاملہ سنگین ہوگا تو گولیاں ضرور چلیں گی۔''

''مراد! ہم کسی بھی سنگین یا رنگین معاملے میں نہیں پڑیں گے۔ حالات ہمیں مجبور کریں گے، تب بھی ہتھیار نہیں پکڑیں گے۔ جیسے ہی چچا جان آئیں گے، ہم انہیں یہاں سے چپ چاپ لے جائیں گے۔''

وہ بولا۔''چھپت راؤ سے نہ اب دوستی ہے، نہ اس کے کسی معاملے سے ہمیں دلچسپی ہوگی۔ جہاز لیٹ ہے۔ ہمیں مجبوراً یہاں رکنا ہوگا۔ ورنہ ابھی یہاں سے چلے جاتے۔''

چھپت راؤ ٹوائلٹ کی طرف جاتے وقت ٹھیک ان کے سامنے رک گیا تھا۔ جہازوں کی آمدورفت کے انفارمیشن بورڈ کو پڑھ رہا تھا۔ اس کے کان سے فون لگا ہوا تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔''پلیز درگا! مجھے بتاؤ تم کہاں ہو؟ مجھ سے ناراض ہو کر کہیں دور نہ جانا۔ بھاسکر کو تم پر حملہ کرنے کا موقع مل جائے گا۔''

وہ چپ ہو کر درگا کی باتیں سننے لگا۔ مرینہ اور مراد کے درمیان سے رک رک کر آگے جانے لگا۔ پھر اس نے کہا۔''میں تم سے کہہ چکا ہوں، تمہارے مراد بھائی کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ ماسٹر اسے جان سے زیادہ چاہتا ہے۔ اسے صرف اپنی دنیا میں واپس لانا چاہتا ہے۔ تمہارے بھائی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔ پلیز! مجھے بتاؤ تم کہاں ہو؟''

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ ہیلو ہیلو کہہ کر درگا کو آوازیں دینے لگا۔ فون بند ہو گیا تھا۔ اس نے بے بسی سے دائیں بائیں دیکھا پھر مرینہ اور مراد جیسے اجنبیوں کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ مرینہ نے مسکرا کر پوچھا۔''کیا بات ہے بھیا! معلوم ہوتا ہے' ہماری بھابی آپ سے ناراض ہو گئی ہیں؟''

مراد نے بھی مسکرا کر کہا۔''مسٹر! فون پر کیا پوچھتے ہو کہ کہاں ہے؟ ہم سے پوچھو۔ بیوی روٹھ کر ہمیشہ میکے جاتی ہے۔ یہاں کیا کر رہے ہو، اس کے میکے میں جاؤ۔''

وہ جھینپ کر تیزی سے آگے بڑھتا ہوا ٹوائلٹ کی طرف جانے لگا۔ اس کے جاتے ہی مرینہ نے کہا۔''اس فون کال سے یہ سمجھ میں آ رہا ہے کہ یہ تمہیں نقصان پہنچانے

آیا ہے اور اس کی بیوی تمہاری خاطر اس سے ناراض ہو گئی ہے۔''

''ہاں، درگا مجھے بہت چاہتی ہے۔ بھائی کی طرح مانتی ہے۔ لیکن یہ معاملہ کیا ہے؟ ماسٹر مجھے نقصان کیسے پہنچائے گا؟ یہ چمپت راؤ یہاں کیوں آیا ہے؟''

پھر وہ مرینہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''کیا ماسٹر کسی فلائٹ سے آرہا ہے؟''

وہ بولی۔ ''اگر آرہا ہے تو کیا اسے یقین ہے کہ تمہیں ڈھونڈ نکالے گا؟''

''ان کے اچھے بھی مجھے پہچان نہیں سکیں گے۔ ابھی چمپت راؤ سامنے آکر بھی ہمیں پہچان نہ سکا۔''

''لیکن یہ بڑے اعتماد سے یہاں آیا ہے۔ اسے کسی کا انتظار ہے اور یہی سمجھ میں آرہا ہے کہ ماسٹر یہاں آنے والا ہے۔''

لاؤڈ اسپیکر سے آواز ابھر رہی تھی۔ کہا جارہا تھا کہ کراچی سے فلائٹ آچکی ہے۔ مراد نے کہا۔ ''اگر میں درگا سے ابھی فون پر رابطہ کروں تو بہت کچھ معلوم ہو سکے گا۔ وہ مجھے بتادے گی کہ چمپت راؤ یہاں ائرپورٹ کس لیے آیا ہے۔ درگا کو یقین ہے کہ مجھے نقصان پہنچایا جائے گا۔ اسی لیے وہ اپنے پتی دیو سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ کر کہیں گئی ہے۔''

مرینہ نے کہا۔ ''بے شک ہمیں بہت کچھ معلوم ہو گا لیکن درگا کو ہمارا فون نمبر معلوم ہو جائے گا۔ تم اپنی بہن سے چھپ کر نہیں رہ سکو گے۔ وہ ضد کرے گی۔ تم اس سے ملنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔''

''ہاں۔ وہ مجھ سے ملنا چاہے گی لیکن میری بہتری کے لیے مان جائے گی۔ یہی چاہے گی کہ میں اس سے بھی چھپ کر رہوں۔''

اس نے فون نکال کر درگا کے نمبر پنچ کیے۔ اسے کان سے لگایا لیکن توقع کے مطابق رابطہ نہ ہو سکا۔ یہ معلوم ہوا کہ وہ نمبر استعمال میں نہیں ہے۔ یعنی درگا کا فون نمبر بدل چکا تھا۔

وہ فون کو جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں محتاط رہنا ہے۔ اگرچہ چمپت راؤ نے ہمیں نہیں پہچانا ہے لیکن ہو سکتا ہے کوئی دوسرا ہمیں پہچاننے کا دعویٰ کر رہا ہو اور چمپت راؤ یہاں اسی کا انتظار کر رہا ہو۔''

وہ دونوں اس گیٹ کی طرف دیکھنے لگے جہاں سے کراچی کی فلائٹ کے مسافر باہر آرہے تھے۔ ان میں بشریٰ اور بلا بھی تھے۔ ایک ٹرالی میں ان کا مختصر سا سامان تھا۔ بشریٰ اس ٹرالی کو دھکیلتی ہوئی آرہی تھی۔ بلا اس سے کچھ فاصلے پر فون کو کان سے لگائے چمپت راؤ سے کہہ رہا تھا۔ ''ہم گیٹ سے باہر آگئے ہیں۔ میں میرون کلر کی شرٹ اور بلیو جینز میں ہوں۔ میری وائف پنک کلر کے شلوار سوٹ میں ہے۔''

چمپت راؤ نے کہا۔ ''او کے، میں نے دیکھ لیا ہے۔''

ایسے ہی وقت مرینہ کے فون سے کالنگ ٹون ابھری۔ حویلی سے ایک عزیزہ نے کال کی تھی۔ اس سے پوچھ رہی تھی۔ ''چچا جان آگئے ہیں یا نہیں؟ کب تک انہیں لے کر آرہے ہیں؟''

مرینہ نے جواب دیا۔ ''جہاز دو گھنٹے لیٹ ہے۔ ہم دیر سے آئیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔''

وہ فون کو کان سے لگائے بولتی ہوئی ایک ذرا ادھر سے ادھر جارہی تھی۔ بشریٰ نے بھی سر گھما کر چند لمحوں کے لیے بلے کی طرف دیکھا۔ ایسے وقت اس کی ٹرالی نے مرینہ کو زور کا دھکا مارا۔ وہ چیخ مار کر لڑکھڑاتی ہوئی آگے جا کر اوندھے منہ گری۔ پھر اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ پلٹ کر غصے سے بولی۔ ''یو نان سینس۔ نظر نہیں آتا۔ اندھی ہو گئی ہے؟''

بشریٰ نے کہا۔ ''اندھی ہو گی تیری ماں، تیرا باپ... کمبخت فون پر اپنے یار سے باتیں کر رہی ہے۔ سامنے کا ہوش نہیں ہے کہ کسی سے ٹکرانے والی ہے۔''

مرینہ چوٹ کھا کر غصے میں بپھری ہوئی تھی۔ اس پر سے بشریٰ گالیاں دے رہی تھی۔ وہ غصے میں بھول گئی کہ مرینہ نہیں ہے۔ جان محمد کی سیدھی سادی سی بیوی عمارہ ہے۔ وہ اپنی جنگجو فطرت کے زیر اثر آکر یکبارگی مرینہ بن گئی۔ اس نے گھوم کر ایک کک ماری۔ بشریٰ بھی فارغ اوقات میں فائٹر بننے کی تربیت حاصل کرتی رہی تھی۔ اس نے اپنی مہارت دکھائی۔ چشم زدن میں بیٹھ کر اٹھی تو مرینہ کی لات اس پر سے گزر گئی۔ اس نے اچھل کر مرینہ کو فلائنگ کک ماری۔ اس نے بھی مہارت دکھائی۔ فضا میں قلابازی کھا کر دور ہو گئی۔

بشریٰ فلائنگ کک کے باعث نیچے آکر گرنے والی تھی۔ بلے نے فوراً ہی اسے تھام لیا۔ دونوں بازوؤں میں اسے جکڑ کر اس کے کان میں بولا۔ ''پاگل ہوئی ہے۔ کیا اپنی اصلیت ظاہر کرنا چاہتی ہے۔''

وہ اس کی گرفت میں تڑپتی ہوئی بولی۔ ''چھوڑ مجھے۔ میں اس حرام زادی کو نہیں چھوڑوں گی۔''

ٹلے نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''اب ایک لفظ بھی بولے گی تو منہ توڑ دوں گا۔''

ادھر مراد نے مرینہ کو بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ اسے سمجھا رہا تھا۔ ''جوش میں نہ آؤ۔ ہوش میں رہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیوں محتاط رہنا بھول گئی ہو؟''

وہ جھنجلا کر بولی۔ ''پتا نہیں، یہ کون حرام زادی ہے۔ مجھے گالیاں دے رہی ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔''

''تو پھر میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ جاؤ اپنی اصلیت ظاہر کرو۔''

وہ ٹھنڈی پڑ گئی۔ مراد سے لپٹ کر بولی۔ ''مراد! تم نے دیکھا ہے یہ کتنی فاسٹ فائٹر ہے۔ یہ کون ہو سکتی ہے؟''

مراد اس وقت ٹلے کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ ذہن میں یہ بات تھی کہ جس کی عورت ایسی فائٹر ہے، اس کا مرد کیسا زبردست ہوگا؟ لیکن یہ شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ بلا ہے کیونکہ وہ بشریٰ کو ایک عام سی عورت سمجھتا تھا۔ مرینہ کے مقابلے میں مہارت دکھانے والی عورت کو بشریٰ نہیں مان سکتا تھا۔

دوسری طرف بلاّ مراد کو دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ یہ قدوقامت میں مراد جیسا ہے اور جس فائٹر عورت کو بازوؤں میں لے کر تھپک رہا ہے۔ اس کی فائٹنگ مہارت کہہ رہی ہے کہ یہ مرینہ ہو سکتی ہے۔

چیپت راؤ ان کے درمیان آ گیا تھا۔ مراد سے کہہ رہا تھا۔ ''مسٹر! ایک تو تمہاری عورت فون پر بولتی ہوئی خود ہی ٹرالی سے ٹکرا گئی، اوپر سے میری مہمان خاتون پر پہلے حملہ کیا۔ اس بے چاری کو لڑنے پر مجبور کیا۔ کیا تم لوگوں کی شامت آئی ہے؟ کیا ہم بتائیں کہ کس طرح ہم تمہیں خاک میں ملا سکتے ہیں؟''

حویلی کے دوسرے رشتے دار بھی آ گئے تھے۔ مراد نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''ہمیں معاف کر دیں۔ میری وائف سے غلطی ہو گئی ہے۔ ہم لڑنے جھگڑنے والے لوگ نہیں ہیں۔''

''ارے واہ! لڑنے جھگڑنے والے نہیں ہو اور تمہاری عورت کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ بہت سیکھی سکھائی فائٹر ہے۔''

مراد مرینہ کو وہاں سے کھینچ کر لے جاتے ہوئے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''ہزار بار سمجھایا ہے کہ لڑنے جھگڑنے سے باز آ جا۔ لیکن تو میری بے عزتی کراتی رہتی ہے۔ چل یہاں سے...''

وہ مراد علی منگی جو کسی سے زیر نہیں ہوتا تھا، اس وقت مصلحتاً اپنی بے بسی ظاہر کرتے ہوئے' مرینہ کو دو چار ہاتھ مارتے ہوئے چیپت راؤ کی نظروں سے دور آ گیا۔ وہ دونوں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر عمارت کے باہر چلے گئے تھے۔

ٹلے کو وہاں چیپت راؤ کے ساتھ رہنا تھا کیونکہ اگلی فلائٹ سے ماسٹر آ رہا تھا۔ بشریٰ اپنا بیگ اٹھا کر ٹوائلٹ میں چلی گئی۔ جلد ہی وہاں سے نکلی تو عبا اور نقاب میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی عمارت سے باہر آئی اور دور تک نظریں دوڑانے لگی۔

اس کو اور بلا کو یقین کی حد تک شبہ تھا کہ وہ دونوں مرینہ اور مراد ہیں۔ انہیں کسی طرح خطرے سے آگاہ کرنا تھا۔ پھر اس کے اندر عورتوں والی انتقامی ضد تھی کہ وہ کمینی مرینہ ہے۔ اگر سچ وہی ہوگی تو مراد بھائی کو خطرے سے آگاہ کرنے کے بعد بھابی کی دشمن کے پیچھے پڑ جائے گی۔

وہ ٹہلنے کے انداز میں ادھر سے ادھر جا رہی تھی اور دور تک نظریں دوڑا رہی تھی۔ وہ دونوں نظر نہیں آ رہے تھے۔ پھر وہ پارکنگ ایریا کی طرف آ کر ایک جگہ رک گئی۔ اسے ایک کار میں وہی عورت دکھائی دی جس سے ابھی فائٹ ہو چکی تھی۔

مرینہ کار کی کھڑکی کے باہر عمارت کے اس حصے کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں چیپت راؤ تھا اور جہاں سن سٹی کی فلائٹ سے مسافر آنے والے تھے۔ اگرچہ اتنی دور سے عمارت کے اندر چیپت راؤ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ ادھر دیکھتے ہوئے کچھ بول رہی تھی۔

اس کے پاس بیٹھا ہوا مراد عارضی میک اپ کے ذریعے خود کو تبدیل کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ڈاڑھی مونچھوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ بھویں گھنی ہو گئی تھیں۔ سر پر لانبے بالوں کی وگ آ گئی تھی اور وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا شرٹ بدل رہا تھا۔

اس بات سے بے خبر تھا کہ ہزار تبدیلیوں کے باوجود ایک کتا اسے پہچان لے گا۔ مرینہ نے عبا پہن لی تھی۔ پھر چہرے کو نقاب میں چھپاتے ہوئے بولی۔ ''وہ ذلیل عورت مجھے پہچان نہیں سکے گی۔ کہیں تنہائی میں مل جائے تو اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کے رکھ دوں گی۔''

مراد نے سخت لہجے میں کہا۔ ''کیوں خوامخواہ اسے اہمیت دے رہی ہو؟''

''کیا تم بہرے ہو گئے تھے؟ کیا تم نے سنا نہیں تھا؟ اس نے مجھے حرام زادی کہا تھا۔''

''تم نے بھی جواباً یہی کہا تھا۔ اپنے معاملات پر توجہ

دو۔ کیا تمہاری سمجھ میں آرہا ہے کہ یہ لوگ مجھے تلاش کرنے یہاں کیوں آئے ہیں؟ وہ کیسے جانتے ہیں کہ میں یہاں موجود ہوں؟ اور اگر جانتے ہیں تو چیپت راؤ نے مجھے کیوں نہیں پہچانا؟''

''وہ تمہیں پہچاننے کے لیے یہاں کسی کا انتظار کررہا ہے۔''

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے بولا۔ ''اناؤنسمنٹ ہورہی ہے۔ سن سٹی سے آنے والا جہاز لینڈ ہوچکا ہے۔''

وہ دونوں کار سے نکل کر عمارت کی طرف جانے لگے۔ بشریٰ ان کی کار کے قریب آتے ہوئے انہیں دیکھ رہی تھی۔ جب وہ عمارت کے اندر جاکر نظروں سے اوجھل ہوگئے تو وہ فوراً ہی کار کا دروازہ کھول کر اندر آگئی۔

سامنے ہی سیٹ پر ایک موبائل فون پڑا ہوا تھا۔ مراد اسے بھول کر چلا گیا تھا۔ بشریٰ نے پہلے ڈیش بورڈ کا خانہ کھول کر تلاشی لی۔ وہاں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جن سے ان دونوں کی اصلیت اسے معلوم ہوتی۔

اس نے مراد کے فون سے اپنے نمبر پر کال کی پھر لائن کاٹ کر مراد کے فون سے اپنے فون کے نمبروں کو مٹا دیا۔ اسے وہیں سیٹ پر چھوڑ کر کار سے نکل کر دور جانے لگی۔ اس نے بڑی پھرتی سے یہ کام کیا تھا۔ دیر کرتی تو پکڑی جاتی کیونکہ مراد اپنا فون لینے کے لیے واپس آرہا تھا۔

بشریٰ عمارت کی طرف واپس آکر ایک جگہ رک کر بلے کو کال کررہی تھی۔ وہ چیپت راؤ کے ساتھ ایگزٹ گیٹ کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ وہاں سے مسافر باہر آرہے تھے۔ فون کی رنگ ٹون نے اسے مخاطب کیا۔ وہ چیپت راؤ سے ذرا دور ہوکر فون کو کان سے لگا کر بولا۔ ''کہاں ہے تو؟''

''یہیں تیرے قریب ہوں۔ ابھی عبا اور نقاب اتار کر آجاؤں گی۔ وہ جو مراد بھائی جیسا نظر آتا ہے، میں نے اس کا فون نمبر حاصل کرلیا ہے۔''

وہ بتانے لگی کہ کس طرح حاصل کیا ہے۔ پھر یہ بھی بتایا کہ اب وہ شخص ڈاڑھی مونچھوں کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ سر پر بڑے بالوں کی وگ ہے اور اس نے بلیو کلر کی شرٹ پہنی ہے۔ اس کے ساتھ جو کمینی ہے، وہ عبا اور نقاب میں چھپی ہوئی ہے۔

اس نے سمجھایا۔ ''بشریٰ! اس عورت کو اہمیت نہ دے۔ اسے بھول جا اور وہ فون نمبر مجھے SEND کردے۔''

پھر وہ گیٹ کی طرف دیکھ کر چونک گیا۔ حیرانی سے بولا۔ ''اوگاڈ! ماسٹر آگیا ہے۔''

ماسٹر سامان کی ٹرالی کے ساتھ گیٹ سے باہر آرہا تھا۔ چیپت راؤ اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ بلا فون بند کرکے ادھر جانے لگا۔ بشریٰ تیزی سے چلتی ہوئی ٹوائلٹ میں چلی گئی۔ وہاں سب ہی بڑی تیزی سے متحرک ہوگئے تھے۔ مرینہ اور مراد نے حیرانی سے ماسٹر کو دیکھا پھر کہا۔ ''میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ سن سٹی سے ماسٹر ہی آئے گا۔''

مرینہ نے کہا۔ ''وہ تمہاری کسی حرکت سے یا کسی عادت سے تمہیں پہچان سکتا ہے۔ ہمیں یہاں سے جانا چاہیے۔''

''میں یہی دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ مجھے کس طرح پہچاننے آیا ہے۔ ہمیں دور ہی دور سے ماسٹر اور چیپت راؤ پر نظر رکھنی ہوگی۔''

بشریٰ ٹوائلٹ سے باہر آکر بلے اور ماسٹر کی طرف جارہی تھی۔ اب وہ عبا اور نقاب میں نہیں تھی۔ مرینہ نے مراد کا بازو تھام کر کہا۔ ''مراد! یہ کتیا کراچی سے اپنے مرد کے ساتھ آئی ہے۔ اب یقین کرلینا چاہیے کہ بلا یہاں بشریٰ کے ساتھ ماسٹر سے ملنے آیا ہے۔''

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا۔ ''بے شک یہ بشریٰ اور بلا ہیں۔''

''اور تم نے کہا تھا کہ یہ ماروی کو جی جان سے چاہتی ہے اور اس کی خاطر مجھ سے عداوت رکھتی ہے۔ دیکھ لو اس نے یہاں آتے ہی عداوت دکھائی ہے۔''

''فضول باتیں نہ کرو۔ اتفاقاً ایسا ہوا ہے۔ یہ نہیں جانتی ہے کہ تم مرینہ ہو۔ پلیز، ماسٹر کی طرف دھیان دو۔''

ماسٹر چیپت راؤ سے کہہ رہا تھا۔ ''میں ابھی کسی ہوٹل میں نہیں جاؤں گا۔ پہلے مراد کے پاس جانا ہے۔ کیا کتے کو یہاں لائے ہو؟''

وہ بولا۔ ''یہاں لانا مناسب نہ تھا۔ کتا اور اس کا ٹرینر ریس کورس کے میدان میں ہیں۔ آئیں ادھر چلیں۔''

وہ سب پارکنگ ایریا کی طرف جانے لگے۔ چیپت راؤ فون پر ڈائس ٹرینر سے بول رہا تھا۔ مرینہ اور مراد تیزی سے چلتے ہوئے اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ ان کی نظریں ماسٹر پر بشریٰ اور بلے پر تھیں۔

ماسٹر ان کے ساتھ ایک بلیک مرسیڈیز میں بیٹھ گیا تھا۔ چیپت راؤ دوسرے ماتحتوں کے ساتھ ایک ویگن کار میں جارہا تھا۔ مرینہ ان سے فاصلہ رکھ کر اپنی کار ڈرائیو کرنے لگی۔

بلا پریشان تھا۔ وہ کسی طرح مراد کو خطرے سے

آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ جان کا خطرہ نہیں تھا لیکن ماسٹر اسے پھر سے جرائم کی دنیا میں لاکر اپنی سرپرستی میں رکھنا چاہتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اسے اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتا تھا۔

بشریٰ نے مراد کا فون نمبر حاصل کرلیا تھا جبکہ پوری طرح یقین نہیں تھا کہ وہ مراد ہے۔ پھر بھی بلا اس سے رابطہ کرکے تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ اگر فون پر رابطہ ہوجاتا تو شاید وہ مراد کو پہچان لیتا لیکن ماسٹر کی موجودگی میں مجبور ہوگیا تھا۔ اسے کال نہیں کرسکتا تھا۔

وہ تمام گاڑیاں تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھیں۔ ریس کورس کا میدان ابھی دور تھا۔ منزل تک پہنچنے سے پہلے بھی نیند آجاتی ہے۔ کبھی موت آجاتی ہے اور موت کا سامان ہورہا تھا۔

یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ ماسٹر کوبوبو جیسا خطرناک اور ناقابلِ شکست مجرم اور سنڈیکیٹ دی ماسٹرز کا سربراہ اور مراد علی منگی کا سرپرست اپنے ہیڈکوارٹر سے باہر آئے اور دشمنوں کو خبر نہ ہو۔

اس روز دہلی شہر سارے جہاں کے مجرموں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ ریڈ الرٹ کا سربراہ میکی براؤن اور اس کی تمام اتحادی تنظیموں کے سربراہ اپنے ماہر شوٹرز کے ساتھ وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ ان سب نے پلاننگ کی تھی کہ ماسٹرن سٹی سے باہر آئے گا تو اس پر قاتلانہ حملے نہیں کیے جائیں گے، وہ انتظار کریں گے۔ یہ دیکھیں گے کہ وہ روپوش ہوجانے والے مراد سے دہلی میں کہاں ملاقات کرنے والا ہے۔

پہلے ماسٹر اور مراد کو اچھی طرح دیکھ لیا جائے گا۔ یقین کرلیا جائے گا کہ وہ دونوں بہروپیے نہیں ہیں۔ جب تصدیق ہوجائے گی، تب انہیں بڑے ہی منظم طریقے سے گھیر کر موت کے گھاٹ اتارا جائے گا۔

ان تمام دشمنوں کے صرف تین جاسوس موٹر سائیکلوں پر ماسٹر کا تعاقب کررہے تھے اور فون کے ذریعے اپنے سربراہوں کو ایک ایک پل کی رپورٹ دے رہے تھے۔ انہیں یہ معلوم ہورہا تھا کہ کراچی کی فلائٹ سے آنے والے میاں بیوی نے چمپت راؤ سے ملاقات کی ہے اور وہ دونوں اب ماسٹر کے ساتھ بلیک مرسڈیز میں جارہے ہیں۔ یوں کسی حد تک یقین ہورہا تھا کہ کراچی سے آنے والے ہی مرینہ اور مراد ہیں۔

میکی براؤن نے فون پر اپنے ایک جاسوس سے کہا۔ ''مغالطہ ہوسکتا ہے۔ انہیں گولی مارنے کے بعد معلوم ہوگا کہ اصلی ابھی زندہ ہیں۔ اس بار کسی شک وشبے کی گنجائش نہ رکھو۔ پہلے پوری طرح یقین کرو۔ جب تک یقین نہ ہو، تب تک ماسٹر اور ان دو پاکستانی میاں بیوی کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دو۔''

وہ گاڑیاں ایسی سڑکوں پر دوڑ رہی تھیں، جہاں زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ پھر بھی اتنی گاڑیاں آ اور جارہی تھیں کہ تعاقب کرنے والی گاڑیوں پر شبہ نہیں ہورہا تھا۔

ان دشمنوں میں درگا کا سابقہ شوہر جے بھاسکر بھی تھا۔ وہ ممبئی انڈر ورلڈ کا ایک بدنام سربراہ تھا۔ اس کی پوری جوانی اس انتظار میں گزر گئی کہ وہ بھی ایک بیٹے کا باپ بنے گا۔ اس نے بڑھاپے میں درگا سے شادی کی تو ایک بیٹا پیدا ہوا۔ درگا اس سے رشتہ توڑ کر اپنے ننھے بیٹے کو لے کر فرار ہوگئی تھی اور اب چمپت راؤ کی بیوی بن گئی تھی۔

وہ اپنے بیٹے کو حاصل کرنے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ میکی براؤن نے بھاسکر کو بتایا تھا کہ چمپت راؤ ماسٹر کا دستِ راست ہے۔ تم اسے ٹریپ کرو گے تو بیٹا تمہیں مل جائے گا۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ یوں بھاسکر بھی اپنے دو زبردست شوٹرز کے ساتھ ماسٹر کے تعاقب میں تھا ماسٹر کا وہ قافلہ ریس کورس گراؤنڈ میں پہنچ گیا تھا۔ اس روز گھڑ دوڑ کے مقابلے نہیں ہورہے تھے۔ وہاں تقریباً ویرانی سی تھی۔ چمپت راؤ کے دو ماتحت پارکنگ ایریا میں ایک کتے اور اس کے ٹرینر کے ساتھ ایک کھلی جیپ میں موجود تھے۔

مرینہ نے ان سے بہت دور گاڑی روک دی۔ مراد ونڈ اسکرین کے پار توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ ماسٹر، بشریٰ اور بلا بلیک مرسڈیز سے باہر آگئے تھے۔ ماسٹر اپنے بیگ میں سے ایک چھوٹا سا شاپر نکال کر چمپت راؤ کے ساتھ اس کتے کی طرف جارہا تھا۔

ایسے وقت بلے نے اس سے دور ہوکر فوراً ہی فون نکال کر بشریٰ کے SEND کیے ہوئے نمبروں کو پنچ کیا۔ پھر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جارہی تھی۔

مراد نے چونک کر اپنے فون کو دیکھا۔ اسکرین پر انجانے نمبر تھے۔ وہ ابھی اس تجسس میں تھا کہ ماسٹر ایک شاپر لے کر کتے کے پاس کیوں جارہا ہے؟

وہ ابھی کسی دوسری طرف توجہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے چیخنے والے فون کا گلا گھونٹ دیا۔ اس وقت حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ ماسٹر چھوٹے سے شاپر سے ایک اترن نکال کر اسے بھی کتے کے قریب لارہا تھا کبھی ذرا دور کررہا تھا۔

مراد کا فون پھر چیخنے لگا۔ مرینہ نے اس کے ہاتھ سے

فون لے کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو، کون ہو تم؟''
بجے نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا تم کون ہو؟ اگر مرینہ ہو تو مراد سے کہو خطرہ ہے۔ ابھی ایک کتا اس کی بو سونگھتا ہوا آنے والا ہے۔ وہ ماسٹر سے چھپا نہیں رہے گا۔''
یہ ایسی اطلاع تھی کہ مرینہ لرز گئی۔ اس نے حیرت سے چیخ کر کہا۔ ''او، گاڈ! یہ کتا مراد پر لپکنے والا ہے؟''
اس نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر فون کو مراد کی گود میں پھینکا پھر کار اسٹارٹ کرتے ہوئے اسے مین روڈ کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ ''مراد! وہ کتا تمہارے پیچھے آنے والا ہے۔ ماسٹر اسے تمہاری اترن سونگھا رہا ہے۔''
مرینہ اس وقت نقاب میں نہیں تھی اور بشریٰ اس وقت بجے کے قریب کھڑی ہوئی دعائیں مانگ رہی تھی کہ مراد فون اٹینڈ کر لے۔ ایسے وقت مرینہ اس کے قریب سے ڈرائیو کرتی ہوئی گزری۔ بجے نے بشریٰ سے کہا۔ ''تھینکس گاڈ، اس نے مرینہ کی بات سنی ہے۔ انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کتا...''
بشریٰ نے بات کاٹ کر کہا۔ ''میں نے اس لڑنے والی کتیا کو دیکھا ہے۔ وہ دیکھو۔ وہ کار ڈرائیو کرتی جا رہی ہے۔ میں نے اسی کار سے مراد کا فون نمبر حاصل کیا تھا۔''
وہ انگلی اٹھا کر کار کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ بجے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''ماسٹر کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ ادھر اشارہ نہ کر۔ انہیں جانے دے۔ یہ کافی ہے کہ ہم مرینہ اور مراد کو نئے بہروپ میں پہچان گئے ہیں۔''
اسی وقت کتا بھونکنے لگا۔ بشریٰ اور بجے نے پریشان ہو کر دیکھا۔ کتا اسی سمت منہ اٹھائے بھونک رہا تھا جدھر ابھی مرینہ کار ڈرائیو کرتی ہوئی گئی تھی۔
وہ بھونکنے والا کھلی جیپ میں تھا۔ اس کی زنجیر ٹریزر کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ اچھل اچھل کر جیپ سے باہر جانا چاہتا تھا۔ ٹریزر اسے روک رہا تھا پھر جیپ اسٹارٹ ہو کر اس کے بھونکنے کی سمت جانے لگی۔
ماسٹر اور چیپت راؤ کی گاڑیاں بھی جیپ کے پیچھے ہو گئیں۔ بشریٰ اور بلا ماسٹر کے ساتھ کار میں تھے۔ وہ پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ بہت دور مراد کی گاڑی جا رہی تھی۔ ابھی ماسٹر وغیرہ اس گاڑی پر شبہ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ آگے پیچھے اور کئی گاڑیاں دوڑتی جا رہی تھیں۔
میکی براؤن کو اور دوسرے دشمنوں کو فون سے اطلاع مل رہی تھی کہ ماسٹر ایک کتے کے ذریعے کسی کی تلاش میں جا رہا ہے۔ اب یہی سمجھ میں آ رہا تھا کہ کراچی سے آنے

والے وہ میاں بیوی مرینہ اور مراد نہیں ہیں۔ مراد تک پہنچنے کے لیے اس کتے کو استعمال کیا جارہا ہے۔

جے جے بھاسکر اپنے شوٹروں کے ساتھ ایک گاڑی میں تھا اور اس جیپ کے کبھی آگے کبھی پیچھے ہورہا تھا۔ اسے مراد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ چپت راؤ کو ٹریپ کر کے درگا تک پہنچ کر اپنے بیٹے کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔

آخر اس بھاگ دوڑ کا کچھ تو نتیجہ نکلنے والا تھا۔ مراد نے سوچا تھا کتے سے بہت دور نکل کر کسی دکان سے پرفیوم خرید کر اپنے اوپر اسپرے کرے گا تو اس کے بدن کی قدرتی مہک عارضی طور پر خوشبو میں گم ہوجائے گی۔ پھر کتا اس کی سمت کو نہیں پاسکے گا۔

لیکن جو سوچو، وہ نہیں ہوتا۔ کچھ اور ہوجاتا ہے۔ وہ بھاگ کر زیادہ دور نہ جاسکا۔ آگے چوراہے پر سرخ سگنل تھا۔ کئی گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔ مرینہ نے فوراً ہی راستہ بدل کر جانا چاہا تو دوسری طرف ایک بڑا سا ٹرک رکا ہوا تھا۔ وہ رکنے پر مجبور ہوگئی۔

اب مراد کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا کہ وہ کار سے نکل کر دوڑ لگائے اور دشمن کتے سے دور ہوتا جائے۔ اس نے فوراً ہی کار سے نکل کر ایک سمت دوڑ لگائی۔

اب بھی اس کے اور کتے کے درمیان کئی گاڑیاں تھیں۔ ماسٹر نے کسی کو آگے کسی کار سے نکل کر بھاگتے نہیں دیکھا۔

ٹرینر نے چیخ کر کہا۔ ”یہ کتا دوسری طرف بھونک رہا ہے۔ اسے جیپ سے اتار کر دیکھنا ہوگا کہ یہ کدھر جانا چاہتا ہے۔“

پھر وہ زنجیر کو مضبوطی سے تھام کر کتے کے ساتھ جیپ سے اتر گیا۔ وہ بھونکتا ہوا ٹرینر کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا دوسرے راستے پر دوڑنے لگا۔

اب مراد کے لیے یہ ناممکن ہوگیا تھا کہ وہ آگے کہیں جاکر کسی دکان میں رکتا اور اپنے لیے پرفیوم خریدتا۔ اتنا وقت نہیں مل سکتا تھا۔ اتنی دیر میں کتا اس پر لپکنے آجاتا۔

ایسے ہی وقت بڑے بڑے سورما بھی ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ وہ دوڑتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ کیا ہار مان جاؤں؟ ماسٹر کے آگے ہتھیار ڈال دوں؟

وہ اس لیے بھی مجبور ہوگیا تھا کہ جرائم سے توبہ کرنے کے بعد اپنے پاس ایک ننھا سا پستول بھی نہیں رکھتا تھا۔ اس وقت اسلحہ ہوتا تو وہ کتے کو دور ہی سے گولی ماردیتا۔

ایسا سوچتے ہی اچانک زوردار آواز کے ساتھ ایک گولی چلی۔ کتا دوڑتے دوڑتے یک بارگی اچھل کر زمین پر گرا پھر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہوگیا۔ جو سوچا بھی نہیں تھا، وہ ہوگیا۔

مراد نے فوراً ہی رک کر دیکھا۔ وہ فٹ پاتھ پر تھا اور قریب ہی ایک کار کے کھلے ہوئے دروازے پر درگا دکھائی دی۔ اسی نے گولی چلائی تھی، چیخ کر کہہ رہی تھی۔ ”بھائی! جلدی آؤ...“

یہ کہتے ہی اس نے ایک سمت فائرنگ کی۔ ادھر سے بھاسکر کے شوٹروں نے گولیاں چلائی تھیں اور وہ اپنی گاڑی کو دوسری طرف موڑ رہے تھے۔ درگا کی گن سے نکلی ہوئی گولی نے اس گاڑی کے پہیے کو بیکار کردیا۔ مراد جھکتا ہوا، دوڑتا ہوا کار کے اندر آگیا۔ درگا نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کی۔ پھر اسے تیزی سے آگے بڑھاتے ہوئے مراد کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بھائی! آپ میرے مراد بھائی ہیں نا؟“

”ہاں میری بہنا! میں مراد علی منگی ہوں۔ تم نے نہ پہچانتے ہوئے بھی مجھے دشمنوں سے کیا سوچ کر بچایا ہے؟“

”میں اس طرح پہچان گئی کہ وہ کتا صرف آپ پر جھپٹنے والا تھا۔ چپت راؤ نے بتایا تھا کہ تمہاری ایک اترن ماسٹر کے پاس ہے۔ وہ اس کے ذریعے تمہیں ڈھونڈ نکالے گا۔“

ایک شاٹ گن درگا کی گود میں رکھی ہوئی تھی۔ مراد نے اسے اٹھالیا۔ جیسے صدیوں سے کھوئی ہوئی طاقت واپس مل گئی تھی۔

وہ عقب نما آئینے میں دیکھ کر بولا۔ ”پیچھے جو گاڑی آرہی ہے، اسے ایک شخص ڈرائیو کررہا ہے۔ اس کے ساتھ ایک گن مین بیٹھا ہے۔“

درگا نے کہا۔ ”وہ بھاسکر ہے۔ اسے ڈاج دے کر یہاں سے نکلنا ہے۔“

مراد کار کی کھڑکی سے آدھا باہر نکل گیا۔ پیچھے بھاسکر اپنی گاڑی ڈرائیو کررہا تھا۔ کئی گاڑیوں کے درمیان سے نکلتا ہوا قریب آرہا تھا۔ اس کا گن مین بھی اپنی گن کے ساتھ کھڑکی سے آدھا باہر نکلا ہوا تھا۔ گاڑیوں کے ہجوم میں تیز رفتاری کے باعث وہ ایک دوسرے کے نشانے پر نہیں آرہے تھے۔ بیچ میں کچھ گاڑیاں آتی تھیں پھر دوسری سمت نکل جاتی تھیں۔ باقی دشمن بہت پیچھے رہ کر بھٹک گئے تھے۔

درگا نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے فون کو آپریٹ کیا۔ پھر چپت راؤ سے رابطہ ہوتے ہی بولی۔ ”میں بول رہی ہوں۔“

اس نے چیخ کر پوچھا۔ ”کہاں ہو تم؟ واپس

آجاؤ۔ تمہارے دل کی مراد پوری ہوگئی ہے۔ تمہارے بھائی کے سر سے خطرہ ٹل گیا ہے۔ اس کتے کو کسی نے گولی ماردی ہے۔''

وہ بڑے فخر سے بولی۔ ''میں نے ماری ہے۔''

''کیا......؟'' وہ حیرت سے چیخ پڑا۔

وہ بولی۔ ''تم ماسٹر کی نمک حلالی کرو۔ میں اپنے بھائی کی محبتوں کو'جاں نثاری کو اور احسانات کو کبھی نہیں بھولوں گی۔''

''مائی گاڈ! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ ماسٹر کے درجنوں شوٹرز ابھی ایک گاڑی کو گھیرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ یہ تمہاری گاڑی ہوگی۔ تم پکڑی جاؤ گی اور ماری جاؤ گی۔ میں کیا کروں؟''

''تم کچھ نہ کرو۔''

اس نے کن انکھیوں سے مراد کو دیکھا۔ وہ گن سمیت کھڑکی سے آدھا باہر تھا۔ وہ بولی۔ ''میرے ساتھ یم دوت (ملک الموت) ہے۔ بھائی نے پھر سے گن پکڑلی ہے۔ اب جسے مرنا ہو'وہ آئے۔''

اسی لمحے میں مراد نے تڑاتڑ کئی گولیاں چلائیں۔ گاڑی کے شیشے توڑتی ہوئی گولیوں نے بھاسکر کو یکلخت زندگی سے توڑ دیا۔ مردے کے ہاتھ سے اسٹیئرنگ نکلا تو گاڑی ڈگمگاتی ہوئی دوسری گاڑیوں سے ٹکراتی ہوئی' فٹ پاتھ پر چڑھ کر اچھلی۔ پھر ایک طرف الٹ کر قلابازیاں کھاتی ہوئی سروس روڈ پر چلی گئی۔

وہ گن مین گاڑی سے باہر نہ نکل سکا۔ بھاسکر کے ساتھ وہ گاڑی اس کے لیے بھی جنازہ بن گئی۔ اس شاہراہ پر تمام گاڑیاں تتر بتر ہورہی تھیں۔ درگا بڑی مہارت سے اپنی کار کو آگے نکال رہی تھی۔ مراد نے کہا۔ ''آگے راستہ رکے گا۔ ہم سگنل پر مجبور ہوجائیں گے۔ یہاں سے نکلو۔''

وہ درگا کی چادر کو کھینچ کر اس میں شاٹ گن کو چھپاتے ہوئے بولا۔ ''روکو گاڑی...... میرے ساتھ آؤ۔''

وہ کار کو روکتے ہی باہر نکل کر مراد کے ساتھ دوڑتی ہوئی جانے لگی۔ اس نے فون بند کردیا تھا لیکن چمپت راؤ ابھی تک اسے کان سے لگائے ہوئے دم بخود سا تھا۔ اس نے فون کے ذریعے جو فائرنگ کی اور گاڑیوں کے ٹکرانے کی آوازیں سنی تھیں، اس سے یقین ہوگیا تھا کہ مراد توبہ توڑ کر موت کا فرشتہ بن گیا ہے اور درگا اپنے بھائی کے پاس پہنچی ہوئی ہے۔

ماسٹر'بلا'بشریٰ اور چمپت راؤ اس مردہ کتے کے پاس پہنچے تو دیر ہوچکی تھی۔ درگا اور مراد وہاں سے جاچکے تھے۔ انہیں کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ زمین پر پڑے ہوئے ٹریز نے دور انگلی اٹھا کر کہا تھا۔ ''وہ گولی چلانے والے ادھر سفید ٹویوٹا میں جارہے ہیں۔''

پھر ان سب نے اس ٹویوٹا کے پیچھے دوڑ لگائی تھی۔ مرینہ بھی مراد کی خاطر اسی طرف جارہی تھی۔ آگے اس سفید ٹویوٹا تک پہنچنا محال تھا۔ آگے پیچھے' دائیں بائیں جانے والی بے شمار گاڑیاں رکاوٹیں بن رہی تھیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہی اسی شاہراہ پر مراد نے گولیاں چلائی تھیں۔ بھاسکر کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ وہاں گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرارہی تھیں۔ اچھی خاصی بھگدڑ نے تمام راستے بند کردیے تھے۔ ایسے میں ماسٹر اور چمپت راؤ کی گاڑیاں بھی رک گئی تھیں۔ وہ سب باہر نکل کر ٹویوٹا کی طرف دوڑ رہے تھے۔

وہاں پہنچ کر انہوں نے دیکھا۔ ٹویوٹا خالی تھی۔ پنچھی اڑ گئے تھے۔ چمپت راؤ کی نظر ایک موبائل فون پر گئی۔ وہ فون سیٹ کے نیچے پڑا تھا۔ اس نے اسے اٹھالیا۔ وہ سب ہی مراد کو گھیرنے کی فکر میں تھے لیکن بشریٰ' مرینہ کی فکر میں تھی۔ وہ اس گاڑی کو بھی آگے کبھی پیچھے دیکھتی آرہی تھی جس میں مرینہ تھی۔ اب مرینہ بھی اپنی کار سے نکل کر فٹ پاتھ پر آگئی تھی اور دور تک نظریں دوڑاتی ہوئی اندازہ کررہی تھی کہ مراد کدھر گیا ہوگا؟

اتنی دیر میں پولیس فورس آگئی تھی۔ مسلح سپاہی دور تک پھیل رہے تھے۔ گولیاں چلانے والوں کو تلاش کررہے تھے۔ جن پر شبہ ہورہا تھا ان کی تلاشی لے رہے تھے۔ وہاں کے اور میکی براؤن کے درجنوں شوٹرز موجود تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ مراد کو دیکھ سکیں گے اور اسے گولیوں سے چھلنی کرسکیں گے۔ لیکن حالات اچانک ہی بدل گئے تھے۔ پولیس والے اس علاقے کو گھیر کر ہتھیار والوں کو گرفتار کررہے تھے۔ جو لائسنس یافتہ شہری تھے انہیں عارضی طور پر روک رہے تھے۔ جو مراد کے خلاف ہتھیار لے کر آئے تھے، وہ درجنوں ہتھیار یوں پھینک کر نہیں جاسکتے تھے اور نہتے ہو کر مراد کے مقابلے میں کمزور نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اس لیے پولیس والوں سے ان کی ٹھن گئی تھی۔

یوں صورتِ حال اور بگڑ گئی۔ اپنے ہتھیار نہ پھینکنے والے شوٹرز ان سپاہیوں سے کترانے لگے، ان پر گولیاں چلانے لگے۔ یہ ایسی سچویشن تھی کہ دکانیں بند ہونے لگیں۔ لوگ بھاگتے ہوئے گلی کوچوں میں جاکر چھپنے لگے۔ مرینہ

نے سوچا مراد بھی کسی گلی کو بچے میں گیا ہوگا۔ وہ دوڑتی ہوئی ایک سمت جانے لگی۔ بشریٰ اس گلی کے موڑ پر تھی۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق اس کی ٹانگ پر اپنی ٹانگ ماری۔ مرینہ اچھل کر اوندھے منہ گری۔ اس کے کانوں میں آواز سنائی دی۔ ''منحوس کی بچی! تو میری بھابی کا سہاگ اجاڑے گی...؟''

وہ فوراً ہی اچھل کر کھڑی ہوئی۔ اس نے پلٹ کر بشریٰ کو دیکھا۔ پھر حقارت سے کہا۔ ''حرام زادی! تو میرے ہاتھوں مرنے کے لیے آئی ہے۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی بشریٰ نے اس پر حملہ کیا۔ مرینہ فضا میں قلابازی کھاتی ہوئی اس کے سر پر سے گزرتی ہوئی پیچھے زمین پر آئی پھر بڑی پھرتی سے ایک کک ماری۔ بشریٰ لات کھا کر پیچھے گئی۔ اس کی ناک سے لہو کی پتلی سی دھار نکل آئی۔

وہ آگے پیچھے یوں ڈگمگانے لگی جیسے سر چکرا رہا ہو۔ مرینہ دھوکا کھا گئی۔ حملہ کرنے قریب آئی تو بشریٰ اس سے لپٹ گئی۔ اسے رگیدتی ہوئی پیچھے ایک دیوار کے کونے سے اسے ٹکرا دیا۔ اس دیوار کی کئی اینٹیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ مرینہ کی پشت اور کمر پر ایسی چوٹیں آئیں کہ ہڈیاں چٹخ گئیں۔ اس کے حلق سے کراہیں نکلیں۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

وہ جوابی حملہ کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ بشریٰ نے اسے دوسری بار اپنی طرف کھینچ کر پھر اسی دیوار سے ٹکرا دیا۔ وہ دوسرا حملہ ناقابلِ برداشت تھا۔ مرینہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر گر پڑی۔

وہ ناقابلِ شکست فائٹر تھی۔ بشریٰ جیسی نوآموز فائٹر سے مات نہیں کھا سکتی تھی لیکن اسے نوآموز اور طفلِ مکتب سمجھ کر دھوکا کھا گئی تھی۔ اس کے شکنجے میں آکر دیوار سے ٹکرا کر نیم مردہ سی ہو گئی تھی۔ وہ دو چار گولیاں کھا کر بھی گرنے والی عورت نہیں تھی۔ لیکن کیا کرتی؟ انسان کی آدھی سے زیادہ قوت اس کی کمر میں ہوتی ہے۔ وہ کمر کے بل پر ہی کھڑا ہوتا اور اٹھتا بیٹھتا ہے۔ اور اس کی کمر کی ہڈی چٹخ گئی تھی۔ اب کھڑے رہنا تو دور کی بات ہے، وہ زمین سے اٹھ کر بیٹھنے کے بھی قابل نہیں رہی تھی۔ بشریٰ نے اس کے منہ پر ایک ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ''سالی کتیا! تجھے ڈورے ڈالنے کے لیے میری بھابی کا مرد ہی ملا تھا۔ کسی اور کے پاس نہیں جا سکتی تھی۔''

وہ کچھ بول نہیں سکتی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ تکلیف کی شدت سے بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ منہ پر ٹھوکر پڑی تو یکلخت اس کا دماغ تاریکی میں ڈوب گیا۔

بشریٰ کی سمجھ میں آیا کہ وہ مر گئی ہے۔ وہ جھک کر اس کی نبض ٹٹولنا چاہتی تھی۔ اسی وقت کہیں قریب سے فائرنگ ہوئی۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ مرینہ کو چھوڑ کر وہاں سے بھاگتی ہوئی دوسری گلی میں چلی گئی۔

وہاں بھی رکنا مناسب نہیں تھا۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ وہ واپس شاہراہ کی طرف آئی۔ وہاں ماسٹر بلا اور چپت راؤ اپنی گاڑیوں کے پاس تھے۔ سپاہی گاڑیوں کے لیے راستہ بنا رہے تھے۔ دائیں بائیں مڑی ہوئی گاڑیاں سیدھی ہو رہی تھیں۔

بتے نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ ''تو کہاں چلی گئی تھی؟''

وہ بولی۔ ''مجھے ایک شخص بالکل مراد بھائی جیسا لگ رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے گئی تھی لیکن وہ چھلاوا تھا۔ آگے جا کر کہیں گم ہو گیا۔ میں یقین سے کہتی ہوں، وہ مراد بھائی تھے۔''

ماسٹر نے مایوس ہو کر کہا۔ ''میری پلاننگ ناکام ہو گئی ہے۔ وہ ہوشیار ہو گیا ہے۔ آئندہ بو سونگھنے والے کتوں سے بچنے کی تدبیر کرتا رہے گا۔''

وہ اپنی ران پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''میں کیا کروں؟ کسی طرح اس سے ایک بار ملاقات ہو جائے یا فون پر بات ہو جائے تو میں اسے پھر واپس لے آؤں گا۔''

چپت راؤ نے کہا۔ ''آپ ہوٹل میں چل کر آرام کریں۔ ہم اسے آپ سے ملانے کے لیے دن رات ایک کر دیں گے۔''

ماسٹر کا فون گنگنانے لگا۔ اس نے حیرانی سے ننھی اسکرین کو پڑھا پھر کہا۔ ''میکی براؤن مجھے کال کر رہا ہے۔''

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا پھر بڑی ناگواری سے کہا۔ ''ہیلو......!''

وہ بولا۔ ''ہماری معلومات کی داد دو۔ ہم جانتے ہیں کہ تم ایک مدت کے بعد سن سٹی سے باہر انڈیا کے شہر دہلی میں آئے ہو۔ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ تم کتے کے ذریعے کسی کو تلاش کرنے میں ناکام رہے ہو۔ وہ محبوب وہ جانِ جگر کون ہے ماسٹر جس کو ڈھونڈنے ہزاروں میل دور آئے ہو؟''

ماسٹر نے کہا۔ ''بڑی معلومات کا دعویٰ کر رہے ہو تو یہ بھی بتا دو کہ میں کسے تلاش کر رہا ہوں؟''

''مراد علی منگی کو...''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔''ہم یقین سے کہتے ہیں کہ اس نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور تمہاری طاقت آدھی سے بھی آدھی رہ گئی ہے۔ پچھلے ایک ماہ سے جرائم کی دنیا میں کوئی ہلچل نہیں ہے۔ کہیں سے یہ خبر نہیں آرہی ہے کہ مراد علی منگی نے کسی پر ایک گولی بھی چلائی ہے۔ تمہارا یار تمہیں چھوڑ کر اس شہر میں آکر چھپا ہوا ہے۔ تم اسے منانے کے لیے پھر سے طاقتور بننے کے لیے یہاں آئے ہو۔ ماسٹر! تم نے مراد کی گن سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ یو بلڈی بل ڈاگ...! تم نے میرے جوان بیٹے کو ہلاک کرایا ہے۔ اب وہ خطرناک ناقابلِ شکست شوٹر تمہارے ساتھ نہیں ہے۔ اب تمہیں کون بچائے گا؟ واپسی کا راستہ بھول جاؤ۔ میں اپنے جوان مقتول بیٹے کی قسم کھا کر آیا ہوں۔ تم یہاں سے زندہ نہیں جاؤ گے۔ میرے تمام اتحادی بھی یہاں موجود ہیں۔''

اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ ماسٹر کا جواب سننا ضروری نہیں سمجھا۔ صرف یہ چیلنج کرنے کے لیے فون کیا تھا کہ وہ ماسٹر، مراد کے بغیر کھوکھلا اور کمزور ہے۔ وہاں اسے کوئی بچا نہیں سکے گا۔ وہ اپنے جوان بیٹے کی ہلاکت کا انتقام ضرور لے گا۔

ماسٹر فولاد تھا۔ دھونس میں آنے والا نہیں تھا لیکن دل ہی دل میں تسلیم کر رہا تھا کہ سن سٹی سے ہزاروں میل دور اس انجانے شہر میں صرف مراد ہی اس کی زندگی کی ضمانت دے سکے گا۔

چمپت راؤ نے اس کے اطراف سیکیورٹی سخت کر دی تھی۔ جس ہوٹل میں اس کے لیے ایک سوئٹ ریزرو کرایا گیا، اس کے اندر اور باہر شوٹرز کے علاوہ جاسوسوں کو ڈیوٹی پر لگا دیا۔

ماسٹر نے بشریٰ اور بلّے سے کہا۔''تم دونوں مرینہ اور مراد سے کسی طرح کم نہیں ہو۔ میرے ساتھ سوئٹ میں رہا کرو گے۔''

لیکن ہوٹل میں پہنچتے ہی انڈین انٹیلی جنس کے سراغ رسانوں نے اسے گھیر لیا۔ ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔''ماسٹر کو بوبو...! تمہاری پوری ہسٹری ہمارے ریکارڈ روم میں ہے۔ تم لوگ جرائم کے ایسے پکے کھلاڑی ہو کہ اپنے خلاف کوئی ثبوت اور گواہ نہیں رہنے دیتے۔''

دوسرے افسر نے کہا۔''یہاں تمہارے آتے ہی شہر کا امن وامان غارت ہو گیا ہے۔ ہم ثابت نہیں کر سکیں گے کہ آج جو کچھ ہوا ہے، اس کے پیچھے تمہارا ہاتھ ہے۔''

''تمہارے ملک کے سفارت خانے سے بات ہو چکی ہے۔ ہم تمہیں ابھی یہ ملک چھوڑنے کا حکم دے رہے ہیں۔ یہاں تم کسی ہوٹل میں، کسی مکان میں، کسی کے بھی مہمان بن کر نہیں رہو گے۔ یہاں سے فوراً ائرپورٹ جاؤ۔ ہم کسی بھی پہلی فلائٹ میں تمہارے لیے ایک سیٹ کرا دیں گے۔''

ماسٹر نے کہا۔''حکم تو ماننا پڑے گا لیکن یہ سن لیں کہ ریڈ الرٹ اور دوسری کئی خطرناک تنظیموں کے سربراہ مجھے قتل کرنے کے لیے یہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ اس لیے میرے درجنوں مسلح گارڈز یہاں سے ائرپورٹ تک میری حفاظت کے لیے موجود رہیں گے اور جہاز کی روانگی تک وہاں رہیں گے۔''

''بے شک تم اپنی سیکیورٹی کے انتظامات کر سکتے ہو۔ ہمارے مسلح سپاہی بھی تمہارے آگے پیچھے رہیں گے۔''

چمپت راؤ ہوٹل سے ائرپورٹ تک ماسٹر کو سلامتی سے لے جانے کے انتظامات کرنے لگا۔ اس نے پریشان ہو کر درگا سے فون پر کہا۔''ہم بہت مشکل میں ہیں۔ پتا نہیں ماسٹر کو کتنے گھنٹوں کے بعد کسی فلائٹ میں سیٹ ملے گی۔ تب تک اسے دشمنوں سے بچائے رکھنا ہے۔''

درگا نے کہا۔''اچھا ہے، اسے مرنے دو۔ وہ میرے بھائی کو پکڑنے آیا تھا۔ خود ہی دشمنوں کے جال میں پھنس گیا ہے۔''

''میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا ہے، وہ مراد سے دشمنی کے لیے نہیں آیا ہے۔ وہ مراد کو اپنا بیٹا مانتا ہے۔ اس کی بہتری کے لیے یہاں آیا تھا۔ اب اسے بھارتی حکومت یہاں سے جانے کو کہہ رہی ہے۔''

''اچھا ہے وہ چلا جائے۔ ایسے وقت مجھے کیوں فون کیا ہے؟ میں کیوں یاد آرہی ہوں؟''

''درگا......! ایسے وقت مراد ہی ماسٹر کو سلامتی سے سن سٹی پہنچا سکتا ہے۔ میکی براؤن اور اس کے اتحادیوں کو بس اتنا معلوم ہو جائے کہ مراد خم ٹھونک کر ماسٹر کی سیکیورٹی کے لیے میدان میں آگیا ہے تو دشمن اپنی چوکڑیاں بھول جائیں گے۔''

''تم میرے بھائی کی باتیں مجھ سے نہ کرو۔''

''غصہ تھوک دو درگا! وہ ابھی تمہارے ساتھ ہے۔ پلیز مجھ سے بات کراؤ۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر مراد کی آواز سنائی دی۔''ہاں بولو۔ دوسرا کتنا کب لا رہے ہو؟''

''پلیز مراد! مجھے دشمن نہ سمجھو۔ درگا سے پہلے میں

تمہارا دوست اور بھائی بن کر کام آتا رہا ہوں۔''

''اور تمہارے جیسے بھائی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ برے وقت میں صرف بہنیں کام آتی ہیں۔''

''بھگوان کے لیے یقین کرو۔ ماسٹر تمہیں غلام نہیں کہتا' بیٹا مانتا ہے۔ تمہاری بہتری کے لیے یہاں آیا ہے۔''

''میں اپنی بہتری کے لیے کسی ماسٹر کا محتاج نہیں ہوں۔ صرف خدا کا بندہ ہوں اور رہوں گا۔ اگر میری بہن اس کتے کو گولی نہ مارتی تو اس وقت میں سر جھکائے ماسٹر کے سامنے کھڑا رہتا۔ درگا نے میرا سر اٹھایا ہے۔''

وہ نفرت سے اونہہ کہتے ہوئے بولا۔ ''تم میری بہن کے پتی بن کر رہنے کے لائق نہیں ہو۔ ابھی تم ماسٹر کی نہیں اپنی فکر کرو۔ اگر ماسٹر کی وفاداری میں میری بہن کے خلاف کوئی قدم اٹھاؤ گے تو یہ بھائی تمہیں ایک کے بعد دوسری سانس لینے نہیں دے گا۔''

''توبہ کرو مراد! میں اور درگا جیسی دھرم پتنی کے خلاف کچھ کرنے کی حماقت کروں گا؟ یہ تو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہم میاں بیوی کے درمیان تھوڑی دیر کے لیے تمہاری وجہ سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ اب میرے دل میں کوئی رنجش' کوئی کدورت نہیں ہے۔ میں تو اس کی منتیں کر رہا ہوں کہ وہ واپس آ جائے اور تم چاہو گے تو میرا گھر پھر سے آباد ہو جائے گا۔''

پھر اس نے التجا کی۔ ''فار گاڈ سیک! درگا تو اپنے گھر کا معاملہ ہے۔ ماسٹر کی بات کرو مراد! تم اس کے احسانات سے اور اس کی دریا دلی سے انکار نہیں کرو گے۔''

مراد نے کہا۔ ''درست کہتے ہو۔ اس کی دریا دلی کے عوض یہ چاہوں گا کہ وہ بخیریت اپنے گھر پہنچ جائے۔ ٹھیک ہے، میں کوشش کروں گا کہ یہاں ماسٹر کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔''

مراد نے فون بند کر دیا۔ درگا نے پریشان ہو کر کہا۔ ''بھائی! میں نہیں چاہتی کہ آپ پھر سے بندوق پکڑیں۔ آپ ماسٹر کی سیکیورٹی کے لیے نہ جائیں۔''

وہ شکست خوردہ انداز میں ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ایک پرانی کہاوت ہے کہ میں کمبل کو چھوڑ رہا ہوں مگر کمبل مجھے نہیں چھوڑ رہا۔ یہ ہتھیار میری زندگی سے جونک کی طرح چمٹ گئے ہیں۔ اگر میں ماسٹر کے لیے گن نہیں پکڑوں گا تو مرینہ کے لیے پکڑنا ہوگی۔ تم دیکھ رہی ہو۔ کئی بار اسے کال کر چکا ہوں۔ پتا نہیں وہ کہاں گم ہو گئی ہے۔ جواب نہیں دے رہی ہے۔ طرح طرح کے اندیشے ہیں کہ وہ دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ غضب ناک فائٹر ہونے کے باوجود بے بس اور مجبور ہو گئی ہے۔ اس خیال سے بھی صدمہ ہو رہا ہے کہ کہیں دھوکے سے ماری نہ گئی ہو۔ اگر وہ دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے تو آئی ڈی کارڈ کے ذریعے انہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ جان محمد کی بیوی بن کر پرانی حویلی میں رہتی ہے۔''

درگا نے کہا۔ ''اسی لیے کہتی ہوں۔ جب تک مرینہ کا سراغ نہ ملے، آپ حویلی کا رخ نہ کریں۔ عقلمندی یہی ہے کہ اس مکان سے بھی باہر نہ نکلیں۔''

''نہیں درگا! مرینہ کو تلاش کرنے کے لیے باہر جانا ہوگا۔ تم فکر نہ کرو۔ مجھے مراد کی حیثیت سے کوئی نہیں پہچانے گا۔''

مراد کا اپنا فون ٹویوٹا کار میں رہ گیا تھا۔ وہ چیپت راؤ کے ہاتھ لگا تھا لیکن اس فون پر کسی کی کال نہیں آ رہی تھی۔ مرینہ ہی اسے کال کیا کرتی تھی۔ اب وہ بھی فون کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اسے پولیس کی ایک گشتی ٹیم نے اسپتال پہنچا دیا تھا۔ ایک سب انسپکٹر وہاں ڈیوٹی پر تھا اور اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

ادھر ماسٹر کو مراد کے بعد صرف بلا پر بھروسا تھا۔ وہی دشمنوں کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہو سکتا تھا۔ ہوٹل سے باہر آتے وقت بشریٰ اور بلا مسلح باڈی گارڈز بن کر اس کے ساتھ تھے اور جہاز کے روانہ ہونے تک ائیرپورٹ میں رہنے والے تھے۔ بشریٰ نے تنہائی میں موقع ملتے ہی بلے کو بتایا کہ مرینہ سے اس کا مقابلہ ہوا تھا۔ وہ مقابلے میں شاید مر گئی ہے۔ اگر زندہ ہو گی تو چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے گی۔

اس نے کہا۔ ''یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔ مراد یہاں.... بے شمار دشمنوں کے مقابلے میں تنہا ہے۔ اس کے لیے مرینہ بہت ضروری تھی اور تو نے اسے ناکارہ بنا دیا ہے۔''

''میں ایک ہی بات جانتی ہوں۔ مرد سر پر کفن باندھ کر لڑتا ہے۔ عورت کا آنچل سر پر رکھ کر بندوق نہیں چلاتا۔ پھر میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مرینہ کو بھابی کی سوکن بن کر رہنے کے لیے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

پھر وہ بولی۔ ''میں مطمئن نہیں ہوں۔ اس کتیا کی موت کا یقین نہیں ہو رہا ہے۔ آج ماسٹر چلا جائے گا تو یہاں کے اسپتالوں میں اسے ڈھونڈوں گی۔ وہ مرے گی تو مجھے سکون ملے گا۔''

''بہت ہو گیا بلی! اسے معاف کر دے۔ مراد بھائی کو طلاق دے چکا ہے۔ اب مرینہ کو بھابی کی سوکن نہیں کہا

جائے گا۔''

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ ''ارے واہ! اسی کمینی کی وجہ سے طلاق ہوئی ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔''

بلّے نے اس سے بحث نہیں کی۔ وہ کسی طرح ایک بار مراد سے ملنا چاہتا تھا۔ یہ سوچ رہا تھا کہ مرینہ کو اگر اسپتال پہنچایا گیا ہے تو ماسٹر کے جانے کے بعد مرینہ کو صرف اس لیے تلاش کرے گا کہ اس کے ذریعے مراد تک پہنچ سکے۔

بلا اور چمپت راؤ دونوں ہی ماسٹر کے وفادار تھے۔ دونوں کی بیویاں مراد کو بھائی مانتی تھیں۔ یہ بات انہوں نے ماسٹر سے چھپائی تھی۔ اسے معلوم ہوتا تو وہ بلا اور چمپت راؤ کو مجبور کرتا کہ وہ اپنی عورتوں کے ذریعے اسے مراد تک پہنچائیں۔

بہرحال وہ انڈیا چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ایسے وقت مراد نے فون پر چمپت راؤ سے کہا۔ ''ہوٹل کے کمرے میں ماسٹر کو رہنے دو۔ وہاں سے اس کی ڈمی باہر لاؤ۔ دشمنوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ماسٹر اپنے گارڈز کے ساتھ ائرپورٹ جا رہا ہے۔''

چمپت راؤ نے جب ماسٹر کو بتایا کہ مراد اس کی سیکیورٹی کے لیے آ گیا ہے تو وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ بڑے فخر سے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''وہ میرا بیٹا ہے۔ اپنے باپ کو خطرات سے نمٹنے کے لیے تنہا نہیں چھوڑے گا۔ آخر آ ہی گیا۔ اس سے بولو، مجھ سے فون پر بات کرے۔ میرے پاس آئے۔''

بلّے نے کہا۔ ''وہ آپ سے ضرور ملے گا۔ ابھی اسے حفاظتی تدابیر پر عمل کرنے دیں۔ ہمیں وہی کرنا چاہیے۔ جیسا وہ کہہ رہا ہے۔''

وہی کیا گیا۔ ایک ایسے شوٹر کا انتخاب کیا گیا جو کسی حد تک ماسٹر سے مشابہت رکھتا تھا۔ دور سے دیکھنے والوں کو دھوکا دیا جا سکتا تھا۔ اسے ماسٹر کا قیمتی سوٹ پہنایا گیا۔ اس کا ہیئر اسٹائل بنایا گیا۔ گہرے سن گلاسز نے اس کی آنکھیں چھپا دیں۔ پھر تین گن مین اس کے باڈی گارڈز بن کر ہوٹل کے باہر اس کے ساتھ کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ اس کار کے آگے پیچھے درجنوں مسلح گارڈز کی گاڑیاں تھیں۔ دشمنوں کے جاسوس دور ہی دور سے اس کی تاک میں تھے۔ میکی براؤن اور دوسرے اتحادی آقاؤں کو فون پر کہہ رہے تھے کہ سیکیورٹی بہت سخت ہے۔ ائرپورٹ تک راستے میں کہیں اس پر گولیاں چلانا ممکن نہیں ہے۔

ماسٹر اور چمپت راؤ نے پولیس کے اعلیٰ افسران کو اپنے اعتماد میں لیا تھا۔ ان سے کہا تھا کہ ایک ڈمی ماسٹر ائرپورٹ جا رہا ہے۔ وہاں جہاز کی روانگی تک وی آئی پی روم میں رہے گا لیکن وہ در پردہ ایک عام مسافر کی طرح بورڈنگ کارڈ لے کر ان افسران کے سامنے جہاز پر سوار ہو جائے گا۔ اس حکمتِ عملی کو راز میں رکھا جائے۔ کسی ایک سپاہی کو بھی حقیقت نہ بتائی جائے۔

ماسٹر کے چہرے پر ڈاڑھی مونچھوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ آنکھوں پر عینک تھی۔ سر پر گاندھی کیپ اور بدن پر دھوتی کرتہ تھا۔ اس کے ساتھ ایک عمر رسیدہ دھرم پتنی تھی۔ کوئی دشمن قریب آ کر بھی اس پر شبہ نہیں کر سکتا تھا۔

میکی براؤن اور دوسرے اتحادی اس پر حملہ کرنے کی دھن میں تھے۔ یہ خیال تھا کہ ماسٹر ابھی جس طرح آزادی سے انڈیا آیا ہے، آئندہ پھر کبھی سن سٹی سے باہر نہیں آئے گا۔ لہٰذا یہی موقع ہے۔ اسے زندہ واپس نہ جانے دیا جائے۔

ان تمام دشمنوں کو اپنی فکر نہیں تھی۔ انڈیا میں ان کے دشمن نہیں تھے۔ وہی ایک ماسٹر تھا جو واپس بھاگ رہا تھا۔ اس لیے میکی براؤن اور دوسری تنظیموں کے سربراہ اپنی گاڑیوں میں چھپ کر ائرپورٹ آئے تھے۔ انہیں مراد کی طرف سے خطرہ نہیں تھا۔ یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ ماسٹر کا ساتھ چھوڑ چکا ہے اور انڈیا میں تلاش کرنے کے باوجود اس کی موجودگی کا سراغ نہیں مل رہا ہے۔

مراد آزادی سے ائرپورٹ پر گھوم رہا تھا اور دشمنوں کو تاڑ رہا تھا۔ صرف بشریٰ اور بلا نے اسے دور سے دیکھا تھا۔ اسے موجودہ بہروپ میں پہچان رہے تھے۔ اس کے قریب جانے اور اس سے ملنے سے پہلے فون کے ذریعے اس کی مرضی معلوم کرنا چاہتے تھے۔

لیکن بشریٰ نے اس کا جو فون نمبر معلوم کیا تھا اس کے ذریعے رابطہ نہیں کر سکتے تھے۔ اب وہ فون چمپت راؤ کے پاس تھا اور چمپت راؤ نہیں جانتا تھا کہ مراد کا فون اس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔

مراد نے بھی بشریٰ اور بلّے کو دور سے دیکھ لیا تھا۔ وہ دونوں ٹہلتے ہوئے دور تک جاتے ہوئے دشمنوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر مراد نے میکی براؤن کو دیکھ لیا۔ وہ پارکنگ ایریا میں ایک کار کے اندر فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ فون کو کان سے لگائے معلومات حاصل کر رہا تھا کہ اس کے شوٹرز ماسٹر کا کام تمام کرنے کے لیے کیا کر رہے ہیں؟

اور یہ سن کر اسے مایوسی ہو رہی تھی کہ ماسٹر تک پہنچنے کے لیے وی آئی پی روم کے اندر جانے کی کسی کو اجازت نہیں دی جارہی ہے۔ جو ویٹر اور دوسرے ملازم اندر جاتے تھے، ان کی اچھی طرح تلاشی لی جارہی تھی۔ کسی سپاہی کو بھی اسلحے کے ساتھ اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

مراد اس پارکنگ ایریا میں ادھر سے ادھر جا کر ایسی جگہ دیکھ رہا تھا جہاں سے کسی کی نظروں میں آئے بغیر فائر کر سکے۔ اکثر گاڑیوں کے مالکان وہاں نہیں تھے۔ اس نے ایک خالی ویگن کار کے پیچھے آکر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا اور میکی براؤن وہاں سے تقریباً بیس فٹ کے فاصلے پر صاف نشانے پر دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے دائیں بائیں آگے پیچھے محتاط نظروں سے دیکھا۔ کوئی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ سائیلنسر لگے ہوئے ریوالور سے نشانہ لے کر ٹریگر کو دبا دیا۔ ونڈ اسکرین کا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹا۔ مراد نے میکی کو تڑپتے ہوئے سیٹ پر ڈھلکتے دیکھا پھر گن کو وہیں پھینک کر تیزی سے چلتا ہوا پارکنگ ایریا سے باہر آگیا۔ میکی کے دو شوٹرز فوراً اس کار سے باہر نکل کر دوسری کاروں کے پیچھے چھپتے ہوئے قاتل کو دور سے دیکھ لینا چاہتے تھے۔

شیشہ ٹوٹنے کی آواز سے دو چار لوگ چونک گئے تھے۔ وہ خوف زدہ ہو کر چیختے ہوئے دور بھاگنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر پھیل گئی کہ پارکنگ ایریا میں گولی چلی ہے۔ پولیس کو تو وہاں پہنچنا ہی تھا۔ دشمن بھی یہ دیکھنے کے لیے آئے کہ کس نے کس کو گولی ماری ہے؟

پھر اتحادی تنظیموں کے سربراہ وہاں میکی براؤن کی لاش کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ بازی الٹ گئی تھی۔ وہ ماسٹر کو ہلاک کرنے آئے تھے اور ان کا سب سے بڑا اتحادی ریڈ الرٹ کا سربراہ میکی براؤن مارا گیا تھا۔

ماسٹر کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے اسکرین پر انجانے نمبر پڑھے پھر بٹن کو دبا کر اسے کان سے لگایا۔ دوسرا ہی لمحہ چونکا دینے والا تھا۔ وہ مراد کی آواز سنتے ہی خوشی سے اچھل پڑا۔ جانے کہاں سے فون پا کر وہ ماسٹر سے بات کر رہا تھا۔ ''میرے بیٹے! میری جان! تم باپ سے ناراض کیوں ہو؟''

مراد نے کہا۔ ''پلیز، جوش میں نہ آئیں۔ بالکل نارمل رہ کر بولیں۔ دشمنوں کو کسی طرح کا شبہ نہ ہونے دیں۔''

''ہاں بیٹے! ہاں...... میں بالکل نارمل رہوں گا۔''

''میں بہت بڑی خوش خبری سنا رہا ہوں۔ اگر آپ خود پر قابو نہیں پائیں گے اور خوشی سے ناچنے لگیں گے تو میکی براؤن کے قاتل کہلائیں گے۔ میں نے اسے جہنم میں پہنچا دیا ہے۔''

''کیا......؟'' وہ بے اختیار خوشی سے چیخ پڑا۔ پھر اپنے آس پاس دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بیٹے! مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ پھر بھی میں خود کو قابو میں رکھوں گا۔ ماسٹر کی جان! تم نے کیا کمال کیا ہے۔ ریڈ الرٹ کی آخری طاقت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔''

اس کے اندر مسرتیں ایسی بھر گئی تھیں جیسے بارود بھر گئی ہو اور وہ پھٹ پڑنے والا ہو۔ چیخ چیخ کر اتحادیوں کو للکارنے والا ہو کہ اب کس میں اتنا دم خم ہے کہ ماسٹر کے سامنے مقابلے پر ٹھہر سکے گا۔

وہ خوشی سے لرزتے ہوئے بولا۔ ''بائی گاڈ مراد! تم دیکھو گے، میں سن سٹی پہنچتے ہی اعلان کروں گا کہ تم میرے جانشین ہو۔ میرے بعد سنڈیکیٹ دی ماسٹرز کے آئندہ ماسٹر تم ہی ہو۔ میں خوشی سے پاگل ہو رہا ہوں۔ اوہ گاڈ! تم نے مجھے اچھی خبر سنائی......''

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ پتا چلا کہ ہوا سے باتیں کر رہا ہے۔ دوسری طرف فون بند ہو گیا تھا۔ اس نے ہیلو ہیلو کہہ کر آواز دی۔ پھر اسی نمبر کو پنچ کیا تو مایوسی ہوئی۔ یہ معلوم ہوا کہ اس نمبر پر رابطہ نہیں ہو سکے گا۔ صاف ظاہر تھا۔ مراد اپنے فون کی سم بدل چکا تھا۔

اسی وقت چیپت راؤ دوڑتا ہوا آیا۔ پھر ماسٹر کے سامنے رک کر ہانپتے ہوئے بولا۔ ''ماسٹر! بہت بڑی خوش خبری ہے۔''

ماسٹر نے کہا۔ ''میکی براؤن از نو مور۔ اینڈ دی ریڈ الرٹ از فنشڈ...''

چیپت راؤ نے حیرانی سے پوچھا۔ ''آپ کیسے جانتے ہیں؟''

''میرے بیٹے نے فون کیا تھا۔ بولو چیپت راؤ! میرے مراد علی منگی جیسا اس زمین پر کوئی ہے؟ نہیں ہے۔ کوئی نہیں ہے۔ اسے سیلیوٹ کرو۔''

یہ کہتے ہی اس نے خود تن کر سیلیوٹ کیا۔ چیپت راؤ نے بھی ایڑیاں بجاتے ہوئے سیلیوٹ کیا۔ پھر کہا۔ ''ماسٹر! ہمیں اس طرح خوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ دشمنوں کے علاوہ پولیس والے بھی مراد کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ ہماری خوشیاں دیکھ کر انہیں ہم پر شبہ ہوگا۔''

وہ قائل ہو کر سر ہلا کر بولا۔ ''درست کہتے ہو۔ مراد بھی یہی کہہ رہا تھا کہ مجھے نارمل رہنا چاہیے مگر وہ کہاں ہے؟ مجھے خوش خبری سنا کر پھر گم ہو گیا ہے۔ اسے تلاش کرو۔ وہ یہیں کہیں ہوگا۔''

اسے ڈھونڈ نکالنا آسان نہ تھا۔ جہاز کی روانگی کا وقت ہو گیا تھا۔ ماسٹر نے چیپت راؤ کو بشریٰ اور بلے کو بڑی حسرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ مجھ سے کیوں نہیں بول رہا ہے؟ کیوں مجھ سے ناراض ہے؟ میں مجبور ہو کر جارہا ہوں۔ وہ ایک بار تو مجھ سے بول سکتا ہے۔''

بلے نے کہا۔ ''وہ آپ سے ناراض نہیں ہے۔ وہ جرائم کی دنیا سے نکل جانا چاہتا ہے۔ پھر بھی دیکھیں کہ چھپ کر آپ کو سیکیورٹی دے رہا ہے۔ اس نے آپ کو سب سے بدترین اور طاقتور دشمن سے نجات دلائی ہے۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''ہم ابھی انڈیا میں رہیں گے۔ بھائی کو تلاش کریں گے اور آپ سے اس کی بات ضرور کرائیں گے۔''

وہ مایوس ہو کر بورڈنگ کارڈ لینے کے لیے اندر چلا گیا۔ اتحادی تنظیموں کے سربراہ پریشان تھے۔ میکی براؤن کی موت نے انہیں دہلا دیا تھا۔ وہ سب سہمے ہوئے تھے۔ یہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ اتنے خطرناک اور طاقتور شخص کو صرف مراد ہی ہلاک کر سکتا ہے۔

وہ سب انڈین سیکیورٹی ایجنسیوں سے اور اپنے سفارت خانوں سے رابطے کر رہے تھے۔ مراد علی منگی کی گرفتاری کا مطالبہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ان کی سیکیورٹی کے لیے سخت انتظامات کیے جائیں اور ان کے ملکوں میں جانے والی پہلی فلائٹس میں ان کی سیٹس کنفرم کرائیں۔

فرینکفرٹ کی ایک انڈر ورلڈ کا سربراہ میکی کی لاش دیکھنے کے بعد تیزی سے چلتا ہوا ایک سمت جانے لگا۔ اس کی کار پارکنگ ایریا کے ایک دور افتادہ حصے میں تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ اسی وقت مراد پچھلا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اس نے سہم کر اپنی گن نکالتے ہوئے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟ گیٹ آؤٹ......''

وہ اپنی گن اس کی طرف نہ کر سکا۔ اس سے پہلے ہی ایک گن کی نال اس کی گردن سے آ کر لگ گئی۔ مراد نے دوسرے ہاتھ سے اس کے ریوالور کو چھین کر کہا۔ ''گاڑی چلاؤ۔''

وہ سہم گیا تھا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مراد نے اس کے ریوالور کو اس کی پیشانی سے لگا کر کہا۔ ''گاڑی چلانے میں ایک لمحے کی بھی دیر کرو گے تو گولی چل جائے گی۔ کم آن...... ہری اپ۔''

اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھانے میں دیر نہیں کی۔ مراد نے حکم دیا۔ ''رفتار بڑھاؤ۔''

رفتار بڑھنے لگی۔ وہ ائرپورٹ سے دور ہوتے گئے۔ اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ ''پلیز بتاؤ، مجھ سے کیا دشمنی ہے؟''

مراد نے کہا۔ ''اگر تم کسی سے دشمنی نہیں کرتے ہو تو میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ آگے جا کر زندہ چھوڑ دوں گا۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''میں کسی سے دشمنی نہیں کرتا ہوں۔''

آئندہ نسلیں

مقرر کی تقریر لمبی ہو گئی تو سامعین بیزاری کا اظہار کرنے لگے۔ صورتِ حال کو بھانپتے ہوئے مقرر نے کہا۔ ''میں یہ سب آپ کی آئندہ نسلوں کی بھلائی کے لیے کہہ رہا ہوں۔''

ایک آواز آئی۔ ''جاری رکھیے...... ہماری آئندہ نسلیں جلسہ گاہ میں آنے ہی والی ہیں۔''

☆☆☆

کمپرومائز

ان دونوں میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی تھی اور انہیں ایک مثالی جوڑا سمجھا جاتا تھا۔ ایک بار دوستوں نے اصرار سے پوچھا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ خاوند نے بتایا۔ ''آدھا دن تو بیگم ہر کام اپنی مرضی سے کرتی ہے اور باقی آدھا دن میں ہر کام بیگم کی مرضی کے مطابق کرتا ہوں۔''

☆☆☆

بوڑھی

لیڈی چرچل کی ستّرویں سالگرہ تھی اور وہ کہہ رہی تھی۔

''اب تو مجھ سے ٹھیک طرح سے اخبار بھی نہیں پڑھا جاتا مگر چرچل مجھے عینک نہیں لگانے دیتے۔ کہتے ہیں، عینک لگانے سے تم بوڑھی نظر آتی ہو۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

''کسی سے دشمنی نہیں کرتے ہو۔ سب ہی دوست ہیں تو یہ ریوالور کس لیے رکھتے ہو؟''

''آں وہ...... کچھ سرپھرے مجرم ہوتے ہیں۔ ان سے نمٹنے کے لیے اسلحہ رکھنا پڑتا ہے۔''

''مجھ جیسے سرپھرے سے کیسے نمٹو گے؟''

''نن...... نہیں...... تم مجرم نہیں ہو سکتے۔ شریف آدمی ہو۔ مجھ پر رحم کرو۔''

''اگر مراد علی منگی تمہارے نشانے پر ہوتا تو کیا اس پر رحم کرتے؟''

''آں...... تت...... تم کون ہو؟''

''وہی ہوں جس سے دور بھاگ رہے ہو۔''

مارے خوف کے اسٹیئرنگ اس کے ہاتھوں سے بہکنے لگا۔ مراد نے کہا۔ ''گاڑی روکو۔ میں ڈرائیو کروں گا۔''

اس نے حکم کی تعمیل کی لیکن گاڑی روکتے ہی ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر بھاگتے ہوئے چیخنے لگا۔ ''بچاؤ، مجھے بچاؤ۔ یہ مراد ہے۔ مجھے مار ڈالے گا۔''

ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ایک گولی نے اس کی آواز بند کر دی۔ اس سڑک پر گاڑیاں کم تھیں۔ پیدل چلنے والے بھی زیادہ نہیں تھے۔ مراد نے کار کو تیزی سے آگے بڑھاتے ہوئے ہوائی فائرنگ کی تو کسی گاڑی والے نے اس کے پیچھے آنے کی جرأت نہیں کی۔

وہ جس ملک میں جاتا تھا، وہاں کی پولیس اور انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے لیے چیلنج بن جاتا تھا۔ پاکستان اور انڈیا میں تھی وہ مطلوب اور مفرور مجرم تھا۔ انٹرپول اور انٹرنیشنل سی آئی اے کی ٹیمیں بھی اس ملک میں پہنچ جاتی تھیں جہاں اس کی موجودگی کا سراغ ملتا تھا۔

عالمی سطح پر کام کرنے والی سراغ رسانوں کی ٹیمیں ان غباروں کی بھی نگرانی کر رہی تھیں جو مراد کا پیغام لے کر ماروی کے پاس کہیں جا رہے تھے۔ اگرچہ یہ بچوں جیسی باتیں تھیں۔ تاہم عقل و فراست کے حامل سراغ رساں ماروی تک پہنچنے والے پیغام کو اہمیت دے رہے تھے۔ ایک بات جو عقل سے بعید تھی وہ دیکھنے میں آ رہی تھی اور وہ یہ کہ وہ غبارے ہوا کے بدلتے ہوئے رخ کے ساتھ اپنا رخ نہیں بدل رہے تھے۔ وہ سیدھے مغرب کی سمت جا رہے تھے۔ کبھی وہ گم ہو جاتے تھے کبھی اچانک ہی پھر آسمان کی بلندیوں میں اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

اب تمام ملکوں کے سفارت خانوں نے اور خفیہ ایجنسیوں نے یہ طے کیا تھا کہ ماروی بہت اہم ہے۔ اسے تلاش کیا جائے۔ وہ ہاتھ آئے گی تو مراد پھڑ پھڑاتا ہوا ان کے قدموں میں آ جائے گا۔ وہ درگا کے پاس آ گیا۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''بھائی کہاں رہ گئے تھے؟ آپ کے انتظار میں صبح سے بھوکی بیٹھی ہوں۔ فکر کے مارے ایک گھونٹ پانی بھی حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔''

وہ ٹی وی آن کرتے ہوئے بولا۔ ''کھانا لگاؤ۔ مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔''

ایک چینل سے مقامی خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ یہ کہا جا رہا تھا کہ مراد علی منگی کئی مہینوں سے دہلی شہر میں چھپا ہوا ہے۔ وہ بھیس بدلنے کا ماہر ہے۔ پھر یہ کہ پلاسٹک سرجری کی ٹیکنالوجی اس قدر ایڈوانس ہو گئی ہے کہ سرجری کے بعد مجرم کا چہرہ اور پچھلی تمام ہسٹری کامیابی سے چھپ جاتی ہے۔ ایسے مجرم کو کوئی پکڑ نہیں پاتا۔ ماسٹر کو بو بو سٹی کے ایک معزز بزنس مین کہلاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس بزنس مین کے پیچھے ایک خطرناک مجرم چھپا رہتا ہے۔

درگا کھانا گرم کر کے لے آئی تھی۔ وہ خبریں سن کر مسکرا رہی تھی۔ خبروں میں کہا جا رہا تھا کہ ماسٹر کو بو بو کو واپس جانے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اس کے آتے ہی مراد نے دہلی شہر کے امن و امان کو غارت کر دیا ہے۔

اس نے بیرونی ممالک سے آنے والی دو اہم شخصیات میکی براؤن کو اور واسکوڈی کو ہلاک کر دیا ہے۔ یہ میکی براؤن وہی ہے جس کا بہنوئی جاسوسی کے الزام میں پاکستانی جیل میں تھا۔ وہ جیل توڑ کر فرار ہو رہا تھا۔ تب مراد نے اسے گولی ماری تھی۔ واسکوڈی بھی انڈرورلڈ سے تعلق رکھتا ہے۔ ابتدا سے اب تک یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ مراد علی منگی صرف ان لوگوں کو ہلاک کرتا ہے جو جرائم کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ کہنا پڑتا ہے کہ مراد نے انڈیا کے کسی بھی معزز شخص کو یا عام آدمی کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔

درگا نے پوچھا۔ ''کیا سچ مچ آپ دو بڑے مجرموں کو ٹھکانے لگا کر آئے ہیں؟''

اس نے کہا۔ ''ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا، لیکن وہ آسانی سے نظروں میں آ گئے تھے۔ وہ سب ہی میرے خون کے پیاسے تھے۔ میں نے انہیں پیاسا ہی اوپر بھیج دیا۔'' پھر وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''بڑی عجیب سی بات ہے۔ میں ہتھیار چھوڑتا ہوں، ہتھیار مجھے نہیں چھوڑتے۔ میں نہیں جانتا، آئندہ ماروی کے پاس پہنچنے تک کیسے حالات پیش آئیں گے۔ فی الحال یہی سمجھ میں آ رہا ہے کہ میں نیکی اور شرافت سے رہنے کی آخری حد تک کوششیں کرتا رہوں گا۔ کبھی مجبوراً

ہتھیار اٹھانا پڑے تو ان حالات سے نمٹ کر پھر ہتھیاروں کو پھینک دیا کروں گا۔''

وہ گلاس اٹھا کر پانی پینے لگا۔ درگا نے کہا۔ ''بھائی! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ماروی آپ کو مل جائے تو آپ اسے لے کر میرے پاس آجائیں اور اپنی بہن کے ساتھ زندگی گزاریں۔''

''میں اپنی آئندہ زندگی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیسے گزرے گی۔ ابھی تو مرینہ کی فکر ہے۔ پتا نہیں وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ تم ایک کام کرو۔''

وہ کھانے کے جھوٹے برتن اٹھاتے ہوئے بولی۔

''کیا مرینہ کو تلاش کرنا ہے؟''

''ہاں۔ جب تک مرینہ کی صحیح خبر نہیں ملے گی، میں اپنی حویلی کی طرف نہیں جاؤں گا۔ کوئی گڑبڑ ہوسکتی ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ میں جاؤں گی۔ کسی طرح معلوم کروں گی کہ وہ کہاں ہے؟''

وہ اسپتال میں تھی۔ اس کے ساتھ یہ ہوا تھا کہ بشریٰ اسے نیم مردہ حالت میں چھوڑ کر اس لیے بھاگ گئی تھی کہ کچھ لوگ ادھر دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ اس علاقے میں دور تک بھگدڑ مچی ہوئی تھی اور کچھ لوگ موقع سے فائدہ اٹھا کر لوٹ مار کے ذریعے مال کمارہے تھے۔

انہوں نے مرینہ کے پاس آکر دیکھا۔ وہ بے ہوش تھی۔ اس کے پاس ایک بیگ پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے بیگ کی تلاشی لی۔ کچھ نقد روپے ان کے ہاتھ لگے۔ وہ رقم لے کر بھاگ گئے۔ تھوڑی دیر بعد گشتی پولیس کی ایک ٹیم ادھر آئی۔ انہوں نے اسے اسپتال پہنچایا۔ اس کے بیگ میں آئی ڈی کارڈ تھا اس کے ذریعے اس کا رہائشی پتا معلوم ہوا۔ حویلی والوں کو اطلاع دی گئی کہ ان کے گھر کی ایک عورت اسپتال میں ہے۔

اس طرح جان محمد کے گھر والوں نے اسپتال پہنچ کر اپنی بہو کی حالتِ زار دیکھی۔ اس وقت اسے آپریشن کے لیے لے جایا جارہا تھا۔ ایکسرے کی رپورٹ سے معلوم ہوا تھا کہ ریڑھ کی ہڈی نیچے کمر کی طرف ذرا سی چٹخ گئی ہے۔ آپریشن اور دواؤں کے ذریعے پھر اس میں پہلی جیسی مضبوطی لائی جاسکتی تھی۔

درگا نے تقریباً دو گھنٹے بعد واپس آکر کہا۔ ''میں حویلی میں گئی تھی۔ وہاں ایک ملازمہ سے معلوم ہوا کہ اس گھر کی بہو اسپتال میں ہے۔ پھر میں اسپتال گئی۔ اسے دور سے دیکھا۔ وہ بے ہوش تھی۔ اسے آپریشن تھیٹر سے لاکر ایک بیڈ پر اوندھے منہ لٹایا گیا تھا۔ سنا ہے، اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ تم جاسکتے ہو۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

وہ فوراً ہی اٹھ کر تیزی سے باہر جاتے ہوئے بولا۔

''میں فون پر رابطہ رکھوں گا۔ تم پریشان نہ ہونا۔''

وہ اسپتال پہنچا تو جان محمد کے کئی رشتے دار وہاں موجود تھے۔ مرینہ ایک بیڈ پر آنکھیں بند کیے اوندھی لیٹی ہوئی تھی۔ رشتے داروں نے اسے دیکھتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ ''یہ عمارہ کی کیا حالت ہوگئی ہے۔ تم اسے کہاں لے گئے تھے؟ کس نے اس پر حملہ کیا تھا؟ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ کیا تم تماشا دیکھ رہے تھے؟ اس بے چاری کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ نامعلوم لوگوں کے درمیان فائرنگ ہورہی تھی۔ گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرارہی تھیں۔ ہم فائرنگ سے بچنے کے لیے بے شمار لوگوں کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔ ایسے وقت عمارہ مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔ میں صبح سے اسے تلاش کررہا ہوں۔ اب پتا چلا کہ یہ زخمی ہوگئی ہے۔ اسے کیا ہوگیا ہے؟ اس نے کچھ بتایا ہوگا؟''

ایک خاتون نے کہا۔ ''ہم یہاں آئے تو اسے آپریشن کے لیے لے جایا جارہا تھا۔ واپس لایا گیا تو یہ بے ہوش تھی۔ ہم سے کوئی بات نہ ہوسکی۔''

دوسری خاتون نے کہا۔ ''وہ دیکھو اسے ہوش آرہا ہے۔''

مراد نے دیکھا۔ وہ ذرا سا کسمسائی تھی۔ اس نے ایک بزرگ سے کہا۔ ''آپ فوراً ڈاکٹر کو بلائیں۔''

وہ بزرگ چلے گئے۔ اس نے خواتین سے کہا۔ ''یہ ہوش میں آرہی ہے۔ ابھی اس سے کوئی سوال نہ کریں۔ اس کے ذہن پر بوجھ پڑے گا۔ پہلے اسے اچھی طرح ہوش و حواس میں آنے دیں۔''

وہ مرینہ کے قریب آکر اس پر جھک گیا۔ وہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہی تھی۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے مراد کو ایسے دیکھا جیسے پہچان نہیں رہی ہے۔ وہ سیدھی ہوکر لیٹنا چاہتی تھی۔ ایک خاتون نے فوراً ہی اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کہا۔ ''نہیں بیٹی! حرکت نہ کرنا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے تم ابھی کئی ہفتوں تک اوندھی لیٹی رہو گی۔''

تب وہ ذرا ہوش میں آئی۔ اسے یاد آیا کہ بشریٰ نے اس سے فائٹ کی تھی اور اس کی کمر کی ہڈی میں ایسی چوٹ لگی تھی کہ اسے پھر اپنا ہوش نہیں رہا تھا۔ اس نے مراد کو دیکھا۔ اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن رشتے داروں کی بھیڑ میں کہہ نہیں سکتی تھی۔ ایسے وقت ڈاکٹر نے آکر کہا۔ ''پلیز! آپ

لوگ یہاں بھیڑ نہ لگائیں۔ باہر جائیں۔''
وہ سب ایک ایک کر کے چلے گئے۔ مراد نے کہا۔
''یہ میری وائف ہے۔ پلیز مجھے بتائیں، یہ جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گی نا؟''
وہ مرینہ کا معائنہ کرتے ہوئے بولا۔ ''کمر کی ہڈی بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ دوبارہ مضبوطی آنے میں وقت لگے گا۔''
''کیا یہ اسی طرح پڑی رہیں گی؟''
''ہماری کوشش ہوگی کہ جلد ہی اٹھنے بیٹھنے کے قابل ہو جائیں۔''
پھر وہ مرینہ سے پوچھنے لگا کہ وہ کیسا محسوس کر رہی ہے؟ اسے ایسی دوائیں دی گئی تھیں کہ درد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ایک نرس نے اسے انجکشن لگایا۔ دوائیں کھلائیں۔ ڈاکٹر نے ضروری ہدایات دیں پھر وہ چلے گئے۔
مراد نے فوراً ہی دروازے کو اندر سے بند کیا تاکہ رشتے دار اندر نہ آئیں پھر مرینہ کے پاس آ کر اسے چوم کر بولا۔ ''کیا ہوا تھا؟ کس سے فائٹ ہوئی تھی؟''
مرینہ کی آنکھوں سے غصہ اور نفرت جھلکنے لگی۔ وہ دانت پیستے ہوئے یوں ہانپنے لگی جیسے انتقام لینے کے لیے پھر بشریٰ کے مقابلے پر آ گئی ہو۔
وہ پھر اسے چوم کر بولا۔ ''ایزی مرینہ! غصہ تھوک دو۔ جس نے تمہاری یہ حالت بنائی ہے، اسے میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''
وہ شدید نفرت سے بولی۔ ''اسے تو میں ہی جہنم میں پہنچاؤں گی۔ وہ میرے ہاتھوں مرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔''
وہ اسے تھپکتے ہوئے بولا۔ ''تعجب ہے۔ کیا کسی عورت سے فائٹ ہوئی تھی؟ کوئی مرد فائٹر تم پر حاوی نہیں ہوتا، وہ کیسے ہوگئی؟''
پھر اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''بائی دا وے۔ کوئی عورت میری اور تمہاری دشمن نہیں ہے۔ کیا تم اسے جانتی ہو؟''
اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ مراد نے پوچھا۔
''کون ہے وہ؟''
اس نے ہانپتے ہوئے دوبارہ گہری سانس لی پھر حقارت سے تھوکنے کے انداز میں کہا۔ ''بشریٰ......!''
مراد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''بشریٰ......؟''

وہ مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ ''میں اس حرام زادی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ ڈاکٹر کہتے ہیں، مجھے ہفتے اور مہینے لگیں گے۔ تب چلنے پھرنے کے قابل ہوسکوں گی۔ میں اتنے دنوں تک انتظار نہیں کرسکوں گی۔ اوہ مائی گاڈ.....! اسے نہ مار سکی تو مر جاؤں گی۔''
وہ اسے تھپکتے ہوئے بولا۔ ''پلیز کول ڈاؤن۔ مجھے سوچنے دو۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ...... یہ اس طرح بشریٰ اور بلانے مجھے چیلنج کیا ہے۔ میں انہیں کیسے موت کے گھاٹ اتاروں۔ میرا دل نہیں مانے گا۔ مجھے تکلیف ہوگی لیکن...... لیکن میں ان کے بھی ہاتھ پاؤں توڑ کر رکھ دوں گا۔''
وہ مراد کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ''نہیں، وہ میرے لیے چیلنج بن گئی ہے۔ تم کچھ نہیں کرو گے۔ میں اسے دوڑا دوڑا کر تڑپا تڑپا کر جہنم میں پہنچاؤں گی۔''
وہ اس کے چہرے کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''بھول جاؤ۔ اس مرینہ کو بھول جاؤ۔ جو دوڑتی تھی، بجلی کی طرح دشمنوں پر ٹوٹ پڑتی تھی، وہ دن خواب ہو چکے ہیں۔ تمہاری کمر کی ہڈی مضبوط ہونے کے باوجود تم آئندہ فضا میں اچھلنے کے فلائنگ کک مارنے کے اور پھرتی سے پلٹنے جھپٹنے کے قابل نہیں رہوگی۔''
وہ پریشان ہو کر اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس حقیقت کو سمجھ رہی تھی کہ ایک فائٹر کی حیثیت سے ناکارہ ہوگئی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''بشریٰ نے پہلے سن سٹی میں رہ کر ٹریننگ حاصل کی۔ پھر دن رات بلے کے ساتھ رہتے ہوئے ایسی فائٹر بن گئی ہے کہ تمہیں بیڈ پر پہنچا دیا ہے۔''
وہ غصے سے بولی۔ ''ہرگز نہیں۔ میری انسلٹ نہ کرو۔ میں دھوکے سے مات کھا گئی ہوں۔ مجھے اٹھ کر کھڑا ہونے دو۔ میں، میں...''
وہ بولتے بولتے چپ ہوئی پھر سوچ کر بولی۔ ''اگر ہینڈ ٹو ہینڈ فائٹ کے قابل نہ رہی تو اسے دوڑا دوڑا کر گولی ماروں گی۔ اسے اپنے ہاتھوں سے چھلنی کروں گی۔ تم بشریٰ سے میرا انتقام نہیں لوگے۔ اسے میرے لیے زندہ رہنے دوگے۔''
وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ وہ بشریٰ کو بہت چاہتا تھا۔ اپنی بہن مانتا تھا۔ پھر اس کی صلاحیتیں، اس کی تیز طراری اسے متاثر کرتی تھی۔ مرینہ سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ دشمنی کو آگے نہ بڑھاؤ۔ یہ بات تشویشناک تھی کہ وہ دونوں عورتیں لڑتی رہیں گی تو رفتہ رفتہ ایک دوسرے کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیں گی لیکن اب مرینہ ماننے والی نہیں تھی۔ اس قدر

نوٹنے کے بعد بشریٰ کو بھی اپاہج بنائے بغیر سکون سے رہنے والی نہیں تھی۔ یہ طے تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں ماری جانے والی ہیں۔ اس نے سوچا کہ مرینہ کا علاج ہوجائے۔ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوجائے تو وہ ان کے درمیان صلح صفائی کی کوشش کرے گا۔

مرینہ جسمانی لحاظ سے بے حد کمزور لگتی تھی۔ پہلے کی طرح ناقابلِ شکست فائٹر نہیں رہی تھی یہی سوچ کر اب مراد کی پریشانی بڑھ گئی۔ مرینہ کو اس کی کمزوریوں کا یقین دلانا اور یہ سمجھانا ضروری تھا کہ وہ بشریٰ سے صلح کرے یا اسے نظرانداز کردے۔ اس سے ہمیشہ دور رہا کرے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ مرینہ کی طرف سے انتقام لے۔ وہ بشریٰ کو بہن مانتا تھا۔ اسے سزائے موت نہیں دے سکتا تھا لیکن اسے سزائیں دے سکتا تھا۔ وہ ناراض ہوجاتا تو بشریٰ آئندہ مرینہ کی طرف رخ نہ کرتی۔

مرینہ اور مراد نے...... بشریٰ اور بلا نے اپنے اپنے چہرے اور شناخت تبدیل کی تھی۔ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوگئے تھے۔ خیال تھا کہ کبھی سامنا ہوگا تو کوئی کسی کو پہچان نہیں سکے گا۔ لیکن تقدیر تماشے کرتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو پہچان گئے تھے۔

آئندہ پھر چہرے بدل کر چھپنا چاہتے تو اس بات کی ضمانت نہیں تھی کہ وہ خون کی پیاسی عورتیں ایک دوسرے کو نہ پہچانیں۔ وہ پھر تقدیر کے کسی موڑ پر ٹکرا جاتیں اور ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتیں۔

وہ ڈاکٹر کے چیمبر سے باہر آیا۔ مرینہ کے پاس جانا چاہتا تھا۔ اسے پھر سے آئندہ کی پلاننگ کرنی تھی۔ وہ جان محمد کے والد مرحوم کے چالیسویں کے بعد ماروی کی تلاش میں لندن جانے والا تھا۔ ایک ایک دن گن رہا تھا۔ اب چالیسویں کو اٹھارہ دن رہ گئے تھے۔

مرینہ دن رات ساتھ رہنے کے لیے اس کی منکوحہ بن گئی تھی۔ لیکن اس نے جس طرح ماروی کو مراد سے دور کردیا تھا، اسی طرح بشریٰ بھی اسے مراد سے کاٹ چکی تھی۔ اسے بیڈ پر پہنچا دیا تھا۔ وہ اٹھارہ دنوں کے بعد مراد کے ساتھ سفر کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اگر حساب کیا جائے تو بشریٰ نے خوب تماشا کیا تھا۔ اس نے مرینہ کی آدھی قوت چھین لی تھی۔ اسے ماروی کی طرح گھر گرہستی والی عورت بنا دیا تھا۔ وہ آئندہ میدانِ جنگ میں مراد کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔

بات صرف یہیں تک نہیں تھی۔ اب جوانی کی گرمی اور جوش دکھانے کے لیے وہ شعلوں کی طرح لپکنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ بڑھاپے میں کمر کمزور کردیتی ہے۔ بشریٰ نے جوانی میں اس کی کمر کو لچکنے اور مٹکنے کے قابل نہیں رہنے دیا تھا۔ مراد اپنی ماروی کے مقابلے میں مرینہ کی جس تیزی طراری کا دیوانہ تھا۔ اس تیز رفتاری کو بشریٰ نے اوندھے منہ سلا دیا تھا۔

وہ اسپتال کے ایک کوریڈور سے گزرتے وقت ٹھٹک گیا۔ دوسری طرف سے آنے والی بشریٰ اور بلا بھی ٹھٹک گئے۔ ان دونوں کو پہلے سے اندازہ تھا کہ مرینہ جس اسپتال میں ہوگی، وہیں مراد بھی ہوگا۔

بلا' مراد سے ملنا چاہتا تھا اور بشریٰ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ دشمن عورت کس حال میں ہے؟ کیا پھر اس سے فائٹ ہوگی؟ یہ دیکھنا تھا کہ آئندہ اس سے کس طرح نمٹنا ہوگا؟

ان سب کے چہرے بدل گئے تھے۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کو پہچان رہے تھے۔ مراد غصے سے بشریٰ کو دیکھ رہا تھا۔ بلا آہستہ آہستہ چلتا ہوا مراد کے سامنے آیا پھر بولا۔ ''مرینہ کے ساتھ جو ہوا، اس کے نتیجے میں تمہاری تکلیف کو اور تمہارے غصے کو سمجھ رہا ہوں۔ مراد...! ہم ایک دوسرے کے جاں نثار دوست ہیں۔ پلیز غصہ تھوک دو اور ہم سے بات کرو۔''

وہ سن رہا تھا لیکن بلے کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھیں بشریٰ پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ بڑی بے باکی سے قریب آکر بولی۔ ''میں آپ کو بھائی کہتی تھی لیکن اب نہیں کہوں گی۔ ماروی کو بھی بھابی کہتی تھی لیکن اب وہ میری مظلوم بہن ہے۔ آپ کو مرینہ کی ٹوٹ پھوٹ دیکھ کر غصہ آرہا ہے۔ ایسے وقت میری بہن کے لیے سوچیں کہ آپ نے طلاق دے کر اسے کس طرح توڑ دیا ہے۔ ماروی کی تباہی پر مجھے بھی اتنا ہی غصہ آرہا ہے۔ میں بھی آپ کی طرح سلگتی رہوں گی۔ آپ کو ماروی سے دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے مرینہ سے اور آپ کے غصے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ماروی جیسی شریف عورت سے جدا کرنے والی اس ذلیل عورت کی سلامتی چاہتے ہیں تو ابھی مجھے گولی مار دیں۔ ورنہ یہ لکھ لیں کہ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''بہت بول رہی ہو۔ یہ جانتی ہو کہ کوئی دشمن مجھ سے بچ کر نہیں جاتا۔ تمہیں ایک چیونٹی کی طرح مسل ڈالنے میں ذرا دیر نہیں لگے گی۔''

اس نے بلے کو دیکھا پھر بشریٰ سے کہا۔ ''لیکن تمہیں کیسے مار ڈالوں۔ تم نے دشمنی کی ہے لیکن دوستی کی

طرح...... تم ماروی کی دوست ہو۔ بہن ہو۔ تم نے میری ماروی کے لیے مرینہ سے دشمنی کی ہے۔ میں کس زبان سے کس دل سے تمہیں دشمن کہوں؟ تمہارے جو جذبات ماروی کی بہتری کے لیے ہیں، اس کی قدر کیسے کروں؟ جبکہ دوسری طرف تم نے میری شریک حیات کو ناکارہ بنا دیا ہے۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا ہے کہ اس کی کمر کی ہڈی اتنی مضبوط نہیں ہو گی کہ وہ جمناسٹک کی مشقیں کر سکے یعنی اب وہ فائٹ کرنے کے قابل نہیں رہی ہے۔''

وہ بولی۔''خدا کا شکر ہے۔ میں نے آپ کے ساتھ بہت بڑی نیکی کی ہے۔ آئندہ آپ ایک مرد کی طرح تنہا اپنی جنگ لڑیں گے۔ یہ کبھی نہیں کہیں گے کہ دشمنوں سے نمٹنے کے لیے مرینہ ضروری ہے۔ میں نے آپ جیسے مرد میدان کے لیے اسے غیر ضروری بنا دیا ہے۔''

مراد کے ذہن کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ وہ ماروی سے یہی کہا کرتا تھا کہ جرائم کی دنیا میں مرینہ اس کے لیے ضروری ہے۔ اب وہ بھی ماروی کی طرح گھر کی چار دیواری میں رہنے والی بی بی جی بن گئی تھی۔

وہ زیادہ سے زیادہ گن چلا سکتی تھی لیکن گن چلانے کے لیے بھی دوڑنا' بھاگنا' نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے چھلانگیں مارنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ گن فائٹر کی حیثیت سے بھی قابلِ اعتماد نہیں رہی تھی۔

وہ جھاگ کی طرح ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ یہ بات دل کو لگ رہی تھی کہ مرینہ اب دشمنوں سے لڑنے اور اپنی حفاظت آپ کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ آئندہ کبھی دشمنوں سے مقابلہ ہوگا تو اسے اپنے ساتھ مرینہ کی بھی حفاظت کرنا ہو گی۔ وہ جنگ کے میدان میں بوجھ بننے والی تھی۔

یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ ماروی کی طرح اسے گھر کی چار دیواری میں بٹھا کر رکھنا ہوگا۔ ماروی کی ہائے لگ رہی تھی۔ جو اس کے ساتھ ہوا، وہی اب مرینہ کے ساتھ ہونے والا تھا۔ ماروی تو ہر اعتبار سے مکمل تھی۔ مرینہ آدھی بھی نہیں رہی تھی۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ پھر بینچ پر سے اٹھتے ہوئے بشریٰ کو دیکھ کر بولا۔''مجھ سے بحث نہ کرنا۔ جو کہہ رہا ہوں، اسے مان لو۔ مرینہ سے جو عداوت ہے، اسے یہیں ختم کر دو اور واپس چلی جاؤ۔''

پھر وہ بیٹے سے بولا۔''اسے یہاں سے لے جاؤ۔''

وہ جواب سنے بغیر ان سے منہ پھیر کر چلا گیا پھر آگے جا کر کوریڈور کے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بشریٰ نے کچھ کہنے سے پہلے ہی چپ چاپ اسپتال سے باہر جانے لگی۔

☆☆☆

قلندر شاہ دو دنوں اور دو راتوں تک ٹارچر سیل میں جاگتا رہا تھا۔ اسے سزا کے طور پر سونے نہیں دیا گیا۔ جب بھی اسے اونگھ آتی تو بدن پر چابک پڑتی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر چیخنے لگتا تھا۔ کبھی گرم پانی کی پتلی سی دھار اسپرے کی جاتی تھی۔ وہ تکلیف کی شدت سے تڑپنے اور پھڑ پھڑانے لگتا تھا۔ نیند ہوا ہو جاتی تھی۔

جیل سے فرار ہونے کے بعد وہ ایک سوزوکی کے پچھلے حصے میں آ کر چاروں شانے چت ہو گیا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ گاڑی کون چلا رہا ہے؟ اور وہ جیل سے نکل کر کہاں پہنچنے والا ہے؟ اس نے خود کو حالات کے دھارے پر بہنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس کی پہلی اور آخری خواہش تھی کہ وہ سو جائے۔ اب اگر نہیں سوئے گا تو مر جائے گا۔ وہ گاڑی کے پچھلے حصے میں چاروں شانے چت ہو کر کھلے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں بند کر رہا تھا۔ آسمان کی بلندی پر بے شمار غبارے پستی کی طرف آ رہے تھے۔ وہ اتنے سارے رنگین غباروں کو دیکھ کر حیران ہونے اور ان میں دلچسپی لینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند ہوتے ہوتے اتنا ہی دیکھا تھا کہ وہ تمام غبارے اس پر آ گئے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ سے غافل ہو گیا تھا۔ ایسی گہری نیند آئی تھی جیسے مر گیا ہو۔

ایسے وقت اسے گولیوں سے چھلنی کیا جاتا تو وہ کسی تکلیف کے بغیر آرام سے مر جاتا۔ بے ہوشی کی نیند آدمی کو اسی طرح زندہ لاش بنا دیتی ہے۔ پہلے بھی پل چرخی جیل کو توڑ کر قیدیوں کو رہا کرایا گیا تھا۔ اس بار حریت پسندوں نے منظم ہو کر جیل پر حملہ کیا تھا۔ وہاں ان کے کئی جاں باز ساتھی قیدی بنے ہوئے تھے۔ قلندر شاہ حریت پسند نہیں تھا۔ اس نے معاوضہ لے کر دو امریکی آرمی افسران کو ہلاک کیا تھا۔ وہ حملہ آور اسے بھی رہائی دلا کر پھر آرمی کے افسران کو ہلاک کرانا چاہتے تھے۔ حملہ ایسا زبردست تھا جیسے کسی ملک کی فوج آ گئی ہو۔ صرف گولیاں نہیں چلی تھیں۔ بموں کے دھماکے بھی ہوئے تھے۔ جیل کا عملہ اپنی جانیں بچانے کی فکر میں تھا اور قیدی تتر بتر ہو کر بھاگ رہے تھے۔

جیل کے باہر حریت پسندوں کی کئی گاڑیاں اپنے ساتھیوں کو لے جانے کے لیے موجود تھیں۔ ان کے ڈرائیور

باہر آنے والے قیدیوں کو اپنی گاڑیوں کی طرف بلا رہے تھے اور انہیں بٹھا کر لے جا رہے تھے۔ ایسے ہی وقت ایک ڈرائیور قلندر شاہ کا ہاتھ پکڑتا ہوا اسے اپنی گاڑی کے پچھلے حصے میں لایا تھا اور اس ڈرائیور کا اور اس گاڑی کا تعلق حریت پسندوں سے نہیں تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی بڑی بے باکی سے ان کے درمیان اپنی گاڑی لا کر قلندر شاہ کو وہاں سے کسی اور سمت لے جائے گا۔

حریت پسندوں کو اور جیل سے نکلنے والے قیدیوں کو اپنی سلامتی کی فکر تھی۔ وہ آرمی کے آنے سے پہلے وہاں سے دور نکلتے چلے گئے تھے۔ انہیں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کرائے کا شوفر ان کے ساتھ نہیں آیا ہے۔ کسی دوسری طرف نکل گیا ہے۔

وہ سوزوکی..... تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی پچیس کلومیٹر تک چلی گئی تھی۔ پھر ایک ویران سے کچے راستے پر جا کر رک گئی۔ وہاں ایک پجیرو اور دو ویگن کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان گاڑیوں میں مسلح عورتیں تھیں۔ وہ سب ڈارک بلیو جینز اور جیکٹ میں تھیں۔ ان کی کمر سے کارتوس کی پیٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ہولسٹر میں ریوالور تھے اور ہر ایک کے ہاتھوں میں جدید ماڈلز کی رائفلیں تھیں۔ وہ عورتیں سوزوکی کے پیچھے آ کر رک گئیں۔ وہاں بے شمار رنگین غباروں نے قلندر شاہ کو ڈھانپ لیا تھا۔ ان غباروں کی ہوا نکل گئی تھی۔ پھر بھی چند غبارے ایک ذرا سے پھولے ہوئے تھے۔ ان عورتوں نے غباروں کو وہاں سے ہٹایا تو اس سے بندھے ہوئے تین پلاسٹک کے لفافے دکھائی دیے۔

جب وہ غبارے دلی سے چلے تھے تو ان کے ساتھ دو پلاسٹک کے لفافے تھے۔ اب تین ہو گئے تھے۔ ایک عورت نے پجیرو کے سامنے آ کر فوجی انداز میں سیلیوٹ کیا۔ وہاں اگلی سیٹ پر ایک جوان صحت مند خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا نام نگارا خانم تھا۔ وہ ان مسلح عورتوں کی ملکہ معظمہ تھی۔ باقی تمام محکوم تھیں۔ سیلیوٹ کرنے والی عورت نے کہا۔ ''ہر ہائی نس! اس کی آنکھیں بند ہیں۔ اسے ہلاؤ تو ہلتا نہیں ہے۔ جگاؤ تو جاگتا نہیں ہے۔ وہ ایک لاش کی طرح پڑا ہے۔''

نگارا خانم نے پوچھا۔ ''سانسیں چل رہی ہیں؟''

''جی خانم جان! وہ سانسیں لے رہا ہے۔''

''اسے یہاں پجیرو میں لا کر ڈالو۔ اسے فرسٹ ایڈ پہنچاؤ۔''

اس عورت نے دوسری عورتوں کو یہی حکم دیا۔ دو عورتیں قلندر شاہ کو کاندھوں پر اٹھا کر لے آئیں، اسے پجیرو کی آخری سیٹ پر لٹا دیا۔ ایک عورت نے کہا۔ ''قلندر شاہ کے اوپر بہت سے رنگین غبارے تھے۔ ان غباروں سے یہ تین لفافے بندھے ہوئے تھے۔''

اس عورت نے وہ لفافے نگارا خانم کو پیش کیے۔ خانم نے ان پلاسٹک کے لفافوں کو لے کر انہیں الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس عورت نے کہا۔ ''یہ لفافے ان غباروں کے ساتھ کہیں سے اڑتے ہوئے آئے ہوں گے۔''

نگارا خانم نے ان لفافوں کو دیکھتے ہوئے زیرلب کہا۔ ''تعجب ہے۔ یہ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جانے والے تھے؟ کیا غباروں کے ذریعے خفیہ پیغام رسانی ہو رہی ہے؟''

وہ گاڑیاں آگے بڑھ گئیں۔ اس نے ایک لفافے کو کھول کر دیکھا۔ اس میں جو تہ کیے ہوئے کاغذات تھے، ان پر لکھی ہوئی تحریر پڑھ نہ سکی۔ تحریر اردو زبان میں تھی اور وہ ازبک خاتون تھی۔ ان کاغذات میں مراد نے ماروی کو محبت بھرا پیغام لکھا تھا۔ اس نے اپنی غلطی پر پچھتاتے ہوئے ماروی سے التجا کی تھی کہ اس کی زندگی میں واپس آ جائے۔

خانم جان نے دوسرے لفافے کو کھولا۔ اس کی تحریر بھی اردو زبان میں تھی۔ مراد نے جن کے ہاتھوں میں وہ غبارے پہنچنے والے تھے، ان سے گزارش کی تھی کہ وہ نئے غباروں کے ذریعے اس کے پیغام کو آگے بڑھا دیں۔ اس مقصد کے لیے اس نے لفافے کے اندر ایک ہزار ڈالرز رکھے تھے۔ نگارا خانم کا تجسس بڑھ گیا کہ ہزار ڈالرز کے ساتھ اردو زبان میں کیا لکھا ہے؟

پجیرو کے آگے پیچھے مسلح عورتوں سے بھری ہوئی دو گاڑیاں تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھیں۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں پتا چل رہا تھا کہ وہ قافلہ کسی پہاڑی علاقے کے نشیب و فراز سے گزر رہا ہے۔

خانم نے تیسرے لفافے کو کھولا۔ اس میں انگریزی زبان تھی۔ انڈین آرمی نے لکھا تھا۔ ''انسان ازل سے محبت کا بھوکا ہے۔ وہ جس سے محبت کرتا ہے، اس سے اپنے لیے بھی چاہت کی تمنا کرتا ہے۔ یہ بدنام زمانہ انتہائی خطرناک مجرم مراد علی منگی کا پیار بھرا پیغام اپنی ماروی کے نام ہے۔''

مراد علی منگی کا نام پڑھتے ہی خانم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ آگے لکھا ہوا تھا۔ ''اس نے ماروی کو طلاق دے کر غلطی کی تھی۔ اب وہ پچھتا رہا ہے۔ اپنی غلطی کا اعتراف

کرتے ہوئے اس سے واپس آنے کی التجا کر رہا ہے۔ یہ غبارے بھارت کی راجدھانی دہلی سے چھوڑے گئے ہیں۔ یوں معلوم ہو چکا ہے کہ مطلوب اور مفرور مجرم مراد علی منگی دہلی میں ہے لیکن ماروی کا سراغ نہیں مل رہا ہے۔ اسے تمام ملکوں کے سراغ رساں تلاش کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ مراد بھی نہیں جانتا کہ وہ کہاں گم ہو گئی ہے۔ شاید فون کے ذریعے بھی ان کے درمیان رابطہ نہیں رہا ہے۔ اس لیے مراد غباروں کے ذریعے اپنی محبت اپنی التجا ماروی تک پہنچا رہا ہے۔ ہم نادان نہیں ہیں۔ یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ بچوں کا کھیل ہے۔ ہم عقل و فراست والے نہیں جانتے کہ روپوش رہنے والی کہاں ہے؟ پھر گونگے، بہرے اور اندھے غبارے اس دلنواز محبوبہ تک کیسے پہنچیں گے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کبھی ماروی تک نہیں پہنچیں گے۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے۔ اندازے سے ہوا میں چلایا ہوا تیر اتفاقاً نشانے پر آکر پیوست ہو جاتا ہے۔ مسافر اندھیری راتوں میں بھٹکتے بھٹکتے اچانک منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

''یہ غبارے انٹرپول اور تمام دنیا کی انٹیلی جنس سروس کی نگرانی میں رہیں گے۔ اگر یہ منزل تک پہنچیں گے تو ہم بھی ماروی تک پہنچ جائیں گے۔ مراد علی منگی دہلی میں ہے۔ لیکن تلاش بسیار کے باوجود گرفت میں نہیں آرہا ہے۔ ہم اسے ماروی کے ذریعے آسانی سے گرفتار کر سکیں گے۔ آپ سے گزارش ہے کہ ان لفافوں کو نئے اور تازہ دم غباروں کے ذریعے آگے اڑا دیں۔ اس سلسلے میں اخراجات کے لیے ایک ہزار ڈالرز لفافے میں موجود ہیں۔''

نگارا خاتون ایک ریاست کی ملکہ تھی۔ اس کا تعلق جرائم کی دنیا سے نہ ہوتے ہوئے بھی تھا۔ وہ مراد کی ہسٹری جانتی تھی۔ اسے اپنی ضرورت کے لیے استعمال کرنے کی ایک عرصے سے خواہش تھی۔ وہ اسے گھیرنے اور اپنے شکنجے میں رکھنے کی اکثر پلاننگ کرتی رہتی تھی لیکن ماروی تک پہنچنے کا وہ بچکانا کھیل عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کی بھی عقل نہیں مان رہی تھی اور وہ اسی پہلو سے سوچ رہی تھی کہ کھیلنے میں حرج ہی کیا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ انہونی ہو ہی جائے۔

اس نے تینوں لفافوں کو اپنے ہینڈ بیگ میں رکھتے ہوئے سوچا۔ صبح تک اپنی ریاست میں پہنچ کر مراد کی لکھی ہوئی اردو تحریر کسی سے پڑھوائے گی اور توجہ سے سنے گی۔ پھر ان لفافوں کے ذریعے ماروی اور مراد تک پہنچنے کی تدبیر کرے گی۔

وہ ازبکستان کے جنوبی علاقے میں چالیس کلومیٹر کے رقبے تک پھیلی ہوئی زمینوں کی مالکہ تھی۔ وہاں اس کی ماں اور دادی کے زمانے سے عورتوں کی ایک ریاست قائم تھی۔ اس ریاست کے قوانین کے مطابق عورتیں برتر تھیں اور مرد ان سے کمتر بن کر رہتے تھے۔

اس کی دادی جان دلشاد خانم نے اس ریاست کی بنیاد ڈالی تھی۔ دادی جان نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا کہ اس کے دادا جان جبار بن فرغب بہت ہی عیاش، ظالم اور جابر تھے۔ دادی دلشاد خانم بھی بہت ہی ضدی اور خودسر تھیں۔ انہیں یہ ناانصافی پسند نہیں تھی کہ شوہر حرم سرا میں کنیزوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا رہے اور وہ اس کے انتظار میں تمام رات کروٹیں بدلتی رہے۔ یہ سب سوچ کر اس کے دل و دماغ میں بغاوت بھر گئی کہ مرد اپنی بیوی کو چھوڑ کر دوسری عورتوں کے ساتھ بے حیائی کیوں کرتا ہے؟

جب جبار بن فرغب کو اس کے خیالات کا علم ہوا تو وہ بولا۔ ''بیوی کو اولاد پیدا کرنے کے لیے پردوں میں رکھا جاتا ہے تاکہ وہ کسی دوسرے مرد سے میلی نہ ہو اور صرف ہماری خالص اولاد پیدا کرے۔''

وہ بولی ''اگر آئندہ نسل باپ کے نام سے نہ چلے۔ ماں کے نام سے چلے تو پھر حیا و شرم کا جھگڑا نہیں رہے گا۔ اگر بے حیائی مرد کے لیے ہو تو عورت کے لیے بھی ہو۔ اگر نسل ماں سے چلے تو پھر کوئی بے حیا نہیں کہلائے گا۔''

یہ کہتے ہی دلشاد خانم نے اپنے لباس کے اندر سے پستول نکال کر کہا۔ ''میں پوری تیاریاں کر چکی ہوں۔ فوج کے سپہ سالار کو اپنا دیوانہ بنا چکی ہوں۔ تمہارے مرتے ہی فوج میرے کنٹرول میں رہے گی۔ اس کے بعد میں یہاں اپنی من مانی حکومت قائم کروں گی۔''

یہ کہتے ہی اس نے ریاست کے حکمران کو گولی مار دی۔ شاہ کے قتل پر مخالفین نے آواز اٹھائی تو آری کے جوانوں نے انہیں بھی گولیوں سے بھون ڈالا۔ پھر کہیں سے بغاوت نہیں ہوئی۔ ایک خاتون کے حکمران ہونے پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

ڈائری میں لکھا تھا کہ دلشاد خانم بڑی ٹھوس پلاننگ پر عمل کرتی رہی۔ اس کے حکم کے مطابق عورتیں زیادہ سے زیادہ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنے کے لیے ٹریننگ حاصل کرنے لگیں۔ تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیاں کیڈٹ کالج میں داخلہ لینے لگیں۔ نئے قوانین کے مطابق عورتوں اور مردوں کے حقوق برابر رکھے گئے۔

دلشاد خانم خفیہ حکمتِ عملی سے ذہین اور شہ زور

مردوں کو کمزور بناتی رہی۔ دس بارہ برسوں میں عورتیں تمام سیاسی اور سماجی شعبوں میں اعلیٰ عہدیدار بن گئیں۔ مرد ان کے ماتحت ہوتے چلے گئے۔ یعنی وہ مرحلہ آگیا کہ ملازمت کرنے والے مرد اپنی افسران بیویوں کو سیلیوٹ کرنے لگے۔

کوئی چالیس برس پہلے وہ ریاست'روس کے ماتحت تھی۔ ان دنوں ناروے'ڈنمارک' جرمنی اور روس کی کئی ریاستوں میں یہ قانون پاس کرایا گیا تھا کہ اولاد کو ماں کے نام سے پکارا جائے گا۔ یہ کہا گیا کہ شرم وحیا کے الفاظ عورتوں کو فریب دینے کے لیے تھے۔ آئندہ مرد ایک سے دوسری عورت کے پاس جائے کوئی بات نہیں۔ اب عورت بھی اپنی پسند کے دوسرے مرد کے پاس جاسکتی ہے۔ جب چاہے، جس وقت چاہے، عورت اپنے شوہر سے طلاق لے سکتی ہے۔

دلشاد بیگم کی وفات کے بعد اس کی بیٹی عظمیٰ خانم نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس نے اعلان کیا کہ زیادہ سے زیادہ بیٹیاں پیدا کرنے والی عورتوں کو نقد رقم انعام کے طور پر دی جائے گی۔ بیٹے پیدا کرنے والیوں کی دل شکنی کی جاتی تھی۔

اسکول کی درسی کتابوں میں یہ لکھا ہوتا تھا کہ مرد سے زیادہ عورت اہم ہے۔ وہ پیدا کرتی رہتی ہے۔ تب ہی یہ دنیا آباد ہوتی ہے۔

عظمیٰ خانم نے شادیاں کیں اور طلاقیں بھی لیتی رہی۔ کیونکہ ان مردوں سے بیٹے پیدا ہوتے رہے۔ جب بھی الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ نے بتایا کہ بیٹا ہوگا تو اس نے فیملی ڈاکٹر کو حکم دیا کہ اسے عورت بنادو۔

بیٹے کی پیدائش کے بعد ڈاکٹر اسے دوائیں دیتی تھی FEMINIZING HARMONES جیسی دوا کے ذریعے اس بیٹے میں عورت پن پیدا ہوتا تھا۔ یوں وہ خسرا بن کر رہ جاتا تھا۔

عظمیٰ خانم یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بعد کوئی بیٹا حکمراں بنے اور مردوں کی حکومت قائم کرے اور اس کی ریاست میں مرد پھر سے عورتوں پر حاوی ہوجائیں۔ اس نے دس برسوں میں چار شوہروں سے طلاقیں لیں۔ پھر پانچویں شوہر سے نگارا خانم پیدا ہوئی۔ نگارا نے جوان ہوکر اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے حکومت کی ذمے داریاں سنبھالیں۔ اس سے پہلے جو بھائی پیدا ہوئے تھے، وہ سب حکمران بننے کے قابل نہیں رہے تھے۔

نگارا خانم نے اپنی ریاست کا نام "باب النساء" رکھا اور کہا۔ "عورت اس دنیا میں آنے کا پہلا دروازہ ہے۔ اسے عزت دو۔ یہ اپنی کوکھ میں تمہیں زندگی کی سانسیں دیتی ہے۔ اس دنیا میں آتے ہی پہلی خوراک دودھ کا پہلا قطرہ بھی پلاتی ہے۔ صرف عورت ہی وہ نقطۂ آغاز ہے جہاں سے تم زندگی کا سفر شروع کرتے ہو۔ میری مدر اور گرینڈ مدر نے بڑی محنت سے بڑی ذہانت سے عورتوں کی یہ حکومت قائم کی ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ آس پاس کے ملکوں میں بھی عورتیں حکمران بن جائیں۔"

لیکن مرد کا وجود سمجھاتا ہے کہ بے شک عورت دنیا میں آنے کا پہلا دروازہ ہے مگر دروازہ کھولتا وہی ہے۔ جس طرح مرد عورت کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا۔ اسی طرح عورت بھی مرد کی ضرورت سے نہ انکار کرسکتی ہے نہ اس کے بغیر دنیا کو آباد رکھ سکتی ہے۔ جھگڑا صرف طاقتور اور حکمران بننے کا تھا۔ مرد جسمانی طور پر شہ زور ہوتا ہے۔ عورت کمزور ہوتی ہے لیکن حکمرانی جسمانی قوت سے حاصل نہیں ہوتی۔ صرف ذہانت اور مکاری کی ملی جلی سیاست سے حاصل ہوتی ہے۔

اب نگارا خانم کی ریاست میں مرد محکوم اور مظلوم تھے۔ جس طرح مرد عورتوں کو پھولوں کی طرح رکھتے ہیں اور اپنے مفادات کی خاطر انہیں پاؤں کی جوتیاں بھی بنا دیتے ہیں، اسی طرح باب النساء کی ریاست میں مردوں کو جینے کے تمام حقوق دیے جاتے تھے۔ لیکن عورتوں کے خلاف سر اٹھانے والوں کو سختی سے کچل دیا جاتا تھا۔

کون ایسی دل والی ہے'جو مراد علی منگی کی خوبروئی اور مردانہ وجاہت سے متاثر نہیں ہوتی تھی۔ نگارا نے اس کی ایک بہت ہی مختصر سی ویڈیو فلم دیکھی تھی۔ اس کی گرجنے برسنے والی اور پیار سے دل میں گھس جانے والی آواز ویڈیو ریکارڈر کے ذریعے سنی تھی اور اس کے لیے پاگل ہوگئی تھی۔

اس نے ماسٹر کو بوبو سے رابطہ کیا تھا اور اس سے مراد کا فون نمبر طلب کیا تھا۔ ماسٹر نے کہا تھا۔ "سوری۔ مراد علی منگی صرف مجھ سے ضرورت کے وقت باتیں کرتا ہے۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم اسے ڈسٹرب کرو۔"

"ماسٹر! تم انکار کرکے میری انسلٹ کررہے ہو۔ میں کوئی معمولی عورت نہیں ہوں۔ شمالی ایشیا کی ایک ریاست کی حکمران ہوں۔ تمہیں اس علاقے میں میری ضرورت پیش آسکتی ہے۔"

"جرائم کی دنیا کا کوئی بھی سنگین مسئلہ ہو اسے مراد حل

کردیتا ہے۔ وہ ہتھیاروں کا ناقابل شکست بازی گر ہے۔ مجھے کبھی تمہاری ضرورت پیش نہیں آئے گی۔''

ماسٹر کے غرور اور انکار نے اس کے آتش شوق کو اور بھڑکا دیا۔ ایک حکمران عورت کی انا اور خودداری کو ٹھیس پہنچی تھی۔ اس نے غصے میں آکر اپنے شوہر کو طلاق دے دی۔ وہ مراد کے مقابلے میں کمتر لگ رہا تھا۔ پھر یہ اپنی ازدواجی زندگی میں تبدیلی لانا چاہتی تھی۔

مراد کے متعلق اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ ماروی کا دیوانہ ہے۔ نگارا خانم جیسی ملکہ معظمہ کو بھی اپنی منکوحہ نہیں بنائے گا۔ اس نے حقارت سے سوچا تھا کہ ماروی کی کیا اوقات ہے۔ اسے ایک چٹکی میں مسل دے گی تو دیوانہ اس کے قدموں میں آجائے گا۔

اس نے میکی براؤن سے رابطہ کیا۔ اس سے کہا کہ مراد سے بات کرائے۔ اس نے ایک نمبر دیتے ہوئے کہا۔ ''اس نمبر پر کبھی اس سے رابطہ ہوجاتا ہے۔ لیکن اکثر مایوسی ہوتی ہے۔ وہ نمبر بدل دیتا ہے۔''

نگارا نے اس نمبر کو کئی بار آزمایا۔ کال کرنے کے علاوہ میسج بھی دیے لیکن مایوس ہوتی رہی۔ اٹلی کے انڈر ورلڈ کے ایک سربراہ نے کہا۔ ''قلندر شاہ ایک جاسوس بھی ہے اور خطرناک شوٹر بھی۔ وہ مراد پر دو بار زبردست حملے کرچکا ہے۔ وہ قسمت کا دھنی ہے۔ اس لیے بچ گیا۔ کسی دن اسی قلندر شاہ کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ وہ کرائے کا قاتل اور جاسوس ہے۔ اس کی خدمات حاصل کرو۔ وہ مراد کو ٹریپ کرسکے گا۔''

اس نے نگارا کو قلندر شاہ کا فون نمبر دیا۔ نگارا نے وہ نمبر پنچ کیے تو رابطہ ہونے پر کسی نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''کون ہو تم؟ قلندر شاہ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

وہ بولی۔ ''یہ اس کا فون ہے۔ میری اس سے بات کراؤ۔''

جواب ملا۔ ''وہ قاتل ہے۔ دو امریکی افسران کو ہلاک کرچکا ہے۔ اس وقت پل چرخی جیل میں ہے۔ اسے یہاں دو دنوں تک رکھا جائے گا۔ تیسرے دن صبح اسے گولی ماردی جائے گی۔''

اس نے ناگواری سے فون بند کرکے سوچا۔ ''یہ کیا ہوگیا؟ جو میرے کام آنے والا تھا۔ وہ پرسوں حرام موت مر جائے گا۔''

پھر اس نے سوچا۔ ''میں افغانی حریت پسندوں کو مالی امداد دیتی ہوں۔ ہتھیار بھی سپلائی کرتی ہوں۔ وہ شاید اسے بچانے کی کوشش کرسکیں گے۔''

اس نے حریت پسندوں کے کمانڈر سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ''میرے کام کا ایک آدمی قلندر شاہ پل چرخی جیل میں ہے۔ پرسوں صبح اسے گولی ماردی جائے گی۔ کیا اسے کسی طرح بچایا جاسکتا ہے؟''

اسے جواب ملا۔ ''ہم کل رات جیل توڑنے والے ہیں۔ ہمارے کئی ساتھی وہاں قیدی ہیں۔ ہمارے لیے قلندر شاہ بھی ضروری ہے ہم اسے نکال لائیں گے۔''

''پلیز اسے میرے حوالے کردیں۔''

''وہ آپ کو مل جائے گا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد۔ یہاں کی اہم شخصیات کو وہی ٹھکانے لگا سکتا ہے۔ جب ہمارا کام ہوجائے گا تو ہم اسے آپ کے حوالے کردیں گے۔''

''آپ کے خطرناک کام میں وہ پھر پکڑا جاسکتا ہے یا مارا جاسکتا ہے۔''

''ہم جان جوکھم میں ڈالنے والے مجاہد ہیں۔ موت سے نہیں ڈرتے۔ قلندر شاہ مجاہد نہیں ہے۔ پیسوں کے لیے کام کرتا ہے۔ کرتا ہے مرتا ہے۔ ابھی تو زندہ ہے۔ ہم خطرات مول لے کر اسے وہاں سے نکالیں گے اور اس سے اپنا کام پہلے کرائیں گے۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ یہ یقین تھا کہ حریت پسند اسے جیل سے نکال لیں گے لیکن اپنے مقاصد کے لیے اسے پھر آگ میں جھونکیں گے۔ کیوں نہ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر قلندر شاہ کو یہاں لے آؤں؟

مراد ملکہ عالیہ کے دل و دماغ میں گھس گیا تھا۔ اسے حاصل کرنے کے لیے قلندر شاہ ضروری ہوگیا تھا۔ اس نے حریت پسندوں کے لیڈر سے کہا۔ ''مجھے بتاؤ کہ کس وقت جیل پر حملہ کیا جائے گا۔ میں ٹھیک اس وقت اسلحے سے بھرا ہوا ٹرک وہاں پہنچاؤں گی۔''

انہوں نے مزید اسلحہ حاصل کرنے کے لیے یہ راز کی بات بتادی کہ ٹھیک صبح چار بجے جیل کے صدر دروازے پر پہلا دھماکا ہوگا اور ان کی کئی گاڑیاں جیل سے کچھ فاصلے پر اپنے قیدی ساتھیوں کو لے جانے کے لیے کھڑی رہیں گی۔

نگارا خانم نے وعدے کے مطابق ایک گاڑی میں اسلحہ پہنچایا اور وہیں سے دوسری گاڑی میں قلندر شاہ کو اغوا کر کے لے آئی۔

وہ پجیرو کی پچھلی سیٹ پر گہری نیند میں تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ بے ہوشی کی نیند سونے کے دوران اس کے ساتھ کیا ہورہا ہے اور جیل سے نکلنے کے بعد اسے کہاں پہنچایا

جارہا ہے؟

نگارا خانم اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں وہ تین لفافے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جس مراد علی منگی کو وہ حاصل کرنا چاہتی ہے، وہ اس کے ہاتھوں میں آگیا ہے۔

اس کی تحریر غباروں کے ذریعے ہوا میں اڑتی ہوئی آئی تھی۔ دل کہہ رہا تھا۔ یہ قدرتی اشارہ ہے۔ جسے چاہتی ہے، اس کا نامہ محبت آیا ہے۔ وہ بھی جلد آجائے گا۔

وہ صبح دس بجے تک اپنی سلطنت میں پہنچ گئی۔ شاہی محل کے احاطے میں گاڑیاں رک گئیں۔ درجنوں مسلح عورتیں فوجی انداز میں متحرک تھیں۔ قلندر شاہ کو پچھلی سیٹ سے نکال کر ایک اسٹریچر پر ڈال رہی تھیں۔

نگارا نے اس کے قریب آکر دیکھا۔ سر سے لے کر پاؤں تک اس کے بدن کی جلد ایسی ہوگئی تھی جیسے اسے آگ میں رکھ کر بھونا گیا ہو۔

نگارا نے دل میں کہا۔ ''اس پر بڑے مظالم ڈھائے گئے ہیں۔ بڑا جی دار ہے۔ ناقابل برداشت تشدد اور اذیتوں سے گزر کر بھی زندہ ہے۔''

اس نے حکم دیا۔ ''اسے اسپیشل ٹریٹمنٹ دو۔ شاہی محل کے ڈاکٹر اس کا علاج کریں گے۔ میں اسے جلد سے جلد صحت یاب دیکھنا چاہتی ہوں۔''

اس نے محل کے اندر آکر مختلف زبانوں کے ترجمان کو طلب کیا۔ ان میں سے ایک خاتون اردو زبان جانتی تھی۔ نگارا نے اسے دو لفافے دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ اردو زبان میں کچھ لکھا ہوا ہے انہیں پڑھ کر سناؤ۔''

وہ اس کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ کر مراد کی تحریر پڑھنے لگی۔

''ماروی......! میری زندگی! میری جان! تم کہو گی طلاق کے بعد میری جان نہیں رہی ہو۔

''میں کہتا ہوں، میری جان ہو اور ہمیشہ رہو گی۔ تم صرف جسمانی طور پر دور ہوگئی ہو۔ محبت کا کوئی جسم نہیں ہوتا۔ یہ احساسات اور جذبات سے بھرپور روح ہوتی ہے۔''

نگارا خانم نے دل میں کہا۔ ''واہ کیا دل کو لگنے والی بات لکھی ہے۔ واقعی یہ ماروی کا سچا عاشق ہے۔''

وہ پڑھ رہی تھی۔ ''تمہاری محبت کی روح آخری سانس تک میرے اندر رہے گی جب تک جیوں گا۔ تم میری جان رہو گی۔ تمہیں چھوڑنا اور تم سے دور ہونا بہت ہی تلخ تجربہ ہے...''

نگارا سن رہی تھی اور دل میں کہہ رہی تھی۔ ''میں ایسا ہی چاہنے والا دیوانہ بن کر رہنے والا لائف پارٹنر چاہتی ہوں۔ اس کی تحریر سن کر یقین نہیں ہوتا کہ یہ گولیاں چلاتا ہے اور اب تک درجنوں لاشیں گرا چکا ہے۔ یہ تو صرف دل میں اتر جانے والا شاعر لگتا ہے۔''

اس نے آخر میں ماروی کو لکھا تھا۔ ''تم جانتی ہو۔ تمہارے بغیر سکون سے جی نہیں سکوں گا۔ یہ نہیں جانتی ہو کہ تمہیں دیکھے بغیر مر بھی نہیں سکوں گا۔

''اگر تم چاہتی ہو کہ مجھے غلطی کی سزا ملے اور میں مر جاؤں تو ابھی آجاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ تمہیں دیکھتے ہی جان دے دوں گا ایک سانس کے بعد دوسری سانس نہیں لوں گا۔''

نگارا خانم کے دل سے ہائے نکلی۔ ''ہائے! ایسی محبت کرنے والا شہ زور اور ناقابل شکست مرد میدان ایک بار مجھے مل جائے تو میں اس کے قدموں سے لپٹ کر زنجیر بن جاؤں گی۔ اسے پھر کہیں جانے نہیں دوں گی۔''

مرینہ بھی یہی کرتی آرہی تھی۔ اب نگارا بھی اسے زنجیروں سے باندھ کر رکھنا چاہتی تھی۔ اور وہ اب تک صرف ماروی سے ہی بندھا ہوا تھا۔

وہ مراد کی تحریر کو ہاتھ میں لیے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ ماروی میں ایسی کیا بات ہے کہ اسے طلاق دے کر چھوڑنے کے بعد پھر پکڑنا چاہتا ہے؟

اس کے اندر جو بھی خوبی ہو۔ اسے زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ جب تک اس کا وجود رہے گا۔ وہ میری طرف مائل نہیں ہوگا۔

مجھے مراد سے پہلے ماروی کو ڈھونڈنا اور اس کے وجود کو نابود کردینا چاہیے۔

لیکن یہ بات سمجھ سے باہر ہے۔ غبارے ایک عاشق کا پیغام وہیں کیسے لے جائیں گے، جہاں وہ موجود ہوگی؟

وہ فون کے ذریعے اور اسکائپ کے ذریعے مختلف ممالک کے حکمرانوں سے رابطہ کرکے یہ سوال کرنے لگی۔ اسے یہی جواب ملا کہ مراد ایک طویل عرصے سے چیلنج بنا ہوا ہے۔ وہ ہوا کی طرح موجود ہے لیکن مٹھی میں نہیں آرہا ہے۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ کسی میجک کے ذریعے وہ لفافے ماروی کے پاس پہنچیں گے۔ اکثر بہت سی کرامات اور کرشمے ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔

ملکہ نگارا خانم نے کہا۔ ''میں ماروی اور مراد کے

معاملے میں دل کی گہرائیوں سے ملوث ہو گئی ہوں۔ وہ غبارے اور لفافے میرے پاس پہنچ گئے ہیں۔ اب میں ایسی تیاریوں کے ساتھ انہیں آگے بڑھانا چاہتی ہوں کہ یہ آگے جا کر کسی کے ہاتھ نہ لگیں۔ میں دن رات ان کی نگرانی کروں گی۔''

اس سے پوچھا گیا۔ ''آپ کس طرح دن رات نگرانی کر سکیں گی؟''

اس نے کہا۔ ''میرا ایک ہیلی کاپٹر ان غباروں کے تعاقب میں رہا کرے گا۔''

''غبارے کی رفتار بہت سست رہتی ہے۔ کیا ہیلی کاپٹر دن رات سست رفتاری سے فضا میں معلق رہے گا؟''

''میرا ہیلی کاپٹر غباروں سے دور رہا کرے گا۔ زیادہ تر زمین پر رہے گا۔ وہ جس ملک کے آسمان پر جاتا رہے گا، اس ملک کی ایجنسیاں اپنی سرحد تک مجھے فون پر رپورٹ دیتی رہیں گی۔ جب غبارے ان کی ملکی سرحد سے آگے جائیں گے تو میرا ہیلی کاپٹر پرواز کرتا ہوا پھر ان کی نگرانی کرے گا۔ میں نے طریقہ کار اچھی طرح طے کر لیا ہے۔ ان غباروں اور لفافوں کو دریا یا سمندر میں ڈوبنے نہیں دوں گی۔ جب تک وہ ماروی کے ہاتھوں میں نہیں پہنچیں گے، تب تک انہیں زمین پر گرنے نہیں دوں گی۔ نئے غباروں کے ذریعے پھر انہیں آگے بڑھا دوں گی۔''

نگارا خانم نے ان تینوں لفافوں کو اپنے سیف میں رکھتے ہوئے زیر لب کہا۔ ''کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں ایسی تیاریوں کے ساتھ غبارے اڑاؤں گی کہ کسی پہلو سے ناکامی نہیں ہو گی۔ اگر وہ کرامات سے، کرشمے سے یا جادوئی عمل سے پہنچنے والے ہیں تو میں بھی ان کے ساتھ ماروی کی شہ رگ تک پہنچ جاؤں گی۔''

اس نے لفافے کو دیکھ کر کہا۔ ''مراد! یہ لکھ لو کہ تم صرف میرے لیے پیدا ہوئے ہو۔''

اس نے لفافوں کو بڑے جتن سے رکھ کر سیف کو بند کر دیا۔

☆☆☆

ریڈ الرٹ کے سربراہ میکی براؤن کو ہلاک کرنا ایسی ہی بات تھی جیسے کوئی ایک ہی وار میں لوہے کے ستون کو توڑ کر گرا دے۔ ایسی ناممکن واردات کو مراد نے ممکن کر دکھایا تھا پھر اس کے بعد ایک ہی دن میں دوسرے انڈر ورلڈ کے سربراہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

مراد علی منگی کی دہشت پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔ وہ مجرم جو موت سے نہیں ڈرتے تھے، وہ اب سوچنے لگے کہ آئندہ مراد کے مقابلے میں خوب سوچ سمجھ کر میدان میں اترنا ہو گا۔ ریڈ الرٹ اور اس کی تمام اتحادی تنظیمیں سوگ منا رہی تھیں۔ ان کے سربراہ یہ طے کر چکے تھے کہ آئندہ اپنی خفیہ پناہ گاہوں سے باہر دوسرے ملکوں میں نہیں جائیں گے۔ وہ موت کا فرشتہ کسی ملک میں بھی اچانک پہنچ جاتا ہے۔

ان میں سے دو اتحادی تنظیمیں ریڈ الرٹ کو چھوڑ کر ماسٹر کو بوبو سے اتحاد کر رہی تھیں۔ ماسٹر تو خوشی سے ناچ رہا تھا۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ سن سٹی میں دس دنوں تک جشن منایا جائے گا۔

مراد نے آخری بار اس سے فون پر مختصر سی باتیں کی تھیں۔ اب وہ ہر روز اس نمبر کو آزماتا تھا کہ کسی دن اس سے پھر بات ہو سکے گی۔ وہ صبح و شام چمپت راؤ کو تاکید کرتا تھا کہ مراد دہلی میں ہے۔ اسے کسی بھی طرح ڈھونڈ نکالو۔ وہ ماسٹر کو نظر انداز کر رہا تھا اور ماسٹر بہت بڑی کامیابی کی خوشی میں اپنی انسلٹ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اگر مراد سامنے آ جاتا تو وہ اس کے قدموں میں جھک کر اسے منا لیتا۔ صرف اسی ایک مرد میدان کے باعث وہ جرائم کی پوری دنیا میں بہت زیادہ طاقتور، بہت زیادہ اہم ہو گیا تھا۔

مراد نے چہرہ اور شخصیت بدل کر جرائم کی دنیا سے نکل کر سب ہی کو الجھا دیا تھا۔ کسی کو نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس کا تحریری پیغام لے جانے والے غبارے دنیا والوں کی نظروں میں آ گئے تھے۔ پھر بھی وہ نظروں سے اوجھل تھا۔

وہ آئے دن خبریں سن رہا تھا۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ انٹرپول کے علاوہ کئی ممالک کے جاسوس اور آر آر والے ان غباروں کے ذریعے ماروی تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ پھر ماروی کے ذریعے اسے ٹریپ کرنا چاہتے ہیں۔

اس نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ غبارے دوستوں دشمنوں اور قانون کے محافظوں کو یوں اپنے پیچھے لگا کر ماروی تک لے جائیں گے۔

اب وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ غبارے کبھی ماروی کے سائے تک بھی نہ پہنچیں۔ وہ محبت کی ماری پھر مراد کی زندگی میں آنا چاہے گی تو اس سے پہلے دشمن اس کی ہلاکت کے لیے پہنچ جائیں گے۔ اب وہ لندن جانے اور اسے ڈھونڈنے کے لیے اور زیادہ بے تاب ہو گیا۔ جان محمد کے والد مرحوم کا چالیسواں دوسرے دن تھا اور وہ تیسرے دن جہاز کے ٹکٹ لے چکا تھا۔ ایسے وقت مرینہ ہارے ہوئے

سپاہی کی طرح بستر پر پڑی تھی۔

اسے اسپتال سے گھر لایا گیا تھا۔ علاج سے اتنا فائدہ ہوا تھا کہ اب وہ اوندھے منہ نہیں رہتی تھی۔ چت ہوکر چھت کو تکتی رہتی تھی۔ کروٹیں لیتے وقت بھی تکلیف ہوتی تھی۔ پتا نہیں کتنے ہفتوں اور مہینوں کے بعد بیٹھنے کے قابل ہونے والی تھی۔

اسے سب سے زیادہ صدمہ اس بات کا تھا کہ وہ مراد کے ساتھ لندن نہیں جاسکتی تھی اور ڈاکٹروں نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ دوڑنے اور اچھلنے کودنے کے قابل نہیں رہے گی۔ یہ اور زیادہ صدمے کی بات تھی کہ وہ آئندہ مراد کے ساتھ فائٹر بن کر شانہ بشانہ نہیں رہ سکے گی۔

وہ سوچ سوچ کر اندر سے ٹوٹ رہی تھی۔ اب وہ ماروی کے مقابلے میں مراد کی ایکشن سے بھرپور لائف پارٹنر نہیں رہی تھی۔ اب اس کے پاس صرف حسن و شباب کا ہتھیار رہ گیا تھا۔ پھر بھی وہ ماروی سے زیادہ حسین اور پرکشش نہیں تھی۔

وہ کتنے ہی اہم پہلوؤں سے اپنی اہمیت کھو چکی تھی۔ ابھی اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ مراد کے لیے غیر ضروری ہو گئی ہے۔ وہ صحت یاب ہونے اور چلنے پھرنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے بعد ہی خود کو ناپ تول سکتی تھی کہ کتنے پانی میں ہے۔

آدمی آسودہ ہو تو اپنے رب کو یاد کرتا ہے اور کلمہ پڑھتا ہے اگر غصے میں ہو تو اپنے رب کو بھول کر دوسروں کو گالیاں دیتا ہے۔ وہ کلمہ پڑھنا بھول گئی تھی۔ دن رات بشریٰ کو گالیاں دیتی تھی اور قسمیں کھاتی رہتی تھی کہ صحت یاب ہوتے ہی اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔

ماسٹر کو بوبار بار چھپت راؤ سے کہہ رہا تھا کہ وہ کسی طرح مراد کو ڈھونڈ نکالے اور چھپت راؤ جانتا تھا کہ وہ اپنی بہن درگا کے ساتھ کہیں رہتا ہے۔ جس طرح ماروی مراد کی زندگی سے نکل گئی تھی، اسی طرح درگا نے عارضی طور پر چھپت راؤ کو چھوڑ دیا تھا۔ اس سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ ''جب تک میرا بھائی میرے ساتھ ہے اور جب تک وہ دہلی میں رہے گا، میں تمہارے پاس واپس نہیں آؤں گی۔''

چھپت راؤ نے کہا۔ ''میری سچائی کو اس طرح سمجھو کہ میں نے ماسٹر کو اب تک یہ نہیں بتایا ہے کہ مراد میری دھرم پتنی درگا کے ساتھ چھپا رہتا ہے۔''

درگا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اور جب معلوم ہو جائے گا کہ ہم بھائی بہن دہلی میں کہاں رہتے ہیں، تب بھائی کو اچھی طرح گھیر کر ماسٹر کو اطلاع دو گے۔''

''درگا! تم مجھے غصہ دلا رہی ہو۔''

''غصہ کرتے رہو۔ شملہ جاتے وقت میرے بھائی نے زیادہ سے زیادہ دشمنوں کو نرک میں پہنچایا تھا۔ شملہ پہنچ کر گرودیو کے استھان میں بھائی نے مجھے چھپا کر رکھا تھا اور اب بھاسکر کو نرک میں پہنچا کر مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ یہ سمجھ رہے ہو؟ اب میرے بیٹے پر دعویٰ کرنے والا شیطان باپ اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔ اب کوئی میرے بیٹے کو مجھ سے چھیننے نہیں آئے گا۔ ایک ماں کے دل سے جو دعائیں نکل رہی ہیں، وہ سیدھی بھگوان تک پہنچ رہی ہیں۔ بھگوان نے چاہا تو میرے دیوتا سمان بھائی کو ہمیشہ سلامتی ملتی رہے گی۔''

حقیقت یہ تھی کہ مراد اب درگا کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ جان محمد کی حیثیت سے اپنی بیوی عیارہ (مرینہ) کے ساتھ حویلی میں رہنے لگا تھا۔ درگا چاہتی تھی کہ جب تک وہ لندن نہ چلا جائے، تب تک چھپت راؤ کو اسی دھوکے میں رکھے کہ اس نے اپنے بھائی کو چھپا کر رکھا ہے۔

مرحوم کے چالیسویں کی رسم ادا ہو گئی۔ مراد دوسرے دن سفری بیگ اٹھا کر جانے لگا تو مرینہ رو پڑی۔ وہ اسے جھک کر سینے سے لگا کر بولا۔ ''حوصلہ رکھو۔ میں جلد ہی واپس آجاؤں گا۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''نہیں آسکو گے۔ اسے ڈھونڈتے رہو گے۔ وہ برسوں تک نہیں ملے گی۔ تم برسوں تک نہیں آؤ گے۔''

''وہ نہ ملے۔ تب بھی تم سے ملنے کے لیے آتا جاتا رہوں گا۔ میں تمہیں زبان دے رہا ہوں۔''

''اور جب وہ مل جائے گی تو کبھی واپس نہیں آسکو گے۔ وہ آنے نہیں دے گی۔ وہ پہلے بھی مجھے برداشت نہیں کرتی تھی۔ آئندہ بھی نہیں کرے گی۔ تمہارے سامنے یہی ایک راستہ رہ جائے گا کہ مجھے چھوڑ دو گے، تب وہ تمہاری زندگی میں واپس آئے گی۔''

''تمہارے دل میں ایسے اندیشے پیدا ہوتے رہیں گے۔ نہ میں یقین دلا سکتا ہوں، نہ تم یقین کرو گی جبکہ میں پوری سچائی اور ایمان سے واپس آنے کا وعدہ کر رہا ہوں۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''اب مجھ میں کیا رہ گیا ہے۔ تمہیں واپس لانے والی کوئی کشش مجھ میں نہیں رہی ہے۔ میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ تمہیں الوداع کہنے کے لیے اس کمرے کے دروازے تک جاسکوں۔''

وہ بجلی کی طرح دشمنوں پر ٹوٹنے والی نا قابل شکست فائٹر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مراد اسے تسلیاں دیتے دیتے تھک گیا۔ صحیح وقت پر ائر پورٹ پہنچنا ضروری تھا۔ وہ اسے چوم کر تھپک کر حویلی سے نکل آیا۔ یہ یقین تھا کہ کوئی اسے مراد علی منگی کی حیثیت سے پہچان نہیں سکے گا۔ پہلی بار دور دراز کا سفر کرتے وقت اس کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا اور لندن پہنچ کر بھی کوئی اسے نہ اسلحہ دینے والا تھا، نہ وہ لینے والا تھا۔ وہ ایک عام سی زندگی گزارنے والا شہری جان محمد تھا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی دشمن کو پہچان لے گا، تب بھی اس سے دور رہے گا۔ کبھی کسی کے جھگڑے میں نہیں پڑے گا۔ اسے جلد از جلد ماروی تک پہنچنے کی لگن تھی۔ یہ طے کر چکا تھا کہ کوئی اسے دشمنی کے لیے بھڑکائے گا، تب بھی جوش اور جذبات میں آ کر کسی نئے مسئلے میں الجھ کر ماروی تک پہنچنے میں دیر نہیں کرے گا۔ وہ آسمان کی بلندیوں میں پرواز کر رہا تھا۔ زمین پر ہونے والے تمام جھگڑوں سے دور جہاز کے اندر خاموشی، امن اور سکون تھا۔ اس کے ایک طرف ایک پہلوان نما شخص اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہاف آستین کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ بار بار ہاتھ موڑ کر اپنے مسلز کو پھلا رہا تھا اور کن انکھیوں سے مراد کو دیکھ رہا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ اس کی باڈی بلڈنگ کی تعریف کی جائے۔ مراد اسے نظر انداز کر کے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ اس نے بازو کو بیوی کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''چھو کر دیکھو کیسے پتھر کی طرح سخت ہیں۔''

بیوی نے ناگواری سے کہا۔ ''روز ہی دیکھتی ہوں۔ کہو تو بڑا سا سائن بورڈ لکھ دوں کہ میرا مرد آدمی نہیں پتھر ہے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''تمہیں یاد ہے، میں نے چار بدمعاشوں سے اکیلے فائٹ کی تھی۔ ایک کی گردن اور دوسرے کی کمر توڑ دی تھی۔''

اس نے پھر کن انکھیوں سے مراد کو دیکھا۔ وہ اس سے کترانے کے لیے کھڑکی کے پار دیکھ رہا تھا۔ اس نے مراد کے بازو کو تھپکتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ اپنی تعریف سنے بغیر رہنے والا نہیں تھا۔ مراد نے سر گھما کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بڑے فخر سے بولا۔ ''میں اکیلا تھا اور وہ چاروں بہت ہی تنگڑے تھے۔''

مراد نے کہا۔ ''وہاٹ ڈو یو مین بائی تنگڑا۔ وہائی ڈو یو کال می تنگڑا؟ ہاؤ ڈیئر سے می تنگڑا؟''

قوموں کی ترقی

نادر شاہ نے جب دلی پر قبضہ کیا تو اسے ہاتھی کی سواری پیش کی گئی۔ ہاتھی پر بیٹھ کر اس نے مہاوت سے کہا۔ ''اس کی لگام میرے ہاتھ میں دے دو۔''

مہاوت نے عرض کیا۔ ''حضور! اس کی لگام نہیں ہوتی بلکہ یہ میرے اشارے پر چلتا ہے۔''

نادر شاہ یہ سن کر ہاتھی سے اتر آیا اور کہنے لگا۔ ''میں ایسی سواری پر نہیں بیٹھتا جس کی لگام کسی اور کے ہاتھ میں ہو۔''

☆☆☆

راہ کے دیپ

☆ ہم جب اللہ سے مانگتے ہیں تو بے حساب مانگتے ہیں لیکن جب عبادت کا وقت آئے تو نفل بھی گن گن کر ادا کرتے ہیں۔

☆ وہ شخص جسے خوشی کی تمنا نہیں ہوتی، دراصل سب سے زیادہ خوش وہ ہوتا ہے۔

☆ اس دنیا میں لوگ زیادہ ہیں مگر انسان کم۔

مرسلہ۔ مرحا گل، رمنا گل۔ درابن کلاں

وہ پریشان ہو کر مراد کا منہ تکنے لگا۔ اس کی وائف نے جلدی سے کہا۔ ''یہ انگریزی نہیں جانتے ہیں۔ آپ اردو یا ہندی میں بولیں۔''

مراد نے کہا۔ ''سوری، میں اردو اور ہندی نہیں جانتا۔ یہ تنگڑا کیا ہوتا ہے؟ ہماری کوئی جان پہچان نہیں ہے اور یہ مجھے تنگڑا کہہ رہا ہے؟''

وہ بولی۔ ''تنگڑا ایک اچھا لفظ ہے۔ یہ گدھا اپنے آپ کو تنگڑا کہہ رہا ہے؟''

مراد نے مسکرا کر پہلوان کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''تمہارے جیسے تنگڑے گدھے سے مل کر خوشی ہو رہی ہے۔''

وہ پہلوان سے بولی۔ ''یہ تمہاری تعریف کر رہا ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرو۔''

وہ خوش ہو کر گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ''تھینک یو۔ میں انگریزی نہیں جانتا ہوں۔ تو تو میری وائف جانتی ہے، یس یس میرا نام دلیر جان ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''میرا نام جان محمد ہے۔''

اس کی وائف نے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام ریشماں ہے۔ میں اپنے ہزبینڈ کو بہت چاہتی ہوں۔ یہ مجھے خوش رکھتا ہے۔''

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ دلیر جان بھی خوش ہو کر یوں سر ہلا رہا تھا جیسے انگریزی زبان سمجھ رہا ہو۔ مراد نے کہا۔

''تمہارے میاں کو شیخی بگھارنے کی عادت ہے۔ یہ اپنے مسلز دکھاتا رہتا ہے، تم بیزار نہیں ہوتیں؟''

''بالکل نہیں۔ میں انجوائے کرتی ہوں۔ یہ دل کے بہت اچھے ہیں۔ مجھے پھول کی طرح رکھتے ہیں۔''

دلیر جان نے ریشماں سے کہا۔ ''تم لوگ کیا بول رہے ہو۔ کچھ مجھے بھی بتاؤ؟''

وہ اپنے میاں سے اردو میں بولی۔ ''مرد الو کے پٹھے ہوتے ہیں۔ حسین عورت کو دیکھتے ہی پھسلنے لگتے ہیں۔ یہ میرے حسن کی تعریف کر رہا ہے۔ میں کہہ رہی ہوں کہ میرے شوہر سے زیادہ کوئی میری تعریف نہیں کر سکتا تم تو میرے حسن پر شاعری بھی کرتے ہو۔''

وہ جانتی تھی کہ دلیر جان انگریزی نہیں جانتا۔ اس لیے مراد کے ساتھ انگریزی زبان میں شوہر کا مذاق اڑا رہی تھی اور یہ معلوم ہوا تھا کہ مراد اردو زبان نہیں جانتا، اس لیے شوہر کے ساتھ اردو زبان میں مراد کو گدھا اور الو کا پٹھا کہہ رہی تھی۔

وہ اپنی دانست میں دو مردوں کا مذاق اڑاتے ہوئے انجوائے کر رہی تھی۔ مراد نے سوچا۔ اسے انجوائے کرنے دیا جائے۔ جب وہ سفر کے اختتام پر اردو بولے گا تو وہ چکرا کر رہ جائے گی۔

تین گھنٹے آرام سے گزر گئے۔ ریشماں کچھ پریشان ہوگئی۔ وہ اپنے خاوند کی طرف جھک کر بولی۔ ''میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔''

دلیر جان نے کہا۔ ''اوہ ریشماں! وہی ضعیف الاعتقادی' وہی جاہلوں جیسی باتیں۔ تم یہی کہو گی کہ کوئی مصیبت آنے والی ہے۔''

''بے شک۔ میں نے کئی بار یہی دیکھا ہے۔ جب بھی یہ بائیں آنکھ پھڑکتی ہے تو کوئی مصیبت آتی ہے۔''

وہ بازو کے مسلز پھلاتے ہوئے بولا۔ ''آنے دو۔ میں تمہارا مجازی خدا ہوں۔ تمہارا محافظ ہوں۔ جو بھی مصیبت آئے گی، اسے کچل کر رکھ دوں گا۔''

ریشماں نے مراد سے کہا۔ ''مسٹر! کیا تمہاری بائیں آنکھ کبھی پھڑکتی ہے اور پھڑکنے سے کوئی مصیبت آتی ہے؟''

مراد کے ساتھ ایسا کچھ نہیں تھا۔ اس نے محض انجوائے کرنے کے لیے کہا۔ ''مائی گاڈ! ابھی میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔ میرے اندر گھبراہٹ سی ہے۔ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔''

وہ بولی۔ ''میں بالکل فٹ ہوں۔ بیمار نہیں پڑوں گی۔ یہاں کوئی دوست یا دشمن مصیبت بننے والا نہیں ہے۔ مجھے گھبرانا نہیں چاہیے۔''

وہ بولا۔ ''گھبراہٹ خود بخود ہو رہی ہے۔ مصیبت یہ آسکتی ہے کہ......کہ......''

''کہ......؟'' ریشماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

اس نے کہا۔ ''یہ جہاز ہزاروں فٹ کی بلندی سے زمین پر گر سکتا ہے۔''

''نہیں......'' وہ خوف سے چیخ پڑی۔ آس پاس کے مسافر اسے دیکھنے لگے۔ دلیر جان نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ یہ جان محمد کیا کہہ رہا ہے؟''

وہ بولی۔ ''وہی کہہ رہا ہے، جو میرے دل میں ہے۔ یہ جہاز نیچے گر سکتا ہے۔''

دلیر جان نے گھور کر مراد کو دیکھا۔ پھر گھونسا دکھاتے ہوئے بولا۔ ''میری وائف کو ڈرا رہے ہو۔ میں ایک پنچ میں تمہیں جہاز کے باہر گرا دوں گا۔''

مراد نے اس کے گھونسے کو دیکھ کر سہم کر کہا۔ ''مم...... مجھے معاف کر دو۔ تمہارا گھونسا دیکھتے ہی مجھے وہ ہونے لگا ہے۔ میں واش روم جا رہا ہوں۔''

مراد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ریشماں نے کہا۔ ''یہ تم سے سہم گیا ہے۔ اسے واش روم جانے دو۔''

دلیر جان فخر سے مسکرانے لگا۔ مراد سیٹوں کے درمیان سے ان کے سامنے سے گزرتا ہوا ٹوائلٹ کی طرف چلا گیا۔ بائیں آنکھ پھڑکے یا نہ پھڑکے۔ مصیبت بہت پہلے ہی آچکی تھی۔ تمام مسافروں کی لاعلمی میں اس جہاز کو ہائی جیک کیا جا رہا تھا۔ پائلٹ کیبن کے اندر پائلٹ' کو پائلٹ اور ائر ہوسٹس ہائی جیکرز کے نشانے پر تھے۔ پرواز کا رخ بدل گیا تھا۔ وہ طیارہ شمال مغرب کی سمت جا رہا تھا۔

ادھر کیوں جا رہا تھا؟ اسے کیوں اغوا کیا جا رہا تھا؟ وہ کون لوگ تھے؟ تنہا مراد علی منگی ابھی بے خبر تھا۔ وہ ٹوائلٹ میں جا کر دروازے کو اندر سے بند کر کے آرام سے بیٹھ گیا تھا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں



روایت پسند

تنویر ریاض

روایت کی پاسداری کا مطلب ماضی سے جڑے رہنا بھی ہوتا ہے کیونکہ پچھلے وقتوں کے یادگار لمحات کا اعادہ کرنا... اپنے قیمتی وقت کے کچھ پل اس کی نذر کرنا اور اس احساس کو پھر سے جگانے کی کوشش کرنا یہ سب اس پاسداری میں ہی توشامل ہے مگر وہ... عجیب روایت کا پابند تھا... تہ در تہ شخصیت کا مالک دل میں بیک وقت کتنے ہی احساسات کا طوفان چھپائے وہ ناکام عاشق ان غمزدہ لمحات کو ہر سال بڑے اہتمام سے مناتا تھا جن کا ذرہ برابر بھی احترام اس کے دل میں نہیں تھا۔

تالاب کے مانند ٹھہرے ہوئے پانی میں چھپے طوفان کا احوال

مسز بولیٹو کو بولنے کا ایسا مرض تھا کہ بولے بغیر اس کا کھانا ہضم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس روز بھی حسبِ عادت اس نے صبح کا آغاز ایک سنسنی خیز انکشاف سے کیا اور جین سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ مسٹر تھارپ ہر سال اسی مخصوص ہفتے میں یہاں آتے ہیں اور اس کے پیچھے ایک زبردست کہانی ہے۔'' جین کو اس انکشاف پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ مسز بولیٹو کے پاس ایسی بہت سی کہانیاں ہیں جنہیں وہ اپنے مخصوص انداز میں

اسے سناتی رہتی ہے۔

یہ اس کی پہلی ملازمت تھی اور اسے روزانہ کام پر آنا پڑتا تھا۔ چاہے اس کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام بھی نہ ہو لیکن وہ شفٹ ختم ہونے سے پہلے نہیں جاسکتی تھی۔ اس کے نزدیک یہ ملازمت بڑی اہمیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے اب وہ اپنی ضروریات کے لیے ماں باپ کے آگے ہاتھ پھیلانے پر مجبور نہیں تھی۔ مکان کا کرایہ دینے کے بعد جو پیسے بچتے وہ انہیں بینک میں جمع کرادیتی۔ اس نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کرلیا تھا کہ اکیلے بیٹھ کر بور ہونے سے بہتر ہے کہ مسز بولیٹو کی کہانیاں سن لی جائیں۔ اس کے ہاتھ ایک دلچسپ مشغلہ آگیا تھا اور وہ بڑے شوق سے اس بوڑھی عورت کی کہانیاں سنتی رہتی تھی۔ ویسے بھی وہ اس کی انچارج تھی اور وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

جب اس نے ملازمت شروع کی تو گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہورہی تھیں اور ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے کئی مہمان نیا تعلیمی سال شروع ہونے کی وجہ سے جارہے تھے، لہٰذا اب ہوٹل میں چند بوڑھے جوڑے ہی رہ گئے تھے۔ یہ صورتِ حال پورے موسم خزاں میں جاری رہتی البتہ کرسمس اور نئے سال کے موقع پر ہوٹل میں آنے والے گاہکوں کی تعداد بڑھ جاتی تھی۔ مسز بولیٹو نے سختی سے اسے تاکید کررکھی تھی کہ وہ ہوٹل کی انتظامیہ پر کبھی یہ ظاہر نہ کرے کہ اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے بلکہ ان کے سامنے ہمیشہ مصروف نظر آنے کی کوشش کرے، ورنہ وہ اسے فارغ کرسکتے ہیں۔

شروع میں وہ اپنی سہیلیوں اور بوائے فرینڈ بوبی سے پیغامات کا تبادلہ کرکے وقت گزارنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس میں کمی آتی گئی، کیونکہ جن لڑکیوں کو ملازمت مل گئی وہ مصروف ہوگئی تھیں۔ بوبی اسے پسند تھا لیکن بے روزگار ہونے کی وجہ سے وہ اس کے دل سے اترتا جارہا تھا اور وہ سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی کہ بوبی اس کی منزل نہیں ہے اور اب اسے کسی اور سے دوستی کرنا چاہیے جو مالی طور پر آسودہ ہو۔

ملازمت شروع ہوتے ہی اس کا واسطہ مسز بولیٹو سے پڑا جو عمر میں اس کی ماں کے برابر تھی، اس سے پہلے ماں اور اسکول ٹیچر کی صورت میں اس کی زندگی میں دو بوڑھی عورتیں آچکی تھیں لیکن ان کی جانب سے ہونے والی بے جا روک ٹوک کی وجہ سے وہ ہمیشہ انہیں اپنا دشمن سمجھتی رہی۔ مسز بولیٹو ان سے بہت مختلف تھی۔ ہوٹل میں کام کرنے والی دوسری عورتوں کا رویہ بھی اس کے ساتھ دوستانہ تھا۔ اس لیے وہ بہت جلد اس ماحول سے مانوس ہوگئی۔

ان میں سے کئی عورتیں رومانی ناول پڑھ کر اپنی آنکھوں میں خواب سجائے ہوئے تھیں لیکن انہیں اپنی زندگی میں آئیڈیل محبوب ملنے کی امید کم ہی تھی۔ جین ان کی باتیں سن کر لطف اندوز ہوتی رہتی لیکن اس نے دوسری عورتوں کو بوبی کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا گوکہ وہ اب بھی کبھی کبھار اس سے مل لیا کرتی تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ دھیرے دھیرے اس کے دل سے اترتا جارہا تھا۔

مسز بولیٹو غالباً اس ہوٹل کی سب سے پرانی ملازمہ تھی۔ اس نے بھی جین کی طرح اسکول کی تعلیم ختم ہوتے ہی کمروں کی صفائی کرنے والی خادمہ کے طور پر یہاں کام شروع کردیا تھا۔ شاید اسی لیے وہ جین میں خصوصی دلچسپی لیتی تھی یا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ وہ عملے کے انہی لوگوں سے قریب ہوتی تھی جو اس کی باتیں سننے کے لیے تیار ہوں۔ اس حوالے سے جین ایک اچھی سامع تھی اور اسی لیے مسز بولیٹو اسے پسند کرتی تھی۔

عام تاثر یہی تھا کہ مسز بولیٹو کی زندگی میں کوئی دکھ ہے گوکہ اس نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی اور نہ ہی اس نے کبھی اپنے شوہر مسٹر بولیٹو کے بارے میں کچھ بتایا کہ وہ کون ہے، کہاں ہے، کیا کرتا ہے، زندہ بھی ہے یا مرگیا جس سے اس کی بدنصیبی کا اظہار ہوتا تھا اور لوگ یہی سمجھتے تھے کہ یہ بدقسمت عورت اپنے غم کو سینے میں چھپائے زندہ رہنے کی جدوجہد میں مصروف ہے لیکن یہ سب کچھ بہت پہلے ہوچکا تھا اور ہوٹل کے عملے میں کوئی بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

مسز بولیٹو کو وہ دن اچھی طرح یاد تھے جب اس ہوٹل کا انتظام مسٹر جیک اور ان کی بیگم کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اب بھی بڑے اچھے انداز میں ان دونوں کا ذکر کیا کرتی تھی اور اپنی اس رائے کا برملا اظہار کیا کرتی تھی کہ مسٹر جیک کے انتقال کے بعد مسز جیک نے ہوٹل فروخت کردیا اور اس کے بعد سے ہی اس کا زوال شروع ہوگیا۔ جن لوگوں نے یہ ہوٹل خریدا تھا وہ اس سے پہلے ایک پب چلاتے تھے اور انہیں ہوٹل کے کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس کے بعد یہ ہوٹل ایک ایسے گروپ نے خریدلیا جن کے دوسرے شہروں میں بھی اس طرح کے ہوٹل تھے لیکن ذاتی دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے اس کی حالت میں کوئی بہتری نہیں آئی۔ موجودہ

مالکان اسے کانفرنس ہال میں تبدیل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے جنہوں نے صرف دو سال قبل ہی یہ ہوٹل خریدا تھا لیکن مسز بولیٹو کو امید نہیں تھی کہ وہ اس پر بھی عمل کر سکیں گے۔

مسز بولیٹو جب بھی ہوٹل کی انتظامیہ کے بارے میں کوئی بات کرتی تو اس میں ایک ڈھکا چھپا مفہوم نمایاں ہوتا اور وہ یہ کہ اگر وہ ہاؤس کیپر کے بجائے یہاں کی انچارج ہوتی تو ہوٹل زیادہ بہتر انداز میں چل سکتا تھا۔

ان تمام انتظامی تبدیلیوں اور نشیب و فراز کے باوجود ایک روایت ہمیشہ برقرار رہی اور وہ یہ کہ مسٹر تھارپ ہر سال اکتوبر کے پہلے ہفتے میں یہاں قیام کرنے ضرور آتے تھے اور اس ہوٹل میں صرف مسز بولیٹو کو ہی معلوم تھا کہ اس روایت کے پیچھے کون سی کہانی چھپی ہوئی ہے۔

جب جینن نے پہلی بار مسٹر تھارپ کو دیکھا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ہوٹل میں آنے والے دوسرے مہمانوں سے کسی حد تک مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ عمر رسیدہ تھا۔ اس عمر میں اور بھی کئی معمر افراد آتے تھے۔ وہ ان جھریوں سے بھری جلد والے مردوں اور لڑکھڑاتی ہوئی عورتوں کو سن باتھ لیتا دیکھ کر سوچتی کہ پرانے فرنیچر کی طرح بیکار پڑے ہوئے ان لوگوں کی زندگی کا کیا مقصد ہے۔ ان میں سے زیادہ تر اپنے حال سے مطمئن نظر آتے تھے اور جینن یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ایسا کیوں ہے۔ ان کے پاس باتیں کرنے کے لیے کوئی خاص موضوع نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود وہ بولتے رہتے تھے۔ جینن عموماً ان کی بے تکی باتیں سننے سے گریز کرتی تھی اور سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی کہ کبھی وہ اس عمر کو پہنچے گی۔

عمر رسیدہ ہونے کے باوجود مسٹر تھارپ میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو لوگوں کو ان کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیتی تھی۔ مسز بولیٹو کا کہنا تھا کہ وہ عمر میں اس سے پندرہ سال بڑے ہیں جبکہ ہوٹل کے عملے کے مطابق وہ خود ساٹھ سے کم کی نہیں تھی اور اس حساب سے اسے ریٹائر ہو جانا چاہیے تھا لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ یہ بات ان کے منہ پر کہہ سکے۔ جینن نہیں جانتی تھی کہ مسٹر تھارپ میں ایسی کیا بات ہے جو انہیں دوسروں سے مختلف اور منفرد ظاہر کرتی ہے لیکن اس کے پاس ان کی اس منفرد خصوصیت کو بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔

وہ ہمیشہ تنہا ہی نظر آتے لیکن انہوں نے کبھی اپنی تنہائی کو تماشا نہیں بنایا جیسا کہ عموماً تنہا لوگ کیا کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں وقار تھا اور انہوں نے اپنے دکھوں کو بھی اس کے پردے میں چھپا رکھا تھا۔ وہ مجلسی انسان نہیں تھے اور نہ ہی لوگوں سے راہ و رسم پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اگر کوئی ان سے مخاطب ہوتا تو وہ دوستانہ انداز میں اس کی بات کا جواب دیتے۔ پہلی بار جینن کا سامنا ان سے اس وقت ہوا جب وہ ان کے کمرے میں بستر کی چادر بدلنے گئی تھی۔ اس کے بعد جب بھی مسٹر تھارپ نے اسے دیکھا تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس مسکراہٹ میں دوسرے لوگوں کی طرح ہوس شامل نہیں تھی بلکہ شرمیلا پن نمایاں تھا۔

مسز بولیٹو کے مطابق ہوٹل میں آنے والے بیشتر مہمان جن میں بوڑھے بھی شامل ہیں، نوجوان خادماؤں کو اپنی جانب راغب کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں، جینن ننھی بچی نہیں تھی اور جانتی تھی کہ نوجوان خادمائیں ان ہوٹلوں میں کیا گل کھلاتی ہیں۔ شاید اسی لیے ہوٹل کی انتظامیہ بوڑھی یا ادھیڑ عمر عورتوں کے بجائے نوجوان خادماؤں کو ترجیح دیتی تھی تاکہ گلشن کا کاروبار چلتا رہے لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ مسز بولیٹو یہ بات اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ رہی ہے یا اس کا اشارہ ہوٹل کی دوسری نوجوان خادماؤں کی جانب ہے لیکن باتوں باتوں میں مسز بولیٹو نے یہ ضرور جتا دیا کہ سارا قصور مردوں کا ہی نہیں ہوتا بلکہ اس جرم میں ہوٹل میں کام کرنے والی لڑکیاں بھی شامل ہیں جو اضافی آمدنی کی خاطر ان مردوں کی خواہشات پوری کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتیں۔

لیکن مسٹر تھارپ کا شمار اس طرح کے مردوں میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ انتہائی وضع دار اور بردبار شخص تھے اور انہیں اپنی حیثیت و رتبے کا بہت خیال تھا۔ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتے تھے جس سے ان کی عزت اور ساکھ پر حرف آئے۔ ایک دن باتوں باتوں میں مسز بولیٹو نے انکشاف کیا کہ مسٹر تھارپ بھی اپنی محبت کو کھو چکے ہیں۔ مسز بولیٹو کا کہنا تھا کہ اس حادثے کے بعد مسٹر تھارپ کی زندگی میں محبت کا خانہ خالی ہی رہا اور انہوں نے دوبارہ کسی عورت سے دل نہیں لگایا۔ جینن کے لیے یہ ایک سنسنی خیز انکشاف تھا اور اب وہ اس کہانی کا بقیہ حصہ سننے کے لیے بے چین تھی۔

اس واقعے کے تین چار روز بعد ان دونوں عورتوں کو ایک الگ روم میں بیٹھ کر باتیں بنانے کا موقع مل گیا۔ موسم بہت خراب ہو گیا تھا اور تیز ہوا نے آندھی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہوئی اور یوں لگتا تھا کہ چاروں طرف سے پانی کی بوچھاڑ کیسل ہوٹل

پر یلغار کر رہی ہے۔ پانی کی چادر نے قریب کی چیزوں کو بھی دھندلا دیا تھا اور اس ردم سے باہر کی کوئی عمارت نظر نہیں آرہی تھی جس میں یہ دونوں بیٹھی تھیں۔ لاؤنج میں بیٹھے ہوئے بوڑھے بھی اپنی بحث ختم کر کے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔

اس بارش نے اس ابھری ہوئی چٹان کو بھی ایک دھندلی سی لکیر میں تبدیل کر دیا تھا جو ہوٹل کے احاطے میں قدرتی طور پر ابھری ہوئی تھی اور جسے لوگ ایک پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ جین کو اپنے والدین کے گھر جانے کے لیے اس چھوٹی سی چٹان کے عقب میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ جب وہ شفٹ ختم کر کے جاتی تو عام طور پر وہ جگہ خالی ہوتی تھی لیکن اسے اندازہ تھا کہ آج ایک شخص وہاں ضرور موجود ہوگا۔ اس نے تصدیق کرنے کی خاطر مسز بولیٹو سے پوچھا۔

''کیا اس موسم میں بھی وہ وہاں موجود ہوں گے؟''

''کون؟'' حالانکہ مسز بولیٹو جانتی تھی کہ جین کا اشارہ کس طرف ہے لیکن وہ ہمیشہ گھما پھرا کر بات کرنے کی عادی تھی۔

''مسٹر تھارپ......''

''ہاں۔ وہ وہاں ہوں گے۔'' بوڑھی عورت نے ہسٹریائی انداز میں کہا۔ ''وہ اپنے ایک ہفتہ قیام کے دوران روزانہ سہ پہر کا وقت اسی پناہ گاہ میں گزارتے ہیں اور موسم کی تبدیلی ان کے معمول پر اثر انداز نہیں ہوتی۔''

''ان دنوں ان کا قیام کہاں ہے؟'' جین نے پوچھا۔

''اب وہ امریکا میں رہتے ہیں۔'' مسز بولیٹو نے بتایا۔ ''اس سے پہلے ان کا قیام اسی شہر میں تھا۔ وہ یہیں پلے بڑھے ہیں۔ بین تھارپ مکمل طور پر یہاں کا شہری ہے۔''

یہ پہلا موقع تھا جب اس نے مسٹر تھارپ کا پورا نام سنا اور اس نے سوچا کہ کاش وہ انہیں صرف بین کہہ کر پکار سکے۔ اس نے اپنے دونوں بازو سینے کے گرد سختی سے باندھ لیے۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ مسز بولیٹو مزید معلومات فراہم کرنے کے موڈ میں ہے۔

''کیا تم انہیں اس وقت سے جانتی ہو؟'' اس نے مسز بولیٹو سے پوچھا۔

''ہاں، یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں بین تھارپ کو شروع سے ہی جانتی ہوں، گو کہ وہ عمر میں مجھ سے بڑا ہے لیکن ہمیشہ سے ہی ہینڈسم تھا۔ یہاں بھی کچھ لڑکیاں اس کے آگے پیچھے پھرتی رہتی ہیں لیکن وہ انہیں بالکل بھی منہ نہیں لگاتا۔'' اس نے یہ بات اتنے حسرت آمیز لہجے میں کہی جیسے وہ خود بھی ان عورتوں میں شامل رہی ہو۔

''وہ کیا کام کرتے ہیں؟'' جین نے پوچھا۔ ''کیا یہاں بھی وہ کسی کام کے سلسلے میں آتے ہیں؟''

''ہاں، یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ یہاں ملازمت کے بہت کم مواقع ہیں۔ کان کنی عرصہ ہوا ختم ہو چکی ہے اور مچھلیاں پکڑنے کے کام میں بھی پہلے جیسا مزہ نہیں رہا۔ اس کام میں وہی لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں جن کا تعلق ماہی گیروں کے خاندان سے ہو۔ اسی لیے بہت سے نوجوان لوگوں نے یہاں کام حاصل کرنے کی امید چھوڑ دی ہے اور وہ زیادہ عرصہ یہاں سے باہر جانے کے لیے انتظار نہیں کر سکتے۔''

''وہ اب بھی یہی کر رہے ہیں۔'' جین نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن بین ایسا نہیں تھا۔ اسے کارن وال سے محبت تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ یہاں آتا رہتا ہے۔ بہرحال وہ ایک محنتی اور تیز لڑکا تھا اور مختلف نوعیت کے کام کر سکتا تھا۔ اسے فوٹو گرافی سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ تصویریں کھینچتا اور خود ہی انہیں ڈیولپ کرتا۔ اب تو ڈیجیٹل کیمروں کی وجہ سے کافی آسانی ہوگئی ہے لیکن پہلے یہ سہولت نہیں تھی۔''

مسز بولیٹو نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''وہ ایک اچھا باغبان بھی تھا اور اسی لیے اسے ٹریوی ہاؤس میں نوکری مل گئی۔ تمہیں تو شاید معلوم نہ ہو لیکن تمہارے والدین اس مکان کے بارے میں ضرور جانتے ہوں گے۔''

''ہم لوگ یہاں سے سینٹ آسٹل چلے گئے تھے جب میں بارہ سال کی تھی۔'' جین نے بتایا۔

''اوہ پھر تو وہ بھی شاید اس بارے میں کچھ نہ جانتے ہوں۔ بہرحال تمہیں ٹریوی ہائٹس کا تو پتا ہی ہوگا۔''

''تم ان فلیٹس کی بات کر رہی ہو جہاں لوگ چھٹیاں گزارنے آتے ہیں؟''

''ہاں۔ وہ فلیٹ ٹریوی ہاؤس کی جگہ پر ہی بنائے گئے ہیں۔ اس کے بعد سے ہی بین تھارپ کی زندگی میں مسائل بڑھنا شروع ہوگئے تھے۔''

مسز بولیٹو نے ایک بار پھر توقف کیا اور بولی۔ ''ایک زمانے میں ٹریوی ہاؤس کی بڑی شان تھی۔ اس میں ٹریوی خاندان نسلوں سے آباد تھا۔ گھر میں نوکروں کی فوج تھی جو

انتہائی مستعدی سے سارے کام نمٹاتے تھے لیکن جنگِ عظیم دوم کے بعد حالات خراب ہونا شروع ہو گئے۔ ملک کے بیشتر حصوں میں اچھے ملازمین کی قلت ہو گئی۔ گو کہ یہاں ایسی صورتِ حال نہیں تھی اور بہت سے لوگ ملازمت کی تلاش میں پھر رہے تھے لیکن مسٹر اور مسز ٹریوی انہیں ملازمت نہیں دے سکتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی آمدنی میں کمی واقع ہو گئی تھی کیونکہ ان کا گزارہ سرمایہ کاری سے ہونے والے منافع پر تھا جس میں جنگ کی وجہ سے بہت زیادہ کمی آ گئی تھی۔ وہ اس مکان کو بھی فروخت کرنا نہیں چاہ رہے تھے کیونکہ برسوں سے ان کا خاندان اس میں آباد تھا۔ اس کے علاوہ جنگ کے بعد جائداد کی قیمتیں بھی گر گئی تھیں۔ اس لیے اگر وہ چاہتے تو بھی اس جگہ کو نہیں بیچ سکتے تھے۔

''آمدنی میں کمی ہو جانے کی وجہ سے ان کے لیے ملازمین کا خرچ برداشت کرنا ممکن نہ رہا چنانچہ ایک ایک کر کے تمام نوکروں کو چھٹی دے دی گئی اور گھر کے بیشتر کام انہوں نے خود سنبھال لیے بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ اس میں زیادہ حصہ ان کی بیٹی ٹیمی کا تھا۔ اس کا اصل نام تو ٹامسن تھا لیکن سب اسے ٹیمی کہہ کر ہی بلاتے تھے گو کہ اس کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی تھی لیکن اس نے بہت جلد بدلے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا اور کھانا پکانے کے علاوہ گھر کے دوسرے کام بھی خود ہی کرنے لگی البتہ باغ کی دیکھ بھال اس کے بس کی نہیں تھی۔''

''اور اس کے لیے بین تھارپ کی خدمات حاصل کی گئیں۔'' جین نے لقمہ دیا۔

''ہاں۔'' بوڑھی عورت نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔''وہ باغ کی دیکھ بھال کرنے میں ٹیمی کی مدد کے لیے آنے لگا۔ اسے کام شروع کیے چند روز ہی ہوئے تھے کہ وہ دردناک حادثہ پیش آ گیا۔''

مسز بولیٹو ایک بار پھر رک گئی۔ یہ اس کی عادت تھی کہ کہانی میں سسپنس پیدا کرنے کے لیے وہ بار بار رک جاتی، گہری گہری سانسیں لیتی اور پھر دوبارہ بولنا شروع کر دیتی۔ جب اس نے دیکھا کہ جین پوری طرح اس میں گم ہو گئی ہے تو اس نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر اور مسز ٹریوی کسی کام سے لندن گئے تھے۔ شاید انہیں اسٹاک بروکر یا بینک منیجر سے ملنا تھا۔ جب وہ واپس آ رہے تھے تو ٹریوی ہاؤس سے چند میل کے فاصلے پر یہ حادثہ پیش آ گیا، اس جگہ پر سڑک کافی تنگ تھی اور مسٹر ٹریوی ہمیشہ اس طرح گاڑی چلاتے تھے جیسے انہوں نے پورا ملک خرید لیا ہو۔''

مسز بولیٹو نے ایک بار پھر وقفہ لیا جبکہ جین آگے کا حال جاننے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ مسز بولیٹو نے اس کی بے تابی کو بھانپ لیا اور دوبارہ بات شروع کرتے ہوئے بولی۔''مخالف سمت سے ایک ٹریکٹر آ رہا تھا۔ اس کے ڈرائیور نے بڑی کوشش کی لیکن اس کا ٹریکٹر مخالف سمت سے آنے والی مسٹر ٹریوی کی کار سے ٹکرا گیا۔ ٹریکٹر کا تو کچھ نہیں بگڑا لیکن مسٹر ٹریوی کی کار ماچس کی ڈبیا کی طرح بکھر گئی اور دونوں میاں بیوی موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔

''ان کے جنازے پر کاؤنٹی کے سبھی لوگ آئے، حالانکہ مسٹر ٹریوی کی پہلے جیسی شان و شوکت نہیں رہی تھی لیکن علاقے میں ان کی بڑی عزت تھی اور ان کے انتقال پر سب لوگ اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔ اب ٹیمی اتنے بڑے اور عالیشان گھر میں تنہا رہ گئی تھی۔ اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا۔ اس موقع پر بین تھارپ نے اس کی دلجوئی کی۔ ٹیمی کی عمر تیس سے زیادہ ہو چکی تھی اور اس کی شادی کے امکانات دن بہ دن کم ہوتے جا رہے تھے پھر ایک دن لوگ یہ خبر سن کر حیران رہ گئے کہ اس نے بین تھارپ سے منگنی کر لی ہے۔''

جین سنبھل کر بیٹھ گئی۔ کہانی میں دلچسپ موڑ آ گیا تھا اور وہ جاننا چاہ رہی تھی کہ یہ پیار کہانی آگے چل کر کیا رخ اختیار کرتی ہے۔ اس بار مسز بولیٹو نے خاصا طویل وقفہ لیا۔ شاید وہ بھی اس کی بے چینی سے لطف اندوز ہو رہی تھی پھر اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولی۔

''تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ یہ خبر سننے کے بعد لوگوں نے کیسی کیسی باتیں بنائی ہوں گی۔ بین تھارپ اور ٹیمی کی عمر میں کم از کم پندرہ سال کا فرق تھا اور بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے محض پیسے کے لالچ میں اپنے سے بڑی عمر کی عورت کا انتخاب کیا تھا۔ گو کہ ٹیمی کے مالی حالات پہلے جیسے نہیں تھے لیکن ٹریوی ہاؤس کی صورت میں اس کے پاس جو قیمتی جائداد تھی، اسے بیچ کر تھارپ ساری زندگی آرام سے گزار سکتا تھا۔

''جن دنوں یہ افواہیں زوروں پر تھیں اور لوگ بین تھارپ کو لالچی اور خودغرض جیسے القابات سے نواز رہے تھے... ایک عجیب واقعہ پیش آ گیا۔ تھارپ اپنی منگیتر کے وکیل سے ملا اور اس سے یہ معاہدہ لکھوایا کہ ٹیمی کی موت کی صورت میں وہ اس کی جائداد کا وارث نہیں ہو گا لیکن اگر ان کے بچے ہوئے تو یہ جائداد ان کو مل جائے گی۔

''لوگ اس خبر کو سن کر ششدر رہ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں

سکتے تھے کہ تھارپ ایسی غیر معمولی جرأت کر سکتا ہے اور اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ لوگوں کی زبانیں بند ہوگئیں اور وہ تھارپ کے بارے میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوگئے۔

ان کے خیال میں تھارپ لالچی نہیں تھا بلکہ یہ صرف محبت تھی جس نے نیمی اور تھارپ کو یکجا کر دیا تھا۔ اب وہ دونوں زیادہ محنت اور جوش وجذبے کے ساتھ کام میں لگ گئے تاکہ ٹریوی ہاؤس کی کھوئی ہوئی شان وشوکت بحال کر سکیں۔ وہ لوگ جو ان کی منگنی پر بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے وہ بھی ٹریوی ہاؤس کی تبدیل شدہ حالت دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"نیمی کے والدین کے انتقال کو ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ ان دونوں نے شادی کرلی گو کہ اس تقریب میں اتنے زیادہ لوگ شریک نہیں ہوئے جتنے کہ اس کے والدین کی تدفین میں آئے تھے اور اس کی وجہ یہی تھی کہ علاقہ کے معززین اس شادی سے خوش نہیں تھے۔ انہیں یہ بالکل اچھا نہیں لگا کہ ٹریوی خاندان کی لڑکی کسی عام لڑکے سے اپنا مستقبل وابستہ کرلے لیکن وہ دونوں خوش تھے اور انہوں نے لوگوں کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر زندگی کا نیا سفر شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے ہنی مون کا ابتدائی ہفتہ اسی ہوٹل میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

"ان دنوں اکتوبر کے مہینے میں بھی موسم بہت خوش گوار تھا گو کہ دن میں گرمی ہوتی تھی لیکن شام میں ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہوجاتی تھی۔ ان لوگوں کے آجانے سے ہوٹل کا ماحول بھی خوشگوار ہوگیا تھا۔ جنگ کی تباہ کاریوں اور نیمی کے والدین کے انتقال کے بعد جو اداسی چھا گئی تھی وہ چھٹنے لگی اور نئی امیدیں جنم لینے لگیں لیکن بدقسمتی سے یہ امیدیں بھی بہت جلد دم توڑ گئیں۔"

جین کے اندر کا موسم بھی بگڑنے لگا تھا۔ اسے مسز بولیٹو پر شدید غصہ آیا جو کہانی کو کلائمکس کے قریب لے جا کر ایک بار پھر خاموش ہوگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ کہانی آگے بڑھتی۔ روم میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوگئی۔ یہ ہوٹل کے منیجر کا فون تھا، کسی بوڑھے مہمان کی طبیعت خراب ہوگئی تھی اسے الٹیاں ہو رہی تھیں۔ وہ اسپتال جا چکا تھا لیکن اس کے کمرے کی چادریں فوراً تبدیل کرنا تھیں۔

جین جب اس کام سے فارغ ہوئی تو اس کی شفٹ کا وقت ختم ہوچکا تھا لہٰذا اس روز اس کی مسز بولیٹو سے ملاقات نہ ہوسکی۔ دوسرے روز معلوم ہوا کہ مسز بولیٹو کو بھی وہی مرض لاحق ہوگیا تھا جس میں وہ بوڑھا مبتلا ہوا تھا اور وہ کام پر نہیں آئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جین کو کہانی کا بقیہ حصہ کسی دوسرے ذریعے سے معلوم کرنا پڑا۔

اگلی صبح سورج پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا اور لگتا ہی نہیں تھا کہ ایک روز پہلے یہاں موسلا دھار بارش ہوچکی ہے۔ مسز بولیٹو کی غیر موجودگی میں ہوٹل کے ایک اسسٹنٹ منیجر نے تمام اسٹاف کی ڈیوٹی نئے سرے سے ترتیب دی اور جین کو یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ اب اس کی شفٹ دوپہر دو بجے ختم ہوجائے گی۔ تب اسے احساس ہوا کہ مسز بولیٹو نے جو اوقات کار مقرر کر رکھے تھے وہ کام کے مقابلے میں زیادہ تھے۔ شاید اس لیے کہ اس طرح اسے اپنے ماتحتوں سے جی بھر کر باتیں کرنے کا موقع مل سکے۔

اس نظرثانی شدہ شیڈول کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس روز جین کی شفٹ دو بجے ختم ہوگئی اور وہ گھر جانے کے لیے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ہوٹل سے باہر آگئی۔ اب اسے معمول کے مطابق اسی راستے سے گزرنا تھا۔ جو چٹان کے عقبی حصے سے گزر کر اس کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر مسٹر تھارپ اپنی مخصوص جگہ پر موجود ہوئے تو اسے ان کے سامنے سے گزر کر جانا ہوگا اور ایسا ہی ہوا۔ وہ اپنے معمول کے مطابق وہاں موجود تھے۔ اسے دیکھتے ہی ان کے جھریوں بھرے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"شاید تم نے مجھے اپنا نام بتایا تھا لیکن میں بھول گیا۔ کیا میں تمہارا پیارا سا نام جان سکتا ہوں؟"

جین کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ مسٹر تھارپ جیسا شخص ہوٹل کی ایک معمولی خادمہ کو اتنی اہمیت دے رہا تھا۔ وہ چہچہاتے ہوئے بولی۔ "ہیلے جین۔"

"بہت خوب۔"

"آپ روزانہ یہاں آتے ہیں؟" جین نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"شاید اس جگہ سے آپ کی کچھ یادیں وابستہ ہیں؟"

تھارپ کی زرد آنکھوں میں ایک چمک سی ابھری۔ وہ جانتا تھا کہ جین محض اندازے کی بنیاد پر یہ بات نہیں کہہ رہی بلکہ اس کے پاس ٹھوس معلومات ہیں۔ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تم اس بارے میں مسز بولیٹو سے بہت کچھ جان چکی ہو۔"

"جی......" جین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کا کیا جواب دے۔

"بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مسز بولیٹو نے تمہیں اس بارے میں بتادیا ہے۔"

"انہوں نے مجھے آپ کی شادی اور اس ہوٹل میں ہنی مون کے بارے میں بتایا تھا۔" جین بے وقوفی سے بولی۔

مسٹر تھارپ خاموش ہوگئے۔ وہ ڈر رہی تھی کہ شاید اس نے انہیں ناراض کردیا ہے لیکن جب انہوں نے بولنا شروع کیا تو ان کے لہجے میں ناراضگی کے بجائے افسردگی کا تاثر نمایاں تھا۔

"ہاں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں میں نے آخری بار ٹیمی کو زندہ دیکھا تھا۔"

"یہاں اس ہوٹل میں؟" وہ چونک پڑی۔

"ہاں۔ ٹھیک اسی جگہ، یہیں سے میں نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا اور مجھے ڈھیروں خوشیاں ملیں۔"

"پھر کیا ہوا؟"

مسٹر تھارپ دور خلاؤں میں دیکھ رہے تھے پھر ان کی نظریں جین کے چہرے پر جم کر رہ گئیں اور وہ بولا۔

"مجھے ساری زندگی فوٹوگرافی کا شوق رہا۔"

"مسز بولیٹو نے مجھے بتایا تھا کہ آپ بہت اچھے فوٹوگرافر ہیں۔"

"اور یہ جگہ....." انہوں نے انگلی سے سمندر میں ابھری ہوئی چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ جگہ فوٹوگرافی کے لیے بہترین ہے۔ ہم نے اسی ہوٹل میں شادی کی دعوت دی تھی اور سب مہمان تقریباً چار بجے تک رخصت ہوچکے تھے، اس زمانے میں آج کی طرح شام میں شادیاں کرنے کا رواج نہیں تھا۔ مہمانوں کے جانے کے بعد میں اور ٹیمی یہاں آگئے کیونکہ میں اس جگہ پر شادی کی یادگار تصویر بنانا چاہ رہا تھا۔ ٹیمی اس چٹان کے سامنے اس طرح کھڑی ہوگئی جیسے وہ اسی کا حصہ ہو۔"

پہلی بار جین نے اس چٹان کو غور سے دیکھا۔ اس کا اوپری حصہ بالکل مچھلی کے سر جیسا تھا جو اپنا جبڑا کھولے ہوئے کھڑی ہو۔

"پھر کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

مسٹر تھارپ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولے۔ "میں ہمیشہ سے ہی کمال پرست واقع ہوا ہوں اور کمالِ فن کا قائل ہوں اور شاید یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ میں چاہ رہا تھا کہ میری دلہن کی تصویر ہر لحاظ سے مکمل ہو اور میں اسے ایک شاہکار تصویر کا درجہ دے سکوں۔ میں اس لمحے کو امر کرلینا چاہتا تھا جس نے مجھے زندگی

کی سب سے بڑی خوشی عطا کی تھی تاکہ میں اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھ سکوں۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر بھیگی ہوئی آنکھوں سے افق کے پار دیکھنا شروع کردیا۔

''میں نے اپنا کیمرا سیٹ کیا۔ اس زمانے میں بڑے بڑے کیمرے ہوتے تھے جنہیں اسٹینڈ پر رکھنا ہوتا تھا اور ان کے لینس بھی اتنے طاقتور نہیں تھے لہٰذا مجھے اس کام میں کافی وقت لگ گیا۔ ٹیمی نے اس کا بالکل برا نہیں منایا۔ وہ میری ہدایات پر پوری طرح عمل کر رہی تھی۔ ہمارے پاس اکٹھے وقت گزارنے کے لیے پوری زندگی پڑی ہوئی تھی۔ اس لیے ایک یادگار تصویر کے لیے چند منٹ دینا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔''

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا پھر اس نے بولنا شروع کیا۔ ''ٹیمی مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ جہاں چٹان کا آخری کنارہ ہے۔ اس نے میرا اشارہ سمجھنے میں غلطی کی۔ میں اسے تھوڑا سا دائیں جانب ہونے کے لیے کہہ رہا تھا جبکہ وہ سمجھی کہ میں اس سے پیچھے جانے کے لیے کہہ رہا ہوں۔''

مسٹر تھارپ کی آواز بھرا گئی۔ انہوں نے ایک گہری سانس لی اور دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولے۔ ''جیسے ہی میں نے کیمرے کا بٹن دبایا تو ٹیمی منظر سے غائب ہو چکی تھی۔''

جینن اس کی بات کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ صدمے سے اس کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی اور وہ کوشش کے باوجود کچھ نہ بول سکی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے حواس یکجا کیے اور بولی۔ ''اس کے بعد تمہیں یہاں رہنے کا بھی خیال نہیں آیا۔''

بوڑھے تھارپ نے بے رخی سے اسے دیکھا اور خودکلامی کے انداز میں بولا۔ ''اس کے بعد..... نہیں۔ کبھی نہیں۔''

''پھر تم ہر سال یہاں کیوں آتے ہو؟''

''ہاں۔'' مسٹر تھارپ نے جذباتی انداز میں کہا۔ ''یہ ایک رسم ہے۔ میں ٹیمی کا شکریہ ادا کرنے اور اسے خراجِ عقیدت پیش کرنے یہاں آتا ہوں۔''

☆☆☆

پہلے جینن کا خیال تھا کہ اس نے اتنی زبردست رومانی کہانی آج تک نہیں سنی۔ اب اسے بھی اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ وہ ہر حال میں بوبی سے جان چھڑانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ اس نکمے آوارہ انسان کے پاس کیا تھا جو وہ اسے دے سکتا تھا۔ وہ اس کی جگہ کسی دوسرے بہتر شخص کو دے سکتی تھی جو اس کی تمام محرومیوں کا ازالہ کرسکے اور اس کے لیے اسے اپنا قصبہ چھوڑ کر کہیں نہیں جانا پڑتا، وہ کارن وال سے محبت کرتی تھی کیونکہ اس کے خیال میں وہ دنیا کی سب سے زیادہ رومانی جگہ تھی۔

جب مسٹر تھارپ واپس اپنے ہوٹل لاس ویگاس پہنچا جہاں وہ عرصہ دراز سے مقیم تھا تو وہ اپنے آپ کو ہمیشہ کی طرح بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا اور اب یہ اس کے لیے سب سے زیادہ ضروری روایت بن گئی تھی۔ وہ واقعی ٹیمی کا شکرگزار تھا جس کی وجہ سے اسے عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کا موقع ملا تھا اگر وہ اسے شادی والے دن چٹان سے دھکا نہ دیتا تو ان کی زندگی میں یہ بہار کبھی نہ آتی۔

گو کہ اس نے یہ خبر پھیلا دی تھی کہ وہ ٹیمی کی وصیت سے دستبردار ہو گیا ہے اور اس سلسلے میں قانونی دستاویز بھی تیار کرلی گئی ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کاغذ پر کبھی دستخط نہیں ہوئے تھے۔ ٹیمی نے ورثے میں بہت کم دولت چھوڑی تھی جو ٹریوی ہاؤس کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ البتہ اس کی مدد سے وہ امریکا کے کسی شہر میں کچھ عرصہ قیام کرسکتا تھا چنانچہ ایک دن اس نے ٹریوی ہاؤس کو تالا لگایا اور چپکے سے کارن وال چھوڑ کر چلا گیا۔

اسے چند سال انتظار کرنا پڑا تاکہ جائداد کی قیمتیں ایک بار پھر اوپر آجائیں۔ کسی وصیت کے نہ ہونے کی صورت میں وہی ٹیمی کی جائداد اور اثاثوں کا قانونی وارث تھا لہٰذا اسے ٹریوی ہاؤس کو فروخت کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ اس سودے میں اس کے ہاتھ ایک بڑی رقم آئی جس کے ذریعے وہ لاس ویگاس منتقل ہو کر وہ طرزِ زندگی اپنا سکتا تھا جس کا اس نے ہمیشہ خواب دیکھا تھا۔

مسٹر تھارپ نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پونے چار بج رہے تھے۔ اب وہ کافی عمر رسیدہ ہو چکا تھا۔ اس لیے بازاری عورتوں میں اس کی دلچسپی برائے نام رہ گئی تھی لیکن چند منٹوں بعد جو لڑکی آنے والی تھی، اس نے گویا انہیں پھر سے جوان کردیا تھا۔ ٹھیک چار بجے جینن نے ان کے دروازے پر دستک دی اور تیزی سے ان کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ مسٹر تھارپ ہمیشہ سے ہی روایت پسند تھا۔ اس لیے ایک نئی روایت قائم کرنے میں اسے کوئی عار محسوس نہیں ہوا۔ جینن نے اسے وہ سب کچھ دے دیا تھا جس کی تمنا کوئی بھی مرد کرسکتا ہے۔

☆

شرارت

طاہر جاوید مغل

کبھی کبھی نادانیاں بھی آگہی کے در وا کر جاتی ہیں... اور بالخصوص بچوں کی معصوم شرارتوں کو دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے جیسے قدرت ان ننھے منے فرشتوں سے جان بوجھ کر ایسی حرکتیں سرزد کراتی ہے جو بعد میں کسی نہ کسی پیغام کی نشاندہی کر رہی ہوتی ہیں۔ بچے کی ایسی ہی ایک ادا نے ماں کو جو اشارہ دیا وہ قدرت کی طرف سے اس کے صبر اور حوصلے کا بہت بڑا انعام ثابت ہوا۔ بات صرف سمجھنے کی تھی۔

دل برداشتہ لمحات میں ایک دوسرے کا حوصلہ بن جانے والے اثر انگیز سفر کا قصہ

میرا نام انجم امین ہے۔ میں لاہور کی ایک مشہور بوتیک کی مالک ہوں۔ لاہور میں میری بوتیک کی دو شاخیں ہیں۔ اب حال میں ہی میں نے سیالکوٹ میں تیسری شاخ کا افتتاح کیا ہے۔

وہ جولائی کی ایک گرم شام تھی۔ میں لاہور میں اپنی بوتیک کی مین برانچ میں تھی اور اپنی مخصوص نشست پر بیٹھی چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ یہ سچ ہے کہ چائے کے شوقین موسموں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ آج موسم کافی گرم



رہا تھا۔ دن کے وقت بھی مشکل سے تین چار کسٹمرز آتے تھے۔ اس وقت شاپ میں دو میاں بیوی لیڈیز کُرتے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ دو چھوٹے بچے تھے۔ بڑے بچے کی عمر تین ساڑھے تین سال سے زیادہ نہیں تھی۔ میں دیکھ رہی تھی۔ شوہر چھوٹے بچے کو اٹھانے کے لیے نیچے جھکا تو اس کی جیب میں سے بال پین نیچے گر گیا۔ یہ پین بڑے بچے نے بڑی تیزی سے اٹھالیا۔ والد اور والدہ کو خبر نہیں ہوئی۔ اسی دوران میں میں نے ایک کال اٹینڈ کی۔ جب دوبارہ دیکھا تو وہ بچہ فرش کی ٹائلز پر بنے ہوئے ڈیزائن پر اپنے والد کا بال پین بڑی تیزی سے چلا رہا تھا۔ تب ہی اس کے والد کی نظر بھی اس پر پڑی۔ وہ شخص موسم کے پیشِ نظر پہلے ہی ذرا تپا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے بچے کو ڈانٹا اور ایک چپت بھی لگائی۔ میں نے سچویشن کو نارمل کرنے کے لیے فوراً کہا۔ ''ارے نہیں جناب! کوئی بات نہیں۔ بچے کو ماریں مت۔ بچے کے ہر کام میں معصومیت ہوتی ہے اور اکثر کوئی نہ کوئی بہتری اور فائدہ پوشیدہ ہوتا ہے۔''

میرے اس اچانک بولے گئے جملے نے مجھے چھ سات سال پیچھے پہنچا دیا۔ مجھے یاد آنے لگا کہ آج میں اور میری فیملی جس معیار کی زندگی گزار رہے ہیں...... اور یہ شاندار بوتیک کس طرح وجود میں آئی...... ہاں، یہ سب کچھ بھی ایک بچے کی معصوم سی شرارت کا ہی مرہونِ منت تھا۔

میرے شوہر امین یونس اردو کے ایک مقامی روزنامے میں سب ایڈیٹر ہیں۔ ہمارے تین بچے ہیں۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ فیضان، عادل اور انعم۔ آج سے پانچ سال پہلے دوسرے بیٹے عادل کی پیدائش کے بعد اخراجات ایک دم بڑھ گئے۔ عادل کی دیکھ بھال کے لیے چھوٹی چھوٹی ضروریات کی بھرمار تھی اور انہی دنوں فیضان کا بھی اسکول میں ایڈمیشن کرایا گیا تھا۔ اب ہمیں اندازہ ہوا کہ آمدن کے مقابلے میں اخراجات بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ دھیرے دھیرے امین کے مزاج میں تلخی آتی جا رہی ہے۔ آئے دن چھوٹی چھوٹی باتوں پر مجھ پر بگڑنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اخراجات کے بوجھ کی وجہ سے ہی تھا۔ ہم نے بڑی کفایت شعاری سے رمضان کے روزے رکھے تھے اور اب عید قریب تھی۔ اپنی تو خیر تھی، پر بچوں کے لیے تو نئے کپڑے درکار تھے۔

ایک دن میں نے امین سے کہا۔ ''عید سر پر آ گئی ہے۔ اپنی تو خیر ہے، بچوں کے لیے نئے کپڑے چاہئیں۔ آپ مجھے ان کے کپڑوں کے لیے کچھ پیسے دے دیں۔''

بس میرا یہی کہنا تھا کہ وہ ایک دم آگ بگولا ہو گئے۔ ''تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ میں کس طرح سے ضرورتیں پوری کر رہا ہوں؟ ایک سیلاب ہے خرچوں کا۔ کہاں سے لاؤں اتنے پیسے؟ کوئی ڈاکا ڈالوں یا اپنا گردہ بیچ آؤں......؟''

''امین! میں تو صرف......'' میری بات ادھوری رہ گئی۔

''چپ کر جاؤ خدا کے لیے۔'' انہوں نے چلّا کر کہا اور پاؤں پٹختے ہوئے آفس کے لیے روانہ ہو گئے۔

میری تو حالت ہی عجیب ہو رہی تھی۔ موجودہ صورتِ حال پہ میں سکتے کے عالم میں کافی دیر یونہی کھڑی رہی۔ شکر ہے بچے اس وقت دوسرے کمرے میں سو رہے تھے۔ امین آج سے پہلے کبھی اس انداز میں نہیں بولے تھے۔ بحث تکرار تو چلتی رہتی تھی لیکن ایسی تلخ کلامی کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی۔

شام کو بھی وہ وقت پر گھر نہیں آئے۔ میں بڑی پریشان تھی۔ بہرحال جب وہ آئے تو ان کے چہرے پر ٹھہراؤ تھا۔ میں نے شکر کیا۔ اس رات ہم نے تسلی سے بیٹھ کر تفصیل سے بات کی اور اپنے مسائل پر غور کیا۔ ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ ایسے گزارہ مشکل ہے۔ روزگار کا کوئی مزید ذریعہ بھی پیدا کرنا پڑے گا۔

امین نے کہا۔ ''میری نظر میں ایک دکان ہے۔ کرائے پر مل رہی ہے۔ دل چاہتا ہے، وہاں ایک بک شاپ کھول لوں۔ آفس سے آ کر وہاں وقت دوں۔''

''کس جگہ ہے دکان؟'' میں نے پوچھا۔

''مین روڈ پر مدینہ کالونی والے موڑ کے ساتھ ہی۔''

''چلیں آئیں چل کر دیکھتے ہیں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

ہم نے اسی وقت موٹر سائیکل پر وہاں کا وزٹ کیا۔ جگہ دیکھ کر میرے ذہن میں ایک آئیڈیا لپک کر آیا۔ دکان کی لوکیشن ایک بوتیک کھولنے کے لیے بہت آئیڈیل تھی۔ اسی سڑک پر آگے جا کر دو بڑے شاپنگ مالز اور دو تین بوتیکس بھی تھیں۔ میں نے گریجویشن فیشن ڈیزائننگ میں کی تھی۔ اچھے کپڑے خریدنے اور سینے کا شوق مجھے ہمیشہ سے تھا۔ شادی سے پہلے میں ایک مشہور بوتیک کے لیڈیز پورشن میں ایک ڈیڑھ سال جاب بھی کرتی رہی تھی۔

گھر پہنچ کر میں نے امین کو اپنی رائے سے آگاہ کیا۔ امین کو بھی میرا آئیڈیا اچھا لگا۔ ہم نے بڑی سنجیدگی سے

سوچنا شروع کر دیا کہ کیوں نا کسی طرح ہم یہ دکان خرید لیں اور یہاں بوتیک کا کام شروع کریں۔ ایک دفعہ یہ بات ہم دونوں کے ذہن میں بیٹھ گئی تو پھر بیٹھتی چلی گئی۔ ہم نے تہیہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہوگا، ہم یہ دکان خریدیں گے اور اپنی ذاتی جگہ پر کام شروع کریں گے۔

ہمارا کل اثاثہ وہ چار مرلے کا رہائشی پورشن تھا جو وراثت میں ہمارے حصے میں آیا تھا۔ اس کے علاوہ میرے کچھ زیورات تھے۔ ہم نے کچھ مزید سوچ بچار کی اور مکان بیچ کر دکان خریدنے کی نیت کر لی۔

اگلے ہی مہینے ہم ایک کرائے کے مختصر گھر میں منتقل ہو گئے اور مکان کو رنگ روغن کر کے بیچنے کے لیے رکھ دیا۔ کبھی امین پریشان ہوتے تو میں ان سے کہتی۔ ''اللہ سے اچھے کی امید رکھیں امین... بے شک ہم رسک لے رہے ہیں، لیکن رسک کے بغیر تو کوئی کامیابی نہیں ملتی۔''

کبھی میں کرائے کے گھر میں غمزدہ ہوتی تو امین مجھے تسلی دیتے۔ ''پریشانی کے دن تھوڑے ہیں انجم! کاروبار ہو تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔ مکان بھی دوبارہ بن جاتے ہیں۔''

وہ ہمارے لیے بڑی خوشی کا دن تھا جب مکان کا بیعانہ ہوا۔ ہمارا مکان اچھی قیمت پر بک رہا تھا۔ امید تھی کہ ہم نہ صرف دکان خرید سکیں گے بلکہ اگر تھوڑی سی کوشش مزید کریں گے تو کاروبار میں ڈالنے کے لیے کچھ سرمایہ بھی مہیا ہو جائے گا۔ وہ ہماری شادی کی ساتویں سالگرہ بھی تھی۔ صبح گیارہ بجے امین مکان کی بقایا رقم کی وصولی کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ بچے اسکول جا چکے تھے۔ میں معمول کے مطابق گھر کے پاس والی مارکیٹ سے سبزی خریدنے گئی۔ وہاں قریب ہی ایک بک شاپ بھی تھی۔ میں نے وہاں سے امین کے لیے ایک خوب صورت سا بال پین خریدا۔ ویسے تو شادی کی ہر سالگرہ پر ہمارے درمیان قیمتی تحائف کا تبادلہ ہوتا تھا لیکن اس دفعہ بجٹ کے پیش نظر اور اپنی موجودہ استطاعت کے مطابق میں نے امین کو تحفے میں دینے کے لیے یہ بال پین خریدا۔ آج کھانے میں بھی میں نے کچھ اسپیشل بنانے کا سوچا تھا۔ امین کی پسند کا کھانا یعنی ایگ فرائڈ رائس اور منچورین۔

میں کچن سے فارغ ہوئی تو امین گھر آ گئے۔ میں نے کہا۔ ''آپ تو کہہ رہے تھے کہ بارہ بجے تک آ جاؤں گا اور اب ڈھائی بج رہے ہیں۔''

''ہاں، بس فہیم صاحب نے اسٹامپ پیپر کا بندوبست کرتے ہوئے دیر کر دی۔'' بیڈ پر بیٹھ کر انہوں نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی انہوں نے خاکی کاغذ میں لپٹی ہوئی بھاری بھرکم شے مجھے تھمائی اور بولے۔ ''یہ لیں انجم میڈم! مکان کی رقم اور ہمارے خواب کی تکمیل کی طرف ہمارا پہلا قدم۔''

میں نے بسم اللہ پڑھ کر ان کے ہاتھ سے وہ لفافہ لیا۔ وہ بولے۔ ''اسے جا کر سیف کے اسی خانے میں رکھ دو، جہاں زیور پڑا ہے۔ مجھے ڈیلر کے پاس ہی دیر ہو گئی ورنہ بینک میں جمع کروا کر آتا۔''

دراصل جمعہ تھا اور بینک جلدی بند ہو گئے تھے۔ فیضان اور عادل بھی دوپہر کو ہی گھر آ گئے تھے۔ فیضان کی اسکول شرٹ کہنی کے پاس سے پھٹی ہوئی تھی۔ ڈیسک کی کوئی میخ وغیرہ لگ گئی تھی۔ امین نے اسے ڈانٹا۔ حالانکہ امین کو فیضان اور عادل سے ایک جیسا پیار تھا لیکن کبھی کبھی وہ فیضان پر تھوڑی سی سختی بھی کر دیتے تھے۔ شاید یہ اس کی شرارتوں کی وجہ سے تھا۔ فیضان کو پڑنے والی ڈانٹ کے سوا وہ دن اچھا ہی گزرا۔ شام کو ہم نے چائے کے ساتھ سالگرہ کا کیک کاٹا۔ دونوں بچے بھی خوش تھے۔ امین نے مجھے ایک خوب صورت سا ہیئر کلپ دیا اور میں نے انہیں برانڈڈ بال پین دیا، جو انہیں بہت پسند آیا۔ بولے۔ ''واہ! یہ تو عین حسب حال گفٹ ہے۔ میرا پہلا قلم اب جواب دینے لگا تھا۔''

میں نے بھی ان کے گفٹ کے لیے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اسی دوران میں ہمارے پڑوسی بیگ صاحب اور ان کی بیگم ہم سے ملنے آ گئے۔ ہم انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ بچے باہر ہی کھیل رہے تھے۔ اپنے مہمانوں کے ساتھ ہمیں ایک مرتبہ پھر سے چائے پینا پڑی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ کسی دن بہت خوش ہوتے ہیں اور ہر اس عمل سے بچتے ہیں جو بدمزگی کا باعث بنے اور جب آپ بہت زیادہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں تو اکثر آپ کا ڈر حقیقت کا روپ دھار ہی لیتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ مہمانوں سے فارغ ہو کر جب ہم واپس آئے تو دیکھا کہ فیضان کے ہاتھ میں وہی پین تھا جو میں نے امین کو گفٹ کیا تھا۔ فرش کی ٹائلز پر بنے ڈیزائن کے اوپر بڑی تیزی سے وہ پین چلا رہا تھا اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ امین نے فیضان کو ایک زوردار تھپڑ دے مارا اور ساتھ میں خوب ڈانٹ پلائی۔ صرف فیضان کو ہی نہیں مجھے بھی۔ ان کا کہنا یہی تھا کہ میرے بے جا..... لاڈ پیار سے فیضان دن بہ دن بگڑتا جا رہا ہے۔

میرا دل تو جیسے بجھ کر ہی رہ گیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ چیزیں غلط ہونے لگیں تو سب ہوتی چلی جاتی ہیں۔ بس اس دن بھی یہی ہوا۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اب تک جو ہوا، وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ آگے ایک ایسا سخت امتحان آرہا تھا جس نے ان بنیادوں کو ہی ہلا دیا جن پر ہم اپنے خواب کا محل بنا رہے تھے۔

فیضان کو تھپڑ اور ڈانٹ والے واقعے کے بعد ہم نے بس چپ چاپ رات کا کھانا کھایا۔ میں نے بچوں کو سلایا اور خود بھی سونے کے لیے کمرے میں چلی گئی۔ امین ٹی وی پر ایک ٹاک شو دیکھ رہے تھے۔ رات تقریباً پونے گیارہ کا وقت تھا۔ اچانک ہماری ڈور بیل بجی۔ ''اس وقت کون آگیا؟'' امین نے اپنی چپل پہنتے ہوئے کہا اور دروازہ کھولنے کے لیے باہر نکلے۔ میں بھی پریشان ہوگئی اور امین کے پیچھے چلتی ہوئی صحن تک آگئی۔ ''کون ہے؟'' امین نے پوچھا۔

''ہاں جی، امین صاحب! میں مبشر ہوں۔ دروازہ کھولیے۔''

مبشر صاحب ہمارے مالکِ مکان تھے۔ یہاں پر شفٹ ہونے کے بعد بس ایک دو دفعہ ہی ملاقات ہوئی تھی ان سے۔ گھر کا کرایہ ان کا چھوٹا بیٹا وصول کرنے آتا تھا۔

امین نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور پھر وہ ہوا جس کی ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی۔ تین افراد تیزی سے اندر گھس آئے۔ ان میں سے دو نے اپنے چہرے بڑے بڑے رومالوں (ڈھاٹوں) میں چھپا رکھے تھے۔ دو افراد نے تیزی سے امین کو دبوچ لیا۔ ایک میری طرف لپکا۔ میں صرف ایک بار چلا سکی۔ اس سے پہلے کہ دوسری مرتبہ چلاتی لحیم شحیم شخص نے اپنا چوڑا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا اور مجھے ہلنے جلنے سے قاصر کردیا۔ یہ دیکھ کر میری دہشت انتہا کو پہنچ گئی کہ امین کو دبوچنے والے دو بندوں میں سے ایک نے سیاہ رنگ کا پستول امین کی کنپٹی سے لگا دیا تھا۔

یہ وہی شخص تھا جس نے اپنا چہرہ چھپا نہیں رکھا تھا۔ یہ کوئی پٹھان یا افغانی لگتا تھا۔ سر تقریباً گنجا تھا۔ نقوش کرخت تھے۔ عمر چالیس سال کے قریب رہی ہوگی۔ وہ پھنکار کر بولا۔ ''اگر گڑبڑی کروگے تو پھر بہت زیادہ گڑبڑی ہوگا۔ ام گولی چلانے میں بالکل دیر نہیں کرے گا۔''

اس کی آواز میں اتنی سفاکی تھی کہ میں لرز کر رہ گئی۔ امین نے بھی ایک دم مزاحمت ختم کردی۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر بیرونی دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

یہ لوگ مجھے اور امین کو برآمدے میں لے آئے۔ نیم گنجے شخص نے ایک کھڑکی سے کمرے میں جھانکا۔ وہاں ہمارے دونوں بچے حالات کی شدید سنگینی سے بے خبر سو رہے تھے۔ اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''اگر تم دونوں امارے کہنے پر چلے گا تو تمہیں اور تمہارے بچہ لوگ کو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچے گا۔ دوسری صورت میں خون خرابا ہوگا۔'' اس نے بچہ لوگ کے لفظ پر زور دیا تھا۔

میں نے چوڑے چکلے شخص کا ہاتھ اپنے منہ سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگوں کو جو چاہیے یہاں سے لے جاؤ۔ لیکن ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔''

''گھر کا چابیاں کدھر ہے؟'' نیم گنجے شخص نے پٹھانی لہجے میں اردو بولتے ہوئے کہا۔

امین کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نظر آئے۔ شاید اسے اپنی ساری جمع پونجی کا خیال آگیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ امین ان بے رحم لٹیروں سے کوئی اور بات کہتے، میں نے بھرائی ہوئی آواز میں انہیں چابیوں کی جگہ بتا دی۔ وہ ہمارے بیڈ کے تکیے کے نیچے رکھی تھیں۔ ایک ڈھاٹا پوش اپنے ہاتھ میں چاقو لہراتا ہوا ہمارے بیڈروم کی طرف گیا اور چابیاں لے آیا۔ میں نے دیکھا امین کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ میری اپنی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ بہرحال ہم دونوں ہی سمجھتے تھے کہ اپنے بچوں کی سلامتی سے بڑھ کر ہم دونوں کے لیے اور کچھ نہیں۔

ان لوگوں نے بڑے سخت الفاظ میں ہم دونوں کو خاموش رہنے کی وارننگ دی۔ پھر ہمیں گھر کے چھوٹے سے اسٹور میں بند کردیا۔ ہم وہاں سکتہ زدہ کھڑے رہے اور ایک چھوٹی سی کھڑکی کے راستے، ڈاکوؤں کو اپنے گھر میں دندناتے ہوئے دیکھتے رہے۔

بے بسی جیسی بے بسی تھی۔ میں نے کہیں سن رکھا تھا کہ اس طرح کی وارداتیں مخبری پر بھی ہوتی ہیں۔ کوئی شخص جب اپنا کوئی قیمتی اثاثہ بیچتا ہے اور کیش رقم گھر لاتا ہے تو کبھی کبھی جرائم پیشہ لوگ اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور رات کو واردات کر ڈالتے ہیں۔ شاید ہمارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر ان خبیثوں نے کیش اور زیورات سمیت وہ سب کچھ حاصل کرلیا جو کرنا چاہتے تھے۔

اسٹور کے اندر امین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہم لٹ گئے انجم۔''

میں نے تسلی دینے والے انداز میں ان کے ہاتھ

اپنے لرزاں ہاتھوں میں تھام لیے۔

ان لوگوں نے کچن میں جا کر ہمارا فریج کھولا اور اس میں کھانے پینے کی جو بھی چیز ملی کھا گئے، ان میں ہماری سالگرہ کا بچا ہوا کیک بھی شامل تھا۔ وہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ نیم گنجا شخص اپنے ایک ساتھی کو لبو کہہ کر بلا رہا تھا۔ اسٹور کے اندر ہم دونوں کی بس ایک ہی خواہش تھی، یہ لوگ اب جلد سے جلد ہمارے گھر سے نکل جائیں۔

آخر وہ گھڑی آگئی۔ وہ لوگ جانے کے لیے تیار نظر آنے لگے۔ کیش اور زیورات انہوں نے فیضان کے ہی خالی بستے میں رکھ لیے تھے۔ یہ بستہ نیم گنجے شخص کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہم سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر تھے اور ان کی مدھم آوازیں ہمارے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔

لبو کی آواز آئی۔ ''کل کہاں ملاقات ہوگی خاناں؟''

''کالونی والے گھر آجانا۔'' نیم گنجے سرغنہ کی آواز سنائی دی۔

''وہ تو مشکل ایڈریس ہے خاناں۔ پچھلی بار کی طرح خجل خوار ہوتا رہوں گا۔''

''اچھا روتا کیوں ہے۔ ام چھوٹے لالے کا پون نمبر (فون نمبر) دیتا ہے تمہیں۔'' نیم گنجے نے کہا۔

امین اور میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں وہ تینوں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ نیم گنجے سرغنہ نے فیضان کا بستہ خالی کرنے کے لیے ساری کتابیں کاپیاں میز پر الٹ دی تھیں۔ اس نے ان میں سے ایک کاپی اٹھائی اور اس پر فون نمبر لکھنے لگا۔ میں نے غور سے دیکھا، اس کے ہاتھ میں وہی قیمتی بال پین تھا جو چند گھنٹے پہلے میں نے امین کو تحفے میں دیا تھا اور فیضان نے فرش پر رگڑ کر خراب کر دیا تھا۔ سرغنہ جھلایا ہوا نظر آیا۔ شاید پین لکھ نہیں رہا تھا۔ اس نے فونٹین پین کی طرح بال پین کو چھڑکا اور پھر لکھنا چاہا۔ دوسری تیسری کوشش میں وہ بہ مشکل کامیاب ہوا۔ اس نے کاپی کا ورق پھاڑ کر لبو کے حوالے کیا۔ اس کے بعد وہ اسٹور روم کی طرف آگیا۔ اس نے اسٹور کا دروازہ باہر سے کھول دیا لیکن اس کے ساتھ یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اگلے پانچ منٹ تک ہم نے اسٹور سے قدم باہر نکالا یا شور مچانے کی کوشش کی تو ہمارے حق میں بے حد برا ہوگا۔ وہ چلے گئے اور ہم حسرت سے انہیں جاتے دیکھتے رہے۔ ہمارے دل سینوں میں ٹھہر سے گئے تھے۔

☆☆☆

ڈاکے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ ''آپ

ذہانت

ایک قصبے میں ایک سرمایہ دار رہتا تھا۔ وہ ہر سال نئے مزدور تلاش کرتا تھا اور انہیں سالانہ تنخواہ دیا کرتا تھا...... لیکن وہ ان کی تنخواہ کاٹنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا مگر ملا کو اس بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ بادشاہِ وقت نے ملا سے کہا کہ وہ تحقیقات کرے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ کرے۔

ملا نے اس سرمایہ دار کے ہاں ملازمت کرلی۔ جب ایک سال مکمل ہوا تو سرمایہ دار نے ملا کو طلب کر کے سرد مہری سے کہا۔ ''تمہیں میرے ہاں ملازمت کرتے ہوئے پورا ایک سال ہوگیا ہے۔ میں تمہیں پورے ایک سال کی تنخواہ دوں گا لیکن تمہیں پہلے میرے ایک سوال کا جواب دینا ہوگا۔''

ملا نے کہا۔ ''سوال کیا ہے؟''

سرمایہ دار بولا۔ ''سوال یہ ہے کہ میرے سر کا وزن کتنا ہے؟ لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو کہ اگر تم نے غلط جواب دیا تو میں تمہیں ایک پائی بھی نہیں دوں گا۔''

ملا نے کچھ دیر اس کے منڈے ہوئے سر کی طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ ''ڈھائی سیر۔''

سرمایہ دار بولا۔ ''بالکل غلط ہے۔''

ملا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''جناب اگر آپ کو شک ہے، تو میں آپ کا سر کاٹ کر ترازو میں تول دیتا ہوں۔'' اور ساتھ ہی خنجر نکال لیا۔ ''اس طرح فیصلہ ہوجائے گا کہ میرا جواب صحیح ہے یا غلط۔''

سرمایہ دار گھبرا گیا اور جلدی سے بولا۔ ''نہیں...... نہیں تمہارا جواب بالکل صحیح ہے۔'' اس کے بعد اس دھوکے باز سرمایہ دار نے کسی مزدور کے پیسے نہیں کاٹے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

نے سنا ہے، نئے کرائے داروں کے گھر میں ڈاکا پڑ گیا۔'' محلے میں ہر شخص کی زبان پر یہی بات تھی۔ ہم میاں بیوی تو دو دن تک سکتے کے عالم میں ہی رہے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ہمارے ساتھ ایسا ہو چکا ہے۔ بچے بھی افسردہ اور سہمے ہوئے لگتے تھے۔ ہمارے پرانے محلے سے بھی ہمارے ساتھ والی آنٹی جن سے ہماری اچھی خاصی شناسائی تھی، ہمارے گھر افسوس کے لیے آئیں اور بھی کئی لوگ پہنچے۔ غرض یہ کہ چند دن گھر میں سوگ کا سماں ہی رہا۔ اسی دوران میں لاہور کے باہر سے بھی ہم دونوں کے عزیز ہم سے ملنے آئے۔ ان میں امین کے بڑے بھائی نعیم بھائی بھی تھے۔ ان کا بڑا بیٹا جو فیصل آباد میں تھا، پولیس میں اے ایس پی تھا۔ ان کے ریفرنس سے ہم نے ایف آئی آر بھی کٹوائی۔ ہم نعیم بھائی کی کار میں ان کے ساتھ ہی پولیس اسٹیشن سے واپس آرہے تھے۔ امین حد درجہ افسردہ تھے۔ بولے۔ ''نعیم بھائی! سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ کسی کا حق نہیں مارا۔ اپنی توفیق کے مطابق صدقہ خیرات بھی کیا ہے۔''

نعیم بھائی نے تسلی دی۔ ''کتنا بڑا شکر ہے کہ اللہ پاک نے تم لوگوں کی جانیں محفوظ رکھی ہیں۔ بہرحال جو مالی نقصان ہوا ہے، اس کا بھی اللہ پاک مداوا ضرور کرے گا۔ تم لوگوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔''

نعیم بھائی اسی دن واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے تین چار دن بعد پولیس اہل کار ہمارے گھر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمیں اے ایس پی صاحب نے بھیجا ہے۔ انہوں نے واردات کے حوالے سے کچھ مزید معلومات لیں اور چلے گئے۔ میں نے امین سے کہا۔ ''لگتا ہے کہ انہوں نے ہمارے کیس کو سنجیدگی سے لیا ہے، ورنہ یہ لوگ تو مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔''

''ہاں دیکھو، کیا بنتا ہے۔'' امین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''ویسے آج ایک دوست سے بات ہوئی تھی۔ وہ تو کہہ رہا تھا کہ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب بھول جاؤ سب کچھ۔ تھانے کچہری وغیرہ کے چکر میں رہے تو تمہاری جاب بھی متاثر ہو سکتی ہے۔ ایسی وارداتوں کے کھوج کم ہی ملتے ہیں۔''

''امین! ایسی بات نہ کریں۔ آپ کو یاد ہے نا نعیم بھائی نے کہا تھا خدا کی ذات پر بھروسا رکھیں۔'' دن گزرتے رہے۔ اب واردات کو ہوئے قریباً تین ہفتے ہو چلے تھے۔ مایوسی مجھ پر بھی غالب آنا شروع ہو گئی تھی۔

ایک دن بچے اسکول سے آئے۔ میں نے انہیں کھانا وغیرہ دیا اور پھر بڑے دکھی دل کے ساتھ بستر پر نیم دراز ہو گئی۔ فیضان اپنا کلاس ورک دکھانے کے لیے میرے پاس آیا۔ اتنی معصوم شکل بنا رکھی تھی اس نے کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی کاپی دیکھنے لگی۔ اچانک میں بری طرح چونک گئی۔ پورے جسم میں جیسے ایک برق سی دوڑ گئی۔ فیضان نے کاپی پر لکھتے ہوئے ذرا دبا کر لکھا تھا۔ کھڑکی سے آنے والی روشنی کاپی کے صفحات پر ترچھی پڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ فیضان کی لکھائی کے مدھم نقوش نیچے والے خالی صفحے پر بھی آرہے تھے۔ کچھ پڑھا تو نہیں جارہا تھا مگر نشانات موجود تھے۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے اس منحوس رات کا وہ منظر یاد آگیا، جب نیم گنجا سرغنہ فیضان کی کاپی پر کوئی فون نمبر لکھ رہا تھا۔ وہ امین کے خراب بال پوائنٹ سے لکھ رہا تھا اور بہت دبا دبا کر لکھ رہا تھا۔ میں اٹھ کر دیوانہ وار اس الماری کی طرف گئی جہاں بچوں کی کاپیاں، کتابیں رکھی رہتی تھیں۔ میں نے پندرہ بیس سیکنڈ کے اندر مطلوبہ کاپی ڈھونڈ لی۔ میں نے اندھا دھند صفحے پلٹے اور پھر ایک خالی صفحے پر میری نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ وہاں ایک فون نمبر نشانات کی صورت میں موجود تھا اور پڑھا جارہا تھا۔ میں نے کاپی کو ذرا ترچھا کیا، نمبر بالکل واضح ہو گیا۔ میں امین کو یہ اطلاع دینے کے لیے ٹیلی فون کی طرف بھاگی۔

☆☆☆

اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ انتہائی تیز رفتاری سے ہوا۔ وہ فون نمبر ایک ایسا کھوج تھا جس نے صرف دس بارہ گھنٹوں کے اندر پولیس کو مجرموں کی شہ رگ تک پہنچا دیا۔ سرغنہ سمیت چھ سات افراد گرفتار ہوئے۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں انہوں نے نہ صرف اپنے جرم کا اعتراف کیا بلکہ مالِ مسروقہ بھی برآمد کروا دیا۔ جو رقم ہمارے گھر سے گئی تھی اور جو برآمد ہوئی، اس میں صرف بیس پچیس ہزار کا فرق تھا۔ میرا زیور بھی جوں کا توں مل گیا تھا۔

اوپر والے کے کام اوپر والا ہی جانتا ہے۔ قیمتی بال پوائنٹ کے ساتھ فیضان کی معصوم شرارت نے ایک موقع پر ہمیں بہت تکلیف دی تھی لیکن اس کی یہی شرارت ہمارے لیے بعد ازاں ایک بہت بڑی راحت اور خوشی کا باعث بن گئی تھی۔ میں بھی کبھی اپنے شاندار بوتیک اور گھر کو دیکھتی ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ قدرت نے ہمیں یہ سب کچھ ایک معصوم شرارت اور ایک خراب بال پوائنٹ کے وسیلے سے دیا ہے۔

شیخ ابوالرضا محمد علیہ رحمۃ اللہ

ضیا تسنیم بلگرامی

انسان کی شخصیت تہ در تہ ہوتی ہے لیکن فطرت گرہ کی طرح ایک ایک کر کے کھلتی ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے انسان خود کو جانتا اور اپنی پہچان بناتا جاتا ہے... اور اسی جان پہچان میں وہ یا تو مخلوق کے قریب ہو جاتا ہے یا خالق کی قربت میں خود کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ پہلی قسم کے لوگ دنیا داری میں گم ہو جاتے ہیں اور دوسری قسم کے انسان خود کو بھول کر اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ آپ کا تعلق بھی انہی میں سے تھا جن کے نزدیک اس فانی دنیا میں کوئی کشش نہیں ہوتی۔ وہ تو بس دنیا میں اپنے ہونے کا سبب پورا کر کے پردہ نشین ہو جاتے ہیں۔

تسلیم و رضا کے پیکر اللہ کے ایک عزیز بندے کا احوال



شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے چچا شیخ ابوالرضا محمد اپنے علم و فضل اور معرفت و شہود میں یکتائے زمانہ تھے۔ ہر بڑے آدمی کی طرح ان کے بچپن اور نوجوانی کے واقعات غیر معمولی تھے اور ان سے سرسری نہیں گزرا جا سکتا تھا۔ ابھی بچے ہی تھے کہ علوم ظاہری کے لیے اس عہد کے صاحب مرتبت بزرگ اور عالم حافظ بصیر کا انتخاب ہوا۔ حافظ بصیر عہد شاہجہانی کے نامور عالم تھے۔ ابھی ان سے تحصیلِ علوم کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ مشہور عالم اور صوفی حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے عالم و فاضل اور صاحبِ

کشف وکمال بزرگ صاحبزادے خواجہ خوردؒ کی نظرِ عنایت ہوگئی اور ابوالرضا کی تدریس کی ذمے داری خواجہ خوردؒ نے سنبھال لی۔ حافظ بصیر اور خواجہ خوردؒ نے ان میں ایک ہی بات محسوس کی۔ یہ دونوں حضرات ابوالرضا کو جو کچھ پڑھاتے یا بتاتے تھے، انہیں ایسا لگتا تھا کہ ان کے شاگرد کو گویا وہ سب کچھ پہلے ہی سے معلوم تھا۔ ابوالرضا کے والد شیخ وجیہہ الدین جب بھی ان دونوں اساتذہ سے اپنے بیٹے کی بابت پوچھتے، انہیں یہی جواب ملتا کہ ابوالرضا کو اکتسابِ علوم کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کا علم وہبی ہے۔ دونوں اساتذہ کے اس جواب پر انہیں شیخ ابوالرضا کے بچپن کا ایک غیر معمولی واقعہ یاد آجاتا۔ ابوالرضا چپ چاپ جھولے میں سو جاتے۔ کافی دیر بعد جب ماں ان کے پاس واپس آتیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتیں کہ جھولا مسلسل ہلے جارہا تھا، ایسا لگتا کو یا کوئی انہیں جھلا رہا ہے۔ اس بات کا چرچا ہوا تو گھر کے دوسرے افراد نے بھی یہ منظر دیکھا مگر سمجھ میں کسی کے بھی نہ آیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

جب شیخ وجیہہ الدین نے اپنے بیٹے ابوالرضا کے دونوں بزرگ اساتذہ کو بچپن کا یہ واقعہ بتایا تو ان دونوں نے یکے بعد دیگرے ایک ہی بات کہی۔ ''ابوالرضا خدا کا خاص بندہ ہے، اسے اکتسابِ علم کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ یہ وہبی عالم ہے اور یہ کہ ابوالرضا مستقبل کا عظیم انسان ہے۔''

ابوالرضا جب فارغ التحصیل ہوچکے تو ان کے والد شیخ وجیہہ الدین نے دنیاداروں کے انداز میں انہیں مشورہ دیا کہ انہیں بھی کسی امیر کے دربار سے وابستہ ہوجانا چاہیے تاکہ معاشی خوشحالی سے معاشرے میں عزت و وقار بحال رہے۔

ابوالرضا نے سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کا مشورہ مان لیا اور باپ ہی کی سفارش پر ایک امیر کے دربار میں آنا جانا شروع کردیا۔ اس آمدورفت نے انہیں مالی فائدے پہنچانا شروع کردیے۔ باپ نے خوش ہوکر ان کی شادی کردی تاکہ ابوالرضا دنیا کی پوری ذمے داریوں میں مبتلا ہوجائیں اور آسائشِ دنیا سے بہرہ ور اور لطف اندوز ہوسکیں۔

ابوالرضا کچھ عرصہ تو درباداری کی لعنتیں گوارا کرتے رہے مگر انہیں ہمیشہ یہی محسوس ہوتا رہا کہ وہ جو کچھ بھی کررہے ہیں، بہ جبر اور اپنی مرضی کے خلاف کررہے ہیں۔ اپنی انا کا خون کرکے کررہے ہیں۔ انہوں نے دیکھا درباری مصاحبین کا اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ وہ امیر کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں۔ امیر دن کو رات اور رات کو دن کہتا تو سارے مصاحبین اس کی تائید اس زوروشور اور وثوق سے کرتے گویا توثیق اور تصدیق کا ایک مقابلہ ہورہا ہے اور اس میں ہر کوئی اول آنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ دربار کی اس روش نے ابوالرضا کی طبیعت میں بدمزگی پیدا کردی اور ان کا دل دربار سے اچاٹ رہنے لگا۔

ایک دن دربار میں شمشیرزن اور شجاع ہم عصر مبارزین کا ذکر چھڑا ہوا تھا۔ امیر موصوف نے اپنے مصاحبین کو حکم دیا کہ وہ سب الگ الگ اپنے طور پر ایک دوسرے سے مخفی ہم عصر بہادر مبارزین کی فہرست تیار کریں اور ان کی ترتیب اس طرح ہو کہ پہلی ہی نظر میں ان کے مقام اور مرتبے کا علم ہوجائے۔

جملہ مصاحبین نے گھنٹوں کی سوچ بچار کے بعد جو فہرست تیار کی، اس میں ایک چیز مشترک تھی۔ وہ یہ کہ امیر موصوف کا نام ہر ایک میں سرِفہرست تھا، امیر ہر مصاحب کی فہرست دیکھتا اور خوش ہوکر اسے انعام واکرام سے نوازدیتا۔ آخر میں ابوالرضا کی باری آئی۔ ان کے ہاتھ سے کاغذ جو لیا تو امیر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ بالکل سادہ تھا۔ اس میں ایک نام بھی نہیں لکھا تھا۔

امیر نے درشت لب و لہجے میں پوچھا۔ ''ابوالرضا! کیا بات ہے، اتنی دیر تم کیا کرتے رہے؟''

ابوالرضا نے جواب دیا۔ ''میں یہ سوچتا رہا کہ کس کا نام سرِفہرست رکھوں اور کس کا سب سے آخر میں؟''

امیر زہرخند لہجے میں بولا۔ ''اس میں بھی کوئی سوچنے کی بات تھی؟''

ابوالرضا نے جواب دیا۔ ''جناب! یہ بڑا پیچیدہ کام تھا۔''

امیر نے کہا۔ ''اگر یہ انتہائی پیچیدہ کام تھا تو یہ دوسرے کس طرح کرلائے؟''

ابوالرضا نے جواب دیا۔ ''یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ ان سب نے آپ کا نام سرِفہرست رکھ کر اپنا حقِ نمک ادا کردیا لیکن میں ایسا نہیں کرسکتا تھا۔''

امیر کو سخت غصہ آیا۔ مصاحبین بھی چراغ پا ہوگئے اور انہوں نے ابوالرضا پر لے دے شروع کردی۔

ایک مصاحب نے کہا۔ ''جناب! یہ شخص خود کو عقلِ کُل سمجھتا ہے۔''

دوسرے نے اس پر سبقت لے جانے کی کوشش کی، بولا۔ ''عقلِ کُل نہیں، اپنے آپ کو اس عہد کا سب سے بڑا مبارز

سمجھتا ہے۔ فہرست میں اپنا نام اوپر لکھنا چاہتا تھا۔''

کسی تیسرے نے کہا۔ ''نہیں جناب! یہ بات نہیں ہے، یہ اس عہد کا سب سے بڑا بہادر اپنے باپ وجیہہ الدین کو سمجھتا ہے شاید اس کا نام سرفہرست رکھنا چاہتا تھا مگر ہمارے امیر کے خوف نے اس کو ایسا نہیں کرنے دیا۔''

امیر نے ابو الرضا سے پوچھا۔ ''اس میں کون سی بات سچ ہے؟''

ابو الرضا نے جواب دیا۔ ''ہر بات غلط ہے، یہ سارے ہی جھوٹے اور خوشامدی ہیں، یہ سچ بول ہی نہیں سکتے۔''

امیر نے سختی سے پوچھا۔ ''پھر تو نے فہرست کیوں نہیں تیار کی؟''

ابو الرضا نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ میں ان سب کی طرح نہ تو جھوٹ بول سکتا تھا اور نہ خوشامد کر سکتا تھا۔''

امیر نے خشمگیں نظروں سے گھورا۔ ''تو نے میرا نمک کھایا ہے اس لیے نمک حلالی کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔''

ابو الرضا نے جواب دیا۔ ''اگر نمک حلالی کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ میں جھوٹ بولنے لگوں تو میں آئندہ اس دربار سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا۔''

ایک مصاحب نے عرض کیا۔ ''حضور والا! یہ شخص اپنے علم پر غرور کرتا ہے۔ معاملہ سچ جھوٹ کا نہیں، تکبر کا ہے۔''

امیر نے کہا۔ ''ابو الرضا! تو شیخ وجیہہ الدین کا بیٹا ہے اس لیے میں تجھ کو معاف کرتا ہوں مگر آج کے بعد تیرا اس دربار سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔''

ابو الرضا نے جواب دیا۔ ''میں خود بھی یہی عرض کرنے والا تھا، میں اس کے بعد بھی اگر اس دربار سے وابستہ رہوں تو یہ بڑی بے غیرتی ہوگی۔''

ابو الرضا اسی وقت گھر چلے آئے۔ اس دن وہ بے حد اداس تھے۔ خاموشی سے گھر میں داخل ہوئے تو بیوی نے بے وقت آتا ہوا دیکھ کر اپنے شوہر کو بغور دیکھا اور پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟''

ابو الرضا نے غمگین لہجے میں جواب دیا۔ ''ہاں، خیریت ہے۔''

بیوی اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بغور دیکھتی رہی، اس کے بعد کہا۔ ''میرا خیال ہے، خیریت نہیں ہے۔ کوئی خاص بات ضرور ہوگئی ہے۔''

ابو الرضا نے بیوی سے پوچھا۔ ''نیک بخت! ذرا یہ تو بتا، میں جس امیر کے دربار سے وابستہ ہوں اور جس سے میری روزی وابستہ ہے، اگر وہ اس روزی کے عوض مجھے جھوٹ بولنے کا حکم دے تو ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟''

بیوی نے دوٹوک جواب دیا۔ ''قطع تعلق۔ اس دربار سے ہمیشہ کے لیے علیٰحدگی کیونکہ میں جھوٹ کی روزی نہ تو آپ کے لیے پسند کرتی ہوں اور نہ ہی اپنے لیے۔''

ابو الرضا کے چہرے پر بشاشت دوڑ گئی۔ خوش ہو کر کہا۔ ''تو بڑی صائب الرائے اور دیانتدار خاتون ہے۔ میں تجھ سے اسی جواب کی توقع رکھتا تھا۔''

بیوی نے کہا۔ ''اب بتایئے، اصل معاملہ کیا تھا؟''

ابو الرضا نے سارا واقعہ تفصیل سے بتا دیا اور پوچھا۔ ''میں نے جو کچھ کیا، اس سے تو تجھے بھی اتفاق ہوگا؟''

بیوی نے جواب دیا۔ ''ہاں، اس سے میں پوری طرح متفق ہوں لیکن اب آئندہ کے لیے آپ کا کیا منصوبہ ہے؟ کیونکہ اس دربار سے تو اب آپ کا تعلق نہیں رہا۔''

ابو الرضا نے کہا۔ ''اب میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ میں کسی بھی امیر کے دربار سے وابستہ نہیں رہوں گا کیونکہ سارے ہی دربار یکساں ہیں اور وہ سب مجھ سے یہی چاہیں گے جو اس امیر نے چاہا تھا۔ میں خود کو دنیا کے مکروفریب اور دجل وریا سے محفوظ رکھوں گا۔ میں نے اپنے لیے وہ راہ پسند کرلی ہے جو صوفیائے کرام کی راہ رہی ہے۔''

بیوی نے کہا۔ ''گزر اوقات کس طرح ہوگی؟''

ابو الرضا نے جواب دیا۔ ''اللہ رازق ہے، میں توکل کی راہ پر چلوں گا، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

اس کے بعد وہ اپنی بیوی کے چہرے سے اس کے ردعمل کا اندازہ لگانے لگے۔ وہ خاموش کسی خیال میں گم تھیں۔ ابو الرضا کو شبہ گزرا کہ شاید بیوی کو ان کا یہ فیصلہ گراں گزرا ہے، بڑے یقین اور اعتماد سے کہنا شروع کر دیا۔ ''بیوی! میں نے یہ راہ بہت غور و فکر کے بعد اختیار کی ہے۔ میں جانتا ہوں یہ بڑی کٹھن راہ ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس میں مصائب و تکالیف

کے علاوہ کچھ بھی نہیں مگر میں ساری پریشانیاں اور جملہ آلام جھیلنے کو تیار ہوں۔''

بیوی نے دریافت کیا۔''میرے لیے کیا حکم ہے؟''

ابوالرضا نے جواب دیا۔''اگر تو میرا ساتھ دے سکے، آسائش وآرام کو بھلا دے، لباس وطعام اور اعزا واقربا کے طعنوں کی پروا کیے بغیر میری شریک حیات بنا رہنا پسند ہو تو نبھا، سبحان اللہ، ورنہ میری طرف سے تجھے آزادی حاصل ہے اگر علیحدہ ہونا چاہے تو میری طرف سے اجازت ہے۔''

بیوی نے کہا۔''میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ میں آپ کی ہم خیال نہ رہوں۔ میرا مرنا جینا آپ کے ساتھ ہے۔ دکھ سکھ، آرام وآسائش، رنج وغم میں ہر معاملے اور ہر جذبے میں آپ کی شریکِ حیات رہنا چاہتی ہوں۔''

ابوالرضا نے صدائے تحسین بلند کی۔''سبحان اللہ! میں تجھ پر ناز کرتا ہوں۔ مجھے تیری رفاقت پر فخر ہے۔''

بیوی کا دل بھر آیا، اس نے منہ پھیر لیا اور چپکے چپکے آنسو بہانے لگی۔ ابوالرضا نے اس کا چہرہ زبردستی اپنی طرف کرلیا، آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پوچھا۔''اگر تو میرے ہر معاملے اور ہر جذبے میں شریکِ حیات رہنا چاہتی ہے تو تیری آنکھوں میں یہ آنسو کیوں ہیں؟''

بیوی نے جواب دیا۔''صرف اس لیے کہ آپ نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ آپ نے مجھ سے جو سوال کیا تھا، وہ میرے اعتماد اور اعتبار کو ٹھیس لگانے کے لیے کافی تھا۔ آپ کو مجھ پر شبہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

ابوالرضا نے کہا۔''بیوی! میں اپنی حد تک تو اس دشوار راہ پر چلنے کا فیصلہ کرسکتا تھا مگر تیری بابت اپنی طرف سے یہ فیصلہ کس طرح کرسکتا تھا۔ اگر میں ایسا کرتا تو گویا میں اپنی مرضی اور اپنا فیصلہ تجھ پر زبردستی مسلط کردیتا اور یہ بات حق اور انصاف کے خلاف ہوتی۔''

بیوی نے خاموشی اختیار کرلی مگر آنسو بدستور بہتے رہے۔

☆☆☆

اس کے بعد بیوی نے اپنا اچھا لباس اور زیورات اتار دیے اور نیلے رنگ کا معمولی لباس زیب تن کیا۔ ابوالرضا نے سوچا باپ نے امیر کے دربار میں رکھوایا تھا، وہ کسی وقت بھی اس سلسلے میں باز پرس کرسکتے ہیں، اس لیے بیوی سے مشورہ کیا کہ اب ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟

بیوی نے جواب دیا۔''جب آپ نے توکل ہی کی راہ پسند کرلی ہے تو باپ کے گھر کو بھی چھوڑ دینا چاہیے۔''

ابوالرضا نے اس مشورے کو پسند کیا اور باپ کے گھر کو چھوڑ کر فیروز آباد کی مسجد کے قریب ایک معمولی سا حجرہ بنا کر اس میں منتقل ہوگئے۔ والدین کو ان کا یہ فیصلہ اچھا تو نہیں لگا مگر دونوں دین دار اپنے بیٹے کے توکل سے خوش بھی ہوئے۔ انہوں نے مخالفت بھی نہیں کی اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

اب یہ حجرہ تھا، اللہ کی یاد تھی اور قناعت اور توکل تھے۔ ریاضت اور مجاہدے میں ایسی لذت میسر آئی کہ مصائب اور آلام کی کلفتیں جاتی رہیں۔ ارادت مندوں کی آمد ورفت شروع ہوگئی۔ جو بھی آتا توکل اور قناعت کا درس لے کر جاتا۔ ان میں محمد جان نامی ایک طباخ بھی شامل تھا۔ وہ اور اس جیسے دوسرے نیازمندان کے لیے جو کی روٹیاں اور دہی لاتے تو ابوالرضا اور ان کی بیوی اسے تنہا نہ کھاتے۔ اس میں اپنے ارادت مندوں کو بھی شامل کرلیتے اور خود بھوکے رہ جاتے۔

انہی دنوں خواجہ خوردؒ کے پاس ایک درویش آیا۔ یہ خواجہ خوردؒ کے خلیفہ خاص شیخ تاج سنبھلی کی صحبت میں خاصا وقت گزار چکا تھا اور اس میں اتنا کمال پیدا ہوچکا تھا کہ خواجہ خوردؒ اس سے جو کچھ بھی پوچھتے، درویش اس کا شافی وکافی جواب دے کر خواجہ خوردؒ کو مطمئن کردیتا۔ آخر خواجہ خوردؒ اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ اعلان کردیا۔''لوگو! اس دور میں جو بھی معرفتِ حق کا طالب ہو، اس درویش سے رابطہ وتعلق قائم کرے۔''

یہ آواز ابوالرضا کے کانوں تک بھی پہنچی۔ خواجہ خوردؒ ان کے استاد تھے، استاد کی بات کس طرح ٹال سکتے تھے۔ اس درویش کی صحبت کا دل میں خیال آیا۔ سوچا، کیوں نہ اس سے بیعت کرلی جائے۔ لیکن اسی وقت معلوم نہیں کس طرح یہ خیال بھی آگیا کہ کیوں نہ پہلے استخارہ کرلیا جائے۔

چنانچہ انہوں نے حضرت غوث الاعظمؒ کی روحِ پرفتوح کی طرف توجہ کی اور ان سے استدعا کی کہ بتائیے، اس درویش کی بیعت کی جائے یا نہیں؟

ابوالرضا غوث الاعظمؒ سے لو لگا کر سو گئے، رات کے پچھلے پہر انہوں نے خواب میں دیکھا کہ غوث الاعظمؒ ایک کشتی میں سوار کنارے کی طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ دریا کے کنارے ابوالرضا کھڑے انہیں بڑی عقیدت اور محبت سے دیکھ رہے ہیں۔ غوث الاعظمؒ کی زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی ہیں اور بال سورج کی طرح شعاعیں بکھیر رہے ہیں۔ ابوالرضا نے بڑی کوشش کی کہ غوث الاعظمؒ کو جی بھر کے دیکھ لیں مگر اس میں کامیاب نہ ہوئے پھر اچانک ایسا محسوس ہوا گویا غوث الاعظمؒ کے جسم سے سورج ابھر رہا ہے اور اس کی شعاعوں سے ایک عالم منور اور روشن ہو رہا ہے۔

ابوالرضا میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ ادھر نظر کرتے۔ آخر غوث الاعظمؒ نے انہیں آواز دی۔ ''ابوالرضا! کیا بات ہے؟ وہاں کیا کھڑا ہے میرے پاس آ۔ کیا میرے ہوتے ہوئے بھی کسی کی ضرورت باقی رہتی ہے؟''

اس کے بعد ابوالرضا کی آنکھ کھل گئی اور درویش کا خیال دل سے نکال دیا۔ اب یہ روحانی طور پر غوث الاعظمؒ کے مریدوں میں داخل ہو چکے تھے اور وہیں سے ان کی تربیت و تعلیم ہونے لگی۔

ابوالرضا غوث الاعظمؒ کے مرید ہونے کے بعد بھی اکثر یہی سوچتے رہتے کہ کیا یہ جو کچھ ہوا ہے، درست ہے اور اس پر اطمینان کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اسی پس و پیش اور فکر میں شب و روز گزرتے رہے اور ان کو طمانیت قلب نہ حاصل ہو سکی۔ آخر ایک شب جبکہ آپ تہجد میں تھے، اپنے حجرے میں غوث الاعظمؒ کو کھڑے دیکھا، یہ وہی شبیہہ تھی جو خواب میں نظر آ چکی تھی۔ چمک دمک ایسی کہ نظریں خیرہ ہو گئیں اور پورا حجرہ بقعۂ نور بن گیا۔ گویا حجرے میں دن طلوع ہو گیا تھا۔ ابوالرضا نے آواز سنی، غوث الاعظمؒ فرما رہے تھے۔ ''ابوالرضا! اپنے دل سے شکوک نکال دے۔ تو واقعی میرا مرید ہو چکا۔''

ابوالرضا اتنے وارفتہ اور از خود رفتہ ہوئے کہ کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔ اس وقت ہوش آیا جب حجرے میں ایک بار پھر شب ہموار ہو چکی تھی۔ پورا حجرہ خوشبو سے معطر ہو چکا تھا۔ ابوالرضا اتنے خوش تھے کہ انہیں جاگتے میں غوث الاعظمؒ کی زیارت ہو گئی تھی۔

اب وہ براہ راست غوث الاعظمؒ کے مرید ہو چکے تھے، روحانی مرید..... انہیں کسی اور پیر کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔

ابوالرضا نے تزکیہ نفس اور مجاہدہ اتنا بڑھایا کہ اورنگ زیب بھی ان کا مشتاق ہو گیا۔ اس نے کئی بار آدمی بھیجے اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے ہر بار یہی جواب دیا کہ ایک عرصہ ہوا میں نے دربار سرکار کا خیال اپنے دل سے نکال دیا۔ اس لیے بادشاہ سلامت مجھے معذور سمجھیں۔ اورنگ زیب اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

انہیں غوث الاعظمؒ کی زیارت کے بعد رسول مقبولؐ کی زیارت کا شوق ہوا اور ہر وقت خدا سے یہی دعا کرتے رہتے کہ کسی طرح حضورؐ کی زیارت نصیب ہو جائے۔

آپ تہجد میں سر بسجود ہو کر روتے رہتے اور زبان سے یہی نکلتا کہ خدایا! حضورؐ کی زیارت کرا دے۔

ایک دن سجدے ہی میں آنکھ لگ گئی۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ رسول مقبولؐ تشریف فرما ہیں اور ان کے پاس ہی دوسرے لوگ بھی مؤدبانہ کھڑے ہوئے ہیں۔ رسول اللہؐ کو اپنے قریب دیکھ کر ابوالرضا کا حال غیر ہو گیا، وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگے۔ انہیں روتا دیکھ کر رسول اللہؐ ان کے قریب آ گئے۔ اتنے قریب کہ اتصال ہو گیا۔ آپؐ کے وجود سے خوشبو کی لپٹیں خارج ہو رہی تھیں۔ اتنے میں کسی شخص نے رسول اللہؐ سے کوئی سوال کیا اور ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ رسول اللہؐ نے فوراً ہی ابوالرضا کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ ''ابوالرضا! اس شخص کے سوال کا جواب تو دے گا۔''

ابوالرضا نے آنحضرتؐ کے فرمان کے ساتھ ہی اپنے دل و دماغ میں ایک روشنی سی محسوس کی اور ان کی زبان نے معدن و جواہر اگلنا شروع کر دیے۔ رسول اللہؐ نے ان کی فصاحت اور بلاغت کے پیش نظر فرمایا۔ ''ابوالرضا! تو اپنے علم سے مخلوق کو فائدہ پہنچا۔''

ابوالرضا نے عرض کیا۔ ''حضور! میں نے دربار سرکار سے اس لیے رابطہ منقطع کیا ہے کہ اپنے اعمال اور افعال میں تاثیر پیدا کروں۔ اب آپ فرما رہے ہیں تو میں اس پر اور زیادہ جوش و خروش سے کام کروں گا۔''

اس کے بعد ابوالرضا کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے اپنے حجرے کو معطر محسوس کیا۔ اب گویا ان کی سب سے بڑی خواہش بھی پوری ہو چکی تھی اس لیے دنیا سے اور زیادہ بیزاری پیدا ہو گئی۔ ان دنوں برصغیر میں ست نامی تحریک کا زور تھا اور ملک کے ایک حصے پر ست نامیوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اورنگ زیب کو ان لوگوں نے خاصا تنگ کر رکھا تھا۔ اورنگ زیب نے آپ کی خدمت میں ایک بار پھر اپنا آدمی بھیجا اور درخواست کی کہ میں اسلام کے لیے اپنی زندگی وقف کر چکا ہوں۔ ہندوؤں نے

بہت سر اٹھا رکھا ہے اس لیے آپ میری مدد کیجیے تاکہ میں کفار سے مقابلہ کر سکوں۔

آپ نے جواب میں کہلا دیا۔ ''شہنشاہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں دربار سرکار سے بیزار ہوں لیکن یہ معاملہ چونکہ کفر و اسلام کا ہے اس لیے میں شہنشاہ کی بس اتنی ہی مدد کر سکتا ہوں کہ اس کے حق میں دعائے خیر کرتا رہوں۔''

اورنگ زیب کے آدمی نے درخواست کی۔ ''حضرت! بادشاہ کی خواہش ہے کہ آپ کم از کم ایک بار اس سے ضرور مل لیں، آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں بادشاہ سے ملنے کے بعد بھی اس سلسلے میں دعائے خیر کروں گا اور ملاقات کے بغیر بھی یہی کروں گا۔ اس لیے میں ملاقات کو ضروری نہیں سمجھتا۔''

بادشاہ کے نمائندے نے پوچھا۔ ''ان حالات میں بادشاہ کو کیا کرنا چاہیے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''بادشاہ کو ست نامیوں کو دفع کرنے کے لیے اپنی فوجیں بھیجنا چاہئیں۔ اللہ نے چاہا تو ضرور کامیابی ہوگی۔''

اورنگ زیب کو یہ جواب ملا تو اس نے فوراً ہی اپنی افواج ست نامیوں کو کچلنے کے لیے روانہ کر دیں۔ دارالحکومت سے دور دراز خطے میں شاہی افواج ست نامیوں سے برسرِ پیکار ہو گئیں اور ان کا مرکز سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ بادشاہ پر ایک ایک پل گراں گزر رہا تھا لیکن کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس معرکے میں کس کا پلہ بھاری رہا۔ بادشاہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سلسلے میں وہ کیا کرے اور کیا قدم اٹھائے۔ آخر اپنے مشیروں سے مشورہ کیا کہ وہ اس مہم کے انجام کا کس طرح پتا چلائے؟

اس شخص نے جو کئی بار بادشاہ کی طرف سے ابوالرضا سے ملاقات کر چکا تھا، عرض کیا۔ ''اگر میرا مشورہ مزاجِ عالی پر گراں نہ گزرے تو کچھ عرض کروں؟''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''میں مشورہ مانگ رہا ہوں، اس میں گراں گزرنے کی کیا بات ہے؟''

شاہی مشیر نے عرض کیا۔ ''اگر حضور فرمائیں تو میں ابوالرضا کے پاس چلا جاؤں اور اس معاملے میں ان کا تعاون حاصل کروں۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''وہ اس سلسلے میں ہماری کیا مدد کریں گے؟''

مشیر نے جواب دیا۔ ''پتا نہیں وہ ہماری کیا مدد کریں گے؟ لیکن اتنی بات ضرور معلوم ہے کہ وہ ہمیں کسی نہ کسی طرح سے مطمئن ضرور کر دیں گے۔''

اورنگ زیب نے کہا۔ ''اچھا تم اسی وقت ان کے پاس چلے جاؤ۔ میں نہیں جانتا کہ وہ اس سلسلے میں کیا کریں گے۔ وہ جو کچھ کہیں سن لینا، جو کریں اس سے مطلع کرنا مگر ان سے یہ ضرور کہنا کہ وہ اس سلسلے میں خدا سے دعا بھی کریں۔''

شاہی ہرکارہ ایک بار پھر آپ کی خدمت میں پہنچ گیا اور سب کچھ بتا کے عرض کیا۔ ''حضورِ والا! اس معاملے میں بادشاہ آپ کے تعاون کا محتاج ہے، آپ اس کی مدد فرمائیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''بادشاہ تو ظل اللہ کہلاتا ہے اس لیے میں کسی ظل اللہ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔''

شاہی آدمی نے عاجزی سے کہا۔ ''بادشاہ ظل اللہ ہوتا ہے، لیکن آپ کی موجودگی میں نہیں۔ ظل اللہ کتنا ہی کیوں نہ بڑھ جائے مگر وہ اہل اللہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔''

آپ نے پوچھا۔ ''بادشاہ کیا چاہتا ہے؟''

شاہی نمائندے نے جواب دیا۔ ''بادشاہ کی خواہش ہے کہ اس کی افواج ست نامیوں پر فتح حاصل کرے اور اس فتح کی خبر بھی انہیں جلد ہی مل جائے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''جاؤ بادشاہ سے کہہ دو کہ شاہی افواج ست نامیوں پر فتح حاصل کر چکی ہیں اور اس کی خوش خبری بادشاہ کو دو چار دن کے اندر ہی مل جائے گی۔''

شاہی نمائندے نے کسی قدر شک و شبہے سے کہا۔ ''کیا میں اتنی بڑی خبر پورے وثوق اور یقین سے بادشاہ کو پہنچا دوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں کیا کہہ رہا ہوں، بات سمجھ میں نہیں آئی؟ کیا میں نے اپنے مفہوم کو ظاہر کرنے میں مشکل الفاظ یا پیچیدہ لہجہ اختیار کیا ہے؟''

شاہی نمائندے نے عرض کیا۔ ''بادشاہ نے آپ کے پاس دعا کے لیے بھیجا تھا، آپ نے دعا تو کی ہی نہیں، بغیر دعا کے فرما دیا کہ شاہی افواج کامیاب و کامران ہوئیں، کیا بادشاہ کو اس پر یقین آجائے گا؟''

آپ نے غصے میں جواب دیا۔ ''اگر نہیں یقین کرتا تو نہ کرے مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ اب تو یہاں سے چلا جا اور میرا وقت ضائع نہ کر۔''

شاہی نمائندے نے یہاں سے اٹھ کر دوستوں میں ساری باتیں بیان کر دیں اور ان سے مشورتاً پوچھا۔ ''کیا مجھے یہ باتیں بادشاہ کے گوش گزار کرنا چاہئیں؟''

دوستوں نے جواب دیا۔ ''ابوالرضا صاحبِ کشف اور خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔ ہمارا خیال ہے اس میں شک وشبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔''

شاہی نمائندے نے جواب دیا۔ ''مجھے یہ ڈر ہے کہ اگر ان کی پیش گوئی غلط نکلی تو مجھے بادشاہ کی نظروں میں بڑی شرمندگی ہوگی۔''

دوستوں نے کہا۔ ''بھائی! اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے؟ اول تو ابوالرضا کی بات غلط نکلے گی ہی نہیں اور اگر خدانخواستہ تمہارا شک درست نکلا تو شرمندگی ہوا ابوالرضا کو۔ تم کیوں شرمندہ ہو؟''

شاہی نمائندہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ اس نے بادشاہ سے کچھ بھی نہیں کہا۔ بات گول کر گیا لیکن اس کے دوستوں نے یہ باتیں سارے شہر میں پھیلا دیں۔ یہ باتیں اورنگ زیب کے کانوں تک بھی پہنچ گئیں۔ اس نے اپنے نمائندے کو بلا کر پوچھا۔ ''یہ شہر میں کیسی خبریں گشت کر رہی ہیں؟''

شاہی نمائندہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ سہم کر پوچھا۔ ''جہاں پناہ! غلام مطلب نہیں سمجھا۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''تو ابوالرضا سے ملا تھا؟ انہوں نے کیا جواب دیا تھا؟''

شاہی نمائندے کے اوسان خطا ہو گئے، بولا۔ ''بندہ پرور! ابوالرضا نے جو کچھ کہا تھا، وہ اتنا بعید از قیاس تھا کہ میری ہمت جواب دے گئی اور میں اسے حضور کے روبرو دہراتے ہوئے شرم اور خوف محسوس کرنے لگا۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''لیکن وہ ساری باتیں بازار میں بلکہ پورے شہر میں گشت کر رہی ہیں۔ تو نے ابوالرضا کی باتیں جن لوگوں کو بتائی ہیں، انہوں نے انہیں پورے شہر میں پھیلا دیا ہے اور وہ میرے کانوں تک بھی پہنچ چکی ہیں۔''

شاہی نمائندہ اور زیادہ ڈر گیا، بولا۔ ''حضورِ والا! ابوالرضا نے جو کچھ کہا تھا، اس میں مراقبہ، غور، کشف یا انہماک شامل نہیں تھا۔ انہوں نے جو کچھ کہا تھا روا داری اور اوپری دل سے کہہ دیا تھا۔ اس لیے میں شبہے میں پڑ گیا کہ معلوم نہیں وہ یوں ہی کہہ رہے ہیں یا اس میں ان کی توجہ اور کشف بھی شامل ہے۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''انہوں نے کیا کہا تھا؟''

نمائندے نے جواب دیا۔ ''انہوں نے کہا تھا کہ شاہی افواج ست نامیوں پر کامیابی حاصل کر چکی ہیں اور یہ خبر دو چار دن میں حضور تک پہنچ جائے گی۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''اچھا تو ایک بار پھر ان کے پاس جا اور پوچھ کہ شاہی افواج نے کس طرح اور کتنی کامیابیاں حاصل کی ہیں؟ ذرا اس پر روشنی ڈال دیں۔''

نمائندے نے عرض کیا۔ ''جیسا حکم حضور کا۔''

شاہی نمائندہ ایک بار پھر ان کی خدمت میں پہنچ گیا اور رک رک کر عرض کیا۔ ''حضرت! بادشاہ سلامت نے ایک بار پھر آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ شاہی افواج نے کہاں کہاں اور کس طرح کامیابیاں حاصل کی ہیں اور یہ خبر ابھی تک دارالخلافے تک کیوں نہیں پہنچی۔''

آپ نے غصے میں جواب دیا۔ ''او بے یقینے! میرا کچھ کہنا یا بتانا فضول ہے کیونکہ تجھے اس پر یقین ہی نہیں آئے گا اور تو میری باتوں کو بادشاہ تک پہنچانے کے بجائے اپنے دوستوں تک پہنچا دے گا۔''

شاہی نمائندے نے عرض کیا۔ ''حضرت! میری توبہ جواب میں ایسی غلطی کروں۔ میں سیدھا بادشاہ کے پاس جاؤں گا اور آپ کی ساری باتیں بادشاہ کے گوش گزار کر دوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''جا، بادشاہ سے کہہ دے کہ شاہی افواج نے جنگی حکمتِ عملیوں اور یلغاروں سے ست نامیوں کو شکست دی ہے ست نامیوں کو شاہی افواج کی تیز رفتاری اور مسلسل کارروائی نے اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ اپنی قوت کو مجتمع کر کے جنگ کرتے۔ شاہی افواج نے ست نامیوں کی نوّے فیصد کمر توڑ دی ہے، بقیہ کا بھی جلد ہی قلع قمع ہو جائے گا۔''

شاہی نمائندے نے پوچھا۔ ''اور یہ خبر کب تک یہاں پہنچے گی؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''زیادہ سے زیادہ کل تک۔ شاہی خبر رساں دارالخلافے میں داخل ہونے ہی والا ہے۔''
شاہی نمائندہ اسی وقت وہاں سے اٹھا اور بادشاہ کے پاس پہنچ گیا اور آپ نے جو کچھ فرمایا تھا، بادشاہ کے گوش گزار کر دیا۔ بادشاہ نے کہا۔ ''حیرت ہے ابوالرضا اس طرح بات کر دیتے ہیں۔ کل تک انتظار کر کے میں اس درویش سے پوچھوں گا کہ اب ان شعبدوں سے باز آجا۔ حجرے سے باہر نکل اور خلقِ خدا کو بے وقوف بنانا چھوڑ دے۔''
شاہی نمائندہ بادشاہ کی سخت گیری سے اچھی طرح واقف تھا۔ بولا تو کچھ بھی نہیں، بس ابوالرضا کے حق میں دعائیں کرنے لگا۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ کل شام تک شاہی خبر رساں کا انتظار کرنے کے بعد وہ چپ چاپ ابوالرضا کی خدمت میں پہنچ جائے گا اور بادشاہ کی برہمی کا واقعہ سنا دے گا اور انہیں یہ مخلصانہ مشورہ دے گا کہ ابوالرضا کچھ عرصے کے لیے کہیں روپوش ہو جائیں۔
دوسرے دن شاہی نمائندے کو شاہی خبر رساں کا بڑی بے چینی سے انتظار رہا لیکن وہ سہ پہر تک نہیں آیا۔ یہ ابوالرضا کے پاس جانے کے لیے پر تولنے لگا لیکن اورنگ زیب نے اس کو ہلنے بھی نہیں دیا اور کہا۔ ''اے شخص! تو پورا دن اور پوری رات میرے پاس ہی رہے گا کیونکہ اگر ابوالرضا کی بات جھوٹی نکلی تو میں کل صبح اپنے ایک دستے کے ساتھ ابوالرضا کے پاس بھیج دوں گا اور حکم دوں گا کہ انہیں کھینچ کر حجرے سے باہر لایا جائے اور اس جھوٹے کو گلی کوچوں میں گشت کرایا جائے کہ لوگو! اس دنیا دار مکار فقیر کو دیکھو جو غلط سلط اور جھوٹی پیش گوئیاں کر کے لوگوں کو گمراہ کرتا پھرتا ہے۔''
شاہی نمائندے کو بادشاہ کے حکم پر ایک کوٹھری میں قید کر دیا گیا جہاں اس کے علاوہ ایک بھی قیدی نہیں تھا۔ وہ بہت پریشان تھا کہ یہ کیسی افتاد آپڑی؟ ناکردہ گناہ کی سزا۔
بادشاہ وہاں سے چلا گیا اور مغرب کی نماز کی تیاری کرنے میں مشغول ہو گیا۔ ابھی بادشاہ مغرب کی نماز پڑھ کر باہر بھی نہیں نکلا تھا کہ دھول اور گرد و غبار سے اٹا ہوا ایک نوجوان مسجد میں داخل ہوا اور کسی نمازی سے پوچھا۔ ''کیا بادشاہ سلامت یہاں تشریف رکھتے ہیں؟''
کسی نے جواب دیا۔ ''ہاں، بادشاہ سلامت یہاں موجود ہیں۔''
لیکن کوئی بھی شخص بادشاہ کے پاس یونہی تو نہیں پہنچ سکتا تھا' آخر شاہی محافظوں نے آنے والے کا اچھی طرح جائزہ لے کر بادشاہ کے روبرو پہنچا دیا۔ یہ شاہی افواج کا خبر رساں تھا جو ست نامیوں پر فتح کی خوشخبری لے کر بادشاہ کے پاس آیا تھا۔
بادشاہ نے فتح کی تفصیلات ابوالرضا کے مطابق پائیں تو بہت خوش ہوا اور شاہی نمائندے کو کوٹھری سے نکلوا کر اسے حکم دیا۔ ''اسی وقت ابوالرضا کے پاس جا اور ان کا شکریہ ادا کر۔ میری طرف سے، اپنی طرف سے، پوری قوم کی طرف سے۔ ایسے اہلِ اللہ کہاں ملیں گے۔''
شاہی نمائندہ ابوالرضا کی خدمت میں پہنچا اور بادشاہ نے جو کچھ کہا تھا، آپ کو پہنچا دیا۔ ابوالرضا نے فرمایا۔ ''لیکن افسوس کہ بادشاہ نے تجھ کو قید کر دیا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ مجھے لوگوں میں ذلیل و خوار کرے مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ وتعز من تشاء وتذل من تشاء۔''
شاہی نمائندے نے دبی زبان سے عرض کیا۔ ''حضرت! بادشاہ کی دین داری پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ وہ وتعز من تشاء وتذل من تشاء کا مطلب بھی جانتا ہو گا مگر وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ واقعی اہلِ اللہ میں جعلی اہلِ اللہ بھی موجود ہوں۔''
ابوالرضا نے فرمایا۔ ''اچھا۔ اب تو جا سکتا ہے۔ بادشاہ سے کہہ دینا کہ صرف روزے نماز سے کام نہیں چلتا، جذب دروں سوزِ دروں بھی پیدا کر، تب کہیں کسی قابل ہو جائے گا۔''
شاہی نمائندے نے بے بسی سے جواب دیا۔ ''افسوس کہ میں آپ کی یہ باتیں بادشاہ سے نہیں کہہ سکوں گا۔''
آپ چپ ہو گئے اور شاہی نمائندہ آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر باہر چلا آیا۔

☆☆☆

آپ زہد و تقویٰ میں اتنے غرق ہو چکے تھے کہ دنیا داری کا خیال تک دل میں نہ آتا تھا۔ ایک دن آپ کو اپنے لباس کے بارے میں یہ عجیب و غریب خیال آیا کہ وہ جو لباس پہنتے ہیں، جلدی میلا بھی ہوتا ہے اور پھٹ بھی جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے اور لباس کے لیے کسی ایسے کپڑے کا انتخاب کرنا چاہیے جو دو سال تک چل جائے۔

اس خیال کا آنا تھا کہ آپ نے ایک کشمیری کو حکم دیا کہ تلاش کر کے ایسا کپڑا لا جو دو سال تک نہ پھٹے اور اس میں شان اور بھڑک بھی نہ ہو۔

وہ کشمیری تلاش اور جستجو کے بعد بہت سخت اور موٹا پشمینہ لے آیا۔ آپ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اس کا لباس تیار کرا کے پہن لیا۔ اس کو آٹھ پہر پہنے رہے۔ دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد جب آپ کی مجلس میں لوگوں نے آنا شروع کیا تو وہ سب اس موٹے لباس کو دیکھ کر پریشان ہو گئے کیونکہ وہ محسوس کر رہے تھے کہ اس موٹے لباس میں آپ کو گرمی بہت زیادہ محسوس ہو رہی ہوگی۔

آپ نے نمازِ چاشت ادا کی اور پھر مجلس میں ساکت و صامت بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تو آنکھیں بند کر کے چپ چاپ بیٹھے رہے اس کے بعد آہستہ آہستہ مسکرانا شروع کر دیا۔ حاضرین مجلس نے یہ منظر دیکھا تو حیرت سے پوچھا۔ ''پیرو مرشد! آپ کے ہونٹوں پر یہ مسکراہٹ کیسی؟''

آپ نے آنکھیں کھول دیں، فرمایا۔ ''اللہ کی ذات بھی کیا چیز ہے، ابھی ابھی بارگاہِ رب العزت سے الہاماً مجھ کو یہ بتایا گیا ہے کہ ابوالرضا یہ تو نے کیسا لباس پہن رکھا ہے؟ کیا اللہ کے خزانے میں کمی واقع ہوگئی ہے جو اتنا موٹا لباس پہن لیا۔ اللہ نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں اس لباس کو اتار دوں اور اس لباس کا انتظار کروں جو عنقریب میرے پاس آنے والا ہے۔''

لوگوں نے دیکھا، آپ نے وہ لباس اسی وقت اتار دیا۔ ایک تہ بند باندھ کر نئے لباس کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ دیکھنے والوں کو حیرت تھی کہ معلوم نہیں مذکورہ لباس آئے گا بھی یا نہیں۔ کچھ دیر بعد باہر سے کسی نے خبر کی کہ ایک بڑی بی آپ سے ملنے آئی ہیں۔

آپ نے اپنے دربان سے فرمایا۔ ''دیکھنا یہ بڑی بی میرے لیے لباس لے کر آئی ہیں؟ اگر ان کا پشمینہ ہرے رنگ کا ہو اور اس پر ہلکے ہرے ہی رنگ کے پھول بھی ہوں تو ان بڑی بی سے یہ لباس لے لینا ورنہ واپس کر دینا۔''

دربان باہر گیا اور بڑی بی سے پوچھا۔ ''کیا آپ حضرت کے لیے لباس لے کر آئی ہیں؟''

بڑی بی نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں ان کے لیے لباس لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ وہ کہاں ہے؟ اس کو میری بابت اطلاع کر دو۔''

دربان نے کہا۔ ''کیا میں اپنے حضرت کے لیے لائے ہوئے پشمینے کو دیکھ سکتا ہوں؟''

بڑی بی نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں۔'' اس کے بعد ہاتھ میں دبے ہوئے لباس کا بنڈل دربان کے ہاتھ میں دے دیا۔ دربان نے اس کو کھول کر دیکھا تو وہ ہو بہو ویسا ہی تھا جس کا وہ پہلے ہی ذکر کر چکے تھے۔ دربان نے کہا۔ ''بڑی بی! آپ اب جا سکتی ہیں کیونکہ اس کپڑے کو ہمارے حضرت قبول فرمالیں گے۔ یہ ہو بہو ویسا ہی ہے جس کا ہمارے حضرت نے ذکر کر دیا تھا۔''

بڑی بی دروازے ہی پر سے واپس چلی گئیں۔ دربان نے یہ لباس آپ کو دکھایا تو آپ نے بے حد پسند فرمایا۔ ''خداوند تعالیٰ نے جیسا بتایا تھا، یہ ویسا ہی ہے۔ اب میں اس لباس کو بخوشی پہن سکتا ہوں۔''

اس کے بعد آپ نے اس لباس کو زیب تن فرمالیا اور اس میں خود کو خوش و خرم محسوس کرنے لگے۔

پھلت نامی جگہ کے لوگوں کو رستم اور اسد اللہ نامی جاگیرداروں نے بہت ستا رکھا تھا۔ جب ان کے مظالم حد کو پہنچ گئے تو پھلت کے کچھ لوگ فیروز آباد آپ کی خدمت میں پہنچے اور اپنے مصائب عرض کیے۔

آپ نے ذہن پر زور دیا اور فرمایا۔ ''رستم اور اسد اللہ کی شکایتیں آج سے پہلے بھی میرے پاس آ چکی ہیں۔ مجھے بتاؤ کون رستم اور کون اسد اللہ ہے؟''

لوگوں نے عرض کیا۔ ''حضرت! رستم اور اسد اللہ یہاں کہاں؟ وہ یہاں کیوں آنے لگے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''پھر تم لوگ میرے پاس کیوں آئے ہو؟ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

لوگوں نے جواب دیا۔ ''ہم سب اسد اللہ اور رستم سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''پھر ان دونوں کی گوشمالی کرائی کس سے جائے؟''

لوگوں نے جواب دیا۔ ''اگر ان دونوں کی شکایات دہلی کے حاکم عاقل خان کو لکھ بھیجی جائیں تو وہ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔''

آپ نے ناگواری سے فرمایا۔ ''جب اللہ موجود ہے تو کسی اور کی کیا حاجت؟ میں تمہاری درخواست اللہ کو دے دوں گا، وہ جو مناسب سمجھے گا کرے گا۔''

پھلت والوں کو اس جواب سے بڑی مایوسی ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ اس سلسلے میں اللہ کیا کرے گا؟ یہ شیخ ابوالرضا کو آخر ہو کیا گیا ہے؟ آپ نے ان سب کو فکر مند دیکھا تو پوچھا۔ ''تم لوگ کیا سوچنے لگے؟''

جواب ملا۔ ''ہمارا خیال تھا رستم اور اسداللہ کے لیے عاقل خان ہی مناسب شخص ہے۔ آپ معاملے کو اللہ کے پاس لے جانا چاہتے ہیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں اللہ کے سوا کسی کو اس لائق ہی نہیں سمجھتا کہ وہ ہمارے معاملات میں دخل دے۔ میں نے آج ہی پھلت والوں کو یہ بتا دیا ہے کہ میں اپنی درخواست کسی انسان کو نہیں دے سکتا۔ میں نے خدا کو کچھ دیر پہلے ایک درخواست دے دی تھی۔ اس کا جواب آنے ہی والا ہے۔''

آپ نے یہ فرماتے فرماتے گردن جھکالی اور آنکھیں بند کرلیں۔ پھر کچھ دیر بعد سر اٹھا کر فرمایا۔ ''میری درخواست کا جواب آگیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو خبردار کیا ہے کہ رستم اور اسداللہ عنقریب ہلاک ہو جائیں گے۔''

پھلت کے جن لوگوں نے ان کی یہ باتیں سنی تھیں، ان میں سے ایک کچھ دن بعد دکن چلا گیا۔ ان دنوں بادشاہ دکن میں قیام فرما تھا۔ بادشاہ نے خلافِ توقع اس شخص کو طلب کرلیا اور اس سے پوچھا۔ ''تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''حضور والا! میں یہاں لینے کچھ بھی نہیں آیا۔ میں حضور کی فوج میں شامل ہو کر جہاد کرنا چاہتا ہوں۔''

بادشاہ اس جواب سے بہت خوش ہوا، پوچھا۔ ''تو آیا کہاں سے ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''پھلت سے۔''

بادشاہ نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا تو نے سوتے یا جاگتے میں شیخ ابوالرضا سے ملاقات کی کبھی؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں شیخ سے بیداری میں ملاقات کر چکا ہوں۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''عجیب بات ہے کہ ابھی پچھلے دنوں میں نے خواب میں سنا کہ کوئی خوشنما آواز میں مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اورنگ زیب! رستم اور اسداللہ نے پھلت والوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے اور مجھ کو یہ حکم دیا ہے کہ ان دونوں کو فوج کے حوالے کر دیا جائے۔''

پھلت والے کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

بادشاہ نے اسی وقت حکم دیا۔ ''رستم اور اسداللہ کو گرفتار کر کے میرے روبرو لایا جائے۔''

بادشاہ کا حکم ملا تو آدھے گھنٹے کے اندر ہی ان دونوں کو بادشاہ اورنگ زیب کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ ان کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب نے ان دونوں کو فوج کے حوالے کر دیا اور کہا۔ ''انہیں سخت نگرانی میں رکھا جائے۔ دارالخلافہ پہنچ کر ان پر مقدمہ چلایا جائے گا۔''

پھلت کا شخص ان دونوں سے ملا اور پوچھا۔ ''تمہارا کیا حال ہے؟''

ان دونوں کے نگراں لشکر خان نامی شخص نے ان دونوں کی طرف سے جواب دیا۔ ''ان کا کیا حال پوچھتے ہو۔ یہ دونوں سخت بیمار ہیں۔ اگر کچھ کر سکتے ہو تو ان کے حق میں دعائے صحت یابی کر دو۔''

پھلت والے نے کہا۔ ''میری دعائے صحت ان کے لیے بے کار رہے گی کیونکہ ان کے لیے دفن کا حکم دیا جا چکا ہے۔ ان کے دن پورے ہو چکے ہیں، ان کی زندگی زیادہ نہیں ہے۔''

چنانچہ اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ رستم انتقال کر گیا تو اس کی موت کے چند دن بعد اسداللہ بھی مر گیا۔

لشکر خان نے ان کی موت کے بعد پھلت والے سے پوچھا۔ ''یہ معاملہ کیا ہے؟''

اس نے شیخ ابوالرضا کے حوالے سے ساری بات بتادی اور کہا۔ ''وہ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ ان کی کوئی بات آج تک غلط نہیں نکلی پھر یہ کس طرح غلط ہو جاتی؟''

☆☆☆

ابوالرضا کے مریدوں میں شیخ مظفر روہتکی کو بڑا قرب حاصل رہا۔ مظفر روہتکی پر غم واندوہ کی کیفیت طاری رہتی تھی جبکہ وہ اپنے پیرومرشد کو خوش وخرم دیکھا کرتے تھے۔ مظفر روہتکی کو شبہ گزرا کہ شاید وہ اپنے مقصد میں ناکام ہیں کیونکہ ان کے دل پر غم واندوہ کی گھٹا سی چھائی رہتی ہے جو شاید مایوسی اور ناکامی کی علامت ہیں۔ اس فکر نے اور زیادہ غم زدہ کر دیا۔ ابوالرضا نے ان کی فکر اور غم زدگی کو کشف سے معلوم کرلیا۔ مظفر روہتکی کو طلب کیا اور پوچھا۔ ''مظفر! کیا تجھ کو یہ مشہور بات نہیں معلوم کہ کتنے

ہی اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام بہت زیادہ رویا کرتے تھے۔''

مظفر نے جواب دیا۔'' مجھے معلوم ہے۔''

آپ نے ناگواری سے فرمایا۔'' کیا معلوم ہے؟ خاک معلوم ہے۔ اگر یہ مشہور بات تجھ کو معلوم ہوتی تو تو اتنا زیادہ غمگین اور اداس نہ رہتا۔ تیری غمگینی اور اداسی میں اس فکر نے اور زیادہ اضافہ کر دیا ہے کہ شاید تو اپنے مقصد میں ناکام ہو گیا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

مظفر نے جواب دیا۔'' آپ جو کچھ فرما رہے ہیں، حقیقت ہے۔ میں واقعی بہت زیادہ پریشان اور فکرمند رہتا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔'' تو اس کا جواب بھی مجھ سے سن لے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دو طرح سے بلاتا ہے۔ یعنی اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جنہیں وہ فرحت اور شادمانی کی راہ سے بلاتا ہے اور دوسرے وہ جنہیں وہ غم واندوہ کی منزلوں سے گزار کر قرب بخشتا ہے۔ غم واندوہ بھی اس کی ازلی دین ہے، اس پر تجھے ملول نہیں ہونا چاہیے۔''

مظفر کی ساری تشویش اور اداسی دور ہو گئی اور وہ اپنے حال میں مست رہنے لگے۔

ان دنوں درگا داس نامی ایک ہندو نے بڑی گڑبڑ پھیلا رکھی تھی۔ روہتک کو تباہ و برباد کر دیا۔ مظفر روہتکی نے فیصلہ کیا کہ اب انہیں اپنا وطن چھوڑ دینا چاہیے اور دہلی میں اپنے پیرومرشد کے قریب زندگی گزارنی چاہیے۔ مظفر نے اپنے اس فیصلے سے جب بستی والوں کو مطلع کیا تو کئی دوسرے خاندان بھی ترکِ سکونت پر آمادہ ہو گئے اور یہ وہ خاندان تھے جن کے نوجوان اور جواں مرد مارے جا چکے تھے اور اب ان میں یا تو بوڑھے بچے تھے یا پھر بیمار، بچے، عورتیں اور جنگ وجدل سے ناواقف لوگ۔ آپ نے ان خاندانوں کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ ان سب نے اپنے ساتھ اپنا مال ومتاع بھی لے لیا تھا۔

روہتک چھوڑنے کے بعد ان پر یہ خوفناک حقیقت کھلی کہ راستے کے دیہاتی لٹیرے بن چکے ہیں اور وہ بڑا خون خرابا کرتے ہیں۔ کسی کو صحیح سلامت گزرنے نہیں دیتے۔ ان خدشات کے پیش نظر مظفر نے ضعیفوں اور بیماروں سے کہا کہ اگر کوئی برا وقت آن پڑے تو گھبرانہ جانا، لاٹھیاں وغیرہ لے کر صرف دکھاوے کے لیے ڈٹ جانا۔ خدا نے چاہا تو وہ سب خوفزدہ ہو کر فرار ہو جائیں گے۔

یہ بات ان سب کی سمجھ میں تو آ گئی لیکن ہمت کسی میں بھی نہیں پیدا ہوئی۔ یہ قافلہ روہتک سے روانہ ہوا اور بے خوف وخطر کافی فاصلہ طے کر گیا لیکن دہلی کے قریب پہنچنے سے پہلے دیہاتی لٹیروں نے انہیں لوٹنا چاہا۔ وہ ایک جتھے کی شکل میں شور کرتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔ مظفر نے بہ آوازِ بلند اعلان کر دیا کہ سب بچے بوڑھے اور بیمار کچھ دیر کے لیے لاٹھیاں لے لے کر لٹیروں کے سامنے آ جائیں تا کہ انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہم ان کے لیے حلوا نہیں ہیں جنہیں یہ بہ آسانی چٹ کر جائیں۔

مظفر کے اعلان کی دیر تھی کہ ہر شخص میں زندگی اور حوصلے کی لہر سی دوڑ گئی اور وہ سب لاٹھیاں لے لے کر صفوں کی شکل میں کھڑے ہو گئے۔ مظفر نے تیر کمان سنبھالی، چلّے میں تیر رکھا اور دیہاتیوں کا نشانہ لیتے ہوئے چیخ کر کہا۔'' لٹیرو! ہم سے لٹیرا بن کے کچھ بھی نہ پاؤ گے بلکہ الٹے پشیمانی کا شکار ہو جاؤ گے۔ ہمارے پاس بڑا مال ومتاع ہے لیکن یہ تمہاری قسمت کا نہیں تھا۔ بچو...... میں تیر چلاتا ہوں، معلوم نہیں کون اس کا شکار ہو جائے۔''

ایک لٹیرے نے جواب دیا۔'' ہم لوگ بھی ایسے ویسے نہیں ہیں۔ جس بات کا ایک بار ارادہ کر لیتے ہیں پھر اسے کر کے ہی رہتے ہیں۔''

مظفر نے اپنی صفوں کو حکم دیا کہ اب کسی بات کی گنجائش نہیں رہی، یہ نبرد آزمائی ہو کر ہی رہے گی۔ ان کے آدمیوں نے صف بندی کے بعد جوش وخروش میں اپنی حدود سے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

دیہاتیوں نے ان کے یہ تیور اور یہ حوصلہ جو دیکھا تو کچھ کچھ خوفزدہ ہوئے اور آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ سردست ان کے پاس سے فرار ہو جائیں ورنہ یہ دل جلے انہیں دوڑا دوڑا کر ماریں گے۔

جب یہ دیہاتی فرار ہو رہے تھے، مظفر نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ان پر حملہ کر دیا۔ ان کا یہ جرأت مندانہ اقدام بڑا مؤثر ثابت ہوا۔ ان میں سے بہت سے تو اپنے اپنے گھروں میں گھس گھس کر چھپروں اور گرہستی کے سامانوں میں روپوش ہو گئے۔ مظفر نے حکم دیا کہ قافلے کو درست راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ چنانچہ قافلے نے دیہاتیوں کو بہت تنگ کر ڈالا اور یہ لوگ بہ آسانی دہلی میں داخل ہو گئے۔

مظفر نے اپنے قافلے کو تو خیموں میں ٹھہرایا اور خود ابوالرضا کی خدمت میں پہنچ گئے۔

ابوالرضا نے انہیں دیکھتے ہی مسکرا کر سوال کیا۔ ''مظفر! سفر کیسا رہا؟''

مظفر نے تکلف سے جواب دیا۔ ''بہت اچھا۔ آپ کی دعائیں جو شاملِ حال تھیں۔''

آپ نے منہ بنا کر فرمایا۔ ''کیا خاک اچھا رہا۔ اگر دیہاتی لٹیرے تمہاری چال میں نہ آتے تو سوچو تو سہی تم سب کا کیا حال ہوتا؟''

مظفر نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ بات آپ کو کس نے بتائی؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میرے رب نے۔ اور میں یوں بھی تیرے قافلے کے ساتھ ہی سفر کر رہا تھا۔ لٹیروں نے میرے خوف سے لوٹ مار نہیں کی۔ ورنہ ان بوڑھوں، بچوں اور بیماروں سے لڑنے میں کیا عار تھی؟''

مظفر نے کہا۔ ''پیرومرشد! میں خود بھی حیران تھا کہ یہ دیہاتی بھاگ کیوں گئے؟ اب معلوم ہوا کہ یہ معاملہ کیا تھا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں نے ان دیہاتی لٹیروں کے حوصلے پست کر دیے تھے اور ان کی قوتِ گویائی سلب کر لی تھی تاکہ وہ آپس میں صلاح مشورے نہ کر سکیں۔''

مظفر نے اپنے پیرومرشد کے دونوں ہاتھ چوم لیے اور لرزتے ہونٹوں سے کہا۔ ''ابھی تک تو میں اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھ رہا تھا یہاں آ کر یہ حقیقت بھی کھل گئی کہ وہ سب میرا خیالِ خام تھا۔''

☆☆☆

دہلی میں ایک شاعر گلشن دہلوی پر شورشِ عشق نے دباؤ جو ڈالا تو وہ اِدھر اُدھر دیوانہ وار بھاگنے لگے۔ گلشن دہلوی نے خود کو ملامتیوں میں شامل کر دیا۔ اپنا منہ کالا کر کے کوچہ و بازار میں پھرنے لگے۔ لوگ انہیں دیکھتے تو بڑا لطف لیتے اور بچے ان کا مذاق اڑاتے۔

کسی نے گلشن سے کہا۔ ''ارے بھائی! اگر تجھ میں کچھ ہے تو ابوالرضا کے دربار سے اس کی سند لا کے دکھا، تو ہم بھی سمجھیں کہ تیرا کوئی مقام بھی ہے۔''

گلشن دہلوی نے یہ سنا تو فیروز آباد کا رخ کیا اور آشفتہ و وارفتہ ابوالرضا کے در پر جا کھڑے ہوئے۔ دربان سے پوچھا۔ ''اندر کیا ہو رہا ہے؟''

دربان نے جواب دیا۔ ''اندر پیرومرشد وعظ فرما رہے ہیں اور ان کے مریدوں اور ارادت مندوں کا ہجوم اسے نہایت انہماک اور توجہ سے سن رہا ہے۔''

گلشن نے پوچھا۔ ''کیا میں بھی اندر جا سکتا ہوں؟''

دربان نے کہا۔ ''کیوں نہیں۔ بالکل جا سکتے ہو لیکن وہاں ذرا ادب سے بیٹھنا کیونکہ وہ انتشار اور بے ادبی ذرا بھی پسند نہیں کرتے۔''

گلشن نے کہا۔ ''تو اطمینان رکھ۔ اللہ نے چاہا تو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

گلشن اندر چلے گئے۔ دیکھا، سیکڑوں آدمی مجسمۂ سکوت بنے بیٹھے ہیں۔ گلشن نے حسبِ عادت اپنے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا، جہاں پر جوتے رکھے تھے۔

ابوالرضا وعظ میں مشغول تھے۔ ایسا لگتا تھا گویا انہوں نے گلشن دہلوی کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ فرقۂ ملامتیہ پر تقریر کر رہے تھے۔ آپ فرما رہے تھے۔

''بہت سارے صوفیا ایسے بھی گزرے ہیں جو خود کو ذلیل و خوار کر کے دنیا سے فرار اور اللہ کا قرب حاصل کرنا چاہتے تھے مگر انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ جس نے خود کو پہچانا خدا کو پہچانا۔ ملامت اور ذلت میں مبتلا ہونے والے خود کو پہچان ہی نہ سکے۔ انہیں اپنا مقام معلوم ہی نہ تھا اسی لیے پوری زندگی، لاعلمی اور نادانی میں گزار دی۔''

گلشن دہلوی کو حیرت تھی کہ موضوعِ سخن انہی کی ذات تھی۔

ابوالرضا نے اچانک ایک خاص لہجہ اختیار کیا۔ ''لوگوں کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے کہ اس طرح رسوائی کے خطرات مول لیتے ہیں اور لوگوں کو باور کراتے ہیں کہ ہم یہ سب کچھ خدا کے لیے کر رہے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ اولیاء کی مجلس میں آتے ہیں۔ اس بات سے ذرا بھی نہیں ڈرتے کہ اس گروہِ روشن ضمیر پر ان کے سارے بھید عیاں ہوتے ہیں۔'' پھر اچانک گلشن کو آواز دی۔ ''گلشن! ذرا میرے پاس تو آنا۔''

گلشن جوتیوں سے اٹھ کر ابوالرضا کے پاس چلے گئے۔ آپ نے فرمایا۔ ''یہ روش چھوڑ دے اور اس وقت یہاں سے چلا جا، پھر کبھی آنا تو تجھے بتاؤں گا کہ خدا کے لیے انسان کو کیا کرنا چاہیے؟''

گلشن دہلوی شرمندہ ہو کر چلے گئے اور اس کے بعد پھر کبھی اپنی سابقہ روش نہیں اختیار کی۔

☆☆☆

آپ فرمایا کرتے تھے کہ علم حجاب الاکبر ہے۔ فرمایا، جب حضورِ قلب حاصل ہو تو لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے سے یہ نعمت زائل نہیں ہوتی۔ لیکن اگر درس و تدریس میں مشغول ہو جائے تو حضورِ قلبی میں خفیف سا حجاب واقع ہو جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اگر کسی کو حضورِ قلب پر اتنی قدرت ہو جتنی آنکھ میں بصارت پر، تو اسے علوم و فنون کے شغف سے بھی کوئی حجاب واقع نہیں ہوگا۔

کسی نے پوچھا۔ ''حضرت! بشری خصوصیات کا کیا مطلب ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''بشری خصوصیات کا مطلب ہے بشری جبلت، لڑائی، جھگڑا، صلح پسندی، غصہ، حسد، رشک، نفرت، محبت، حلم، تندخوئی، یہ ساری باتیں بشری خصوصیات میں آتی ہیں۔ یہ جملہ خصوصیات مختلف قویٰ اور حالات کے باہمی امتزاج یا تصادم سے پیدا ہوتی ہیں۔ انبیائے کرام انہی مختلف النوع قوتوں سے کام لینے کے لیے دنیا میں تشریف لاتے رہے اور انسانوں کو شرعی تکالیف کا پابند بناتے رہے۔''

کسی نے پوچھا۔ ''بصارت اور بصیرت میں کیا فرق ہے؟''

جواب دیا۔ ''بصارت ظاہری بینائی کو کہتے ہیں اور بصیرت حقیقی اور باطنی بینائی کو کہتے ہیں۔''

ان کے ایک ہم عصر بزرگ بایزید نے ایک دن فخریہ کہا۔ ''حضرت! میں خدا کو ان آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اے شیخ! تم کون ہو اس کو دیکھنے والے۔''

بایزید نے کہا۔ ''کیوں اس میں حرج ہی کیا ہے، کیا دوست کو دوست سے جدا کرنا چاہیے؟''

آپ نے فوراً ہی پوچھا۔ ''اس کا دشمن کون ہے؟''

بایزید کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔

ایک فارغ التحصیل عالم مناظرے اور بحث و تکرار میں بڑی دلچسپی رکھتا تھا، وہ شیخ ابوالرضا کے ایک مرید عنایت اللہ سے ملا اور کہا۔ ''جناب! میں نے اس شہر کے علماء اور فضلاء کو مغلوب کر لیا ہے۔ اب میں کسی بڑے شکار کی تلاش میں ہوں۔''

عنایت اللہ نے پوچھا۔ ''کبھی شیخ ابوالرضا سے بھی ملاقات ہوئی؟''

اس نے جواب دیا۔ ''نہیں، ابھی تک تو نہیں ہوئی۔ کیا وہ کوئی بڑے عالم و فاضل ہیں؟''

عنایت اللہ نے کہا۔ ''تب پھر تم ان کے پاس جا کر دیکھو۔''

اس نے جواب دیا۔ ''میں ان کے پاس چلا تو جاؤں گا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ کہیں وہ بھی مجھ سے مغلوب نہ ہو جائیں، میں ان کے پاس نہیں جاتا۔''

عنایت اللہ نے کہا۔ ''لیکن میرا مشورہ ہے کہ تم ان سے ضرور ملو۔ طبیعت خوش ہو جائے گی۔''

عالم نے طنزاً کہا۔ ''میں نے یہ بھی سنا ہے کہ وہ تفسیر حسینی پڑھ کر سناتے ہیں اور لوگوں کو اس سے پڑھاتے ہیں اس لیے میرے نزدیک وہ صاحبِ فضیلت نہیں ہیں۔''

عنایت اللہ نے کہا۔ ''ایسا مت کہو۔ پہلے ان سے ملو، اس کے بعد کوئی رائے قائم کرو۔''

عالم مان گیا اور یہ طے پایا کہ اگلے جمعے کو مجلسِ وعظ میں وہ عالم شرکت کرے گا اور وہیں ابوالرضا سے کچھ باتیں ہو جائیں گی۔ چنانچہ جمعہ آیا تو یہ عالم بھی حضرت شیخ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اس کے دل میں اچانک مناظرے کا خیال آیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ ابوالرضا سے مناظرہ ہونا چاہیے۔

اسی وقت ابوالرضا نے اس عالم کو مخاطب کر کے کہا۔ ''کیا بات ہے بھائی؟ تم تو صرف و نحو تک سے واقف نہیں، مجھ سے مناظرہ کس طرح کرو گے؟''

اس عالم نے اپنے حافظے اور یادداشت پر بڑا زور دیا مگر کچھ یاد نہ آیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کا سارا علم سلب کیا جا چکا ہے، بڑی عاجزی سے کہا۔ ''حضرت! میں بہت شرمندہ ہوں۔ آپ میرا علم مجھ کو واپس فرما دیں ورنہ میں تو کہیں کا بھی

نہیں رہوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''مجھ کو آتا ہی کیا ہے۔ میں تو تفسیرِ حسینی سے پڑھاتا ہوں۔ میں کہاں کا عالم؟''

عالم نے بڑی نیاز مندی سے کہا۔ ''حضرت! میں صاحبِ قال سے تو الجھ سکتا ہوں مگر صاحبِ حال سے نہیں۔ ان کا تو مرتبہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اچھا یہ وعدہ کر کہ آئندہ اپنے علم پر غرور نہیں کرے گا۔''

اس نے وعدہ کر لیا اور کہا۔ ''میں آپ سے بیعت ہونا چاہتا ہوں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں تیرا علم تجھے واپس کر دوں گا مگر بیعت نہیں کروں گا کیونکہ میں تیرے غرور سے ڈرتا ہوں۔''

اس کے بعد آپ نے اس کا علم واپس کر دیا وہ عالم شرمندہ اور خجل سر جھکائے مجلس سے نکل گیا۔

آپ نے اپنے مریدِ خاص مظفر روہتکی سے فرمایا۔ ''مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ میری عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان ہوگی۔''

مظفر اپنے وطن جانا چاہتے تھے، انہوں نے آپ کی عمر کا حساب لگایا تو وہ پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ مرید نے مرشد سے عرض کیا۔ ''حضرت! اگر یہ بات ہے تو میں روہتک نہیں جاؤں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''نہیں، تم نے جو ارادہ کر لیا ہے اس کو پورا کرو۔ اللہ کو یہ بات پسند نہیں ہے۔''

مظفر نے گلشن دہلوی سے علیحدگی میں کہا۔ ''گلشن! میں روہتک جا رہا ہوں، تم پیر و مرشد کا خاص خیال رکھو گے۔''

گلشن نے جواب دیا۔ ''میں نے تو انہیں حاصلِ زیست سمجھ لیا ہے۔ میں ان پر اپنی زندگی تک قربان کر سکتا ہوں۔''

مظفر روہتک چلے گئے۔ گلشن ان کی صحبت میں شب و روز رہنے لگے۔ جب آپ کی عمر پچپن برس کی ہوگئی تو آپ کے عقیدت مندوں نے یہ تبدیلی محسوس کی کہ ان میں پہلے جیسا جوش و خروش نہیں ہے، وہ ہر وقت بجھے بجھے رہتے ہیں۔ ان کے ایک رشتے دار اور مرید شیخ عبدالاحد نے ان کی حالت میں اس غیر معمولی تبدیلی کا حال سنا تو ان سے ملنے پہنچ گئے۔ اس وقت وہ پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ اپنے پاس ہی عبدالاحد کو بھی بٹھا لیا اور مسکرانے لگے۔

عبدالاحد نے پوچھا۔ ''حضرت! آپ کیسے ہیں؟''

جواب دیا۔ ''اچھا ہوں۔''

عبدالاحد نے محسوس کیا کہ اندر خواتین شیخ کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ عرض کیا۔ ''حضرت! کیا اندر تشریف لے جانا پسند فرمائیں گے؟''

جواب دیا۔ ''کیوں نہیں، ابھی لے چلو۔''

عبدالاحد نے انہیں سہارا دیا۔ اسی وقت شیخ کے بڑے بیٹے فخر العالم بھی آگئے اور انہیں پکڑ کر اندر لے گئے۔ ہر ایک کو بڑی حیرت تھی کہ ان کی حالت اتنی تیزی سے کیوں بگڑ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد مغرب کی اذان ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ ''میں نماز باجماعت پڑھنا چاہتا ہوں، مجھ کو مسجد لے چلو۔''

عبدالاحد نے عرض کیا۔ ''تب پھر حضرت کو باہر چلنا ہوگا۔''

آپ نے ناگواری سے کہا۔ ''لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ اندر باہر کا چکر بہت جلد ختم ہو جانا چاہیے۔''

نماز ادا کر چکنے کے بعد عبدالاحد سے کہا۔ ''میرے بڑے بھائی عبدالرحیم کو بلا دو۔''

عبدالاحد ان کی تلاش میں نکل گئے۔ آپ نے حاضرین سے فرمایا۔ ''افسوس کہ اب میں کسی کا انتظار نہیں کر سکتا۔ مجھے خالقِ حقیقی سے جلد از جلد ملاقات کرنا ہے۔''

چنانچہ کچھ دیر بعد جب عبدالاحد شیخ عبدالرحیم کو لے کر واپس آئے تو آپ کی روح جسدِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی اور آپ کے چہرے سے ایسی شاندار طمانیت ہویدا تھی کہ بڑے بڑے آسودہ حال اور بے فکرے چہروں پر بھی کبھی نہ دیکھی گئی ہوگی۔

ماخذات

- تاریخ مبارک شاہی — یحییٰ بن احمد سرہندی
- آثار الصنادید — سرسید احمد خان
- تاریخ فرشتہ — محمد قاسم فرشتہ
- عہدِ سلاطین دہلی — صلاح الدین ناسک
- تاریخ فیروز شاہی — شمس سراج عفیف
- طبقات اکبری — نظام الدین احمد

کنکریٹ کی قبر

ڈاکٹر شیر شاہ سید

ہمیں غلطیوں کا احساس ہمیشہ آخر میں ہی جانے کیوں ہوتا ہے جب... تلافی ممکن ہی نہیں رہتی، بس خمیازہ بھگتنے کی گنجائش رہ جاتی ہے... قدرتی آفات بے شک آنے والی نسلوں کے لیے عبرت ہیں مگر کون ہے جو عبرت حاصل کرے۔

ٹوٹتے ہوئے گھروں اور بکھرتے ہوئے رشتوں کی درد بھری تحریر

زلزلے والے دن وہ مظفرآباد میں تھا۔ اپنے خاندان کے ساتھ۔ اس دن سوائے اس کے کوئی بھی نہیں بچا تھا۔ بیوی اور تینوں بچے تینوں کنکریٹ کے ملبے کے نیچے اس کے سامنے دفن ہوگئے اور اب خود اس کی لاش عیٹی جیٹی کے پل کے نیچے سے ملی تھی۔ اخباروں کی خبر کے مطابق اس نے خودکشی کرلی تھی۔ سیٹھ رزاق بھائی جو مانی۔ مجھے یقین تھا کہ اخباری خبر غلط ہے۔ ایک دن پہلے تو چائے کے ہوٹل، بہادرآباد میں میری ملاقات ہوئی تھی۔ چائے پیتے ہوئے میں نے اس کی باتیں سنی تھیں۔ وہ خطرناک باتیں کررہا تھا مگر خودکشی کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے نہیں لگا کہ وہ خودکشی کرلے گا۔ وہ پریشان تھا، جس کی بیوی اور تین بچے اچانک مر گئے ہوں وہ کیسے پریشان نہیں ہوگا؟

ہم دونوں کا بچپن ساتھ گزرا تھا۔ دونوں نے کراچی کے ایک ہی اسکول میں پڑھا تھا۔ وہ رہتا بھی اسکول کے پیچھے ہی تھا۔ پارسی کالونی کے بالکل پیچھے ایک گندی سی گلی کے کنارے پر ہندوؤں کی بنائی ہوئی ایک خوب صورت بلڈنگ



میں جس کو وہاں رہنے والے باسیوں نے بالکل خراب کر دیا تھا۔ فلیٹوں کی خوب صورت بالکونیوں پر دیواریں کھینچ کر ہوا کا راستہ بند اور خوب صورتی تباہ کر دی گئی تھی۔ اسی عمارت کے ایک فلیٹ میں اس کا بھی گھر تھا۔

رزاق کے والد لائٹ ہاؤس میں ردی کاغذوں کے ایک بیوپاری کے پاس ملازم تھے۔ اس کے گھر سے اور رہنے سہنے کے طریقوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا وہ بھی ہماری طرح غریب ہے اور اس کا باپ بھی میرے باپ کی طرح شریف ہے۔

اسکول کے بعد ہمارے راستے الگ ہو گئے۔ میں نے کامرس میں داخلہ لیا تھا اور جلدی جلدی بغیر فیل ہوئے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بن کر اپنے ماں باپ بھائی بہنوں کے ساتھ کراچی کی وہ گندی گلی چھوڑ کر پہلے ملیر میں بسا اور اس کے بعد ایک آرام دہ مکان گلشن اقبال میں لے کر مزے سے رہ رہا تھا۔ اوپر والے کا بڑا احسان تھا۔ زندگی بہت سوں سے اچھی گزر رہی تھی۔ دینے والے نے ہاتھ کھول کر دیا تھا۔

رزاق نے نہ جانے کیا، کیا مگر یہ ضرور تھا کہ وہ کنسٹرکشن کے کاروبار میں چلا گیا تھا۔ اخباری اشتہاروں سے ہی پتا لگتا تھا کہ جو مانی بلڈرز کیا کر رہے ہیں۔ بے شمار سحر انگیز ناموں والے پروجیکٹ جو مانی بلڈر کے نام سے منسوب تھے اور خوب بکے تھے۔ کبھی کبھی میری نظر ایسے اشتہاروں پر بھی جا ٹکتی تھی جس سے پتا لگتا تھا کہ یہ لوگ کچھ سرکاری عمارتیں بھی بنا رہے ہیں۔ کچھ اسکول، کچھ کالج یا کے ایم سی کی کوئی عمارت۔ آہستہ آہستہ شہر میں ان کا اپنا ایک خاص نام بن گیا تھا۔

اس عرصے میں میں خود اپنے کاموں میں خاصا مصروف تھا۔ رزاق سے کوئی خاص ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ دو تین دفعہ مختلف جگہوں پر ملاقات بھی رہی تو صرف رسمی سی مگر ایک بات ضرور تھی کہ رزاق کھرب پتی نہیں تو ارب پتی ضرور تھا۔ شہر میں اس کی مصروفیات اور اکثر کے بڑے مشہور واقعات تھے مگر وہ مجھ سے جب بھی ملا اچھے انداز میں ملا، جیسے ایک پرانا اسکول کا ساتھی پرانے اسکول کے ساتھی سے ملتا ہے۔ اوروں کے لیے شاید اس کا دماغ خراب ہو گیا ہو، میرے لیے اس کے دل میں بیتے دنوں کی دوستی کا بھرم باقی تھا۔ بچپن کی یادوں کا خیال اور ایک خاص قسم کی دیانت تھی ہم لوگوں کے میل ملاقات میں۔

اس دن وہ مجھے بہادر آباد کی چورنگی پر مل گیا۔ میں ایک اسٹور سے گھر کی ضرورت کی کچھ چیزیں لے کر نکلا اور گاڑی کی طرف جا رہا تھا کہ میری نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ گندی سی شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ شیو بڑھی ہوئی اور شکل پر ایسی ویرانی تھی کہ میں گھبرا سا گیا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ میں پلاسٹک کی تھیلیوں کو گاڑی میں رکھ کر تیز تیز چلتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔

''رزاق، یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا شکل بنائی ہوئی ہے تم نے؟'' میں نے اس کے کاندھے کو ہاتھ لگا کر پوچھا تھا۔

اس کے بجھے ہوئے چہرے پر جیسے زندگی کی ہلکی سی ایک رمق سی آئی اور آنکھوں میں شناسائی کے قمقمے جلے، پھر اس نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے لگا جیسے اس کے ہاتھ کپکپا رہے ہیں اور جسم لرز سا رہا ہے۔ میں نے کہا۔ ''آؤ چلو پٹھان کے پاس چائے پیتے ہیں۔'' فوری طور پر تو یہی میری سمجھ میں آیا تھا۔

وہ خاموشی سے میرے ساتھ ہو لیا۔ میری سمجھ سے باہر تھا کہ سیٹھ رزاق کروڑ پتی، ارب پتی آدمی، شہر کا مشہور و معروف بلڈر، سیکڑوں بلڈنگ، پروجیکٹس کا بانی، شہر کی کئی سرکاری عمارتوں کا کنٹریکٹر، کے ایم سی کی طرف سے شہر کی بیوٹی فکیشن کرانے والا مرکزی ٹھیکیدار، میرا پرانا دوست، اسے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے اس کی حالت پر رحم آ رہا تھا۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بھوکا ہے، میں نے کالج کے زمانے کا کھانا منگوایا، مکس انڈا، گوشت، آلو اور دال۔ ساتھ ہی زریں کو فون کر کے بتایا کہ مجھے دیر ہو جائے گی، وہ اور بچے کھانا کھا لیں، میں کھانا کھا کر آؤں گا۔ زریں نے ہی مجھے بتایا تھا کہ مظفر آباد، بالاکوٹ، مانسہرہ اور باغ کے علاقے میں مزید جھٹکے بھی آئے ہیں اور کراچی کے ساحلی علاقوں پر بھی زلزلے کے جھٹکے محسوس کیے گئے ہیں۔ وہ پریشان تھی کہ کہیں کراچی میں تو زلزلہ نہیں آ جائے گا۔

رزاق نے غور سے میری بات سنی، فون بند ہونے کے بعد اس نے نوالہ اٹھاتے ہوئے دھیرے سے کہا تھا۔ ''میں ادھر ہی تھا امین، اس وقت مظفر آباد میں جب یہ زلزلہ آیا تھا۔ میرے سامنے پورا ہوٹل زمین پر گر گیا اور اس میں موجود سب لوگ مر گئے۔ میری بیوی اور میرے تینوں بچے بھی...... ختم ہو گئے، آج دس دن ہو گئے ہیں۔ سب کچھ ختم...... ہو گیا ہے میرا۔''

میں سن سا رہ گیا۔ مجھے اس کی بے حالی کی وجہ کا پتا چل گیا تھا مگر میں سمجھ نہیں سکا کہ اس کٹھن گھڑی میں جب اسے اپنے گھر ہونا چاہیے تھا...... اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ، اپنے بوڑھے ماں باپ کے ساتھ، اس وقت وہ بہادر آباد کے چوراہے پر زلزلہ زدگان کے امدادی کیمپ کے پاس کیا کر رہا ہے۔ وہ بھی اس حالت میں کہ پہچانا بھی نہ جا سکے۔

''مگر رزاق تم نے اپنی حالت کیا بنائی ہوئی ہے؟'' میں نے آہستہ سے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر سوال کیا۔

''کوئی حالت نہیں ہے بھائی، یہی صحیح حالت ہے۔ ابھی تک بچے اپنے صاف ستھرے لباسوں میں، اسکول کے سفید نیلے اور خاکی ڈریسوں میں اور لوگ اپنے دفتروں میں، دکاندار اپنی دکانوں کے اندر اور مریض اپنے اپنے بستروں پر اسپتال کے ملبے میں دبے ہوئے ہیں، ان کی موت واقع ہوگئی ہے بغیر تدفین کے۔ پلر، لینٹر، لوہے کی دیواریں، ریت اور بجری کے منوں ٹنوں بوجھ کے نیچے آہستہ آہستہ سڑ رہے ہیں۔ وہ سب لوگ، میری بیوی بھی، میرے بچے بھی۔'' اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

وہ خلا میں تکتا رہا، میں نے بیرے کو اشارے سے کہا کہ کھانا اٹھالے اور چائے لادے۔

بیرا برتن ہٹا کے میز صاف کررہا تھا کہ رزاق نے مجھے غور سے دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ''یار میں چھٹی منانے گیا تھا وہاں۔ برسوں سے کوئی چھٹی نہیں لی تھی میں نے۔ کچھ کام کا پریشر، پھر چھٹی کا مطلب تھا کہ نقصان ہو۔ کئی پروجیکٹ ایک ساتھ چل رہے ہوتے تھے میرے مگر بیوی اور بچوں نے بہت دنوں سے ان چھٹیوں کا پلان کرلیا تھا۔ پھر میں نے بھی کہا تھا کہ صحیح ہے، چلے چلتے ہیں۔ کچھ تفریح ہو جائے گی، کچھ تھکن بھی دور ہوگی پر مجھے کیا پتا تھا کہ میرا سب کچھ لٹ جائے گا، ختم ہوجائے گا۔ میری بیوی، بچے میرا سب کچھ۔''

''کراچی سے پنڈی ائرپورٹ پھر پارلیمنٹ لاج میں دو راتیں رکے تھے ہم لوگ۔ وہاں سے مجھے ہیجیرو مل گئی، اسی پہجیرو پر ٹیکسلا، واہ کینٹ، حسن ابدال کے راستے سے ہوتے ہوئے ایبٹ آباد، مانسہرہ کے روٹ سے گزر کر بالاکوٹ پہنچے جہاں دو گھنٹے رک کر ہم لوگ مظفرآباد آگئے تھے۔ دریائے نیلم کے ساتھ نیلم ہوٹل میں ہمارے رہنے کا انتظام تھا۔ بس تیسرے دن یہ سب کچھ ہوگیا۔ پہلی رات اچھی طرح سو کر گزاری، دوسرے دن جیپ میں بیٹھ کر ہم لوگوں نے اونچے اونچے پہاڑوں کی میر کی۔ مظفرآباد کی پتلی گلیوں، سڑکوں پر بے ہنگم بے نقشہ اونچی نیچی پتلی چوڑی ٹیڑھی میڑھی کراچی جیسی بلڈنگوں کے درمیان گھومتے رہے تھے۔ ایک طرح سے وہ منی کراچی تھا۔ اس وقت میں نے نہیں سوچا مگر بعد میں خیال آیا تھا جیسے کراچی میں ہر طرح کی بلڈنگ بن جاتی ہے کچھ دے کر کچھ لے کر، پارک کی جگہ پلازا، اسپتال کی جگہ اپارٹمنٹ، کھلی سڑک پر مسجد اور مسجد کی جگہ دکانیں۔ جہاں تین منزلہ کی اجازت ہو وہاں دس منزلہ۔ نہ لوہے کا حساب اور نہ ہی سیمنٹ کا کوئی تناسب۔ بلڈنگ بنائی بیچی اور بھاگے۔ مظفرآباد میں بھی یہی نظام، یہی طریقہ کار ہوگا۔ اس دن رات گئے تک میں نے یہ نہیں سوچا تھا مگر دوسرے دن سب کچھ بدل گیا تھا۔''

یہ کہہ کر اس نے سانس لی۔ گرم گرم چائے کی ایک چسکی۔ میں نے بھی چائے کی پیالی کو ہونٹوں سے لگایا، ساتھ ہی بیرے سے فرمائش کی کہ تازہ گرم تندور کی روٹیاں لے آئے۔ طالب علمی کے دور میں ہم دونوں نے چائے اور روٹی بہت کھائی تھی۔

''صبح ہم لوگوں کو چکوٹھی کی طرف جانا تھا۔'' اس نے خود ہی بات شروع کی تھی۔ ''نو بجے نکلنے کا پروگرام تھا، طے ہوا کہ صبح آٹھ بجے ناشتا کرکے نو بجے نکل کھڑے ہوں گے۔ میں جلدی تیار ہوکر جانے کیوں ہوٹل کی بلڈنگ سے باہر نکل آیا اور پورچ سے کار آہستہ آہستہ باہر نکال کر دریا کی طرف گھوما تھا جس کے ساتھ ہی گورنمنٹ کا اسکول تھا۔ بس اسی وقت یکایک جیسے زمین میرے پیروں کے نیچے سے نکل گئی تھی، سب کچھ پانچ چھ سیکنڈوں میں ہوگیا، بالکل نظر کے سامنے پوری بلڈنگ دائیں طرف گئی، رکی پھر بائیں طرف آتے آتے دھڑام کرکے ایک کے اوپر ایک گرتی چلی گئی......

''سب کچھ ختم ہوگیا، عورتوں اور بچوں کی آوازیں، چیخیں اور یکایک دور سے دھماکوں کی لرزش۔ میرے سامنے پہاڑ ٹوٹ کر تیزی سے گر رہے تھے، ساری وادی میں ایسا لگ رہا تھا جیسے چہار جانب دھواں اٹھ رہا ہے۔ ہوٹل کی پوری عمارت میری آنکھوں کے سامنے سگریٹ کے خالی ڈبوں کی طرح ڈھیر ہوگئی، میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں، اپنے ہاتھوں سے پتھر چنتا رہا، بڑے بڑے پلرز کو ہٹانے کی کوشش کرتا رہا مگر کچھ نہیں کرسکا۔ لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آتی رہیں مگر سب کچھ بے سود تھا۔ وہ قیامت کا سماں جو بھولا نہیں جاسکتا۔ جوان لوگ، بوڑھے لوگ، اپنے مکانوں کے ڈھیر پر بین کررہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سمندر تھا اور دل ایسا لاچار کہ وہ کچھ بھی نہ کرسکا۔ اپنے پیاروں کی چیخیں سنتے رہے، آہستہ آہستہ ان کی موت کو جیسے سمجھتے رہے وہ بے بسی، وہ لاچاری میں بھول نہیں سکتا۔

''جانے کتنے گھنٹے گزر رہے تھے کہ اس افراتفری کے باوجود کیسے میری آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو اس دھماکے سے کھلی جو کراچی میں ہوا تھا۔ بلڈنگیں ایک کے بعد ایک، اور ایک کے اوپر ایک گرتی چلی گئیں۔ میرے بنائے ہوئے سارے پلازے، میرے بنائے ہوئے ٹاور، وہ اپارٹمنٹ جن میں سیمنٹ کے بجائے چونا تھا، وہ عمارت جسے چھ منزلہ کی اجازت ملی تھی میں نے دس منزلہ بنادی تھی، وہ فوارے اور وہ منارے جو دھڑام سے گرتے چلے گئے تھے۔ وہاں تو کچھ بھی

نہیں ہوا تھا جو کراچی میں ہوگا۔ وہ خواب تھا مگر مجھے دہلا گیا۔''

یہ کہہ کر وہ پھر خاموش ہوگیا، تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کا چہرہ جیسے ویران ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی تازگی سی ہوتی تھی مگر اس وقت مجھے ایسا لگا جیسے کئی ہزاروں سال پرانے چہرے کو دیکھ رہا ہوں۔ حنوط کی ہوئی مصر کی کوئی ممی۔

وہ یکایک بول پڑا۔''میں جانے کیسے کراچی پہنچا تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ مجھے جلدی تھی کراچی پہنچنے کی کہ میں اور بچوں کو بچا سکوں، جوان اسکولوں میں تازہ تازہ پھول جیسے، اپنی ڈیسکوں، کرسیوں پر بیٹھے ہوئے، ہنستے ہوئے مسکراتے ہوئے پڑھ رہے ہوں گے۔ وہ اسکول تو میرے بنائے ہوئے ہیں اور وہ تو فوراً ہی گر جائیں گے ایک جھٹکے میں۔ مظفر آباد میں آنے والا زلزلہ تو بہت بڑا تھا۔ یہ تو کچھ بھی نہیں سہہ سکیں گے، یہ سارے بچے مر جائیں گے۔ ان کی لاشیں ہفتوں پتھروں اور سیمنٹ کے ملبے تلے دبی رہیں گی، جیسے میرے بچے اور میری بیوی مظفر آباد کے ملبے میں دبے ہوئے ہیں۔''

''میں کراچی پہنچتے ہی گورنمنٹ اسکول چلا گیا، اس عمارت میں بائیس سو بچے پڑھ رہے تھے۔ میں نے اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے کہا تھا کہ اس عمارت میں نہ پڑھاؤ۔ یہ عمارت گر جائے گی۔ اس نے مجھے دھکے دے کر اسکول سے نکال دیا۔ اس کی بات صحیح تھی۔ عمارت میں نے بنائی تھی۔ عمارت کے مکمل ہونے کے سرٹیفکیٹ پر اس نے دستخط کیے تھے۔ وہ دستخط واپس نہیں لے سکتا تھا۔ کیسے لیتا؟ میں نے سنا تھا دوسرے دن سے وہ اسکول نہیں آیا تھا۔

''میں نے محکمۂ تعلیم کے بڑے افسروں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ کراچی کے جن انیس اسکولوں میں، میں نے کام کیا ہے وہ سب کے سب موت کے پھندے ہیں، وہ سب گر جائیں گے۔ وہ سب میں نے بنائے ہیں۔ ان میں نہ مناسب سیمنٹ ہے نہ ہی لوہا، اور یہ بھی مجھے پتا تھا کہ ان عمارتوں کو کسی تعلیم یافتہ سول انجینئر نے دیکھا بھی نہیں ہے۔ چھتوں پر لوہے کے کناروں کو موڑا بھی نہیں گیا نہ ہی ان کا جال بنایا گیا ہے۔ وقت بھی کم تھا اور پیسے بھی بچانے تھے۔ منافع بھی کمانا تھا۔ یہ ساری عمارتیں بلڈنگیں، اسکول، کالج، تاش کے پتوں کی طرح بکھر جائیں گے مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

''میں کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی کے آفس میں گیا۔ وہاں بھی بڑے افسروں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ جو پلازے، دکانیں، فلیٹس میری کمپنی نے بنائے ہیں ان سب کو خالی کرالیں میں ذمے داری قبول کرتا ہوں، سارا نقصان برداشت کروں گا۔ سب کچھ دوبارہ کردوں گا۔ بھلے کنگلا ہو جاؤں مگر لوگ تو بچ جائیں گے۔ وہ لوگ جو اپنے بیوی بچوں، اپنے ماں، باپ بھائی بہنوں کے ساتھ ان ڈبوں میں رہتے ہیں، جنہیں وہ اپنا گھر کہتے ہیں، وہ گھر نہیں ہیں وہ موت کے گھر ہیں۔ موت کا کنواں، کنکریٹ کی قبر۔ ایک دن سب گر جائے گا، دھڑام سے۔ جیسے مظفر آباد میں نیلم ہوٹل گر گیا ہے جس کے ملبے کے نیچے میری بیوی کی لاش ابھی تک پڑی ہوئی ہے، جس کے کنکریٹ میں میرے بچے اپنے لیے راستہ بناتے بناتے مر گئے ہیں۔ اپنے ادھڑے ہوئے ناخنوں کے ساتھ۔ اپنی ٹوٹی ہوئی انگلیوں کے ساتھ۔ پاپا، پاپا کہتے ہوئے اندھیرے کنوؤں میں وہ سب ختم ہوگئے ہیں۔''

وہ کہتے کہتے چپ ہوگیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے بہادر آباد میں اگی ہوئی، ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی اونچی اونچی عمارتوں پر نظر ڈالی۔ میں تقریباً مفلوج سا ہوگیا۔ میں کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی آواز آئی۔

''یار کوئی سمجھتا ہی نہیں ہے۔ ڈائریکٹر نے مجھے دھکے دے کر باہر نکلوا دیا۔ سارے کھانے والے افسر جن کی میں نے خدمت کی تھی مختلف پروجیکٹ کے ڈائریکٹر سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ کسی کو میں نے چھ فیصد دیا تھا کسی کو چالیس فی صد، کسی کو تین فیصد دیا تھا کسی کو بارہ فیصد۔ کوئی بھی میری بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔

''میں وہاں کہہ کر آگیا ہوں۔ کل کراچی پریس کلب میں اپنی کمپنی کی بنائی ہوئی ساری بلڈنگوں، عمارتوں، اسکولوں، اسپتالوں کی فہرست کے ساتھ پریس کانفرنس کروں گا۔ کل کے بعد سب بلڈنگوں کو صحیح کردوں گا۔ چاہے کتنا بھی نقصان ہو۔ مگر ان بچوں کو نہیں مرنا چاہیے جو ابھی اسکول جاتے ہیں، وہ لڑکیاں جنہوں نے ابھی شادی کے خواب بھی نہیں بنے ہیں، وہ مائیں جو دن رات اپنے بچوں کے لیے دعائیں مانگتی رہتی ہیں۔ یہ چھوٹے بڑے خاندان، محبت والے لوگ ان کا کیا قصور، قصور تو میرا ہے۔ گناہ گار تو میں ہوں مجھے سزا مل گئی ہے، مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ کیا خیال ہے؟'' اس نے بڑے درد سے پوچھا۔ وہ میری آخری ملاقات تھی۔ میں نے اسے اس کی گاڑی کے پاس چھوڑا تھا۔

دوسرے دن کے اخباروں میں اس کی خودکشی کی خبر تھی۔ میں اب بھی سوچ رہا ہوں اس نے خودکشی کیوں کی؟ کیوں کی آخر خودکشی؟ وہ خودکشی کرنے والوں جیسا نہیں تھا مگر کیا اس کی خودکشی کی وجہ سے بہت سے لوگ خودکشی کرنے سے بچ گئے؟

''کیا خوب صورت پلکیں ہیں۔'' پیٹریشیا نے بچہ گاڑی پر جھکتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں نے کسی بے بی کی ایسی پلکیں کبھی نہیں دیکھیں...... اتنی لانبی اور اتنی خمیدہ! کتنی پیاری پلکیں ہیں۔''

پیٹریشیا نے اتنا بدصورت بے بی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس بچے کی پلکیں ٹھیک ٹھاک تھیں لیکن اس کا سر نوکیلا تھا جس پر بالوں کی چند لٹیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کی ناک بیٹھی ہوئی تھی اور چہرے سے چڑچڑا پن ظاہر ہو رہا تھا لیکن اس بچے کی ماں ایک تھکی ماندی نوجوان عورت تھی جس نے بدرنگ اسکرٹ اور پھٹا پرانا سویٹر پہنا ہوا تھا۔

پیٹریشیا کے ان الفاظ پر اس نوجوان عورت کا جسم تن گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک ابھر آئی اور وہ اپنے بیٹے کو فخریہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم صحیح کہہ رہی ہو۔ اس کی پلکیں واقعی زبردست ہیں۔''

پیٹریشیا نے آگے کی جانب جھکتے ہوئے بس کو دیکھنے کے لیے سڑک پر دور تک نگاہ دوڑائی۔ سہ پہر کا ٹریفک معمول سے قدرے سست رفتاری سے رواں تھا۔ شاید اس کی وجہ تین گھنٹے قبل ہونے والی بینک ڈکیتی کی واردات تھی۔ پولیس کی کاروں نے ابھی تک سڑکیں بند کی ہوئی تھیں۔

اتنے میں بچے نے تیز اور بھاری ناگوار آواز میں رونا شروع کر دیا۔ وہ عورت بچے پر جھکی اور اس کی پیشانی پر بوسہ لیتے ہوئے بولی۔ ''نہیں، نہیں روتے نہیں، سویٹی۔ بس کسی بھی لمحے آنے والی ہے۔ پھر ہم ڈیڈی کے پاس گھر چلے جائیں گے۔ وہ اپنے لمبی خوب صورت پلکوں والے بیٹے کو دیکھ کر بہت

بے جا تعریف

سلیم انور

ایک دوسرے سے حسد نہ کرنا اور کسی کو ہنستے بستے دیکھ کر خوش ہونا شاید کسی اور ہی جہاں کے قصے ہیں جبکہ یہ خصوصیات تو اب ہمارے یہاں دورِ حاضر میں نایید ہو گئی ہیں۔ البتہ مغربی معاشرے کی یہ ایک خوبی واقعی سراہے جانے کے قابل ہے کہ اگر تعریف کے دو جملے کسی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر سکتے ہیں تو بخیل ہونے کے بجائے سخاوت کا مظاہرہ کر دینا چاہیے۔

ٹوٹے ہوئے دلوں کو تعریف کے چند الفاظ سے جوڑنے والے ایک مہربان کا انداز



خوش ہوں گے۔“

پیٹریشیا ایک بار پھر مسکرادی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ نوجوان عورت اس وقت کیا محسوس کر رہی ہوگی۔ اسے اپنا وہ واقعہ یاد آگیا جو کئی سال پہلے اس کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اس وقت اس کے احساسات بھی بالکل اسی نوجوان عورت کے احساسات کے مانند تھے۔

وہ ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو دینے جارہی تھی۔ اس کی حالت خستہ ہورہی تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس نے جو نئے انداز کے بال ترشوائے تھے، وہ خاصے گھناؤنے اور بدوضع تھے اور وہ جانتی تھی کہ کوئی بھی ایسے کسی کو ملازمت پر نہیں رکھے گا جو اس درجے بدہیئت اور بھونڈا دکھائی دے رہا ہو۔

پھر جب وہ لفٹ میں سوار ہونے کے لیے بڑھ رہی تھی تو ایک اجنبی ایک لمحے کے لیے اس کے قریب رک گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”کیا پرفیکٹ تراشی ہوئی زلفیں ہیں۔ نہایت پروفیشنل دکھائی دے رہی ہیں اور ان زلفوں کے درمیان تمہارا چہرہ حسین لگ رہا ہے۔“

اسے وہ اجنبی پھر کبھی دکھائی نہیں دیا لیکن اس اجنبی کے الفاظ نے اسے انٹرویو کا سامنا کرنے کے لیے ایک نیا عزم اور ایک نیا حوصلہ عطا کردیا تھا۔ اسے وہ ملازمت مل گئی تھی اور اسے پسند بھی آگئی تھی۔

پھر اس نے اپنے دفتر کے ایک ساتھی کے ساتھ شادی کرلی تھی۔ اس نے اپنے بہت سے پیارے دوست بھی بنالیے تھے۔ اسے ترقی پر ترقی ملتی چلی گئی تھی حتیٰ کہ وہ بحیثیت ڈویژن ڈائریکٹر ریٹائر ہوئی۔

وہ اس بات کو تسلیم کرتی تھی کہ اس کی یہ کامیاب زندگی اس اجنبی کے چند شفقت بھرے الفاظ کی مرہونِ منت تھی جو اس نے اس کے انٹرویو والے دن لفٹ سے باہر اس کی حوصلہ افزائی کے لیے ادا کیے تھے۔ وہ آج تک اس اجنبی کی احسان مند تھی۔

اور اب ایک بیوہ، پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے غول ہونے کے باوجود وہ اس اجنبی کو آج تک نہیں بھولی تھی۔ اسی لیے اس کا قرض چکانے کے لیے وہ ان لوگوں کو چند ستائشی جملے ضرور کہہ دیتی تھی جن سے اس کی سرِراہ مڈبھیڑ ہوتی تھی۔

”بے جا تعریف تمہیں کہیں نہیں پہنچاسکتی۔“ وہ اکثر اپنے پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں سے کہا کرتی تھی۔ ”لیکن اس سے کسی غریب کا دن بہتر اور بھلا گزر سکتا ہے۔“

بس ٹریفک کی بھیڑ میں رینگتی ہوئی بالآخر آہی گئی۔ پیٹریشیا نے نوجوان عورت کو بچہ گاڑی، بس میں سوار کرانے میں مدد دی۔ پھر بس ڈرائیور کو اس کے صاف ستھرے یونیفارم پر داد دی۔ بس ڈرائیور کے چہرے کے بدمزاج، روکھے تاثرات بے ساختہ مسکراہٹ میں بدل گئے۔

اس نوجوان عورت نے اپنے بچے کے ساتھ سامنے کی ایک سیٹ سنبھال لی اور پیٹریشیا راستہ بناتی ہوئی بس کے پچھلے حصے میں چلی گئی۔ وہاں ایک دبلے پتلے لمبے شخص کے برابر کی نشست خالی دکھائی دی۔ وہ شخص یقینی طور پر پریشان اور افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔ موسم بہتر ہونے کے باوجود وہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ اس نے بڑے سائز کا ایک بریف کیس اپنے سینے سے چمٹایا ہوا تھا جیسے وہ اس کا کوئی چہیتا دوست ہو۔

اس کی کیفیت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی افسردگی کو دور کرنے اور اس کی طبیعت کو بحال کرنے کی واقعی ضرورت ہے۔

پیٹریشیا مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اس شخص کے برابر خالی نشست پر جا بیٹھی۔ ”مائی گڈنیس!“ پیٹریشیا نے اس شخص کے بریف کیس پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”کتنا متاثر کن بریف کیس ہے۔ یہ اس قسم کا بریف کیس ہے جو ایک کامیاب شخص کے پاس ہونا چاہیے۔ تمہارے پاس اس بریف کیس کو دیکھ کر مجھے یہ خیال آرہا ہے کہ تمہیں حال ہی میں کوئی بڑی کامیابی ملی ہے۔ اور یہ بریف کیس بھی یقینی طور پر بڑا ہے۔ میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ اس کے اندر بہت کچھ سما سکتا ہے۔ یہ بالکل برانڈ نیو ہے۔ ہے نا؟ مجھے اس پر کوئی معمولی سی خراش بھی نظر نہیں آرہی ہے۔ تمہیں پتا ہے میری بیٹی ایوالین کو بھی ایک نئے بریف کیس کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ اسے اس جیسا ہی بریف کیس پسند آئے گا۔ یہ تم نے کہاں سے خریدا ہے؟“

اس دراز قامت شخص نے شانے اچکاتے ہوئے اپنا چہرہ ایک طرف گھمالیا اور بولا۔ ”مجھے یاد نہیں۔“

”اوہ، یہ تو برا ہوا۔ ویل، یہ وسط شہر کی ان چھوٹی عمدہ دکانوں میں سے کسی میں لازمی موجود ہوگا۔ مجھے وہ دکانیں... بے حد پیاری لگتی ہیں۔ مالز بھی بہت عمدہ ہوتے ہیں لیکن جو لوگ شہر کی دکانوں میں کام کرتے ہیں، ان کا رویہ زیادہ دوستانہ ہوتا ہے۔ وہ گاہکوں میں حقیقی دلچسپی لیتے ہیں اور اگلی بار جب کوئی گاہک آتا ہے تو وہ اسے پہچان لیتے ہیں۔ تم بھی یقینی طور پر انہیں یاد ہوگے کیونکہ تم ایک گڈ لکنگ ینگ مین ہو۔“

اب بات بن جائے گی، پیٹریشیا نے سوچا۔ ساتھ ہی ہونٹوں پر اپنی بھرپور دلکش مسکراہٹ سجائے اس شخص کی جانب گھوم گئی۔ لیکن اس دراز قامت نوجوان پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ پیٹریشیا کے ستائشی جملوں سے اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اب پسینے سے

اس کا چہرہ تمتمارہا تھا اور وہ پیٹریشیا سے آنکھ ملانے سے گریزاں سیدھا سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

شاید مزید ستائشی جملے ادا کرنا ہوں گے، پیٹریشیا نے فیصلہ کیا۔ وہ اس نوجوان کے سراپا کا جائزہ لینے لگی تاکہ ستائشی الفاظ کے لیے اس کی کوئی شے تلاش کرسکے۔

''اوہ، تمہارے یہ جوتے تو بے حد جاذبِ نظر ہیں۔'' پیٹریشیا نے اس کے پیروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اسپورٹس کے لیے بے حد عمدہ ہیں۔ اگر تمہیں دوڑنے کی ضرورت پیش آجائے تو تم ان جوتوں میں میلوں تک آسانی سے دوڑ سکتے ہو۔''

اس دراز قامت نوجوان نے بہ مشکل تمام اپنا تھوک حلق سے نیچے اتارا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔ اب اس کا پسینا بھی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ یقیناً اس شخص کو کسی بات کی پریشانی لاحق ہے جو یہ شاد نہیں ہورہا ہے، پیٹریشیا نے سوچا...... لیکن اگر وہ اس کے لیے ایک درست ستائشی بات کہہ دے تو یہ خود کو بہتر محسوس کرنے پر مجبور ہوجائے گا۔

''کیا امتیازی ٹائی ہے۔'' پیٹریشیا نے مزید غور سے اس کے سینے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ کوئی مونوگرام ہے؟ ڈبلیو جی؟ ابتدائی حروف بہت عمدہ کڑھے ہوئے ہیں۔''

اس شخص کا چہرہ پھیکا پڑگیا اور اس کا ہاتھ ٹائی کے مونوگرام کو چھپانے کے لیے بے ساختہ اوپر چلا گیا۔

ویل، پیٹریشیا نے سوچا۔ میرے خیال سے اسے نام کے ابتدائی حروف پسند نہیں ہیں۔ شاید کسی اور ذاتی شے کی ستائش سے بات بن جائے۔ ''جانتے ہو۔'' پیٹریشیا نے کہا۔ ''تم بے حد جانے پہچانے لگ رہے ہو۔ ایک منٹ...... میں جانتی ہوں کہ ایسا کیوں ہے۔ تم......''

وہ یہ کہنے جارہی تھی کہ اس کی شکل ٹی وی پر منگل کی شب پیش کیے جانے والے نئے پروگرام ''ڈاکٹرز شو'' کے ہینڈسم نوجوان اداکار سے ہوبہو ملتی جلتی ہے لیکن اسے یہ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

وہ دراز قامت اپنی نشست سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ ''آل رائٹ!'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''میں اب مزید طنز برداشت نہیں کرسکتا۔ تم نے مجھے پاگل کردیا ہے لیکن میں تمہیں مزید ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس شخص نے اپنے بریف کیس سے پیٹریشیا کو دھکا دیا تو وہ اپنی نشست سے نیچے درمیانی گزرگاہ پر گر پڑی۔ وہ نوجوان لڑکھڑاتے قدموں سے پیٹریشیا کو پھلانگتا ہوا بس کے سامنے کے حصے کی جانب لپکا۔

وہ زیادہ دور نہیں جاسکا تھا کیونکہ اس نوجوان عورت نے جو پیٹریشیا کے ہمراہ بس میں سوار ہوئی تھی، شوروغل سن لیا تھا اور پیٹریشیا کو نیچے گرتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی نشست پر سے اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ ''ظالم، بے رحم۔'' وہ چیخی۔ ساتھ ہی اپنا ڈائپر کا بیگ اس دوڑتے ہوئے نوجوان کے چہرے پر دے مارا۔ ''تم نے اس نفیس خاتون کو دھکا کیوں دیا؟''

بس کے پہیے چرچرائے اور بس سڑک کے کنارے رک گئی۔ ڈرائیور نے پلٹ کر دیکھا تو پیٹریشیا بدستور درمیانی راہ گزر پر پڑی ہوئی تھی اور وہ نوجوان عورت دراز قامت پر اپنے ڈائپر بیگ سے مسلسل ضربیں لگائے جارہی تھی۔ ڈرائیور کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟'' ڈرائیور نے کڑک کر کہا۔ ''تم نے اس نفیس لیڈی کو کیوں مارا ہے؟''

ساتھ ہی ڈرائیور اس دراز قامت پر جھپٹ پڑا اور ایک زوردار گھونسا دے مارا۔ گھونسے نے اسے پیچھے لڑھکا دیا۔ بریف کیس اس نوجوان کے ہاتھوں سے نکل کر پیٹریشیا کے قدموں میں جاگرا اور ایک جھٹکے سے کھل گیا۔

تب پیٹریشیا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بریف کیس کے کھلتے ہی نوٹوں کے بنڈل اور ایک ریوالور بس کے فرش پر بکھر گئے تھے۔

''ارے!'' ایک مسافر نے چیخ کر کہا۔ ''یہ یقیناً وہی ڈاکو لگتا ہے جس نے ففتھ ایونیو پر بینک میں ڈاکا ڈالا ہے اور ایک گارڈ کو گولی بھی ماری ہے۔ پولیس نے اس کے ساتھی کو دھرلیا ہے اور اس کار کو بھی قبضے میں لے لیا ہے جس میں یہ فرار ہونے والے تھے۔ البتہ یہ ڈاکو پیدل بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ تم اس کو قابو میں کیے رہو، ڈرائیور! میں نائن ڈبل ون پر فون کرتا ہوں۔''

ایک اور مسافر خاتون نے پیٹریشیا کو اپنے قدموں پر کھڑے ہونے میں مدد دی۔ ''تم نے نہایت عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔'' اس مسافر خاتون نے کہا۔ ''بینک نے اس ڈاکو کو پکڑنے والے کے لیے ایک بڑے انعام کا اعلان کیا ہے...... اور یقیناً وہ انعام تمہیں ہی ملے گا لیکن تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ یہ نوجوان ہی وہ ڈاکو ہے؟''

پیٹریشیا کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، وہ اس صورتِ حال سے خود کو پوری طرح سنبھالنے نہیں پائی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہوگئی۔ ''میں نے بس تھوڑی سی بے جا تعریف سے کام لیا تھا۔'' پیٹریشیا نے کہا۔ ''یہ تمہیں کہیں بھی پہنچا سکتی ہے۔ اور بائی داوے، تم نے جو جیکٹ پہنی ہوئی ہے وہ بے حد پیاری ہے۔''

ثمیر عبداللہ

قرض

یوں تو انسان احساسات کا مجموعہ ہے مگر... حقِ ملکیت کا احساس اسے واقعی بلند پرواز عطا کرتا ہے یہ اور بات کہ سچ میں وہ چیز اس کی ملکیت ہے بھی یا نہیں... مگر کچھ لوگ یہ بات سوچ ہی نہیں پاتے... البتہ وقت ایک ایسا ہتھیار ہے جو بڑے بڑے سورماؤں کو حقیقت تسلیم کرانے پر مجبور کردیتا ہے جیساکہ یہاں... رشتے... جو فرد کو فرد کا احساس دلاتے ہیں... محبتوں کی ڈوری ایک دوسرے کو باندھے رکھتی ہے لیکن... ایسی غلط فہمی میں مبتلا جب مفاد پرستی انسان کو اپنی ذات تک محدود کردے تو کون ہے جو کسی کی محبتوں کا قرض ادا کرنے کا ارادہ باندھے۔ ایسے میں جب آنکھیں خواب دیکھنا چھوڑ دیں اور بھیگے موسم کی پھوار میں دل مدھر تالوں پر دھڑکنا بھول جائے... جب چاندنی میں پھولوں کی خوشبو روح کو سرشار نہ کرپائے اور بے سمت سفر میں انسان بھٹکتا رہ جائے تو ایسے میں سمجھ لینا چاہیے کہ اس گمبھیر خاموش فضا میں کوئی طوفان پوشیدہ ہے... اور بقول شاعر "جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو بوجھ اتارا کرتے ہیں" کے مصداق احساس ہوتا ہے کہ ہم... کس کس کے مقروض ہوگئے ہیں... ایسے میں زندگی بادشاہ ہے کہ مہلت دیتی ہے یا نہیں... لیکن مقروض کو جلد سے جلد قرض اتارنے کی فکر لاحق ہوجاتی ہے۔ بس کسی پر زندگی مہربان ہوجاتی ہے اور کسی پر دائرہ تنگ کردیتی ہے۔

مردہ احساسات میں رشتوں کی بدصورتی اور محبتوں میں منافقت کا احوال





ڈاکٹر ہادی نے اپنے سامنے بیٹھے شخص کو نظر اٹھا کر دیکھا۔ اندر کو دھنسی آنکھیں، گہری سانولی رنگت، موٹے موٹے دانتوں سے بھرے رخسار، الجھے ہوئے.... بے ترتیب بال اور جینز کی گھسی ہوئی بینٹ پر سستی سی چیک دار.... شرٹ پہنے اس ستائیس سالہ جوان کی مجموعی شخصیت کا بالکل بھی اچھا تاثر نہیں بنتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن پر ایک نظر ڈالنے کے بعد دوبارہ دیکھنے کو دل نہیں چاہتا لیکن ڈاکٹر ہادی اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری پوری کرنے کے لیے اس سے بھی زیادہ بدنما لوگوں سے ملنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان کے سامنے بیٹھے اس جوان کا نام ابرار تھا اور وہ آج دوسری بار ان کے کلینک پر آیا تھا۔ شہر کے اس پسماندہ علاقے میں کلینک کا آغاز کیے انہیں صرف تین ماہ کا عرصہ گزرا تھا اور انہوں نے اس جگہ یہ کلینک صرف اس جذبے کے تحت کھولا تھا کہ پسماندہ علاقے میں رہنے والوں کو بھی ایک اچھا ڈاکٹر میسر آسکے۔ وہ اپنی قابلیت اور مہارت سے بہت اچھی طرح واقف تھے اور اس قابلیت اور مہارت کے سبب شہر کے سب سے مہنگے اسپتال میں بہت خطیر معاوضے کے عوض عرصے سے ملازمت کر رہے تھے۔ اچھی ملازمت کے ساتھ ساتھ ان کے پاس ایک بڑا سا گھر، دو شاندار گاڑیاں، خوب صورت بیوی اور دو اپنی ہی طرح لائق فائق بیٹے موجود تھے اور زندگی میں کہیں کوئی کمی نہیں تھی۔ اپنے طور پر وہ اپنی اس زندگی سے مطمئن تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ ان کے بیٹے اپنی تعلیم مکمل کر لیں تو وہ ان کے لیے اچھی سلیقہ مند بیویاں لے آئیں اور پھر آنے والے سالوں میں اپنے پوتوں اور پوتیوں کے ساتھ زندگی سے لطف اندوز ہوں۔

برہان اور وجدان ان کی جڑواں اولاد تھے جن کی پیدائش کے وقت ان کی بیوی عالیہ کے ساتھ کچھ ایسی پیچیدگی ہوگئی تھی کہ وہ آئندہ ماں بننے سے محروم ہوگئی تھی لیکن اس محرومی کو دونوں میاں بیوی نے اس لیے محسوس نہیں کیا کہ قدرت انہیں بہترین نعمت سے نواز چکی تھی اور دو اتنے پیارے پیارے بیٹوں کے ہوتے ہوئے ان کے دل میں مزید اولاد کی خواہش بھی نہیں رہی تھی۔

برہان اور وجدان ایسے بچے تھے جو خوش شکل اور خوش اطوار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت لائق بھی تھے۔ بچپن سے دونوں بھائیوں میں کلاس میں پہلی پوزیشن کے حصول کے لیے سخت مقابلہ ہوتا تھا اور اکثر و بیشتر دونوں بھائی اول پوزیشن کو شیئر کرتے تھے۔ اگر کبھی کوئی ایک آدھ پوائنٹ سے دوسرے کو پیچھے چھوڑ بھی دیتا تو دوسرا اگلے امتحان میں حساب بے باق کر دیتا تھا۔ تعلیمی میدان میں اس مسابقت کے برخلاف دونوں بھائیوں میں گہری دوستی تھی اور ڈاکٹر ہادی کو لگتا تھا کہ پروفیشن کا انتخاب کرتے ہوئے بھی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے لیکن فرسٹ ایئر میں برہان نے پری انجینئرنگ اور وجدان نے پری میڈیکل میں داخلہ لے کر انہیں حیران کر دیا تاہم انہوں نے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور دونوں کو ان کی پسند کے مطابق تعلیم جاری رکھنے میں پوری طرح مدد کرتے رہے۔ اب برہان این ای ڈی اور وجدان ڈاؤ میڈیکل یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ وہ اب بھی دونوں بیٹوں کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھرپور دلچسپی لیتے تھے لیکن وجدان کی اپنی ہی فیلڈ سے وابستگی نے اسے ان سے زیادہ قریب کر دیا تھا اور دونوں باپ بیٹے میں اپنے پروفیشن کے متعلق موضوعات پر ڈھیروں گفتگو ہوتی تھی۔ پچھلے سال وجدان کے اساتذہ نے فائنل ایئر کے طلبا و طالبات کے ساتھ شہر کے مختلف علاقوں میں فری میڈیکل کیمپس لگائے تھے۔ وجدان کی ٹیم نے شہر کے جس علاقے میں کیمپ لگایا تھا وہ بہت پسماندہ تھا اور وہاں لوگوں کی حالت دیکھ کر وہ بہت زیادہ ڈسٹرب ہوا تھا۔ اس نے ڈاکٹر ہادی سے کہا تھا کہ ڈیڈی ہم میڈیا کی وجہ سے اپنے گاؤں دیہاتوں کی حالت زار سے تو باخبر ہیں لیکن یقین جانیے کہ ملک کے اس سب سے بڑے شہر میں بھی کئی علاقے ایسے ہیں جہاں لوگوں کو صفائی و صحت جیسی بنیادی سہولیات تک میسر نہیں اور وہ شہر میں بڑے بڑے اسپتالوں اور ماہر ڈاکٹرز کی موجودگی کے باوجود اپنا مناسب علاج کروانے کی استطاعت نہیں رکھتے۔

وہ اس معاملے میں خاصا جذباتی ہوگیا تھا اور ارادہ رکھتا تھا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایسے ہی کسی علاقے میں پریکٹس کرے گا۔ ڈاکٹر ہادی کا خیال تھا کہ یہ جذباتی ابال ہے جو جلد بیٹھ جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور وجدان مسلسل انہیں کنوینس کرتا رہا کہ خود انہیں بھی کچھ وقت نکال کر شہر کے کسی ایسے علاقے میں کام کرنا چاہیے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمارے پروفیشن کے ساتھ انسانیت کی خدمت کی ٹرم اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ ہم اس سے نظر چرا ہی نہیں سکتے۔ اس نے ان سے کہا تھا کہ میں آپ سے یہ نہیں کہتا کہ آپ

سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بس خدمت میں جت جائیں۔ ظاہر ہے ایک اچھی اور پرتعیش زندگی گزارنا ہر شخص کا خواب ہوتا ہے اور ایسے سرپھرے مشکل ہی سے ملتے ہیں جو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف انسانی ہمدردی میں دور دراز علاقوں میں جا بستے ہیں لیکن یہ تو ہر شخص کے لیے ممکن ہے کہ وہ اپنے لیے بہت ساری سہولیات حاصل کرنے کے بعد کچھ وقت ان لوگوں کے لیے نکال لے جو بے پناہ محرومی کی زندگی گزار رہے ہیں اور انسان ہونے کے ناتے ہم پر حق رکھتے ہیں۔ وہ اس طرح کی بہت سی باتیں مسلسل ان کے ساتھ کرتا رہتا تھا اور آہستہ آہستہ اس کی باتوں نے انہیں متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ وجدان کی تقریروں کا ہی اثر تھا کہ انہوں نے تین ماہ قبل اس علاقے میں اپنے کلینک کا آغاز کر دیا تھا جہاں وہ ہفتے میں صرف دو دن، دو گھنٹے کے لیے بیٹھتے تھے۔ اپنے کلینک پر مریضوں کی تعداد کو کنٹرول کرنے کے لیے انہوں نے ابتدا ہی سے چند اصول وضع کر دیے تھے۔

یہ کسی عام ڈاکٹر کا کلینک نہیں تھا جہاں لوگوں کے نزلہ، کھانسی، بخار یا عمومی امراض کا علاج کیا جاتا۔ ان معمولی امراض کے علاج کے لیے علاقے میں دو تین ڈاکٹرز اور بھی بیٹھتے تھے اور علاقہ مکینوں کی حیثیت کے حساب سے ہی فیس بھی وصول کرتے تھے چنانچہ ڈاکٹر ہادی نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ صرف ان مریضوں کا علاج کریں گے جو کسی خاص مرض میں مبتلا تھے اور عام ڈاکٹرز کو ان کی بیماری سمجھ نہیں آتی تھی۔ ان کے مریضوں میں وہ افراد بھی شامل تھے جو عرصے سے اپنے کسی عمومی مرض کا علاج کرواتے رہنے کے باوجود صحت یاب نہیں ہو پا رہے تھے۔ جیسے طویل المیعاد کھانسی یا بخار میں مبتلا مریض۔ یہ عام سی بیماریاں اگر علاج کے باوجود جلد ٹھیک نہ ہوں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ مریض کا اصل مسئلہ کچھ اور ہے اور ڈاکٹر اس کے مرض کی صحیح تشخیص نہیں کر پا رہا ہے۔ ایسے مریض اپنے پرانے معالج کا پرچہ یا رپورٹس وغیرہ دکھا کر ان کا اپائنٹمنٹ حاصل کر سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے کلینک پر آنے والے مریضوں کے لیے فیس بھی مقرر کی تھی تا کہ لوگ بلاوجہ یہاں کا رخ نہ کریں لیکن جب مریض ایک بار ان کے پاس آجاتا تو وہ اس کے کیس اور مالی حالات کے بارے میں مکمل انویسٹی گیشن کرنے کے بعد اسے اس کے حالات کے حساب سے چھوٹ اور سہولت دے دیتے تھے۔

طب کے شعبے میں ایک عرصہ گزارنے کے باعث ان کے تعلقات خاصے وسیع تھے پھر تعلق بھی اچھے خاندان سے تھا اس لیے کئی لوگ اس کار خیر میں ان کے ساتھ تعاون کے لیے تیار رہتے تھے۔ شہر میں کئی لیبارٹریز ایسی تھیں جو ان کی سفارش پر آنے والے مریضوں کے ٹیسٹ اچھی خاصی رعایت پر کر دیتی تھیں۔ وہ مریض جو بالکل بھی کچھ خرچ نہیں کر سکتے تھے ان کے لیے انہوں نے خصوصی فنڈ کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ میڈیسن کمپنیز سے بھی ان کا رابطہ تھا جن کے تعاون سے لوگوں کو مفت یا رعایتی نرخ پر دوائیں فراہم کی جا رہی تھیں۔ اپنے ایسے اور اس جیسے دوسرے اقدامات کے باعث تین ماہ کے مختصر عرصے میں وہ علاقے میں بہت اچھی ساکھ بنا چکے تھے اور لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کس کس صورت میں ڈاکٹر ہادی کے کلینک کا رخ کریں گے تو انہیں علاج کی بہترین سہولیات میسر آسکیں گی۔ ہاں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے امراض کو نا قابل غور سمجھ کر انہیں واپس لوٹا دیا گیا تھا اور وہ ڈاکٹر ہادی کے بارے میں الٹے سیدھے ریمارکس پاس کرتے رہتے تھے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔

اس وقت ان کے سامنے ابرار نامی جو نوجوان بیٹھا تھا، اس نے کلینک کے اصولوں کے خلاف باہر استقبالیہ پر موجود شخص کو اپنا مسئلہ نہیں بتایا تھا نہ ہی وہ کسی سابقہ معالج کا حوالہ پیش کر سکا تھا لیکن اس نے کچھ ایسے انداز میں ڈاکٹر سے ملاقات کروانے کی درخواست کی تھی کہ استقبالیہ پر موجود کلرک ڈاکٹر ہادی سے اس کے سلسلے میں بات کرنے پر مجبور ہو گیا تھا اور ڈاکٹر ہادی نے محض تجسس کے باعث اس سے ملنا منظور کر لیا تھا۔ ان کے روبرو بھی اس نے بہت مشکل سے اور بڑے جھجکتے ہوئے اپنا مسئلہ بیان کیا تھا اور انہوں نے کسی عام شخص کی طرح کوئی منفی ردعمل دیے بغیر بہت توجہ سے اس کی بات سنی تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے اس سے اس کے بارے میں کئی سوالات بھی کیے تھے جن کے نتیجے میں انہیں ابرار کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، وہ یہ تھیں کہ ابرار اپنے والدین کا سب سے بڑا اور اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے بعد اس کی تین عدد چھوٹی بہنیں تھیں۔ ابرار نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اس سے آگے بھی پڑھنے کا ارادہ اور شوق رکھتا تھا لیکن اسے بتا دیا گیا کہ گھر کے معاشی حالات ایسے نہیں ہیں کہ اس کی مزید تعلیم کے اخراجات برداشت کیے جا سکیں چنانچہ وہ صرف سولہ سال کی عمر میں ایک ٹیکسٹائل مل میں ملازم ہو گیا۔ کیونکہ قانونی طور پر وہ نابالغ تھا اور مل

میں کام کرنے کا اہل نہیں تھا اس لیے اسے ٹھیکیداری نظام کے تحت ملازمت دی گئی۔ وہ ایک ایسا ورکر تھا جس کا مل کے ملازموں میں کہیں اندراج نہیں تھا چنانچہ اسے وہ سارے حقوق بھی حاصل نہیں تھے جو لیبر لاء کے تحت کسی مل مزدور کو حاصل ہوتے ہیں البتہ محنت اس سے خوب لی جاتی تھی۔ احتجاج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اس صورت میں نوکری سے فوری جواب دے دیا جاتا۔

اتنی کم عمری میں ایسی سخت ملازمت کرتے ہوئے بھی اس کے حوصلے بلند تھے اور اس کا ارادہ تھا کہ وہ پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے اپنی تعلیم جاری رکھے گا لیکن وہ اپنے اس ارادے کو کبھی عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ اس کی ملازمت کے چند ماہ بعد ہی اس کے والد بستر سے جا لگے۔ اصل میں وہ عرصے سے دمے کے مرض میں مبتلا تھے اور اب یہ مرض شدت اختیار کر گیا تھا۔ ان کی بیماری کی وجہ سے ایک تو ان کی آمدنی کا سلسلہ رک گیا تھا، دوسرے علاج کا خرچہ الگ تھا اور ابرار کی تنخواہ میں گزارہ ہونا کسی طور ممکن نہیں تھا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے اس نے مزید تعلیم کے خیال کو پس پشت ڈالا اور آمدنی میں اضافے کے لیے مستقل اوور ٹائم کرنے لگا۔ پھر بھی اس کی آمدنی اخراجات کے حساب سے کم ہی رہی اور اس فرق کو مٹانے کے لیے اس کی ماں، بیٹیوں کی مدد سے گھر پر ملنے والے چھوٹے موٹے کام کرنے لگی۔ ان کاموں میں دھاگے کی ریلوں پر لیبل چسپاں کرنا، بچوں کی لاٹریاں پیک کرنا اور دوسرے چھوٹے موٹے کام شامل تھے جنہیں سر جھکا کر کرتے اس کی ماں بہنوں کا پورا دن بیت جاتا لیکن اجرت میں اتنے روپے ہاتھ نہ آپاتے کہ ایک وقت کے کھانے کا ہی بندوبست ہو سکے چنانچہ ان کے گھر میں آمدنی اور اخراجات کے درمیان فرق قائم رہا۔

اس مشقت بھری زندگی میں تھوڑی سی سہولت اس وقت محسوس کی گئی جب چارپائی پر پڑا اس کا باپ ایک سال کی بیماری جھیلنے کے بعد آخر کار تھک ہار کر دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کے کفن دفن پر بھی اچھا خاصا خرچہ تو آیا لیکن دواؤں اور پرہیزی غذا کے مسلسل خرچے سے نجات مل گئی۔ اگلا ایک سال ان قرضوں کو اتارتے ہوئے گزرا جو مختلف لوگوں سے باپ کے علاج کے سلسلے میں لیے گئے تھے۔ قرض اترنے کے بعد کم از کم اتنا ہو گیا کہ گھر کے پانچوں نفوس سادہ ہی سہی لیکن پیٹ بھر کر کھانا کھانے لگے اور دوسری چھوٹی موٹی ضروریات بھی پوری ہونے لگیں۔

اس عرصے میں ابرار اٹھارہ سال کا ہو چکا تھا اور اس بات کا حق دار تھا کہ اسے مل کے مستقل ملازموں میں جگہ دے دی جائے لیکن یہ کام بھی آسانی سے نہیں ہوا اور مل والوں نے اسے یہ اعزاز دیتے دیتے بھی دو سال کا عرصہ مزید لگا دیا۔ یوں بیس سال کی عمر میں وہ مل کے مستقل ملازموں کی فہرست میں شامل ہو سکا اور ذرا سانس لینے کی گنجائش محسوس کی لیکن آمدنی میں ہونے والے معمولی اضافے کے ساتھ ہی اس کی ماں کو اپنے سینے پر دھرے تین بھاری پتھروں کو سرکانے کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ بیٹیاں بیاہنے کے لیے لازم تھا کہ ان کے لیے جہیز کا بندوبست کیا جائے چنانچہ اس کی ماں اس مشن میں جت گئی اور ابرار تو تھا ہی اس مشن کا لازمی حصہ۔ بہنوں کا جہیز جمع کرنے کی خاطر وہ ایک بار پھر کولھو کے بیل کی طرح جت گیا۔

چوبیس سال کی عمر میں اس نے اپنے سے چھوٹی بہن کو بیاہ دیا۔ ماں کا ارادہ تھا کہ دو بیٹیوں کی ایک ساتھ شادی کرے گی تاکہ اخراجات میں کمی آ سکے لیکن شومئی قسمت اس کی بیچ والی بہن شکل و صورت کے معاملے میں ذرا گئی گزری تھی اس لیے اس کی کہیں بات نہیں بن سکی اور ماں کو بڑی بیٹی کی منگنی ٹوٹ جانے کے خطرے کے باعث اسے اکیلے ہی بیاہنا پڑا کیونکہ اس کے سسرال والے مزید انتظار کے لیے تیار نہیں تھے۔ بڑی کی شادی کو سال بھر کا عرصہ گزر گیا لیکن منجھلی کی کہیں بات نہیں بن سکی البتہ چھوٹی کے لیے رشتے آنے لگے۔ ماں منجھلی کو چھوڑ کر چھوٹی کا رشتہ طے کرنے کے لیے تیار نہیں تھی اس لیے اس کے شانوں پر دو بن بیاہی بہنوں کا بوجھ موجود رہا۔ اس عرصے میں رشتے دار اور ملنے جلنے والی خواتین ماں کو مشورہ دینے لگیں کہ بہو گھر لے آؤ۔ ابرار بڑا ہے اور اب اس کی شادی ہو جانی چاہیے لیکن ماں کا جواب تھا کہ بیٹیاں بیاہنے سے پہلے بہو گھر نہیں لاؤں گی۔ بہو آ گئی تو بیٹا ہاتھ سے نکل جائے گا اور میرے لیے بیٹیاں بیاہنا مشکل ہو جائے گا۔ اس موقع پر ابرار نے ماں کو... خود غرض محسوس کیا حالانکہ وہ بے چاری خود غرض سے زیادہ لاچار تھی۔ اسے گھر کے جملہ فرائض کی انجام دہی کے لیے بیٹے پر ہی انحصار کرنا تھا لیکن ابرار کو لگا کہ گھر والوں کے نزدیک وہ محض روپے کمانے کی مشین ہے اور وہ اسے پوری طرح نچوڑ لینا چاہتے ہیں۔ وہ گھر والوں سے بددل ہونے لگا تاہم اس نے اپنے ان خیالات کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کیا اور اس کی بددلی صرف اس کی بداخلاقی کی صورت ہی گھر والوں کے سامنے آ سکی جسے گھر کا واحد کفیل ہونے

کے باعث خندہ پیشانی سے سہا جانے لگا۔ گھر میں چڑچڑے پن کے مظاہروں کے بعد ابرار نے دوسرا کام یہ کیا کہ ڈیوٹی سے آنے کے بعد اپنا زیادہ تر وقت باہر گزارنے لگا۔ باہر وقت گزاری کے لیے بہت سی مصروفیات تھیں۔ جلد ہی وہ ایک جال میں پھنس گیا اور یوں سولہ سال کی عمر میں گھر سے کمانے کے لیے باہر قدم رکھنے والا لڑکا جس نے کبھی غلط راہ پر چلنے کا سوچا تک نہیں تھا۔ پچیس سال کی اچھی خاصی سمجھ داری کی عمر میں بھٹک گیا اور ایسا بھٹکا کہ محض تین سالوں میں اپنا سب کچھ برباد کرنے کے بعد ڈاکٹر ہادی کے روبرو پہنچنے پر مجبور ہوگیا۔ ڈاکٹر ہادی نے پوری توجہ سے اس کا مسئلہ سنا اور سمجھا پھر علاج کے لیے آمادگی بھی ظاہر کردی۔ کامیابی کا امکان کتنے فیصد تھا، فی الحال انہوں نے اسے نہیں بتایا تھا۔ ان کے لیے بتانا ممکن بھی نہیں تھا لیکن وہ ان کے باقاعدہ مریضوں کی فہرست میں شامل ہوگیا تھا اور آج وہ اسے دوسری بار اپنے روبرو دیکھ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بیک وقت شرمندگی اور التجا تھی جو انہیں اکسا رہی تھی کہ وہ اس کے لیے جو کچھ کرسکتے ہیں ضرور کریں۔ ساتھ ہی ان کے ذہن میں بہت سے سوالات بھی تھے جن کے جوابات وہ شاید جانتے تو تھے لیکن حل کے طور پر معاشرے میں نافذ کرنے سے قاصر تھے۔

☆☆☆

اپنی شادی کے دن اب نہیں دور ہیں
لازمی ہے کہ تم مجھ سے پردہ کرو
میں اگر سامنے آ بھی جایا کروں
لازمی ہے کہ تم مجھ سے پردہ کرو

چار پانچ لڑکیوں کا وہ گروپ انزلہ کے کمرے میں براجمان تھا۔ ان لڑکیوں کی عمریں بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں تھیں اور وہ سب کی سب شوخ و شریر انداز میں یہ گیت گاتے ہوئے ایک موبائل فون کو اپنے قبضے میں کیے ہوئے تھیں۔ موبائل کی رنگ ٹون مسلسل بج رہی تھی اور اسکرین پر بصیر کالنگ کے الفاظ کے ساتھ پچیس چھبیس سالہ ایک خوبرو لڑکے کی مسکراتی ہوئی تصویر بھی جگمگا رہی تھی۔ زرد لباس پر زرد اور سبز امتزاج کا گوٹے والا دوپٹا اوڑھے انزلہ کی کوشش تھی کہ وہ ان لڑکیوں سے اپنا موبائل حاصل کرسکے لیکن شریر انداز میں گاتے ہوئے وہ اتنی تیزی سے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں موبائل منتقل کررہی تھیں کہ انزلہ کو اپنی کوشش میں کامیابی حاصل نہیں ہو پا رہی تھی۔ شریر لڑکیوں کا یہ گروپ اصل میں انزلہ کی قریبی سہیلیوں پر مشتمل تھا جو شادی والے گھر میں رونق لگانے تقریباً روز ہی چلا آتا تھا۔ انزلہ کل شام مایوں بیٹھ چکی تھی۔ اس کی سہیلیوں نے مایوں کی تقریب میں بھی بھرپور شرکت کی تھی اور رات گئے اپنے گھروں کو سدھارنے اور دن بھر آرام کرنے کے بعد اب شام میں پھر یہاں موجود تھیں۔ وہ انزلہ کے ساتھ اس کے کمرے میں بیٹھی کل کی تقریب کے بارے میں تبصروں کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھیں کہ انزلہ کا موبائل بجنے لگا۔ آنے والی کال انزلہ کے منگیتر بصیر کی تھی۔ لڑکیوں کو شرارت سوجھی انہوں نے اس سے موبائل جھپٹ لیا۔ اب انزلہ کی کوشش تھی کہ کسی طرح ان سے موبائل حاصل کرلے لیکن وہ ایسا ہونے نہیں دے رہی تھیں اور اس چکر میں کمرے میں خاصا شور شرابا ہوگیا تھا۔

اپنی شرارت میں مگن لڑکیوں کو اس بات کا بھی خیال نہیں رہا تھا کہ یہیں اسی کمرے میں انزلہ کی خالہ بھی موجود ہے۔ انزلہ کی خالہ نازلی تقریباً تیس بتیس سال کی تھی۔ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ شکل وصورت کے اعتبار سے مناسب لیکن واجبی سی پڑھی لکھی لڑکی تھی جسے گھریلو امور کے ساتھ ساتھ کسی بھی کام میں مہارت حاصل نہیں تھی۔ اصل میں نازلی ایب نارمل تو نہیں لیکن کچھ کم دماغ قسم کی لڑکی تھی اس لیے نہ تو پرائمری کلاسز سے آگے تعلیم حاصل کرسکی تھی اور نہ ہی کوئی ہنر سیکھنے میں دلچسپی لی تھی۔ اس کا وجود اہلِ خانہ کے لیے ایک طرح سے ناکارہ ہی تھا اسی لیے اسے کہیں بھی بالکل اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ انزلہ اور اس کی سہیلیوں نے بھی اس کی موجودگی کو بالکل نظرانداز کررکھا تھا اور وہ اس احتیاط سے کام نہیں لے رہی تھیں جس کا اپنے سے بڑوں کی موجودگی میں مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ شاید ان کے خیال کے مطابق نازلی اس بات کی اہل ہی نہیں تھی کہ ان کے درمیان جاری مذاق کو سمجھ سکے لیکن ایسا نہیں تھا۔ نازلی سب سمجھ رہی تھی۔ اسے انزلہ کی سہیلیوں کی شرارت اور انزلہ کے چہرے پر بکھرے حیا اور خوشی کے رنگوں سے مکمل واقفیت تھی اور یہ واقفیت اس کی حالت میں تغیر پیدا کرنے کا سبب بن رہی تھی۔ لڑکیوں کو خبر بھی نہیں ہوئی پہلے نازلی کے چہرے کا رنگ سرخ ہوا، پھر مٹھیاں بھنچیں اور آخر میں دانت کچکچاتے ہوئے وہ یکدم بھڑک اٹھی۔

''بند کرو یہ شور۔ کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے۔'' وہ اتنی بلند آواز میں چیخی کہ باورچی خانے میں کام کرتی اس کی بڑی

بہن صبیحہ یعنی انزلہ کی امی نے بھی واضح طور پر اس کے الفاظ سنے اور وہ ہاتھ میں موجود چھری اور آلو کو تیزی سے کچن کاؤنٹر پر رکھ کر فوری طور پر انزلہ کے کمرے کی طرف دوڑیں۔ انزلہ اور اس کی سہیلیاں نازلی کی دہاڑ پر لمحہ بھر کے لیے ساکت سی ہوگئی تھیں پھر سب سے پہلے انزلہ ہی حرکت میں آئی اور نازلی کی طرف رخ کر کے دانت کچکچاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''آپ کو ہمارے شور مچانے سے کیا پرابلم ہے خالہ؟''

''تمہارے شور سے میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔''

نازلی نے غصیلے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''تو آپ یہاں سے اٹھ کر جاسکتی ہیں۔ یہ میرا کمرا ہے اور یہاں میں اور میری سہیلیاں جو چاہے کرسکتی ہیں۔''

انزلہ کو اپنی سہیلیوں کے سامنے نازلی کے اس رویے کا دکھ تھا چنانچہ وہ رشتے اور عمر کا لحاظ کیے بغیر ترکی بہ ترکی اسے جواب دے رہی تھی۔ ممکن تھا کہ ردعمل میں نازلی مزید شور مچاتی لیکن عین وقت پر ہانپتی کانپتی صبیحہ وہاں پہنچ گئیں۔ صبیحہ کو کسی سے کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کچھ بھی جانے بغیر بہت کچھ جانتی اور سمجھتی تھیں چنانچہ اندر آتے ہی انہوں نے نازلی کا ہاتھ تھاما اور زور لگا کر اسے کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بہت ملائم لہجے میں بولیں۔

''آؤ نازلی...... تم میرے ساتھ میرے کمرے میں چلو۔''

''نہیں۔ مجھے یہیں بیٹھنا ہے۔'' نازلی نے مزاحمت کی۔

''تم ان بچیوں کے ساتھ بیٹھ کر کیا کرو گی۔ یہ یہاں شور شرابا کررہی ہیں۔ تم میرے ساتھ میرے کمرے میں چلو۔ وہاں اے سی چلا کر آرام سے لیٹ جانا۔'' صبیحہ نے ایک بار پھر اسے پچکارا۔

''انزلہ نے میرے ساتھ بدتمیزی کی ہے باجی۔''

بہن کے نرم رویے کو دیکھ کر نازلی کا تناؤ قدرے کم ہوا لیکن وہ بھانجی کی شکایت کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

''اس کو میں بعد میں ڈانٹوں گی۔ ابھی تم میرے ساتھ چلو۔'' صبیحہ نے بھی اصرار جاری رکھا اور ساتھ ساتھ اسے کھینچ کر اپنے ساتھ باہر لے جانے کی بھی کوشش کرتی رہیں۔ نازلی خاصی دھان پان سی تھی جبکہ صبیحہ اس کے مقابلے میں اچھے تن و توش کی مالک خاتون تھیں لیکن اس وقت نازلی کے جسم میں جو طاقت پیدا ہوگئی تھی وہ اس کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھیں اسی لیے مسلسل نرمی سے کام لے کر اسے رام کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔

''خالہ نے میری سہیلیوں کی انسلٹ کی ہے امی اور آپ بجائے انہیں کچھ کہنے کے مجھے ہی ڈانٹنے کی بات کر رہی ہیں۔'' انزلہ کا کچھ دیر پہلے کا خوش گوار موڈ برباد ہو چکا تھا اور اب وہ خفا سے لہجے میں ماں سے احتجاج کررہی تھی۔ اس کے اس احتجاج پر نازلی کے جسم کے تناؤ میں مزید اضافہ ہوگیا جسے صبیحہ نے پوری طرح محسوس کیا اور انزلہ کو آنکھوں اور ہاتھ کے اشارے سے صبر سے کام لینے کی نصیحت کرتی ہوئی بہن کو اپنے ساتھ لے کر باہر نکل گئیں۔

''آپ لوگوں کو میرا کوئی خیال نہیں ہے۔ کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا جب ہی تو آپ کے بچے میرے ساتھ بدتمیزی کرتے ہیں۔ چھوٹی باجی کے مدثر نے بھی اپنی منگنی والے دن میرے ساتھ بہت بدتمیزی کی تھی۔'' صبیحہ کے کمرے میں آنے کے بعد نازلی نے روتے ہوئے بہن سے احتجاج شروع کردیا۔ وہ اتنی شدت سے رو رہی تھی کہ صبیحہ کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا تاہم انہوں نے اپنی کیفیت کو قابو میں رکھا اور نازلی کو پچکارنے لگیں۔ بڑی دیر کی مغز ماری کے بعد انہیں اسے پُرسکون کرنے میں کامیابی حاصل ہوسکی۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب کو ڈھیلا کرنے کے لیے انہوں نے باقاعدہ اس کے سر پر تیل کی مالش کی، کنپٹیوں کو سہلایا، گردن کے مہروں کا مساج کیا تب کہیں جا کر وہ پُرسکون ہوئی اور ان کے بیڈ پر لیٹ کر سوگئی۔ اس کے سونے کے بعد صبیحہ نے دوبارہ کچن کا رخ کیا اور تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے کام نمٹانے لگیں کہ ابھی لاڈلی بیٹی کے موڈ کو صحیح کرنے کا مرحلہ باقی تھی۔ اور اس کا سب سے بہترین طریقہ یہی تھا کہ اس کی سہیلیوں کی شاندار خاطر مدارات کی جائے۔ وہ ڈنر کے لیے پہلے ہی دو تین ڈشز تیار کررہی تھیں۔ اب ان میں چکن تکّا کا مزید اضافہ کرلیا۔ اس حساب سے ان کا کام بھی مزید بڑھ گیا تھا لیکن وہ انزلہ کے لیے یہ سب کرسکتی تھیں۔ اکلوتی بیٹی اور وہ بھی دو دن بعد گھر سے رخصت ہونے کے لیے تیار ان سے ناراض رہے، یہ انہیں کیسے گوارا ہوسکتا تھا۔ انزلہ ان کی شادی کے پورے پانچ سال بعد دنیا میں آئی تھی اسی لیے دونوں میاں بیوی نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر پالا تھا۔

صبیحہ کے شوہر عرفان کا ابھی پچھلے سال ہی انتقال ہوا تھا اور اب وہ اور انزلہ خوشی کے اس موقع پر عرفان کی کمی کو بہت شدت سے محسوس کررہی تھیں۔ خاص طور پر انزلہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر باپ کو یاد کرکے رونے لگتی تھی۔ اب بھی انہیں معلوم تھا کہ سہیلیوں کے جانے کے بعد وہ اس بات کو لے کر گھنٹوں کے لیے رونے بیٹھ جائے

گی اس لیے وہ کوشش کر رہی تھیں کہ کسی طرح اس صورتِ حال سے بچ جائیں۔ کھانے کی تیاری کے دوران ہی انہوں نے سوفٹ ڈرنکس اور ہلکے پھلکے بیکری آئٹمز انزلہ کے کمرے میں پہنچا دیے۔ اس موقع پر وہ ہلکے پھلکے انداز میں انزلہ کی سہیلیوں سے نازلی کے رویے پر معذرت بھی کر آئیں جس پر لڑکیوں نے اٹس او کے اور کوئی بات نہیں آنٹی جیسے الفاظ کہہ کر اپنے ناراض نہ ہونے کا یقین دلا دیا لیکن انزلہ کا منہ ہنوز پھولا ہوا تھا۔ وہ وقتی طور پر اسے نظر انداز کر کے دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئیں۔ تقریباً تمام کام سمیٹنے کے بعد جب وہ دم کے قیمے کو کوئلوں کا دھواں دے رہی تھیں تو ان سے چھوٹی بہن ثروت اور بھانجی نرمین شاپنگ بیگز سے لدی پھندی چلی آئیں۔ وہ دونوں آج کل شادی کی وجہ سے ان کے گھر پر ہی رہ رہی تھیں اور صبیحہ کی دی ہوئی لسٹ کے مطابق خریداری کر کے واپس آئی تھیں۔

عرفان کی وفات کے بعد صبیحہ کو مالی طور پر کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ گھر ان کا ذاتی تھا جس کے اوپر کے دو پورشن کرائے پر چڑھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ دکانیں بھی تھیں جن کا کرایہ آتا تھا۔ بینک میں بھی معقول رقم موجود تھی جس کی مدد سے انہوں نے انزلہ کی شادی کی بھرپور تیاری کی تھی۔ شادی کے انتظامات میں ثروت اور اس کی فیملی نے ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ پھر کرائے دار بھی اچھے تھے جو ہر موقع پر کام آنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ یوں دیکھا جائے تو صبیحہ کو کوئی پریشانی نہیں تھی لیکن نازلی کی صورت ایک مستقل دردِسر ان کے ساتھ تھا۔ وہ والدہ کے انتقال کے بعد پچھلے پانچ سال سے ان کی ذمے داری بنی ہوئی تھی۔ وہ صرف تین بہنیں تھیں اور ان کے والد کا انتقال کئی سال قبل ہو چکا تھا اس لیے والدہ کے بعد ان بہنوں کو ہی نازلی کی ذمے داری اٹھانی تھی۔ ثروت کے اپنے چار بچے تھے اور شوہر بھی ذرا زیادہ نازک مزاج تھا اس لیے اس کے لیے نازلی کو اپنے ساتھ رکھنا ممکن نہیں تھا۔ یوں انہیں ہی اسے مستقل اپنے پاس رکھنا پڑا تھا۔ وہ اس ذمے داری کو اٹھانے سے انکاری نہیں تھیں لیکن بعض اوقات نازلی ان کے لیے بڑا مسئلہ بن جاتی تھی۔ اب بھی وہ اس کی وجہ سے پریشان تھیں اور مستقبل کے حوالے سے بھی انہیں کئی تفکرات تھے۔ انزلہ کی شادی کے بعد ظاہر ہے بصیر کا بھی ان کے گھر آنا جانا لگا رہتا اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ داماد کے سامنے نازلی کی وجہ سے کوئی سبکی اٹھانی پڑے۔

''کیا بات ہے باجی، آپ کچھ پریشان محسوس ہو رہی ہیں؟'' انہوں نے ڈنر کی تیاری مکمل ہونے کے بعد کھانا لگانے کی ذمے داری نرمین کو سونپی اور خود سر تھام کر ثروت کے قریب آبیٹھیں تو ثروت نے ان کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے ان سے پوچھا۔

''وہی نازلی کا مسئلہ ہے۔ اماں دنیا سے جاتے ہوئے میرے لیے ایک دردِسر چھوڑ گئی ہیں۔'' صبیحہ نے بیزاری سے جواب دیا۔ بڑی بہن کی حیثیت سے ان کے دل میں نازلی کی محبت تھی لیکن اپنی اولاد کے مقابلے میں وہ اسے کسی صورت ترجیح نہیں دے سکتی تھیں۔ اب بھی انہوں نے بڑی کوفت سے ثروت کو پورا قصہ کہہ سنایا۔

''یہ تو ہونا ہی تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ کسی بھی شادی یا منگنی کے موقع پر وہ ایسے ہی ری ایکٹ کرتی ہے۔ مدثر کی منگنی کا قصہ یاد نہیں ہے آپ کو۔ اس کی وجہ سے منگنی والے روز ہمارے گھر میں اچھی خاصی بدمزگی ہوگئی تھی۔'' ثروت نے اپنے بیٹے کی منگنی کے موقع کا حوالہ دیتے ہوئے نازلی کی عادت کا ذکر کیا۔

''یہ الگ مسئلہ ہے اس کا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس کی وجہ سے ہم اپنے بچوں کی شادیاں نہ کریں۔'' صبیحہ اچھی خاصی تلخ ہو رہی تھیں۔

''میں نے تو اماں سے بھی کہا تھا اور آپ سے بھی کئی بار کہہ چکی ہوں کہ اس کی کہیں شادی کر دیں۔ اس کا اصل مسئلہ شادی ہے۔ شادی ہو جائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا ورنہ وہ اسی طرح تنگ کرتی رہے گی۔'' ثروت نے کئی بار کا دیا ہوا مشورہ دہرایا۔

''اماں نے اس کی شادی اس لیے نہیں کی کہ ان کے خیال میں اس کے اندر اتنی اہلیت ہی نہیں ہے کہ وہ شادی شدہ زندگی کی ذمے داریاں اٹھا سکے۔ اماں کے اس خیال سے میں بھی بہت حد تک متفق ہوں۔ ایک گھر کی ذمے داری نبھانا کوئی مذاق نہیں ہے عورت کو ناکوں چنے چبانے پڑ جاتے ہیں اور ان محترمہ میں تو کوئی گن ہی نہیں ہے، اوپر سے عقل کی بھی پوری ہیں۔ بھلا کون آنکھوں کا اندھا ہوگا جو ایسی لڑکی سے شادی کرے گا۔ اگر کسی نے کر بھی لی تو چار دن میں میرے سر پر واپس مار کر جائے گا۔'' وہ اپنی جگہ بھری بیٹھی تھیں۔

''نہیں باجی، میں آپ سے اتفاق نہیں کروں گی۔ بے شک وہ عقل کی تھوڑی کم ہے لیکن اسے شادی کا جتنا

شوق ہے، اس شوق میں وہ بہت کچھ سیکھ لے گی۔ آپ میرا مشورہ مان کر تو دیکھیں پھر دیکھیے گا کہ نازلی کیسے اپنی شادی شدہ زندگی کو نبھاتی ہے۔'' ثروت نے اپنی بات پر اصرار کیا

''چلو میں مان جاتی ہوں اس کی شادی کے لیے...... لیکن رشتہ کہاں سے آئے گا؟'' انہوں نے نکتہ اٹھایا۔

''پہلے آپ اس کی شادی کے لیے اپنا ذہن تو بنالیں۔ رشتہ بھی کسی نہ کسی طرح مل ہی جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، پہلے میں ازلہ کی شادی سے فارغ ہوجاؤں پھر اس بارے میں کچھ سوچتی ہوں۔'' انہوں نے نیم آمادگی کا اظہار کر کے موضوع ختم کردیا اور بہن سے کل ہونے والی مہندی کے فنکشن کے سلسلے میں گفتگو کرنے لگیں۔ ازلہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس کی شادی کے انتظامات میں کہیں ایسی کوئی کسر رہ جائے کہ وہ اس کو باپ کی کمی سے منسوب کرسکے۔

☆☆☆

''ابرار......'' وہ بازار سے اماں کی دی ہوئی فہرست کے مطابق خریداری کرنے کے بعد واپس گھر کی طرف جارہا تھا کہ کسی نے اسے پیچھے سے پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ محلے ہی کا ایک لڑکا منیر تھا جو اس کی طرف آرہا تھا۔

''کہاں ہو یار آج کل ملتے ہی نہیں ہو؟'' قریب آنے پر منیر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے دوستانہ لہجے میں سوال کیا۔

''بس وہ مصروفیت زیادہ رہی۔ کئی دن سے فیکٹری میں اوور ٹائم لگ رہا تھا نا؟'' ابرار نے اسے جواب دیا۔ ایک محلے میں رہنے کے باوجود ماضی میں اس کی منیر سے دوستی نہیں تھی بلکہ سچ یہ تھا کہ نوعمری سے ہی وہ اتنا مصروف ہوگیا تھا کہ اس کے پاس منیر سمیت کسی بھی لڑکے سے دوستی کا وقت ہی نہیں ہوتا تھا لیکن تین سال قبل اس کے جن لوگوں سے تعلقات قائم ہونا شروع ہوئے تھے، منیر بھی ان میں سے ہی ایک تھا۔

''آج تو، تو گھر پر ہی ہے نا...... پھر آجا دس بجے تک مجو بھائی کے ہوٹل پر۔ میں ان ہی سے مل کر آرہا ہوں۔ بتا رہے تھے کہ کوئی بہت ہی دھانسو قسم کی سی ڈی لائے ہیں اور ہوٹل کے پیچھے والے کمرے میں سی ڈی دکھانے کا پورا انتظام بھی کرلیا ہے۔ میں تو ایڈوانس میں انہیں پیسے بھی دے آیا ہوں۔ تو چاہے تو ابھی سے بکنگ کروالے کیونکہ مجو بھائی جیسے اس نئی سی ڈی کی پبلسٹی کر رہا ہے، مجھے نہیں لگتا کہ دس بجے پہنچنے پر تجھے وہاں جگہ مل سکے گی۔'' ایک آنکھ کا کونا دبا کر اسے اطلاع فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ منیر نے مشورے سے بھی نوازا۔ اس کی بات سن کر ابرار کے پورے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ اتنے عرصے کے تجربے کے بعد وہ سمجھ سکتا تھا کہ مجو بھائی کس قسم کی سی ڈی لایا ہوگا اور اس سی ڈی کو دکھانے کے لیے اس نے کیسے انتظامات کر رکھے ہوں گے۔ جو لوگ اس قسم کی تفریح کے لیے اس کے ہوٹل آتے تھے، وہ انہیں ان کی پسند کے مطابق نشہ فراہم کرتا تھا۔ کبھی کبھی دیسی شراب کا بھی بندوبست ہوجاتا تھا۔ ابرار نشے کا عادی تو نہیں تھا لیکن کبھی کبھی چرس کا ایک آدھ سگریٹ پینے یا شیشے کا کش لگانے کا تجربہ کرلیتا تھا۔

''کھڑا کھڑا سوچ کیا رہا ہے۔ جلدی جا کر مجو بھائی سے بات کرلے۔'' اسے خاموش دیکھ کر منیر نے اسے ٹوکا اور وہ جو ڈاکٹر ہادی کی دی ہوئی ہدایات کے بارے میں سوچ رہا تھا، اپنے آپ کو مزید کنٹرول نہ کرسکا اور خود بخود اس کے قدم مجو بھائی کے ہوٹل کی طرف اٹھ گئے۔ یہ ایک گندا اور چھوٹا سا ہوٹل تھا جہاں چوبیس گھنٹے چائے کی فراہمی کے علاوہ دوپہر کے اوقات میں کھانا بھی مل جاتا تھا۔ کھانے میں عموماً چنے کی دال اور بھینس کے گوشت کی نہاری ملتی تھی جس کی کم قیمت کی وجہ سے آس پاس کی دکانوں اور ورکشاپس وغیرہ پر کام کرنے والے دوپہر کا کھانا مجو بھائی کے ہوٹل سے ہی لے کر کھاتے تھے۔ ہوٹل کے اس کاروبار کی آڑ میں مجو بھائی لڑکوں کو مخرب الاخلاق فلمیں دکھانے اور نشہ فراہم کرنے کا کاروبار بھی بڑی کامیابی سے چلا رہا تھا۔ اس کاروبار کی کامیابی میں رازداری اور اعتماد کے علاوہ علاقہ پولیس کو باقاعدگی سے دیے جانے والے نذرانے کا بھی بڑا دخل تھا۔

منیر سے ملنے والی اطلاع کو سن کر مجو کے ہوٹل کا رخ کرنے والے ابرار نے ایک کرسی سنبھالی اور دودھ پتی کے ساتھ کیک رس کا آرڈر دیا۔ وہ مجو بھائی کے طے کیے گئے طریقہ کار پر عمل پیرا تھا۔ آرڈر لینے والا لڑکا جب اس کا آرڈر پورا کرنے اس کی میز پر آیا تو اس نے خاموشی سے ایک نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ لڑکا اس سے واقف تھا۔ نوٹ لے کر اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا اور واپس چلا گیا۔ دوبارہ وہ ابرار کی میز پر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پرچی دبی ہوئی تھی جس پر ایک رقص کرتی ہوئی عورت کا عکس تھا۔ یہ ایک طرح سے آج کے شو کے لیے ابرار کا ٹکٹ تھا۔ ابرار نے اس سے پرچی لے کر پھرتی سے

اپنی جیب میں رکھ لی اور خاموشی سے اپنی چائے ختم کرنے لگا۔ ساڑھے سات بجے وہ سودا لے کر واپس اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔ اس کی ماں نے سودا ابّی کو تھمایا اور اس سے کچھ گفتگو کرنی چاہی لیکن وہ ماں کو ٹال کر سر درد کا بہانہ کرتے ہوئے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی اس کے اندر ایک عجیب سی جنگ ہونے لگی۔ ایک طرف وہ سنسنی تھی جو اسے مجو بھائی کے ہوٹل کے پچھواڑے رات چلنے والے شو کو دیکھنے کے لیے اکسا رہی تھی تو دوسری طرف ڈاکٹر ہادی کی ہدایات تھیں۔ انہوں نے اسے واضح طور پر بتا دیا تھا کہ علاج کی کامیابی کا دارومدار اس چیز پر ہے کہ سب سے پہلے وہ برے ماحول کو ترک کردے کیونکہ برا ماحول ہی بری عادات کا سبب بنتا ہے لیکن تین سالوں میں وہ جس علت کا شکار ہو چکا تھا اس سے جان چھوٹنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ اب بھی وہ بڑی دیر اسی کشمکش میں پڑا رہا۔ اس دوران میں بہن نے کھانا تیار کر کے دسترخوان پر لگا دیا۔ بلاوے پر وہ بھی کھانے کے لیے جا بیٹھا۔ بہن نے اس کی پسند کے مطابق ہری مرچوں کا قیمہ بھونا تھا جو خاصا خوش ذائقہ تھا لیکن وہ جس کیفیت میں مبتلا تھا، اس سے ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ ماں اپنے طور پر اصرار کرتی رہ گئیں اور وہ دسترخوان سے اٹھ گیا۔ اب پونے دس ہو چکے تھے۔ اس کے اندر جاری کشمکش نے ابھی تک اسے کسی حتمی فیصلے پر نہیں پہنچنے دیا تھا لیکن نو بج کر پچاس منٹ پر دروازے پر ہونے والی دستک نے فیصلہ کروا دیا۔ وہ منیر تھا جس نے دستک دینے کے ساتھ ہی اس کا نام لے کر پکارا بھی تھا۔ اگلے ہی پل وہ منیر کے ساتھ مجو بھائی کے ہوٹل کی طرف جا رہا تھا۔

''پہلے کبھی کسی کو دوست نہیں بنایا اور اب دوست بنانے کو ملا بھی تو یہ زمانے بھر کا آوارہ مزاج منیر۔ جب سے اس منیر سے دوستی ہوئی ہے رات دیر تک باہر رہنے لگا ہے اور گھر والوں سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔'' پیچھے اس کی ماں بڑبڑاتی ہی رہ گئی۔

''سنا ہے آج مجو بھائی بڑی دھانسو پکچر لگانے والا ہے اور اس حساب سے اس نے سارا انتظام بھی بڑا اے ون کیا ہے۔ لال پری بھی ہوگی آج تو لیکن تو، تو پیتا ہی نہیں ہے ورنہ سچ یہ ہے کہ لال پری سے پکچر کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔'' ابرار کے ساتھ چلتا منیر چٹخارے لے لے کر گویا فلم دیکھنے سے پہلے ہی اس کے مزے لے رہا تھا۔ بے حد کم شرح خواندگی رکھنے والے اس علاقے میں، جہاں لوگوں کی آمدنی بھی بہت محدود تھی مجو بھائی کا کاروبار اس لیے چل رہا تھا کہ کم آمدنی رکھنے والے غیر تعلیم یافتہ لڑکوں میں انٹرنیٹ کا استعمال عام نہیں تھا۔ چند گھروں میں یہ سہولت موجود بھی تھی تو گھر کا ماحول ممنوعہ سائٹس کھولنے کے لیے سازگار نہیں تھا کہ ابھی ان گھروں میں ''پرائیویسی'' کے لفظ سے آگہی نہیں تھی۔ دوسرے مجو بھائی کے ہوٹل میں پکچر کے ساتھ جو چرس اور شراب کا تڑکا لگتا تھا، وہ گھر میں نہیں مل سکتا تھا۔

''بس یار! کبھی ہمت ہی نہیں پڑی تمہاری لال پری کو منہ لگانے کی۔ شاید بچپن میں پڑھائے گئے سبق کا اثر ابھی تک دماغ پر موجود ہے۔'' اس نے دھیرے سے ہنستے ہوئے منیر کی بات کا جواب دیا۔

''تو ایک بار ہمت تو کر کے دیکھ۔ لال پری تو خود آدمی کو بہت بہادر بنا دیتی ہے۔'' منیر نے اسے حوصلہ دیا اور پھر ہوٹل تک پانچ چھ منٹ کے راستے میں شراب کے وہ وہ فوائد گنوائے کہ ابرار کی آنکھیں کھلی رہ گئیں اور وہ محسوس کرنے لگا کہ جس مسئلے کو لے کر وہ ڈاکٹر ہادی کے پاس گیا تھا، اس کا حل تو بہت سادہ سا ہے۔ چند گھونٹ شراب اور بس۔ مجو بھائی کے ہوٹل کے اس خاص کمرے میں قدم رکھنے تک وہ آج شراب کی ان خصوصیات کو آزمانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ فلم چلنی شروع ہوئی اور چرس کے ایک دو کش لگائے تو اس فیصلے نے حتمی شکل اختیار کرلی اور سب پینے والوں کے ساتھ اس نے بھی اپنے لیے شراب کا آرڈر دے دیا۔ ہوٹل کا چھوٹا اور مجو بھائی کا دستِ راست وہاں موجود تمام افراد کی فرمائشیں بامعاوضہ پوری کر رہا تھا۔ اسے بھی چند نوٹوں کے عوض شراب فراہم کر دی گئی۔ عجیب سی بو اور رنگت والے اس سیال کو اس کے نہایت خراب ذائقے کی وجہ سے حلق سے نیچے اتارنے کے لیے اسے خاصی جدوجہد کرنی پڑی لیکن وہ اسے علاج کے لیے پی جانے والی کڑوی دوا سمجھ کر پی گیا۔ پہلا جام ختم نہیں ہوا تھا کہ اس نے اپنے پیٹ میں گرہیں سی پڑتی محسوس کیں لیکن وہ اپنے عادی نہ ہونے کو سبب سمجھتا ہوا آہستہ آہستہ پیتا چلا گیا۔ جھٹکا تو تب لگا جب اس نے منیر اور اس جیسے چند عادی شرابیوں کو جو اس سے پہلے سے مے نوشی کر رہے تھے، پیٹ پکڑ کر الٹیاں کرتے دیکھا۔ فوراً ہی اخبارات اور ٹی وی کی زینت بننے والی چند خبریں اس کے دماغ میں گھوم گئیں لیکن اب دیر ہو چکی تھی اور وہ بھی دوسروں ہی کی طرح پیٹ پکڑے قے کر رہا تھا۔

☆☆☆

جدید ماڈل کے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظریں

جمائے آذر محمود بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹکے تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا۔ لیپ ٹاپ کو اس نے اپنے پیٹ پر رکھا ہوا تھا اور اتنے قریب سے اسکرین پر چلتے مناظر کو دیکھتے ہوئے وہ یوں ان سے لطف اندوز ہو رہا تھا جیسے خود بھی ان کا ایک حصہ رہا ہو لیکن جلد ہی وہ اس کیفیت سے باہر آنے لگا۔ وجہ جسم میں پیدا ہونے والی وہ بے چینی اور کھنچاؤ کی کیفیت تھی جو بالآخر بخار پر منتج ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ایسا بہت دنوں سے ہو رہا تھا۔ بیٹھے بٹھائے ہی دن کے کسی بھی حصے میں بخار چڑھ جاتا تھا جسے رفع کرنے کے لیے وہ کوئی بھی ٹیبلٹ لے لیتا تھا۔ اصل میں وہ ڈاکٹروں سے بھاگنے والا لڑکا تھا جس کی بچپن سے ہی ڈاکٹروں سے جان جاتی تھی۔ کڑوی دوائیں اور انجکشنز اس کے لیے ہمیشہ خوف کی علامت رہے تھے۔ بچپن گزرنے کے بعد وہ ضرورت پڑنے پر گولیاں تو پھر بھی کھانے لگا تھا لیکن انجکشن سے اب بھی اس کی جان جاتی تھی اور ان کے فیملی ڈاکٹر وقار حسین کو نہ جانے کیوں انجکشن لگانا اتنا ہی زیادہ پسند تھا اس لیے بار بار بخار چڑھنے کے باوجود وہ مسلسل ان سے رابطہ کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ آذر محمود، محمود ٹیکسٹائل ملز کے مالک محمود انجم کا تیسرے نمبر کا بیٹا تھا جو ایک نجی یونیورسٹی سے بی بی اے کر رہا تھا۔ اس کے دونوں بڑے بھائیوں نے بھی اسی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی اور اب باپ کے ساتھ اس کے کاروبار کو وسعت دینے میں لگے ہوئے تھے۔

محمود انجم نے بیٹوں کے فیلڈ میں آنے کے بعد انہیں الگ الگ یونٹ لگا کر دے دیے تھے جس کے وہ مالک ومختار تھے۔ آذر کے لیے بھی ان کی یہی منصوبہ بندی تھی کہ اسے بھی اس کے بھائیوں کی طرح الگ یونٹ لگا کر دے دیں گے۔ اس سلسلے میں وہ سائٹ ایریا میں ایک بند ہو جانے والی فیکٹری کی عمارت خرید چکے تھے اور آہستہ آہستہ اس عمارت کی مرمت اور ضروری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ مزید تعمیر کا عمل جاری تھا۔ عمارت تعمیر ہو جاتی تو محمود انجم وہاں مشینری فٹ کروانا شروع کر دیتے اور دونوں بیٹوں کی طرح آذر بھی ایم بی اے کرتے ہوئے ان کی نگرانی میں اس یونٹ میں جز وقتی کام شروع کر دیتا۔ محمود انجم کے اس طریقہ کار کا یہ فائدہ تھا کہ تعلیم مکمل ہونے تک بیٹے کی ٹریننگ بھی مکمل ہو جاتی تھی اور وہ آرام سے اپنے یونٹ کو سنبھال لیتا تھا۔ باپ کے طریقہ کار سے اچھی طرح واقف آذر کو معلوم تھا کہ اس کا مستقبل محفوظ ہے لیکن آنے والے وقت میں وہ بری طرح مصروف ہو جائے گا اس لیے موجودہ فرصت سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے دوست بھی اسی کی کلاس سے تعلق رکھنے والے بے فکرے لڑکے تھے اور آئے دن ان کے مختلف پروگرام بنتے رہتے تھے۔ دنیا کی ہر سہولت سے لیس یہ لڑکے تفریحِ طبع کے لیے اندرون و بیرون ملک گھومنے پھرنے کے علاوہ بھی بہت سے طریقے استعمال کرتے تھے جن میں انٹرنیٹ اور موبائل کے بے دریغ استعمال سے لے کر مختلف اقسام کی منشیات کے تجربات کرنا اور لڑکیوں سے فلرٹ کے علاوہ بازاری عورتوں سے تعلقات سمیت بھی کچھ شامل تھا۔ آذر ان تمام تفریحات میں سب سے آگے رہتا تھا لیکن آج کل طبیعت کی خرابی اس کے معمولات پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ اب وہ جلد ہی لیپ ٹاپ بند کر کے رکھنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کا جسم ٹوٹنے لگا تھا اور بخار میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا لیکن حسبِ عادت اس نے کوئی میڈیسن لینے سے گریز کیا اور یوں ہی بستر پر دراز ہو گیا۔ اس کی خواہش تھی کہ کچھ دیر آرام کرنے سے خود بخود ہی بخار اتر جائے اور اسے کوئی دوا نہ کھانی پڑی۔

آنکھیں بند کر کے لیٹے لیٹے اسے تقریباً آدھا گھنٹا گزر گیا لیکن وہ محسوس کر سکتا تھا کہ بخار کم ہونے کے بجائے مسلسل تیز ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ کوئی ٹیبلٹ کھا ہی لے۔ ٹیبلٹ کھانے کے ارادے سے وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھا اور سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر اس میں سے ٹیبلٹ نکالنی چاہی لیکن وہاں ٹیبلٹ کا پتا موجود نہیں تھا۔ اس نے چیزوں کو آگے پیچھے کر کے اسے تلاش کرنا چاہا اور ناکامی کی صورت میں جھنجلا گیا۔ جھنجلاہٹ کی اس کیفیت میں اسے یاد آیا کہ کل یونیورسٹی جاتے ہوئے اس نے آخری ٹیبلٹ کھانے کے بعد پتا ڈسٹ بن میں پھینک دیا تھا اس لیے اس کے دراز میں موجود ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے سوچا کہ کسی ملازم کو آواز دے کر اس سے میڈیکل اسٹور سے دوا منگوا لے لیکن اس میں یہ خطرہ تھا کہ ملازم کی زبانی اس کی طبیعت کی خرابی کا علم ممی کو ہو جائے گا اور ممی فوراً اپنے فیملی ڈاکٹر وقار حسین کو کال کر لیں گی۔ اس نے ملازم سے دوا منگوانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔ لیٹتے ہی اس کے سرہانے پڑا موبائل بجنے لگا۔ اس نے موبائل اٹھا کر کال کرنے والے کا نام دیکھا۔ اس کا سب سے قریبی دوست باسط کال کر رہا تھا۔ باسط اسی کی طرح اپر کلاس سے تعلق رکھتا تھا لیکن فرق یہ تھا کہ باسط کا خاندان جاگیرداری پس

منظر رکھتا تھا اور وہ لوگ محض پندرہ سال قبل ہی میدانِ صنعت میں وارد ہوئے تھے۔ باسط کے ڈیڈی اور اس کے ڈیڈی محمود انجم کے درمیان تھوڑی بہت پارٹنر شپ بھی تھی اس لیے بھی ان کی دوستی مزید گہری ہوگئی تھی۔

''کہاں ہے یار! آج یونیورسٹی بھی نہیں آیا۔ سونیا تجھے بہت مس کر رہی تھی۔'' اس نے جیسے ہی کال ریسیو کر کے ''ہیلو'' کہا، باسط نے حسبِ عادت بے تکلفی سے بولنا شروع کر دیا۔

''ہاں۔ میں کچھ ٹھیک فیل نہیں کر رہا تھا اس لیے آج آف کر لیا۔'' اس نے اپنی غیر حاضری کی وجہ بتائی۔

''چھ بجے تک خود کو ٹھیک کر لے۔ یار لوگوں نے مل کر میرے فارم ہاؤس پر پارٹی کا پروگرام بنایا ہے۔ سارا ارینجمنٹ ہوگیا ہے۔ فارم ہاؤس کال کر کے میں نے اشفاق سے ڈنر کے لیے کہہ دیا ہے۔ وہ باربی کیو کا ارینجمنٹ کر رہا ہے۔'' اس نے فارم ہاؤس پر مستقل رہنے والے اپنے ملازم کا نام لے کر بتایا اور اس کے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر لگاتار اپنی ہی بولتا چلا گیا۔ ''طارق نے کہا ہے کہ وہ اپنے ساتھ اے ون وہسکی کی بوتلیں لائے گا۔ میری دلشاد آنٹی سے بات ہوگئی ہے، وہ تارا اور سارہ کو ہمارے ساتھ بھیجنے کے لیے ریڈی ہوگئی ہے بس تو سمجھ لے آج کی پارٹی میں عیش ہی عیش ہونے ہیں۔'' باسط نے پروگرام کی جزئیات سے اسے آگاہ کیا۔ وہ دلشاد آنٹی نامی جس خاتون کا نام لے رہا تھا، وہ اصل میں طوائفوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتی تھی جس نے اپنا دھندا چلانے کے لیے کوٹھوں سے کوٹھیوں میں ہجرت کر لی تھی اور پرانے کام کو نئے ڈھنگ سے کر رہی تھی۔ اسی لیے اس کے گاہک بھی اسے بائی جی کے بجائے بڑی عزت سے آنٹی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

''میں چھ بجے تجھے تیرے گھر سے پک کر لوں گا۔ تو بالکل ریڈی رہنا۔ معلوم ہے نا کہ فارم ہاؤس تک پہنچنے میں ہی چار ساڑھے چار گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ مزید لیٹ نکلے تو پھر آدھی رات کو ہی وہاں پہنچیں گے۔'' باسط نے خود ہی ساری بات کی اور اس سے کوئی جواب طلب کیے بغیر لائن کاٹ دی۔ یقیناً وہ جلدی میں تھا کیونکہ میزبان کی حیثیت سے اسے بہت سے کام نمٹانے ہوں گے۔ باسط کے فارم ہاؤس پر پارٹی رکھنا آذر کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ دوست تین چار بار اکٹھے ہو کر وہاں تفریح کے لیے جا چکے تھے۔ طویل راستے کی بوریت سے بچنے کے لیے وہ ہمیشہ ایک ساتھ ایک ہی بڑی گاڑی میں سفر کرتے تھے اور سفر کے دوران بھی گپ شپ، میوزک، سگریٹ نوشی اور کھانا پینا چلتا رہتا تھا۔ فارم ہاؤس پر باسط کا ملازم اشفاق ان کی حسبِ خواہش عمدہ انتظام کر کے رکھتا تھا اور ایسا تابعدار تھا کہ ان کی کسی غیر اخلاقی حرکت کی رپورٹ کبھی باسط کے ڈیڈی تک نہیں پہنچاتا تھا۔ شاید وہ اس کے ڈیڈی کے بھی ایسے کئی کرتوتوں سے آگاہ تھا اور جانتا تھا کہ وہ لوگ جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، وہاں ایسی ہر حرکت کی غیر اعلانیہ اجازت ہوتی ہے اور والدین اپنے بچوں کی حرکتوں پر جان بوجھ کر چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔

فارم ہاؤس جانے کا پروگرام وہ لوگ ہمیشہ ویک اینڈ پر رکھتے تھے اور عموماً دن میں ہی تین سے چار کے درمیان وہاں جانے کے لیے روانہ ہو جاتے تھے لیکن آج کا پروگرام کچھ جلدی میں بنا تھا۔ کل ایک اتفاقی چھٹی اناؤنس ہوگئی تھی اور یونیورسٹی میں ہی باسط سے اس کے گروپ کے لڑکوں نے فارم ہاؤس جانے کی فرمائش کر دی تھی۔ اتنا ارجنٹ پروگرام طے پانے کی وجہ سے انتظامات کے لیے باسط کو تھوڑی مہلت درکار تھی اسی لیے اس نے روانگی کا وقت چھ بجے رکھا تھا اور یونیورسٹی سے غیر حاضر آذر کو بھی اس پروگرام کی اطلاع دے دی تھی۔ آذر نے یہ اطلاع سنی تو وہ بھی خوش ہوگیا اور وقتی طور پر اپنے بخار کو بھول کر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ وارڈ روب سے ایک لباس منتخب کرنے کے بعد اسے استری کرنے کے لیے ملازم کے حوالے کیا اور خود ایک بیگ میں اپنے کپڑوں اور شیونگ کٹ کے علاوہ ضرورت کی دیگر چیزیں رکھنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے گھڑی دیکھی تو ابھی صرف ساڑھے چار ہوئے تھے یعنی چھ بجنے میں پورا ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔ اپنی نڈھال سی طبیعت کو سنبھالنے کے لیے اس نے ایک گھنٹا آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اٹھنے کے بعد نہانے اور تیار ہونے کے لیے آدھا گھنٹا کافی ہوتا۔

موبائل پر ساڑھے پانچ کا الارم لگا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں پھر سردی محسوس کرتے ہوئے اپنے اوپر کمبل بھی تان لیا۔ ذرا ہی دیر میں اس پر غنودگی طاری ہوگئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔ نیند اتنی گہری تھی کہ لحہ بہ لحہ تیز ہوتا بخار بھی اسے نہیں جگا سکا اور وہ سوتا ہی رہا۔ اصل میں یہ نیند سے زیادہ نیم بے ہوشی کی کیفیت تھی، تب ہی وہ ساڑھے پانچ بجے الارم بجنے پر بھی نہیں جاگ سکا۔ ٹھیک چھ بجے باسط نے گیٹ پر پہنچ کر ہارن دیا لیکن وہ گیٹ پر نمودار نہیں ہوا اور ہارن سن کر باہر آنے والے چوکیدار نے بھی اس کی

طرف سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تو غصے میں اسے غائبانہ ہی سخت سست سناتا باسط کوٹھی کے اندر گھس کر دندناتا ہوا اس کے کمرے کی طرف بڑھا۔ باسط کا اس کے گھر بے تکلفانہ آنا جانا تھا اس لیے کسی ملازم نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ باسط اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اسے کمبل اوڑھ کر سوتا دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے اس کے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔

''ایڈیٹ مزے سے پڑا سو رہا ہے اور میں پاگل کا بچہ بن کر ٹھیک وقت پر پہنچ گیا ہوں۔'' بلند آواز میں بڑبڑاتے ہوئے اس نے آذر کے اوپر سے کمبل ایک جھٹکے کے ساتھ کھینچا۔ کمبل کھینچ لیے جانے کے باوجود آذر نے حرکت نہیں کی تو باسط کو کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ اس نے گھبرا کر اس کی کلائی پر ہاتھ رکھا تو لگا دہکتا کوئلہ تھام لیا ہے۔ اتنے تیز بخار پر باسط بوکھلا کر ملازم کو آواز دینے لگا۔ ملازم اس کے پکارنے پر اندر آیا تو اس نے اس سے آذر کی ممی کے بارے میں پوچھا۔ اس کے ڈیڈی اور بھائیوں کے بارے میں تو اسے علم تھا کہ وہ دن کی روشنی میں گھر کے اندر قطعی نہیں پائے جاتے۔

''بیگم صاحبہ تو جم گئی ہیں۔'' ملازم نے اس کے استفسار پر اطلاع دی۔

''اور ماریا؟'' باسط نے میڈیکل کالج میں زیر تعلیم آذر کی چھوٹی بہن کے بارے میں دریافت کیا۔

''پتا نہیں جناب۔ وہ ابھی تک گھر واپس نہیں آئیں۔'' ملازم نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ ''ٹھیک ہے تم لوگ آذر کو اٹھا کر میری گاڑی میں ڈالو۔ اس کی طبیعت بہت خراب لگ رہی ہے۔ اسے فوراً ہاسپٹل لے جانا ہوگا۔'' باسط جو اس دوران آذر کو دو تین بار پکار چکا تھا، اس کی طرف سے کوئی واضح ردعمل ظاہر نہ ہونے پر ملازم سے بولا تو وہ جلدی سے اپنے ایک اور ساتھی کو بلا کر اس کی مدد سے آذر کو باسط کی گاڑی میں منتقل کرنے لگا۔ باسط اس دوران اپنی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا تھا اور اپنے ساتھ موجود طارق کو آذر کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ ان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ آذر کو اس حال میں چھوڑ کر اپنے پروگرام پر عمل کر سکتے چنانچہ طارق فوراً ہی ان باقی دوستوں کو جنہیں انہیں آذر کے بعد پک کرنا تھا، موبائل پر صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔ ملازمین کے آذر کو گاڑی میں لٹاتے ہی باسط نے گاڑی دوڑا دی۔ اس کا رخ شہر کے مہنگے ترین اسپتال کی طرف تھا۔

☆☆☆

اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے پیٹ میں کسی گرائنڈر کا بلیڈ گھوم رہا ہے جو اس کی آنتوں کو کاٹتا جا رہا ہے۔ اتنی شدید اذیت سے وہ زندگی میں کبھی نہیں گزرا تھا۔ تکلیف اتنی زیادہ تھی کہ لگتا تھا موت اس سے بہتر ہوگی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے حلق سے چیخیں نکل رہی تھیں لیکن سرکاری اسپتال کے شعبۂ ایمرجنسی میں ہمہ وقت مچی رہنے والی ہلچل میں کون تھا جو اسے دلاسا دیتا۔ وہاں تو ہر طرف ہی چیخیں اور سسکیاں تھیں۔ اتفاق سے آج ایک بڑا روڈ ایکسیڈنٹ بھی پیش آ گیا تھا اور اس ایکسیڈنٹ کے زخمیوں کو بھی یہیں لایا گیا تھا۔ ڈاکٹرز اور پیرامیڈیکل اسٹاف بری طرح مصروف تھے اور اسے اور اس کے ساتھ یہاں لائے جانے والے افراد کو ابھی تک کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ زہریلی شراب پی کر اس حال کو پہنچنے والے آوارہ گردوں سے کسی کو ہمدردی بھی نہیں تھی اور ذہنوں میں کہیں یہ خیال تھا کہ ایسے بدکردار لوگوں کی جان بچانے کی کوشش میں وقت صرف کرنے کے بجائے دوسری زندگیوں کو بچانے کا کام ترجیحاً کیا جائے۔ اپنی زندگی کی سب سے بڑی تکلیف سے گزرتا ابرار اس وقت پچھتاوؤں کی زد میں تھا۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ وہ جس راستے پر نہ جانے کا عہد کر چکا تھا، شیطان کے بہکاوے میں آ کر دوبارہ اس پر کیوں چلا۔ برائی کی اس راہ پر چل کر وہ تو پہلے ہی اپنا بہت نقصان کر چکا تھا اور اب تو جان پر ہی بن گئی تھی۔ بے پناہ تکلیف سے گزرتے ہوئے اسے اپنی ماں کی یاد آئی۔ معمولی سا بخار ہو جانے پر بھی وہ کیسے اس کے لیے بے چین ہو جاتی تھی اور مستقل اس کے سرہانے جگہ سنبھال لیتی تھی۔ آج وہ ماں اس کے پاس نہیں تھی لیکن اسے خیال آ رہا تھا کہ ہر ایک کے سامنے اپنے بیٹے کے گن گانے والی ماں اس شرمندگی کو کیسے سہے گی جو اس واقعے کی خبر ہر طرف پھیل جانے کی صورت اس کے حصے میں آئے گی۔ وہ جو خاندان اور محلے میں اچھی شہرت رکھتا تھا اگر آج بچ گیا تو کیسے کسی سے آنکھ ملا سکے گا اور اگر مر گیا تو اس کی ماں کس دل سے اس کی میت پر رو سکے گی کہ وہ تو عزت کی موت بھی نہیں مرنے والا تھا۔ اپنی ہی موت کے خیال سے بہہ نکلنے والے آنسوؤں کی روانی میں یکدم ہی ایک بار پھر اسے زوردار ابکائی آئی اور بے پناہ اذیت کے ساتھ اس نے ایک اور الٹی کر ڈالی۔

مجو بھائی کے ہوٹل سے یہاں آنے تک وہ کئی بار الٹی

کر چکا تھا لیکن اس وقت جو الٹی ہوئی تھی اس کی اذیت ایسی تھی کہ اسے لگ رہا تھا، اس کی آنتیں بھی ساتھ ہی باہر آجائیں گی۔ دھندلائی آنکھوں سے اپنے اسٹریچر کے قریب پڑی گندگی میں اس نے خون کے چند لوتھڑوں کا اضافہ دیکھا اور سر اسٹریچر پر ڈال دیا۔ اب اس میں اتنی بھی سکت نہیں رہ گئی تھی کہ اپنی آنکھیں کھلی رکھ سکتا۔ آنکھیں بند کیے وہ موت کے فرشتے کا انتظار کرنے لگا لیکن ابھی فرشتۂ اجل کو اس کی روح قبض کرنے کا حکم نہیں ہوا تھا اس لیے ایمرجنسی میں موجود ایک ینگ ڈاکٹر اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے بعد اسے نہیں معلوم کہ اس کا معدہ واش ہونے اور دیگر ضروری ٹریٹمنٹ کے مراحل کیسے طے ہوئے۔ وہ دوبارہ ہوش میں آیا تو دائیں ہاتھ میں گلوکوز چڑھانے کے لیے لگائے گئے کینولا کی چبھن تھی اور آنکھوں کے سامنے آنسوؤں سے تر ماں کا دھندلایا ہوا چہرہ۔ اس نے تڑپ کر ماں کو پکارنا چاہا لیکن نقاہت اتنی تھی کہ آواز ہی نہیں نکل سکی لیکن ماں اس کی بے آواز پکار سے بھی کیسے بے خبر رہ سکتی تھی۔ وہ تیزی سے لپک کر اس کے قریب آئی اور اس کی نیم وا آنکھوں سمیت چہرے کے ایک ایک نقش کو چومنے لگی۔

''ابرار میرے بچے۔ یہ تجھے کیا ہوگیا۔ میرا اتنا نیک بیٹا کیسے اس حال کو پہنچ گیا۔ جلدی سے ٹھیک ہوجا بیٹا ورنہ تیری ماں کا دل بند ہوجائے گا۔'' اسے پیار کرنے کے ساتھ ساتھ وہ بے تحاشا رو بھی رہی تھی۔ ابرار کو یاد آیا کہ یہ وہ ماں ہے جس کی محبت کو اس نے غرض سمجھنا شروع کر دیا تھا اور یہ بدگمانی کرنے لگا تھا کہ ماں کو اس سے زیادہ اس کی کمائی کی ضرورت ہے لیکن اب اتنی بری طرح اپنے لیے تڑپتی ہوئی ماں کو دیکھ کر وہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ اس کی محبت غرض کی محبت ہے۔ ماں کی آنکھوں سے بہتے شفاف آنسوؤں میں آج اسے اس کی خالص محبت بھی صاف نظر آرہی تھی۔ شدید احساسِ ندامت سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''کیا بات ہے بیٹا، کہیں درد ہو رہا ہے کیا؟ میں ڈاکٹر کو بلا کر لاؤں بچے' ماں نے اس کے آنسو دیکھ لیے اور فوراً ہی تڑپتے ہوئے پوچھنے لگی۔ اس نے بڑی مشکل سے سر کو نفی میں جنبش دی اور اپنے ماتھے پر رکھا ماں کا ہاتھ تھام کر اسے چوم لیا۔

''مجھے پڑوس والے ناصر بھائی نے بتایا تھا کہ مجو کے ہوٹل میں زہریلی شراب پینے سے کئی لوگوں کی حالت بگڑ گئی ہے اور انہیں اسپتال لے جایا گیا ہے۔ انہوں نے اسپتال لے جائے جانے والوں میں تجھے بھی دیکھا تھا۔ سن کر مجھے یقین نہیں آیا کہ میرا بیٹا ایسی کسی جگہ پر بھی موجود ہوسکتا ہے لیکن ناصر بھائی نے یقین دلایا کہ انہوں نے تجھے اچھی طرح دیکھا تھا۔ میں بڑی مشکلوں سے اسپتال کا معلوم کر کے یہاں پہنچی ہوں۔ اتنے مریضوں میں تجھے تلاش کرنے میں بھی میری ٹانگیں ٹوٹنے لگیں۔ مجھے باہر کی دنیا کا کچھ اتا پتا بھی تو نہیں ہے۔ ایک نرس نے مدد کی تو تب کہیں جا کر تیرا پتا چلا سکی۔'' اس کے ہاتھ چومنے پر ماں کی آنکھوں میں خوشی جاگ اٹھی اور وہ اسے اپنے یہاں تک پہنچنے کی تفصیل سنانے لگی۔ اسے یکدم ہی احساس ہوا کہ وہ جو اتنے قریب فرشتۂ اجل کی آہٹیں سن رہا تھا، ماں کی دعاؤں کی وجہ سے زندگی کی طرف لوٹ آیا ہے۔ اس کی شرمندگی دوچند ہوگئی۔ وہ زبان سے تو ماں سے کچھ نہیں کہہ سکا لیکن دل میں عہد کرلیا کہ اس نئی ملنے والی زندگی میں اب ہمیشہ ماں کی قدر کرے گا۔ اسی وقت راؤنڈ پر موجود ڈاکٹر اس کے بیڈ کے قریب چلا آیا۔

''ہاں بھئی، کیا حال ہے تمہارا؟'' اس نے قدرے سخت لہجے میں ابرار سے دریافت کیا۔ ابرار نے سر کی ہلکی سی جنبش سے اپنے بہتر ہونے کا بتایا۔

''موت کے منہ سے نکل کر آئے ہو۔ اگر ذرا بھی عقل ہے تو اس ٹھوکر کو یاد رکھنا اور آئندہ ایسی لعنت کو ہاتھ نہیں لگانا۔ تم جیسے نوجوانوں کو دیکھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے کہ تم اپنی زندگیاں تو برباد کرتے ہی ہو، ساتھ میں بے چارے ماں باپ کو بھی مار ڈالتے ہو۔ ذرا دیکھو اپنی ماں کی حالت۔ تم سے زیادہ تو یہ بے چاری بیمار لگ رہی ہے۔'' عمر رسیدہ ڈاکٹر نے اس کے سرہانے موجود چارٹ دیکھتے ہوئے اسے بے نقط سنا ڈالی۔ اس کے پاس نظریں جھکا کر یہ سب سن لینے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا چیک اپ کیا اور ساتھ موجود نرس کو کچھ ہدایات نوٹ کروانے کے بعد آگے بڑھ گیا۔

ابرار کو دو دن مزید اسپتال میں گزارنے پڑے اور ماں سارا وقت اس کے ساتھ رہی۔ ان دو دنوں کے دوران اسے علم ہوگیا کہ اس کے ساتھ شراب نوشی کرنے والوں میں سے پانچ افراد اپنی جان سے چلے گئے ہیں۔ مرنے والوں میں منیر بھی شامل تھا۔ خود اس سمیت جو لوگ بچ گئے تھے، ان میں سے دو کی حالت اب بھی تشویش ناک تھی۔ مجو بھائی کے بارے میں علم ہوا کہ وہ گرفتاری کے ڈر سے روپوش ہے اور اس کی تلاش میں چھاپے مارے جارہے ہیں۔ اب یہ معلوم نہیں تھا کہ پولیس سچ مچ اسے

گرفتار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے یا پابندی سے ملنے والی رشوت کا حق ادا کرنے کے لیے محض ٹوپی ڈراما کیا جارہا ہے۔ ابرار اور اس سمیت بچ جانے والے افراد بہرحال زیرِحراست ہی تھے اور ان کے وارڈ کے باہر ہمہ وقت دو پولیس والے ڈیوٹی دیتے رہتے تھے۔ اسے اسپتال سے فارغ کیا گیا تو سیدھا تھانے جانا پڑا۔ اس پر غیرقانونی طور پر شراب پینے، ممنوعہ فلم دیکھنے اور منشیات استعمال کرنے کے الزامات تھے۔ ان الزامات کی وجہ سے وہ ایک رات تھانے میں رہا لیکن پھر ماں نے کسی طرح بھاگ دوڑ کر کے اس کی رہائی کا بندوبست کرلیا۔

گھر آنے کے کئی دن بعد اسے معلوم ہوا کہ اس بندوبست کو کرنے کے لیے ماں کو منجھلی بیٹی کے جہیز کے لیے رکھا گیا زیور فروخت کرنا پڑا تھا اور اس کی تھوڑی بہت کی گئی بچت بھی کام آگئی تھی۔ وہ ایک بار پھر احساسِ ندامت میں ڈوبنے لگا لیکن ماں مطمئن تھی کہ اسے اس کا بیٹا واپس مل گیا ہے۔ کمزوری کے باعث اسے فیکٹری سے تین دن مزید چھٹی لینی پڑی تھی۔ چھٹی کی وجہ شدید ڈائریا بتائی گئی تھی۔ فیکٹری گھر سے دور تھی اور اتفاق سے وہاں اس کے محلے کا کوئی دوسرا فرد ملازمت بھی نہیں کرتا تھا اس لیے اصل بات آسانی سے چھپ گئی۔ چھٹیاں ملنے میں بھی اس لیے دشواری پیش نہیں آئی کہ اس نے اشد ضرورت پر لی جانے والی ایک آدھ چھٹی کے علاوہ کبھی چھٹی نہیں کی تھی بلکہ وہ تو ہفتہ وار چھٹی والے دن بھی اکثر اوور ٹائم پر چلا جاتا تھا۔ چھٹی کے یہ دن اس نے گھر پر آرام کرتے اور خوب سوچ بچار کرتے ہوئے گزارے اور آخرکار اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اس نئی ملنے والی زندگی کو اب کسی صورت ضائع نہیں کرنا ہے اور کوشش کرنی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اب تک ہونے والے نقصانات کا ازالہ کردیا جائے۔ پوری طرح صحت یاب ہونے کے بعد ایک شام وہ گھر سے نکلا تو اس کا رخ ڈاکٹر ہادی کے کلینک کی طرف تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ مسئلے کے حل کے لیے کسی ماہر معالج سے ہی رابطہ کرنا ہوگا اور کوئی لال پری اس کے مسئلے کا حل نہیں نکال سکے گی۔

☆☆☆

آذر نے اپنے معالج کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ وہاں گہری سنجیدگی تھی اور وہ صاف محسوس کرسکتا تھا کہ ڈاکٹر کے پاس اس کے لیے کوئی بہت اچھی خبر نہیں ہے۔ اس روز غشی کی حالت میں باسط اسے شہر کے مہنگے ترین اسپتال لے کر آیا تھا۔ کوئی معمولی اسپتال ہوتا تو اس کا بخار اتار کر اسے واپس گھر بھیج دیا جاتا لیکن اس مہنگے اسپتال میں چونکہ مریض بھی صاحب حیثیت ہی آتے تھے اس لیے ان کی جیبیں ہلکی کرنے کے لیے علاج کے نام پر ڈھیروں ضروری اور غیرضروری ٹیسٹ کروا کر انہیں بھاری بل تھما دیے جاتے تھے۔ آذر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کے لاکھ نہ نہ کرنے پر بھی اس کے جسم میں سوئیاں چبھو کر اس کا خوب خون نکالا گیا اور ٹیسٹ کے لیے اسپتال کی ہی لیبارٹری میں بھیج دیا گیا۔ ابتدائی ٹیسٹوں میں ہی یہ بات سامنے آگئی کہ اس کے خون کے سرخ خلیات میں بے حد کمی آگئی ہے اور سفید خلیات بڑھتے جارہے ہیں۔ یہ ایک تشویش ناک صورت حال تھی اس لیے اس کے مزید کئی ٹیسٹ کروائے گئے۔ آذر کے لیے یہ ایک تکلیف دہ صورتِ حال تھی اور وہ کسی بھی طرح اسپتال سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن اس پر اپنے والدین اور بہن بھائیوں کا دباؤ تھا اس لیے اسے اسپتال میں ہی ٹھہرنا پڑا۔ تین دن بعد ہی اس کا کیس اسپتال کے قابل ڈاکٹروں میں سے ایک ڈاکٹر ہادی کو ریفر کردیا گیا اور ان ہی کے مشورے پر اس کے کچھ خاص ٹیسٹ کروائے گئے۔

آذر اسپتال میں خود کو دیے جانے والے ٹریٹمنٹ کے بعد خود کو بہت بہتر محسوس کررہا تھا اور سمجھتا تھا کہ اب اسے مزید اسپتال میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن ڈاکٹرز سمیت فیملی ممبرز کے بھی اصرار نے اسے وہاں سے ملنے نہیں دیا اور آخرکار اسے بتایا گیا کہ اس مرض کی تشخیص ہوچکی ہے اور آج ڈاکٹر ہادی اس سے میٹنگ کرکے خود اس کے مرض کے بارے میں بریف کریں گے چنانچہ اب وہ ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور منتظر تھا کہ وہ اسے وہ بات بتا دیں جس کے لیے اس ملاقات کا اہتمام کیا گیا ہے۔ چند لمحوں کے سکوت کے دوران ڈاکٹر ہادی نے نئے سرے سے اس کا جائزہ لیا۔ خوب صورت نقوش، اجلی رنگت، لمبے قد اور اپنی عمدہ ڈریسنگ کے ساتھ بلاشک وہ ایک ہینڈسم نوجوان تھا جس کی آنکھوں کے نیچے اگر معمولی سے سیاہ حلقے موجود نہ ہوتے تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ بیمار ہے اور بیماری بھی ایسی کہ انہیں خود اسے اس کے بارے میں بتاتے ہوئے افسوس ہورہا تھا لیکن بتانا تو تھا ہی، البتہ انہوں نے بتانے سے پہلے تھوڑی سی تمہید باندھنا ضروری سمجھا اور نرم لہجے میں بولے۔

''تمہیں شاید حیرت ہورہی ہو کہ میں نے تمہارے مرض کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے تمہیں کیوں کال کیا ہے تو اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ میرے ذاتی خیال کے

مطابق پیشنٹ کو اپنی کیس ہسٹری معلوم ہونی چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ اسے جو مرض ہے اس کے علاج کے لیے خود اسے ہی سب سے زیادہ کوآپریٹ کرنا چاہیے۔ ڈاکٹرز یا دوسرے لوگوں کی کوششیں اس کے کوآپریشن اور ول پاور کے بعد ہی کوئی رزلٹ دے سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری وجہ یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی شخص کا مرض اس کا ایک پرائیویٹ معاملہ ہے جسے وہ جس سے چاہے شیئر کرے یا نہ کرے اور بعض امراض تو ہوتے ہی ایسے ہیں جن کا معاشرے کے سامنے آنا آج بھی شرمندگی کا باعث بن جاتا ہے اور مریض کو ہمدردی کے بجائے طنز اور طعنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لیے بہتر یہی ہوتا ہے کہ خود مریض طے کرے کہ وہ اپنا مرض لوگوں پر ظاہر کرے یا نہ کرے۔ بدقسمتی سے تم جس مرض کا شکار ہو، اس کا شمار بھی ایسے ہی امراض میں ہوتا ہے۔ یوں تو اس مرض کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں استعمال شدہ سرنج کا استعمال، بلڈ ٹرانسفیوژن اور دیگر غلط عوامل شامل ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ بے راہ روی کو ہی سمجھا جاتا ہے اور اسی وجہ سے مریض کو معاشرے کے منفی رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسی لیے میں نے اپنے عمومی اصول کے علاوہ بھی یہی مناسب سمجھا کہ کسی بھی دوسرے فرد سے پہلے تمہیں تمہارے مرض سے آگاہ کردوں۔ اس کے بعد آگے کے مراحل بھی تمہاری مرضی کے مطابق طے کیے جائیں گے۔''

''مجھے کیا ڈائیگنوس ہوا ہے ڈاکٹر؟'' ساری تمہید سننے کے بعد آذر نے سرسراتی آواز میں مختصر سا سوال کیا۔

''ایڈز۔'' ڈاکٹر ہادی کے ایک لفظی جواب نے اس کے لیے زمین و آسمان کو ہلا کر رکھ دیا۔ کچھ دیر تو وہ اپنی جگہ سن سا بیٹھا رہ گیا۔ بزنس ٹائیکون محمود انجم کا بیٹا جو چند لمحے پہلے تک پورے اطمینان سے زندگی جی رہا تھا اور جانتا تھا کہ آگے ایک روشن و تابناک مستقبل اس کا منتظر ہے، اسے بتایا جا رہا تھا کہ اس کا کوئی مستقبل ہی نہیں رہا تھا اور بھیانک موت نے ایڈز کی شکل میں اس کے مضبوط، توانا اور خوب صورت جسم میں گھات لگائی تھی۔

''میں تم سے یہ نہیں کہوں گا جوان کہ ڈپریسڈ مت ہو کیونکہ اتنی بڑی بات سن کر کوئی بھی انسان خود کو ڈپریشن سے نہیں بچا سکتا لیکن میں تمہیں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ ڈپریشن کو خود پر اتنا حاوی نہیں ہونے دینا کہ تمہارا وجود موت سے پہلے موت کا شکار ہو جائے۔ تم ایک خطرناک مرض کا شکار ضرور ہوئے ہو لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ابھی تم زندہ ہو اور آدمی جب تک سانس لے رہا ہوتا ہے، اس کے لیے دنیا میں بہت کچھ موجود ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم اپنی بیماری کو مسلسل خود پر طاری کیے رکھنے کے بجائے ان چیزوں پر غور کرو جو تمہارے لیے باقی ہیں۔'' خاموشی کا ایک وقفہ گزرنے کے بعد ڈاکٹر ہادی نے مہربان لہجے میں اسے سمجھانا شروع کیا۔ الفاظ سے زیادہ ان کے لہجے سے اس کے دل پر اثر ہوا اور وہ اس لائق ہوسکا کہ کچھ بول سکے۔

''کیا ملک سے باہر میرا علاج ممکن ہے؟'' فطری طور پر اس کا پہلا سوال اپنی ذات کی بقا کے لیے ہی تھا۔

''بیرونِ ملک اس مرض پر کافی ریسرچ کی جارہی ہے۔ تم صاحب حیثیت ہو اس لیے ٹرائی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' انہوں نے اسے مبہم سا جواب دیا۔

''اوکے ڈاکٹر! میں اپنے اس مرض سے لڑنے کی پوری کوشش کروں گا۔ آئی ہوپ کہ آپ اسے سیکریٹ رکھیں گے اور بات ہم دونوں کے بیچ ہی رہے گی۔'' اس نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا لیکن اپنے بے پروا مزاج کے باوجود معاشرے کے منفی ردعمل سے خوف زدہ بھی تھا اس لیے ڈاکٹر ہادی سے یقین دہانی چاہی۔

''یہ تو میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تمہاری مرضی کے خلاف کسی کو کچھ نہیں بتایا جائے گا اور فیصلہ تمہیں کرنا ہوگا کہ تم کسی کو کچھ بتاتے ہو یا نہیں۔'' انہوں نے اسے جواب دیا۔

''تھینک یوسو مچ ڈاکٹر۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔''

ان کی طرف سے دوبارہ یقین دہانی کروائے جانے کے بعد اس نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھا۔ اپنی جگہ پر بیٹھے ڈاکٹر ہادی کی آنکھوں نے دیکھا کہ بے حد حوصلے کا مظاہرہ کرنے کے باوجود اس کے قدموں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔

☆☆☆

''اماں جاتے جاتے میرے لیے ایک بڑا عذاب چھوڑ گئی ہیں۔ نازلی تو میرے لیے ایسا کانٹا بن گئی ہے جسے میں نہ تو نگل سکتی ہوں اور نہ ہی اگل سکتی ہوں۔ یہ میرا ہی حوصلہ تھا جو میں نے اسے اتنے برس برداشت کرلیا لیکن اب میری برداشت بھی جواب دے گئی ہے۔ میں کہتی ہوں ثروت تم کچھ عرصے کے لیے اسے اپنے گھر لے جاؤ۔'' نہایت خراب موڈ کے ساتھ صبیحہ ٹیلی فون پر اپنی چھوٹی بہن سے مخاطب تھیں۔

''میری مجبوری تو آپ جانتی ہی ہیں باجی۔ اگر میں

نے نازلی کو گھر میں رکھنے کی بات کی تو آپ کے بہنوئی صاحب مجھے بھی گھر سے باہر کر دیں گے لیکن آپ یہ بتائیں کہ ہوا کیا ہے؟ انزلہ کی شادی کے بعد تو بس آپ دونوں ہی گھر پر ہوتی ہیں اور آپ کے ساتھ تو نازلی بالکل ٹھیک رہتی ہے۔'' ثروت نے فوراً ہی اپنی مجبوری کا اظہار کر کے دامن بچایا اور ساتھ ہی ان سے وجہ بھی پوچھ ڈالی۔

''میرے ساتھ وہ اس لیے ٹھیک رہتی ہے کہ میں اس کے پورے ناز نخرے اٹھاتی ہوں لیکن اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں اس کی وجہ سے مہمانوں کی طرح گھر آنے والی بیاہی بیٹی کو ناراض کر دوں۔ شادی سے پہلے میں پھر بھی انزلہ کو نازلی کے معاملے میں ڈانٹ ڈپٹ کر دبا لیتی تھی لیکن اب ایسا کیسے کر سکتی ہوں۔ صاف کہہ گئی ہے وہ کہ اگر نازلی کا یہی حال رہا تو وہ میکے آنا چھوڑ دے گی۔ اب تم ہی بتاؤ کیا میں بہن کے پیچھے اپنی اکلوتی اولاد سے ملنے سے بھی جاؤں۔ میں تو اپنی بچی کے آنے کے دن گنتی ہوں۔'' صبیحہ کے لہجے میں غم وغصے کی آمیزش تھی۔

''آپ یہ تو بتائیں کہ اصل قصہ کیا ہے؟'' ثروت نے ان کے خراب موڈ کی وجہ جاننے پر اصرار کیا۔

''وجہ کیا ہونی ہے۔ انزلہ دو دن کے لیے رکنے آئی ہوئی تھی۔ ابھی نئی نئی شادی ہے اور ماشاءاللہ سے بصیر اس کا خیال بھی بہت رکھتا ہے تو انزلہ جب بھی آتی ہے، سارا وقت اس کے گن گاتی رہتی ہے۔ دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے کے بغیر چین نہیں آتا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں ایک دوسرے کو فون کرتے رہتے ہیں۔ شام کو بصیر دفتر سے سیدھا گھر جانے کے بجائے انزلہ سے ملتا ہوا جاتا ہے۔ کبھی اپنے ساتھ باہر بھی لے جاتا ہے۔ کل بھی وہ اسے اپنے ساتھ ڈنر پر لے گیا تھا۔ انزلہ تیار ہو کر گھر سے نکلی تب بھی نازلی اسے اتنی بری طرح گھور رہی تھی کہ میرا دل ہی دہل گیا اور میں دل ہی دل میں دعائے خیر پڑھتی رہی۔ ڈنر کے بعد دونوں میاں بیوی ہنستے مسکراتے گھر واپس لوٹے تو میری جان میں جان آئی لیکن نازلی تو جلی بیٹھی تھی۔ بصیر انزلہ کو چھوڑ کر واپس جانے لگا تو اسے روک کر بولی کہ جب بیوی کے بغیر رہا نہیں جاتا تو اسے یہاں چھوڑ کر جانے کی کیا ضرورت ہے، اپنے ساتھ ہی واپس لے جاؤ.... بصیر بیچارہ تو اس کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے ہی کسی طرح بات سنبھالی اور اس سے کہا کہ نازلی مذاق کر رہی ہے لیکن تم ہی بتاؤ کہ اس طرح کب تک چلے گا۔ بصیر میرا اکلوتا داماد ہے۔ اس کا میرے گھر آنا جانا تو لگا ہی رہے گا۔ یہ اسی طرح الٹا سیدھا بولتی رہی تو انزلہ کے لیے مشکل ہو جائے گی۔ مردوں کے مزاج کا کچھ پتا تھوڑی ہوتا ہے کہ کب کس بات کا برا مان کر بیوی کی جان کے درپے ہو جائیں۔'' صبیحہ نے پورا قصہ سناتے ہوئے دکھڑا رو دیا تو ثروت نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔

''میں تو آپ سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں باجی کہ نازلی کا اصل مسئلہ شادی ہے۔ اسے شادی کا شوق ہے اسی لیے ایسی حرکتیں کرتی ہے اور انزلہ سے حسد کرنے لگی ہے۔''

''میری بچی سے حسد کر کے وہ میرے ہی گھر میں کیسے رہ سکتی ہے۔ آگے تو انزلہ لمبے عرصے کے لیے میرے پاس رکنے آنے والی ہے۔ اس کی سسرال میں رواج ہے کہ پہلی زچگی میکے میں ہوتی ہے اور ساتویں مہینے سے ہی بہو کو میکے رہنے بھیج دیتے ہیں۔ ظاہر ہے جب انزلہ یہاں اتنے لمبے عرصے کے لیے رکنے آئے گی تو بصیر میاں کا بھی آنا جانا لگا رہے گا اور یہ حسد کی ماری کچھ بھی الٹا سیدھا بولتی رہے گی۔ میری تو داماد کے سامنے ناک ہی کٹ جائے گی۔'' صبیحہ بری طرح فکرمند تھیں۔

''اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے باجی کہ اس وقت سے پہلے پہلے ہی نازلی کی کہیں شادی کر دی جائے۔ نہ وہ آپ کے گھر میں رہے گی اور نہ آپ کو تنگ کرے گی۔'' ثروت نے اپنا ہمیشہ دیا جانے والا مشورہ دہرایا۔

''ارے کہاں سے کر دوں اتنی ارجنٹ میں اس کی شادی۔ اتنے کم عرصے میں کوئی بر ڈھونڈنا آسان ہے کیا۔ پھر شادی کوئی ایسے ہی تو نہیں ہو جاتی۔ لاکھوں خرچ کرنے پڑتے ہیں اور میرے پاس تو سچ ہے کہ اب کچھ نہیں رہا ہے۔ بینک میں جو رقم بھی وہ میں نے انزلہ کی شادی پر خرچ کر ڈالی۔ اب جو کرایہ وغیرہ آتا ہے اس سے میں گھر کا خرچ چلاتی ہوں۔ ویسے بھی میرے پاس جو کچھ ہے، وہ انزلہ کے باپ کا چھوڑا ہوا ہے اور میرے پاس انزلہ کی امانت ہے۔ میں اس کا حق کسی اور پر لٹا کر امانت میں خیانت نہیں کر سکتی۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں اس کی شادی کرنا بھی چاہوں تو کیسے کروں؟'' انہوں نے بہن کے مشورے پر چڑ کر اپنی ساری مجبوریاں گنوا ڈالیں۔

''آپ خوامخواہ پریشان ہو رہی ہیں باجی۔ کوشش کریں تو کوئی ایسا لڑکا مل سکتا ہے جو سادگی سے لڑکی بیاہ کر لے جانے کے لیے راضی ہو۔ جو تھوڑا بہت خرچہ ہوگا اس کے لیے میں آپ کا ہاتھ بٹا دوں گی۔ اصل بات ہے لڑکا تلاش کرنا۔ آپ کہیں تو میں رشتے والیوں سے بات کرتی

ہوں۔ دو چار رشتے والیوں سے میری جان پہچان ہے۔

''ٹھیک ہے۔ تم بات کرلو۔ اب میں اس مصیبت کو زیادہ عرصے اپنے سر پر برداشت نہیں کرسکتی۔'' نازلی سے بیزار صبیحہ نے جب دیکھا کہ بغیر خرچ کیے وہ اپنی جان چھڑا سکتی ہیں تو ثروت کو گرین سگنل دے ڈالا۔

☆☆☆

''تم لندن جانا چاہتے ہو...... لیکن کیوں؟'' محمود انجم نے حیرت سے بیٹے کی شکل دیکھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نمایاں ہونے لگے تھے اور وہ پہلے کے مقابلے میں خاصا کمزور ہوگیا تھا۔

''میں اس سے پہلے بھی تفریح کے لیے ملک سے باہر جاتا رہا ہوں۔ پہلے کبھی تو آپ نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا؟'' اس نے بے نیازی سے ان کی ''کیوں'' کا جواب دیا۔

''پہلے تم ویکیشنز میں اپنے دوستوں کے ساتھ پروگرام بنایا کرتے تھے اس لیے مجھے وجہ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی لیکن اس وقت سیمسٹر کے دوران یہ فیصلہ مجھے سمجھ نہیں آیا۔ ٹھیک ہے میں نے تم بھائیوں پر کبھی پابندی نہیں لگائی اور وہ سب پروائڈ کیا جو تم لوگوں نے مجھ سے مانگا لیکن یوں سیمسٹر چھوڑ کر جانے کی وجہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ ابھی تو تم ہاسپٹل سے آئے ہو، بیماری کی وجہ سے بھی تمہاری یونیورسٹی سے خاصی چھٹیاں ہوگئی ہیں اور اب تم پتا نہیں کتنے دنوں کے ٹور پر لندن جانا چاہتے ہو...... تو کیا میرا رائٹ نہیں بنتا کہ میں تم سے وجہ پوچھوں؟'' محمود انجم نے اس کے اعتراض کا جواب دیا۔

''پلیز ڈیڈی! میں کوئی اسکول گوئنگ چائلڈ نہیں ہوں جسے آپ اس کی چھٹیوں کا حساب کتاب بتا رہے ہیں۔ آئی کین مینیج ایوری تھنگ...... آپ بس میرے اکاؤنٹ میں رقم ٹرانسفر کروادیں۔'' اس کے لہجے میں چڑچڑاہٹ آگئی جسے محسوس کر کے محمود انجم کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے اپنی اولاد کو ہر طرح کی سہولت اور آزادی دے رکھی تھی لیکن وہ یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ اولاد ان سے برابری کی سطح پر بات کرے اسی لیے اس کے انداز پر ان کا موڈ خراب ہونے لگا۔ ان کے ساتھ بیٹھی ان کی بیگم نے یہ بات بخوبی محسوس کی اور ان کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود بیٹے سے مخاطب ہوئیں۔

''آذر...... مائی ڈارلنگ۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں کچھ عرصے تک اپنا پروگرام پوسٹ پون کردینا چاہیے۔ ابھی تم بیماری سے اٹھے ہو اور اتنے ویک ہو رہے ہو۔ اکیلے ملک سے باہر جانا تمہارے لیے مناسب نہیں ہوگا۔''

''پلیز ممی! میرے ساتھ چھوٹے بچوں کی طرح بی ہیو مت کریں۔ اپنی کنڈیشن میں آپ سے بہتر جانتا ہوں اسی لیے میں نے کچھ عرصے کے لیے لندن جانے کا فیصلہ کیا ہے اور میں آپ لوگوں سے کو آپریٹ کے سوا کچھ نہیں چاہتا ہوں۔'' اس نے ماں کے پچکارنے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنا حتمی فیصلہ سنایا اور پیر پٹختا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔

''اسے کیا ہوگیا ہے...... یہ اس طرح کیوں بی ہیو کر رہا ہے؟'' خجل سی بیگم محمود نے شوہر کے سامنے حیرت کا اظہار کیا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ آذر کے اس رویے پر محمود انجم کے غصے کا گراف کچھ اور بلند ہوجائے گا لیکن ایسا نہیں تھا۔ ان کے اندیشے کے برخلاف محمود انجم سوچ میں پڑ گئے تھے۔ انہوں نے آذر کے انداز کا غیر معمولی پن بھانپ لیا تھا۔ وہ ایک کامیاب بزنس مین تھے اور ان کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ سامنے والے کی نفسیات کو بہت آسانی سے سمجھ لیتے تھے۔ آذر کے بارے میں بھی انہیں اندازہ ہوگیا کہ وہ ذہنی طور پر الجھا ہوا ہے اور جب انہوں نے اس کی الجھن کی وجہ تلاش کرنی چاہی تو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد سے کچھ بجھا بجھا سا ہے جسے بیماری کے بعد کی کیفیت جان کر ابھی تک کسی نے توجہ نہیں دی ہے۔ وہ آذر کی فطرت سے بھی واقف تھے۔ وہ اگر کسی بات کو ایک بار چھپا لینے کا فیصلہ کرلیتا تھا تو پھر کسی کی سرتوڑ کوشش بھی اس کی زبان نہیں کھلوا سکتی تھی۔ یعنی اب انہیں جو کچھ معلوم کرنا تھا، اپنے طور پر ہی معلوم کرنا تھا۔

''آذر کو ہاسپٹل سے جو فائل ملی تھی، وہ کہاں ہے؟'' انہوں نے خاصی دیر کی سوچ بچار کے بعد تشویش کے ساتھ اپنی بیگم سے دریافت کیا۔

''اس کے اپنے پاس ہی ہے۔ آپ اس کی عادت جانتے ہیں۔ وہ اپنی پرسنل چیزیں اپنی اسٹڈی میں ہی رکھنا پسند کرتا ہے لیکن آپ کو اس وقت وہ فائل کیسے یاد آگئی؟'' نصرت محمود نے ان کی بات کا جواب دیتے ہوئے آخر میں ذرا حیرت سے پوچھا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ ایک بار ڈاکٹر وقار کو بھی اس کی رپورٹس دکھا دوں۔ وہ ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں اور ان کا ہر ایک کی صحت کے بارے میں مکمل آگاہ رہنا ضروری ہے۔'' انہوں نے بیوی سے اپنی تشویش شیئر کرنے کے بجائے بہانہ بتایا۔

''یہ بات تو میں نے خود بھی آذر سے کہی تھی لیکن اس نے مجھے ٹال دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر وقار کو زیادہ پسند نہیں کرتا اور اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ ان سے دور رہے۔'' نصرت نے ایک کھلی حقیقت بیان کی تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔

''کیا بات ہے محمود...... آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟'' اس بار نصرت چونک گئی۔

''نہیں بس سوچ رہا تھا کہ آذر کو اچانک لندن جانے کا خیال کیسے آ گیا۔'' انہوں نے ایک بار پھر بیوی کو ٹالا۔

''اس کا پتا تو ہے آپ کو کہ کتنا موڈی ہے، کسی بھی وقت کچھ بھی سوجھ جاتا ہے۔ آپ ٹینشن مت لیں۔ میں اسے سمجھاؤں گی۔'' نصرت نے انہیں تسلی دی تو وہ بظاہر ریلیکس ہو گئے لیکن اب ان کے اندر جو ایک الارم سا بج رہا تھا اس نے انہیں اس مسئلے سے چشم پوشی نہیں کرنے دی اور تنہائی ملتے ہی انہوں نے تھوڑی سی کوشش سے ڈاکٹر ہادی کا پرسنل نمبر حاصل کرنے کے بعد انہیں کال کی۔

''جی محمود انجم صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' ان کے مکمل تعارف کروانے کے بعد ڈاکٹر ہادی نے ان سے دریافت کیا۔

''میں آپ سے آذر کی صحت کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ کیا وہ کسی مسئلے کا شکار ہے؟'' انہوں نے اپنے ذہن میں کانٹے کی طرح اٹکا سوال ان سے کیا۔ اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر ہادی کچھ دیر خاموش رہے پھر آہستہ سے بولے۔

''یہ تو آپ کو آذر سے ہی پوچھنا چاہیے تھا محمود صاحب۔ وہ آپ کو اس سوال کا زیادہ بہتر جواب دے سکتا ہے۔''

''اگر آذر سے اس سوال کا جواب مل سکتا تو میں کبھی آپ سے رابطہ نہیں کرتا۔ پلیز! مجھے بتائیں کہ میرے بیٹے کے ساتھ کیا پرابلم ہے؟'' ڈاکٹر ہادی کے لہجے اور انداز سے انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ آذر کے سلسلے میں ان کی تشویش غلط نہیں تھی اس لیے قدرے ہیجانی لہجے میں پوچھا۔

''سوری محمود صاحب! میں اپنے پیشنٹس کے لیے ایک امین کی حیثیت رکھتا ہوں اور ان کی مرضی کے بغیر ان سے متعلق کوئی بھی معلومات کسی سے شیئر نہیں کر سکتا۔'' ڈاکٹر ہادی نے معذرت کی۔

''میں کسی نہیں ہوں۔ میں آذر کا باپ ہوں۔'' ان کی آواز خود بخود ہی بلند ہو گئی۔

''تو پھر آپ اپنے بیٹے کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اس کے ساتھ ایسی ریلیشن شپ ڈیولپ کریں کہ وہ آپ سے اپنا پرابلم شیئر کر سکے۔ اس کی اجازت کے بغیر میں تو آپ کو کچھ بھی بتانے سے معذور ہوں۔'' ڈاکٹر ہادی نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں انہیں دوٹوک جواب دیا تو انہیں خاموشی اختیار کرنی پڑی اور احساس ہو گیا کہ وہ خوامخواہ ڈاکٹر ہادی پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ وہ واقعی مجبور تھے اور اپنی پیشہ ورانہ دیانت داری نبھا رہے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر سے معذرت کر کے فون بند کر دیا اور بے حد تفکر سے آذر کے متعلق سوچنے لگے۔ سوچتے ہوئے انہیں ڈاکٹر ہادی کا مشورہ یاد آیا۔ انہوں نے انہیں آذر کا اعتماد حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا اس مشورے پر ذرا سا غور کرنے کے بعد وہ اس کے درست ہونے کے قائل ہو گئے اور اس سلسلے میں اپنا لائحہ عمل طے کرنے لگے تو سب سے پہلا فیصلہ یہ ہوا کہ آذر کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے۔ یوں اگلے ہی لمحے وہ اپنے چیف اکاؤنٹنٹ سے رابطہ کر کے اسے آذر کے اکاؤنٹ میں ایک بڑی رقم ٹرانسفر کرنے کے سلسلے میں احکامات دے رہے تھے۔

☆☆☆

وہ مغرب کی نماز پڑھ کر گھر واپس آ رہا تھا کہ گلی میں کھڑی منیر کی ماں پر نظر پڑ گئی۔ بے حد میلے کپڑوں اور الجھے ہوئے بالوں کے ساتھ وہ بے قراری سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

''السلام علیکم خالہ۔'' قریب سے گزرتے ہوئے ابرار نے اس ابتر حلیے والی عورت کو سلام کیا۔ اسے اپنے سلام کا جواب نہ ملا اور منیر کی ماں مہر بہ لب آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھتی رہی۔ وہ دکھی سا آگے بڑھ گیا۔ منیر کی ماں کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ٹنک سک سے رہنے والی خاصی دبنگ عورت تھی اور اس کے زبان درازی اور جھگڑالو پن کے قصے آئے دن سننے میں آتے رہتے تھے لیکن جوان بیٹے کی موت کے بعد وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی تو ٹنک سک سے رہنے کا کیا سوال تھا کہ اسے تو اپنا ہی ہوش نہیں رہا تھا۔ قینچی کی طرح چلنے والی زبان بالکل بند ہو گئی تھی اور وہ کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ صرف بے قرار آنکھیں تھیں جو ہر پل بولتی تھیں اور ہر ایک سے سوال کرتی تھیں کہ اس کا بیٹا کہاں ہے؟

ایک دبنگ عورت کا یہ حال اپنے پرائے سب کو دکھی کر دیتا تھا۔ ابرار کا دل بھی بری طرح افسردہ ہو گیا اور خیال آیا کہ اگر اس روز زہریلی شراب پی کر منیر کی طرح وہ بھی

جان سے چلا جاتا تو اس کی ماں کا کیا حال ہوتا۔ وہ تو شاید منیر کی ماں سے بھی زیادہ برے حال میں ہوتی اور اس کی بہنیں جو اس پر جان چھڑکتی تھیں کیسے اس کی موت کا صدمہ سہتیں۔ اس سے وابستہ ان خواتین کو تو اس پر گزری افتاد نے ہی نچوڑ ڈالا تھا اور گھر آنے کے بعد ابھی تک اس کا..... بے حد خیال رکھا جا رہا تھا۔ شادی شدہ بہن بھی اسے دیکھنے کے لیے آئی تھی اور آنسو بہاتی ہوئی اس بات پر شکر ادا کرتی رہی تھی کہ اللہ نے اس کے بھائی کی جان بچالی۔ اس نے ایک بار بھی اس سے یہ شکوہ نہیں کیا تھا کہ بھائی تمہاری حرکت نے سسرال میں میری ناک کٹوادی ہے۔ یہ بات وہ خود سمجھتا تھا کہ بہن کے بے حد تیز سسرال والوں نے اس بات پر اس کا کیسا جینا حرام کیا ہوگا اور شوہر نے سیکڑوں طعنے دیے ہوں گے کہ جس بھائی پر اتنا مان تھا، وہ کردار کا کیسا ہلکا نکلا۔ یہ سب تھا لیکن پھر بھی وہ اس حساب سے خوش قسمت تھا کہ اللہ نے اسے اپنی غلطی سدھارنے کا ایک موقع دے دیا تھا۔

اسے اس کی اس خوش قسمتی کا احساس دلانے والے ڈاکٹر ہادی تھے۔ وہ جب بہت ٹوٹا پھوٹا اور شرمندہ سا دوبارہ ان کے پاس گیا تھا تو انہوں نے بہت سکون سے اس کا سارا احوال سنا تھا اور کسی بھی قسم کے طنز یا طعنوں کا نشانہ بنانے کے بجائے یہ احساس دلایا تھا کہ جو گزر چکا اسے بدلا نہیں جاسکتا۔ ہاں آنے والے وقت کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ ان ہی کے مشورے پر اس نے پانچوں وقت کی نماز پابندی سے پڑھنی شروع کردی تھی کیونکہ ان کے مطابق عبادت انسان کو اندر سے مضبوط کر کے نفسیاتی سہارا دیتی ہے اور پانچوں وقت مسجد جانے والے قدموں کو برائی کی راہ پر جاتے ہوئے خود بھی حیا آتی ہے۔ اس نے اس بار اپنے معالج کے کسی مشورے پر عمل کرنے میں کوتاہی نہیں کی تھی اور خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ نمازوں کی پابندی کا اسے ایک ضمنی فائدہ مزید حاصل ہو رہا تھا۔ گزرے واقعے سے محلے میں اس کا خراب ہوجانے والا امیج اس کے نمازی ہوجانے سے بتدریج بہتر ہوتا جارہا تھا اور لوگ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ ابرار کے قدم وقتی طور پر بہک گئے تھے ورنہ حقیقت میں وہ ایک اچھا لڑکا ہے۔

''ابرار ادھر آبیٹا۔ تجھ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' گھر پہنچ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا تو ماں نے اسے آواز دی۔ وہ فوراً ماں اور بہنوں کے مشترکہ کمرے میں داخل ہوگیا۔ ماں اس وقت وہاں اکیلی تھی کیونکہ دونوں بہنیں مل جل کر باورچی خانے میں رات کا کھانا تیار کر رہی تھیں۔

''آ ادھر بیٹھ جا۔'' وہ اندر پہنچا تو ماں نے اپنے قریب ہی پلنگ پر اس کے لیے جگہ بنائی۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ دیکھو ماں کیا کہتی ہے۔

''میں سوچ رہی ہوں بیٹا کہ تیری شادی کردوں۔ رئیسہ نے مجھے ایک لڑکی کی تصویر بھی دی ہے۔ مجھے تو اچھی لگی ہے۔ تو دیکھ لے اگر تجھے پسند آتی ہے تو میں بات آگے بڑھاتی ہوں۔'' ماں نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک لفافہ برآمد کر کے اس کی طرف بڑھایا لیکن وہ اسے تھامنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھا سکا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ ماں کی اس کایا پلٹ کی وجہ کیا ہے۔ وہ جو بیٹیوں سے پہلے اکلوتے بیٹے کی شادی کرنے کا سوچتی بھی نہیں تھی، اب اسے نکیل ڈالنے کے لیے یہ قدم اٹھانے کو تیار ہوگئی تھی لیکن اب..... اب وہ کیسے راضی ہوسکتا تھا۔ اسے راضی ہونے کے لیے تو ابھی نہ جانے کتنا وقت لگنا تھا۔

''ایسے کیا گپ چپ بیٹھا ہے۔ دیکھ نا تصویر ...... بہت پیاری لڑکی ہے۔'' اسے ساکت بیٹھا دیکھ کر ماں نے ٹوکا۔

''خالہ کو یہ تصویر واپس کردو ماں۔ میرا ابھی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' اپنے اندرونی کرب کو چھپاتے ہوئے اس نے ماں کو انکار کیا۔

''کیوں ارادہ نہیں ہے۔ اچھا ہے نا تیری بیوی آجائے گی تو تیرا گھر میں دل لگ جائے گا۔'' ماں نے اصرار کیا۔

''میں پہلے بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہوں۔'' اس نے بہانہ بنایا جس پر ماں نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ''ان کا بھی کچھ نہ کچھ ہوجائے گا۔ جس مالک نے پیدا کیا ہے، وہی انتظام بھی کردے گا۔'' حقیقتاً اب اسے بیٹیاں بیاہنے سے زیادہ بیٹے کو غلط راہ پر چلنے سے بچانے کی فکر تھی۔

''نہیں، میں نے کہہ دیا نا کہ میں پہلے بہنوں کی شادی کروں گا۔'' اس نے سختی سے اپنا ارادہ دہرایا۔

پھر مزید بولا۔ ''اب تم بھی اپنی ضد چھوڑ دو ماں اور چھوٹی کے لیے آنے والے رشتوں میں سے کسی اچھے رشتے کے لیے ہاں کردو۔ منجھلی کے چکر میں اسے بٹھائے رکھنا مناسب نہیں ہے۔ منجھلی کا وقت آئے گا تو اس کی بھی کہیں نہ کہیں ہو ہی جائے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ اب میں ایسا ہی کروں گی پر تو بھی تو

اپنی سوچ۔ شادی نہیں کرنا مگر بات پکی کر دیتی ہوں تیری۔ شادی دو تین سال بعد جب تو کہے گا تب کر دوں گی۔'' وہ اسے کسی نہ کسی کھونٹے سے باندھنا چاہتی تھی۔

''نہیں، ابھی کچھ بھی نہیں۔ کسی کی بیٹی کو اتنے لمبے عرصے کے لیے خود سے باندھے رکھنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ میرا کیا معلوم کہ میں کبھی شادی کرتا بھی ہوں یا نہیں۔'' وہ بے ساختہ ہی ایک تلخ جملہ کہہ گیا۔

''اے ہے۔ ایسا کیوں بول رہا ہے؟ کیوں نہیں کرے گا تو شادی؟'' ماں اس کی بات پر دہل کر رہ گئی۔

''پریشان مت ہو، بس ایسے ہی زبان سے ایک بات نکل گئی تھی۔'' وہ ماں کی ''کیوں'' کا جواب تو نہیں دے سکتا تھا چنانچہ اسے تسلی دی۔ پھر وہ وہاں مزید بیٹھ نہ سکا اور تیزی سے باہر نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

کھچڑی بال، گہری سانولی رنگت، ناٹا قد اور چھوٹی چھوٹی عجیب مکاری سی آنکھوں والا شخص آف وہائٹ شیروانی میں ملبوس گلے میں بڑا سا گلابوں کا ہار ڈالے صبیحہ بیگم کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ اس کے بالکل برابر میں تقریباً اسی جیسے نقش و نگار والی اس سے عمر میں قدرے کم زرق برق لباس میں ملبوس ایک عورت بیٹھی تھی جبکہ دائیں جانب کے سنگل صوفوں پر دو ایسے حضرات براجمان تھے جنہوں نے اپنے دوست کے نکاح میں گواہ کا کردار ادا کرنا تھا لیکن ان کے حلیوں سے ایسا لگتا تھا کہ نکاح کی اس تقریب سے انہیں پیشگی آگاہ نہیں کیا گیا تھا اور وہ جہاں اور جس حلیے میں تھے اسی طرح یہاں لے آئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے گھسے ہوئے ٹراؤزر پر ایک پرانی سی شرٹ پہن رکھی تھی جبکہ دوسرا گہرے سرمئی رنگ کی قمیص شلوار پہنے ہوئے تھا۔ کپڑوں کی گہری رنگت کے باوجود ان پر جابجا کتھے کے دھبے نمایاں تھے۔ اس کی انگلیوں کے پوروں پر بھی یہ دھبے دکھائی دے رہے تھے اور صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کوئی پنواڑی ہے۔ بائیں جانب کے صوفوں پر رجسٹر لیے عمر رسیدہ قاضی صاحب اور ثروت کا شوہر...... بیٹھے ہوئے تھے۔ ثروت کے شوہر کے چہرے پر بیزاری تھی اور کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ بادلِ ناخواستہ یہاں موجود ہے۔ گھر کے اندرونی حصے میں نازلی کے کمرے میں ثروت، انزلہ اور نرمین موجود تھیں۔ نرمین نازلی کو دلہن بنانے کے بعد فائنل ٹچز دے رہی تھی اور انزلہ اسے مشوروں سے نواز رہی تھی جبکہ ثروت ان کی نگرانی کا فریضہ انجام دے رہی تھیں کہ کہیں کوئی ناخوشگوار صورتِ حال پیدا نہ ہو جائے کیونکہ نازلی کی اپنی بھانجیوں خصوصاً انزلہ سے ذرا کم ہی بنتی تھی۔ لیکن آج نازلی اتنی خوش تھی کہ انزلہ کے چبھتے ہوئے مذاق کو بھی بڑی فراخ دلی سے برداشت کر رہی تھی۔ ثروت کے اندازے کے عین مطابق اس نے اپنی شادی کا فیصلہ سن کر بہت خوشی کا اظہار کیا تھا اور یہ تک جاننے کی زحمت نہیں کی تھی کہ اسے کس سے اور کہاں بیاہا جا رہا ہے۔ اس کے لیے بس اتنا کافی تھا کہ اس کے جذبوں کی تسکین کا سامان ہونے جا رہا ہے۔ ان سب سے ہٹ کر صبیحہ بیگم باورچی خانے میں موجود تھیں اور ثروت کی چھوٹی بیٹی شاہین کی مدد سے ٹرے میں مشروب کے گلاس رکھ رہی تھیں۔

یہ کام مکمل ہو گیا تو شاہین نے ٹرے ہاتھوں میں اٹھائی اور صبیحہ بیگم کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔ ٹرے سینٹرل ٹیبل پر رکھ کر اس نے سب سے پہلا گلاس دُلہا صاحب کو تھمایا۔ گلاس تھامتے ہوئے دُلہا نے اپنی انگلیاں اس کی انگلیوں سے مس کیں۔ اس کے برابر میں بیٹھی اس کی بہن نے یہ حرکت نوٹ کر لی اور فوراً ہی اس کے پہلو میں ایک ٹھوکا دیا۔ بھدی انگلیوں کے لمس نے شاہین کے اندر عجیب کراہیت کا احساس پیدا کیا تھا لیکن چند لمحوں بعد خالو کے عہدے پر فائز ہو جانے والے صاحب کے لیے کسی بدگمانی کو دل میں جگہ دینے کے بجائے اس حرکت کو اتفاق سمجھتی ہوئی ان کی بہن کو گلاس تھمانے لگی۔ اس کام کو انجام دیتے ہوئے اسے ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ ہونے والے خالو کے ساتھ براتی بن کر آئے ہوئے دونوں حضرات اسے کن نگاہوں سے گھور رہے ہیں۔ یہ بات اس کے باپ نے نوٹ کی اور ان کا پہلے سے خراب موڈ مزید خراب ہو گیا۔

''تم اندر جاؤ شاہین۔ سب لوگ خود ہی اپنے گلاس اٹھا لیں گے۔'' انہوں نے سخت لہجے میں بیٹی کو حکم دیا تو وہ کچھ ہکا بکا سی فوراً ہی ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

''آپ ان تکلفات میں کیوں پڑ گئیں آپا جی۔ پہلے نکاح ہو جاتا تو اچھا تھا۔ کھانا پینا تو بعد میں بھی ہوتا رہے گا۔'' ایک ہی سانس میں آدھا گلاس خالی کر دینے والی دُلہے کی بہن نے سب کی توجہ ہٹانے کے لیے صبیحہ بیگم سے کہا۔

''جی ذرا میرا داماد اور بھانجا آ جائیں تو پھر نکاح شروع کرواتے ہیں۔ وہ دونوں ذرا کھانے کا انتظام دیکھنے گئے ہیں۔'' صبیحہ بیگم نے متانت سے اسے جواب دیا۔ دُلہا ناظم اور اس کی اکلوتی بہن سے وہ ہفتہ بھر قبل بھی ثروت کے گھر میں ملی تھیں اور آدھے گھنٹے کی اس ملاقات میں وہ

دونوں انہیں گزارے لائق ہی لگے تھے لیکن آج اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے وہ دونوں انہیں بہت عجیب لگ رہے تھے اور اندر ہی اندر ان کے دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالے خود ہی اپنے آپ کو تسلیاں دینے کا فریضہ انجام دے رہی تھیں کہ نازلی جیسی لڑکی کے لیے ایسا ہی بر مل سکتا تھا، سو مل گیا۔

''باجی! آپ ان خاتون کو بھی اپنے ساتھ اندر لے جائیں۔ یہاں ہم مرد مرد ٹھیک ہیں۔ اندر آپ خواتین اپنی محفل سجا لیجیے گا۔'' دونوں خواتین کے درمیان گفتگو کا سلسلہ مزید آگے بڑھنے سے قبل ثروت کے میاں نے دخل دے کر ہدایت جاری کی تو صبیحہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ جن حلیوں کے لوگ یہاں موجود تھے انہیں بھی یہی مناسب لگ رہا تھا کہ خواتین، خصوصاً جوان لڑکیوں کو ان کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔ چنانچہ دولہا کی بہن کو نہایت اخلاق سے اپنے ساتھ اندر چلنے کی دعوت دی۔ اسی وقت بصیر اور مدثر بھی کھانا لے کر واپس آ گئے۔ لوگ کم تھے لیکن کھانے میں کئی آئٹمز اور اچھی خاصی مقدار میں تیار کروائے گئے تھے کیونکہ اس میں سے کچھ حصہ نازلی کے ساتھ بھی بھجوانا تھا۔

ان کی طرف سے شادی سادگی سے کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا تو دولہا والے بھی دھوم دھڑکے کے خواہاں نہیں تھے چنانچہ گنے چنے لوگوں کے درمیان ہی نکاح کی تقریب رکھ لی گئی تھی۔ جہیز بھی بہت معمولی سا دیا جا رہا تھا جس کا دونوں بہنوں نے مل کر انتظام کیا تھا۔ پورے جہیز میں سب سے قیمتی شے سونے کی وہ چوڑیاں تھیں جو انزلہ کے شوہر بصیر نے اپنی خالہ ساس کو تحفتاً دی تھیں۔ انزلہ کو خالہ کو اتنا مہنگا تحفہ دینا پسند نہیں آیا تھا لیکن وہ بصیر کو اس لیے نہیں ٹوک سکی تھی کہ وہ اس پر اپنی تنگ دلی کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی یہ بتا سکتی تھی کہ وہ لوگ نازلی کو بہت معمولی سے جہیز کے ساتھ رخصت کر رہے ہیں۔ اس نے بصیر کو یہی تاثر دیا تھا کہ صرف نکاح کی تقریب سادگی سے ہو رہی ہے ورنہ اور کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی ہے۔ ایک اچھے ہوٹل سے منگوایا گیا یہ پُرتکلف کھانا بھی اسی تاثر کو مضبوط کرنے کی ایک تدبیر تھی۔ کھانا پہنچ گیا تو نکاح کا آغاز کر دیا گیا۔ دولہا کی بہن کو ثروت کے حوالے کر کے صبیحہ بیگم کچن میں آ گئیں اور موبائل سے اپنے ہاں کام کرنے والی ماسی کا نمبر ملایا۔ آج صبح سے ماسی ان ہی کے گھر میں تھی اور صرف ایک گھنٹے کی چھٹی لے کر گھر گئی تھی کہ اپنے بیمار بچے کو دوا دلا کر لا سکے۔ ایک گھنٹا گزر گیا تھا لیکن ماسی واپس نہیں آئی تھی اور انہیں فکر لگ گئی تھی کہ سارا کام کون سمیٹے گا۔

''کیا بات ہے زبیدہ! تم ابھی تک آئی کیوں نہیں ہو؟ یہاں اتنا کام پڑا ہے اور تم گھر جا کر بیٹھ گئی ہو۔'' دوسری طرف سے کال ریسیو ہوتے ہی انہوں نے تیز لہجے میں ماسی کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔

''بس ابھی آتی ہوں باجی۔ ڈاکٹر کے پاس رش بہت تھا اس لیے تھوڑی دیر ہو گئی۔ میں بچے کو گھر چھوڑ کر ابھی آتی ہوں۔'' ماسی نے ہانپتی ہوئی آواز میں انہیں جواب دیا۔

''فوراً پہنچو۔ یہاں بہت کام ہے۔'' انہوں نے سختی سے اسے حکم دے کر لائن کاٹ دی اور زیر لب بڑبڑانے لگیں۔ آج کی اس تقریب میں کام کرنے کا وہ ماسی کو تنخواہ کے علاوہ الگ سے معاوضہ دیتیں اس لیے خود کو اس غصے کے لیے حق بجانب سمجھ رہی تھیں۔ مدثر نکاح نامے پر دستخط کروانے کے لیے نازلی کے کمرے میں پہنچا تو ان کے نام کی پکار پڑی۔ وہ جلدی جلدی وہاں پہنچیں۔ مدثر کے پیچھے ہی بصیر اور ثروت کے میاں بھی گواہان کے طور پر وہاں پہنچ گئے تھے۔ نازلی نے مدثر کی نشاندہی پر نکاح نامے پر اپنے ٹوٹے پھوٹے دستخط کیے تو صبیحہ بیگم اپنے مرحوم والدین کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گئیں۔ ثروت نے بھی ان کا ساتھ دینے کے لیے چند آنسو بہائے لیکن نازلی اتنی خوش تھی کہ اس نے رسم دنیا نبھانے کو بھی آنسو بہانے کی زحمت نہیں کی۔ نکاح کے بعد کھانا لگا دیا گیا۔ مرد اور خواتین کا کھانا بھی الگ الگ ہی لگایا گیا تھا کیونکہ ثروت کے میاں گواہ کا فریضہ انجام دینے کے بعد جاتے جاتے اس سلسلے میں ہدایت دے کر گئے تھے۔ ان کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ڈرائنگ روم میں موجود مہمانوں کو قطعی اس لائق نہیں سمجھ رہے تھے کہ گھر کی خواتین کو ان کے سامنے آنے کی اجازت دی جائے۔ صبیحہ خود بھی ان سے متفق تھیں اور نکاح کے فوراً بعد پہنچ جانے والی ماسی سے اپنی نگرانی میں سب کام کروا رہی تھیں۔ مہمانوں نے کھانا خوب ڈٹ کر کھایا اور رخصتی کے وقت نازلی سے زیادہ ساتھ دیے جانے والے کھانے کو سنبھال کر اپنے ساتھ لے گئے۔

''کن بے ہودہ لوگوں میں رشتہ کر دیا آپ لوگوں نے بہن کا۔ قطعی جاہل لگ رہے تھے۔'' مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد چائے کا دور چلا تو ثروت کے میاں نے اپنی ناگواری کا اظہار کیا۔

''ایسا تو مت کہیں...... بس ذرا غریب اور سیدھے سادے لوگ ہیں ورنہ ایسی کوئی برائی نہیں ہے ان میں۔''

ثروت نے فوراً میاں کو ٹوکا۔

''مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھائے وہ لوگ۔ تم نے نہ جانے کیا دیکھا۔'' بیوی کے ٹوکنے کے باوجود وہ اپنی ناپسندیدگی کا اعلان کیے بغیر نہیں رہ سکے۔

''دیکھنا کیا تھا بس یہ دیکھا کہ شریف لوگ ہیں اور ہماری نازلی کو محبت سے رکھیں گے۔'' ثروت کا اطمینان قابلِ دید تھا البتہ صبیحہ خاموش تھیں کہ ان کے دل میں کھٹک سی پیدا ہوگئی تھی۔ اگر اپنی بیٹی کے مفادات کا معاملہ نہیں ہوتا تو شاید وہ اتنی عجلت میں نازلی کی شادی نہ کرتیں۔

''انکل صحیح کہہ رہے ہیں آنٹی۔ مجھے بھی وہ لوگ کچھ عجیب سے لگے۔ آپ لوگوں نے ان کے بارے میں اچھی طرح معلومات تو کروالی تھیں نا۔ یہ نہ ہو کہ بعد میں کوئی پرابلم کھڑی ہوجائے۔'' چائے پیتے بصیر نے بھی اپنے اندیشوں کا اظہار کیا۔

''ارے نہیں بیٹا، کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ جس رشتے والی نے یہ رشتہ لگایا ہے، وہ بہت بھروسے کی عورت ہے۔ اس کے لگائے رشتوں میں کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوتی۔'' ثروت نے اسے بھی مطمئن کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں انزلہ نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔

''آپ فضول ٹینشن مت لیں جناب۔ آپ سے زیادہ ہمیں اپنی خالہ کی فکر ہے۔ ہم نے کچھ دیکھ بھال کر ہی ان کی شادی کی ہے۔ اب تھوڑا بہت کمپرومائز تو کرنا ہی تھا کہ خالہ اوور ایج ہوگئی تھیں پھر ان کے غیر تعلیم یافتہ ہونے کا بھی ایشو تھا۔ ہم ان سے اچھے رشتے کی ڈیمانڈ کرتے تو اگلوں کی بھی تو کچھ ڈیمانڈز ہوتیں۔'' اس نے چند جملوں میں ہی شوہر کو چپ کروا ڈالا۔ وہ بھی زیادہ نہیں بولا کہ کونسا اس کی اپنی سگی خالہ کا معاملہ تھا۔ انزلہ کے حوالے سے اس کا نازلی سے جو رشتہ بنتا تھا، وہ شادی پر ایک قیمتی تحفہ دے کر اسے نبھا چکا تھا۔ دوسرے لوگوں کے لیے بھی نازلی اتنی زیادہ اہم نہیں تھی کہ مسلسل اس کی فکر میں مبتلا رہا جاتا چنانچہ جلد ہی موضوع بدل گیا۔

چائے کے بعد ثروت اور اس کی فیملی وہاں سے رخصت ہوگئی۔ بصیر بھی انزلہ کو چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ انزلہ اپنی طبیعت کی وجہ سے آج کل بہت زیادہ نازک مزاج ہو رہی تھی۔ صبیحہ بیگم نے اپنی نگرانی میں اسے دودھ کے گلاس کے ساتھ دوا کھلا کر لٹا دیا اور خود ماسی سے کام سمٹوانے لگیں۔ مختصر لوگوں کی وجہ سے زیادہ پھیلاوا تو نہیں ہوا تھا پھر بھی بچا ہوا کھانا سنبھالنا تھا اور غیر مہذب مہمانوں نے ڈرائنگ روم میں جو کھانے پینے کی چیزیں گرائی تھیں، اس کی صفائی کروانی تھی۔ برتن البتہ ماسی پہلے ہی دھو کر رکھ چکی تھی پھر بھی نہ نہ کرتے کام سمٹنے میں اچھا خاصا وقت لگ گیا۔ انہوں نے ماسی کو بھی اس کے بچوں کے لیے تھوڑا سا کھانا باندھ کر دیا اور جب ماسی کو اس کا میاں آکر واپس لے گیا تو خود بھی سونے کے لیے اپنے کمرے میں آگئیں۔ بے حد تھکن ہو رہی تھی۔ انہوں نے مناسب سمجھا کہ نیند کی گولی لے لیں تاکہ اچھی نیند آجائے۔ گولی کھا کر وہ جو سوئیں تو پھر دن چڑھے ہی آنکھ کھلی۔ انہوں نے وقت دیکھا تو دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ انہیں خیال آیا کہ رواج کے مطابق انہیں ناشتا لے کر نازلی کے سسرال جانا چاہیے تھا لیکن نیند کی گولی کھانے کی وجہ سے ان کی آنکھ ہی نہ کھل سکی۔ کچھ شرمندگی کے احساس کے ساتھ انہوں نے اپنے پاس موجود نازلی کی نند کا موبائل نمبر ملایا۔

''السلام علیکم باجی۔ کیسی ہیں آپ؟'' ان کی آواز سن کر نند صاحبہ نے لہک کر پوچھا۔

''ٹھیک ہوں بس آپ سے معذرت کرنی تھی کہ ناشتا لانے میں ذرا دیر ہوگئی ہے۔ میں بس آدھے گھنٹے میں پہنچ جاتی ہوں۔'' ان کا خیال تھا کہ بازار سے ناشتے کا ریڈی

میڈ سامان لے کر ٹیکسی میں آدھے نہ سہی، ایک گھنٹے میں وہ نازلی کے گھر پہنچ سکتی ہیں اس لیے اس کی نند سے کہا۔

''ارے نہیں باجی۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اختر بھائی سویرے ہی بازار سے حلوا پوری لے آئے تھے اور میں نے بھی گھر پر انڈے پراٹھے بنا لیے تھے۔ ہم سب نے اسی سے ناشتا کرلیا۔ اختر بھائی اور نازلی بھابی تو ناشتے کے بعد تھوڑی دیر پہلے دوبارہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں۔ اٹھ جائیں تو میں انہیں آپ کے فون کا بتادوں گی۔'' نازلی کی نند نے گویا بات ہی ختم کردی۔ صبیحہ نے بھی زیادہ زور نہیں دیا اور چند ایک رسمی باتیں کرکے فون بند کردیا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے سے باہر آئیں تو انزلہ جاگ چکی تھی اور منہ بسورے لاؤنج میں بیٹھی تھی۔

''کیا ہے امی، آپ اتنی دیر سے اٹھی ہیں۔ میرا جوس پینے کا موڈ ہو رہا تھا لیکن بناتا کون؟'' ان کی شکل دیکھتے ہی وہ شروع ہوگئی۔

''میں ابھی بنا دیتی ہوں بیٹا۔ تم بتاؤ کون سا جوس پیوگی۔ کینو کا جوس نکال دوں یا پھر سیب کا؟'' وہ فوراً لاڈلی بیٹی کی نازبرداری میں لگ گئیں۔ انزلہ نے انہیں اپنی پسند سے آگاہ کیا۔

''نازلی کی نند نے ہمیں ولیمے کی دعوت تو دی نہیں۔ معلوم نہیں وہ لوگ کب کا ولیمہ رکھیں گے۔'' جوس کے لیے فریج سے سیب نکالتے ہوئے وہ انزلہ سے بولیں تو وہ زور سے ہنس دی۔

''آپ بھی کمال کرتی ہیں امی۔ تیسری شادی پر بھی بھلا کوئی ولیمہ کرتا ہے۔ وہ اپنے سارے ارمان پہلے ہی نکال کر بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''لیکن نازلی کی تو یہ پہلی شادی ہے۔ انہیں اس کے جذبات کا تو خیال کرنا چاہیے۔'' صبیحہ بیگم کو اعتراض کرتے ہوئے بالکل بھی احساس نہیں تھا کہ خود انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں سوچی تھی اور بس چند افراد کے درمیان بہن کو بھگتانے والے انداز میں رخصت کردیا تھا۔

''اچھا ہے، انہوں نے ایسی کوئی زحمت نہیں کی ورنہ میں بصیر کو ساتھ لے کر کسی تھرڈ کلاس جگہ کیسے جاتی۔ میں نے تو انہیں یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ اختر خالو پہلے ہی دو دو بیویاں بھگتا کر بیٹھے ہیں۔ وہ تو پہلے ہی میرے اتنے کان کھا رہے تھے کہ تم لوگوں نے اپنی خالہ کی شادی اتنی عمر والے بندے سے کیوں کردی۔ پہلی دو شادیوں کا پتا چلتا تو ہمیں بالکل ہی ظالم سمجھنے لگتے۔'' اپنے خوب صورتی سے ترشے ناخنوں پر لگی نیل پالش کا جائزہ لیتے ہوئے انزلہ نے تبصرہ کیا۔

''پہلے دو شادیاں ہوئی ہیں تو کیا ہوا...... کوئی بیویاں تو ساتھ نہیں ہیں۔ بے چارے کی قسمت خراب تھی کہ پہلی بیوی زچگی میں بچے سمیت مرگئی اور دوسری اپنے کسی عاشق کے چکر میں طلاق لے بیٹھی۔ اختر میاں کی بہن بتارہی تھی بیوی کے طلاق لینے کے بعد تو اختر میاں نے بھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ بہن ہی نے کہہ سن کر مشکلوں سے راضی کیا۔'' صبیحہ بیگم نے ایک طرح سے خود اپنے آپ کو ہی صفائی پیش کی۔ نازلی کی ایسی شادی پر اندرونی طور پر تو وہ خود بھی مطمئن نہیں تھیں۔

''بہن صاحبہ خود کنواری ہیں۔ سوچا ہوگا بھائی کی شادی کروادوں گی تو شاید بھائی کو بھی میرا خیال آجائے گا۔'' انزلہ نے زور سے ہنس کر کہتے ہوئے ماں کا تھمایا جوس کا گلاس ہونٹوں سے لگایا۔ اس کی بات پر پہلے تو صبیحہ نے اسے گھورا پھر خود بھی ہنس پڑیں۔

☆☆☆

ایڈز کا مرض پھیلنے کی متعدد وجوہات ہوتی ہیں جیسے آلودہ خون اور آلودہ آلات کا استعمال لیکن حقائق کے مطابق اس مرض کے پھیلاؤ کی ستر فیصد وجہ جسمانی تعلقات ہیں۔ بے راہ روی میں مبتلا افراد اس مرض کا شکار بنتے ہیں اور اس کے پھیلاؤ کا سبب بھی۔ اس مرض کی ایسی کوئی علامات نہیں جنہیں دیکھ کر فوراً کہا جاسکے کہ یہ فرد ایڈز کا شکار ہے۔ ایسے افراد بڑی آسانی سے کسی بھی عمومی امراض میں مبتلا ہوسکتے ہیں۔ اس مرض کا علم مخصوص ٹیسٹوں کے ذریعے ہی ہوپاتا ہے۔ یہ ایک لاعلاج مرض ہے اور صرف احتیاط ہی اس کا علاج ہے۔ یہ وہ چیدہ چیدہ معلومات تھیں جو آذر کو اپنے علاج کے سلسلے میں تگ و دو کرتے ہوئے حاصل ہوئی تھیں۔ لندن جیسی جگہ بھی کوئی اسے یہ امید نہیں دلا سکا تھا کہ اسے اس مرض سے نجات دلائی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹرز کے مطابق یہ مرض برسوں انسانی جسم میں رہتا ہے اور عموماً کوئی علامت ظاہر نہیں ہوتی۔ بعض افراد میں تین چار سال بعد مرض کا پتا چلتا ہے اور بعض کو دس برس تک کا عرصہ بھی لگ جاتا ہے۔ آذر محمود بھی تقریباً چار سال سے اپنے جسم میں یہ مرض لیے پھر رہا تھا۔ یہ اتنا ہی عرصہ تھا جتنے عرصے سے وہ بے راہ روی کا شکار اپنے حساب سے لائف انجوائے کر رہا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اس انجوائے منٹ کے چکر میں وہ اپنی زندگی سے کھیل رہا ہے۔

اپنے ایچ آئی وی پوزیٹو ہونے کا علم ہونے کے بعد

اب جو وہ سود و زیاں کا حساب کرنے بیٹھا تھا تو خیال آرہا تھا کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ بالکل خالی ہاتھ رہ گیا ہے اور ایک بھیانک مرض کے ساتھ شاید بہت کم عمری میں اس طرح دنیا سے جانے والا ہے کہ نہ اس نے دنیا سے کچھ ڈھنگ کا فائدہ اٹھایا ہے اور نہ ہی دنیا کو اپنی ذات سے کوئی فائدہ دے کر جارہا ہے۔ اس نے اگر دنیا کو کچھ دیا بھی تھا تو ایچ آئی وی کا تحفہ دیا تھا اور اب تک نہ جانے کتنے انسانی جسموں میں اس مرض کی منتقلی کا سبب بن چکا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ وہ یہ مرض یورپ سے اپنے جسم میں لے کر آیا تھا جہاں اس نے پہلی بار زندگی کے کچھ تجربات کیے تھے اور ان تجربات کو ایڈونچر کا نام دیتے ہوئے ڈینجر کا لفظ اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ اپنے اعمال کی خطرناکی کا احساس اسے اس وقت ہوا تھا جب وہ ناقابلِ تلافی نقصان اٹھا چکا تھا اور اب کوئی راہ نہیں سوجھتی تھی کہ کیا کرے۔ پچھتاووں میں مبتلا وہ مایوس سا وطن واپس لوٹ رہا تھا کہ جہاز میں تقریباً اپنے ہی ہم عمر ارسلان بیگ سے ملاقات ہوگئی۔ خوش پوش سا وہ نوجوان اپنی حالت سے ہی بیمار لگ رہا تھا..... بے حد کمزور جسم اور آنکھوں کے نیچے موجود حلقے اس کی حالت کا اعلان کر رہے تھے لیکن وہ اپنی جسمانی حالت سے بے نیاز ایپل کے قیمتی لیپ ٹاپ کو کھولے مسلسل اس پر مصروف تھا۔ جہاز میں لنچ سرو کیا جانے لگا تب اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور اپنے ساتھ بیٹھے آذر سے مخاطب ہوا۔

''سوری، آپ سوچ رہے ہوں گے کہ کیسے بداخلاق ہم سفر سے واسطہ پڑا ہے جو مسلسل اپنے کام میں ہی لگا ہوا ہے اور بات کرنے کی فرصت ہی نہیں۔''

''میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا۔ یقیناً آپ کوئی امپورٹنٹ کام ہی کر رہے ہوں گے اور میرا کوئی رائٹ نہیں بنتا کہ میں آپ کے بارے میں کچھ بھی سوچتا پھروں۔'' اپنی سوچوں میں الجھے اسے اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتا اس لیے نہایت صاف گوئی سے اسے جواب دیا۔

''رائٹ کیوں نہیں بنتا۔ رائٹ تو بنتا ہے۔ انسانوں کا انسانوں پر حق ہوتا ہے اور ہمیں تعلق کے اعتبار سے بساط بھر یہ حق ادا کرنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ جیسا کہ میں آپ کا ہم سفر ہوں اور میرا فرض بنتا ہے کہ آپ سے پوچھوں کہ آپ اتنے خاموش کیوں ہیں۔ اگر آپ اپنی خاموشی اور اداسی کی وجہ مجھ سے شیئر کرنا چاہیں گے تو مجھے اچھا سامع اور مشورہ دینے والا پائیں گے۔ نہیں چاہیں گے تو میں برا نہیں

سب سے پہلے

☆ لاطینی زبان میں سب سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ فرانس کے راہب پطرس نرابلس نے 1143ء میں کیا۔

☆ عبرانی زبان میں ہرمن رکنڈرف نے 1857ء میں ترجمہ کیا۔

☆ جرمن زبان میں مارٹن لوتھر نے 1938ء میں اور ولندیزی زبان میں شوئلگیر نے کیا۔

☆ فارسی زبان میں شیخ سعدیؒ نے، جاپانی زبان میں شیخ عبدالرشید ابراہیم نے کیا۔

☆ برمی زبان میں احمد اللہ نے اور انگریزی زبان میں لیٹن نے 1648ء میں کیا۔

☆ بنگالی زبان میں سب سے پہلے ترجمہ غلام اکبر علی نے 1868ء میں کیا۔

☆ یوگنڈی زبان میں سب سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ مولانا رحمت علی نے کیا۔

مرسلہ۔ ریحان خان، مانسہرہ

مانوں گا۔'' آذر کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کا ہم سفر جو اتنی دیر سے خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھا، اتنا باتونی ہوگا۔

''ایسا کرتے ہیں کہ سب سے پہلے تعارف کا مرحلہ طے کر لیتے ہیں۔ مجھے ارسلان بیگ کہتے ہیں۔ میرے والد اب سے چالیس برس قبل لندن میں آکر رہائش پذیر ہوئے تھے۔ وجہ خاندانی دشمنیاں وغیرہ تھیں۔ وہ جاگیردار کے بیٹے ہوتے ہوئے جاگیردارانہ مزاج نہیں رکھتے تھے اس لیے اپنا حصہ لے کر الگ ہوگئے۔ لندن میں انہوں نے سپر اسٹورز کی چین قائم کی اور وہیں ایک پاکستانی فیملی میں شادی کر کے رہنے لگے۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں اور پہلی بار پاکستان اپنے گاؤں جارہا ہوں۔'' آذر کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر بھی اس نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ آذر کو وہ دلچسپ محسوس ہوا اور اس نے مناسب سمجھا کہ سارا وقت اپنی بیماری کے بارے میں سوچ سوچ کر کڑھنے سے بہتر ہے کہ ارسلان سے گفتگو میں کچھ وقت گزار لیا جائے چنانچہ جواباً اس نے بھی اپنا تعارف کروایا اور اندازہ لگاتے ہوئے بولا۔

''تم یقیناً اپنے خاندان والوں سے ملنے اور اپنا ہوم لینڈ دیکھنے کے چکر میں پاکستان جارہے ہوگے؟''

''نہیں۔ میرے دادا دادی کا برسوں پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ چچا اور تایا دونوں خاندانی دشمنی کے چکر میں مارے گئے ہیں اور پھوپھیاں اپنے اپنے گھروں کی ہیں اس لیے میں وہاں کسی سے ملنے نہیں جا رہا۔ ہوم لینڈ دیکھنے کا بھی مجھے زیادہ شوق نہیں ہے کیونکہ پاپا نے کشت و خون کی جو داستان سنا رکھی ہے اس کے بعد ایسی سرزمین سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ میں وہاں اپنے پاپا کی آخری خواہش پوری کرنے جا رہا ہوں۔'' ارسلان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''کیسی خواہش؟'' آذر کو تجسس ہوا۔

''اصل میں، میں اپنے سپر اسٹورز کی چین کو فروخت کر کے اس سے ملنے والی رقم چیریٹی میں خرچ کرنا چاہتا تھا تو پاپا نے مجھ سے کہا کہ لندن سے زیادہ پاکستان کے لوگوں کو اسکولز اور ہاسپٹلز کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے ہوم لینڈ جاؤ اور وہاں یہ سارے کام کرو۔''

''تم نے چیریٹی کے لیے اپنے سپر اسٹورز کی چین بیچ دی؟'' آذر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''ہاں...... کیونکہ اب وہ میرے کسی کام کی نہیں رہ گئی تھیں۔'' اس نے شانے اچکا کر جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' آذر کو اس کا جواب سمجھ نہیں آیا۔

''مجھے بلڈ کینسر ہے۔ وہ بھی ناقابل علاج۔ ڈھیروں پیسا خرچ کر کے میں اپنی زندگی کو تھوڑا سا لمبا تو ضرور کر سکتا ہوں لیکن میرا اندازہ ہے کہ جتنی لمبی زندگی ہوگی، اتنا ہی میری تکلیف میں بھی اضافہ ہوگا تو میں نے سوچا کہ پیسے کے عوض تکلیف خریدنے کے بجائے اپنی اخروی زندگی کے لیے صدقہ جاریہ کا انتظام کر جاؤں۔ بینک میں اتنی رقم موجود ہے کہ ممی اور میں باقی کی زندگی آرام سے گزار سکتے ہیں تو پھر کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم کاروبار سنبھالنے کی جھنجٹ میں پڑے رہیں۔ پاپا ہوتے تو پھر بھی الگ بات تھی لیکن وہ تو اتنے کم ہمت نکلے کہ میرے مرض کے بارے میں معلوم ہوتے ہی دل کا روگ لگا بیٹھے اور جوان بیٹے کے جنازے کو کندھا دینے کی تکلیف اٹھانے سے بہتر یہ سمجھا کہ خود اس کے کندھوں پر قبرستان جائیں۔ اصل میں وہ ہر امن پسند شریف شخص کی طرح بزدل اور کم ہمت تھے۔ بزدل نہ ہوتے تو اس وطن کو جس سے بہت محبت کرتے تھے، چھوڑ کر لندن آ کر کیوں بستے لیکن کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ یہ ممی کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ انہیں اکیلے ہی جدائیوں کے زخم سہنے ہوں گے۔'' وہ اپنی زندگی کی اتنی بڑی ٹریجڈی کو جس روانی سے سنا رہا تھا، اسے آذر نے ششدر کر دیا۔

''ابھی میں اپنے لیپ ٹاپ پر اس اسکول اور ہاسپٹل سے متعلق ہی کام نمٹا رہا تھا جو مجھے اپنے آبائی گاؤں میں بنانا ہے۔ میرے پاس وقت چونکہ کم ہے اس لیے بہت سا کام لندن میں بیٹھے بیٹھے ہی نمٹا لیا ہے۔ پاکستان میں پاپا اور ممی کے کچھ کونٹیکٹس ایسے ہیں جنہوں نے اس کام میں میری خاصی مدد کی۔ زمین خرید کر اس پر تعمیر کا کام شروع ہو چکا ہے لیکن گرلز اسکول کی تعمیر میں کچھ مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو دھمکیاں دے رہے ہیں۔ میں نے کہا میں خود آ کر ان سے نمٹ لیتا ہوں۔ موت کے منہ میں بیٹھے ہوئے شخص کو بھلا کون دھمکا سکتا ہے۔ سچ بولوں یار! جس کے دل سے موت کا ڈر نکل جائے، وہ اس دنیا میں سب کچھ کر سکتا ہے۔ میں بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ کم از کم اپنے پیارے پاپا کی آخری خواہش تو ضرور ہی پوری کر سکتا ہوں بس اسی لیے پاکستان جا رہا ہوں۔'' پل پل وجود سے نچڑتی زندگی کے باوجود وہ بہت پُرامید اور باہمت تھا۔ آذر نے چند گھنٹوں کے سفر میں ملنے والے اپنی زندگی کے اس کردار سے بہت کچھ سیکھا جب ہی پاکستان واپس پہنچنے کے دوسرے دن وہ محمود انجم کے سامنے بیٹھا ان سے مطالبہ کر رہا تھا۔

''اپنی جائداد میں سے جو کچھ آپ مجھے دینے کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ میرے نام کر دیجیے۔'' اس کے اس مطالبے پر محمود انجم دنگ رہ گئے۔

''کیا...... کیا کہا تم نے؟'' انہیں ایسا لگا کہ ان کی سماعتوں کو دھوکا ہوا ہو۔

''میں پراپرٹی میں سے اپنا حصہ لینا چاہتا ہوں ڈیڈی۔'' اس نے اپنا مطالبہ دہرایا۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ میرے جیتے جی تم ایسی کوئی ڈیمانڈ کیسے کر سکتے ہو؟'' تیوری پر بل ڈالے وہ زور سے غرائے۔

''سوری ڈیڈی! یہ میری مجبوری ہے کیونکہ ممکن ہے کہ آپ ابھی بہت لمبا عرصہ جئیں لیکن میرے پاس بہت کم مہلت رہ گئی ہے۔ کم از کم میں ایک نارمل لائف گزارنے کے لائق تو بالکل نہیں رہا ہوں۔'' اس نے نہایت متانت سے ان کے غصے کا سامنا کیا لیکن محمود انجم تو گنگ سے رہ گئے۔ اس کے لندن جانے سے قبل بھی انہوں نے اس کے رویے کا غیر معمولی پن محسوس کیا تھا اور اب وہ ان سے اتنی بڑی بات کہہ رہا تھا۔

''آذر! کیا بات ہے بیٹا؟ تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے۔ کچھ مجھے بھی بتاؤ۔'' انہوں نے بڑی مشکل سے اس سے دریافت کیا۔

''میں ایچ آئی وی پوزیٹو ہوں ڈیڈی۔'' اس نے آہستہ سے انہیں جواب دیا۔

''تو...... تو، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں نے تو ہمیشہ تم لوگوں کی بہت کیئر کی۔ کبھی کسی عام ڈاکٹر کے پاس بھی جانے نہیں دیا۔ ڈاکٹر، ڈینٹسٹ، باربر سب ہی منتخب شدہ ہیں پھر...... پھر کیسے تم اس موذی مرض کا شکار ہوگئے؟'' وہ بے یقینی کا شکار تھے۔

''میں اپنی بداعمالیوں کی سزا بھگت رہا ہوں ڈیڈی اور اس سزا سے بچنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ میں نے لندن کے قابل ترین ڈاکٹرز سے اپنا چیک اپ کروایا ہے اور کسی نے بھی مجھے امید نہیں دلائی ہے اس لیے میں سوچ رہا ہوں کہ دنیا کی زندگی تو میں نے اپنے ہاتھوں سے برباد کرلی ہے، کیوں نہ آخرت کے لیے کچھ سامان کرلوں۔ میں پراپرٹی میں سے اپنا حصہ نہیں لوں گا تو میرے مرنے کے بعد وہ میرے بہن بھائیوں کو مل جائے گا اور وہ اسے عیش وعشرت میں اڑانے کے سوا اور کچھ نہیں کریں گے۔ تو کیا بہتر نہیں ہوگا کہ میں اپنے حصے کو کسی بہتر کام میں لگا دوں؟'' وہ بول رہا تھا اور محمود انجم اسے یک ٹک دیکھ رہے تھے۔ ان کا یہ تیسرے نمبر کا بیٹا جو دونوں بھائیوں سے زیادہ شوخ اور بے پروا مزاج کا ہوتا تھا، آج زندگی کے ایسے موڑ پر آ گیا تھا کہ اس کے لیے زندگی ہی بے معنی ہوکر رہ گئی تھی اور وہ جو اتنے بڑے بزنس ٹائیکون تھے، ایسی کوئی ترکیب لڑانے سے قاصر تھے کہ خود کو اتنے بڑے نقصان سے بچا سکیں۔

☆☆☆

''نازلی کو آپ لوگوں کی بڑی یاد آرہی تھی۔ اس لیے میں اسے لے کر ملوانے کے لیے آ گیا ورنہ آج بھی رات کے کھانے پر میرے ایک دوست کے گھر دعوت ہے اور ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رکیں گے۔''

صبیحہ بیگم کے گھر سے رخصت ہوکر گئی نازلی نے آج چوتھے دن میکے میں قدم رکھا تھا اور اپنے شوہر کے پہلو میں چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا شوہر اختر ہی بڑی سالی صاحبہ کو اپنی مصروفیت سے آگاہ کررہا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے اختر میاں لیکن کچھ حق ہمارا بھی تو بنتا ہے۔ میں نے اتنی بار ٹیلی فون کیا لیکن صرف ایک بار ہی نازلی نے دو تین منٹ کے لیے بات کی ورنہ ہر بار یہی سننے کو ملا کہ آپ لوگ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔'' صبیحہ بیگم نے شکوہ کیا۔

''آپ کی شکایت غلط نہیں ہے آپا جی لیکن یہ بھی تو سوچیں کہ نئے دلہا دلہن کے پاس فرصت ہی کہاں ہوتی ہے۔ یہ لوگ تو گھر میں رہتے ہوئے بھی مجھ سے بات کرنے کی فرصت نہیں نکال پاتے تو آپ کا کیا ذکر۔ پھر جو اختر بھائی کے دوست ہیں نا وہ ان کے لیے سگے بھائیوں سے بھی بڑھ کر ہیں اور بھائی ان میں سے کسی کی دعوت رد نہیں کرسکتے۔ بس ان دعوتوں سے فرصت مل جائے پھر آپ کے ہاں تو آنا جانا لگا ہی رہے گا۔'' بھائی بھاوج کے ساتھ دم چھلا بن کر آئی نازلی کی نند نے ان کے شکوے کو ہوا میں اڑا دیا۔ صبیحہ بیگم چائے کی تیاری کے لیے کچن میں گئیں اور وہاں سے آواز دے کر نازلی کو اپنے پاس بلایا تو نند بھی پیچھے پیچھے ہی چلی آئی۔ یوں دو گھنٹے کے اس عرصے میں صبیحہ بیگم کو موقع ہی نہیں ملا کہ بہن سے تنہائی میں کچھ معلوم کرسکیں۔ وہ لوگ واپس چلے گئے تو انہوں نے فون پر ثروت کو ساری تفصیل سے آگاہ کیا۔

''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے باجی۔ آپ کے لیے تو یہی بہتر ہے کہ نازلی کم سے کم میکے آئے۔ تھوڑے دنوں میں انزلہ آپ کے ہاں رکنے آجائے گی تو نازلی کی زیادہ آمدورفت سے آپ کو پریشانی ہی ہوگی۔'' ساری بات سن کر ثروت نے اطمینان سے تبصرہ کیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے ثروت لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو۔ نازلی سے میری اکیلے میں بات ہوجاتی تو تھوڑی تسلی ہوجاتی لیکن اس کی نند ایسے اس کے ساتھ چپکی رہی کہ مجھے موقع ہی نہیں ملا کچھ پوچھنے کا۔'' انہوں نے بے شک اپنے مفادات کے پیش نظر عجلت میں بہن کی شادی کردی تھی لیکن فطری طور پر اس کی طرف سے تھوڑی فکرمند بھی تھیں۔

''آپ تسلی ہی رکھیں اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوتی تو اپنی نازلی خاموش رہنے والی تھی؟ وہ تو ہنگامہ کھڑا کردیتی۔ میرے خیال میں تو وہ اپنے گھر میں بہت خوش ہے۔ اس کی شادی کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی ہے، اب اسے کیا مسئلہ ہوگا۔'' ثروت کے دلائل نے ان کی تھوڑی سی تشویش کو بھی دور کردیا۔ اس کے بعد وہ انزلہ کے آنے والے بچے کی تیاری میں مصروف ہوگئیں۔ ایک ہفتے بعد انزلہ بھی زچگی تک رہنے کے لیے چلی آئی۔ اس کی ناز برداریوں میں ان کے ذہن سے نازلی کا خیال بالکل ہی نکل گیا۔ ایک بار وہ

پہلے ہی کی طرح ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے اپنے میاں اور نند کے ساتھ ملاقات کے لیے آئی اور اس کے بعد انہیں فون پر یہ اطلاع دے دی گئی کہ نازلی اپنے شوہر کے ساتھ گھومنے پھرنے جا رہی ہے۔ اس کی نند کے مطابق لاہور، ملتان اور پنڈی میں ان کے کچھ عزیز رہتے تھے جہاں وہ لوگ باری باری قیام کرتے اور ساتھ ہی سیر و تفریح بھی ہو جاتی۔ انہوں نے جس طرح کا پروگرام بنایا تھا، اس کے مطابق ان کا ٹور کافی لمبا ہو جاتا۔ نازلی کے گھومنے پھرنے جانے کا سن کر ایک طرف صبیحہ بیگم کو اچھا لگا تو دوسری طرف یہ اطمینان بھی ہو گیا کہ انزلہ کے قیام کے عرصے میں اس کا بالکل بھی میکے آنا نہیں ہوگا اور وہ سکون سے بیٹی کی نازبرداریوں کے ساتھ ساتھ لگے ہاتھوں آنے والے داماد کی خاطر داریاں بھی کرتی رہیں گی۔

☆☆☆

ڈاکٹر ہادی نے اپنے سامنے بیٹھے آذر کو گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ اور کمزور ہو گیا تھا لیکن اس کے چہرے پر ٹھہراؤ اور سکون کی کیفیت تھی۔

"آپ جانتے تھے ناکہ میرا مرض لاعلاج ہے پھر آپ نے مجھے آؤٹ آف کنٹری جانے سے کیوں نہیں روکا؟" وہ باقاعدہ اپائنٹمنٹ لے کر ان سے ملنے آیا تھا اور اپنی کوئی تکلیف بیان کرنے کے بجائے ان سے پوچھ رہا تھا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کی زندگی میں 'کاش' نہیں ہونا چاہیے۔ میں ڈاکٹر ہوں اور میں نے بے شمار لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے مریض کے صحت یاب نہ ہونے پر بے شمار 'کاش' کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کاش ہم بروقت ہاسپٹل پہنچ گئے ہوتے۔ کاش ہمارے پاس اپنے مریض کو علاج کے لیے باہر لے جانے کے وسائل ہوتے۔ کاش ڈاکٹر فلاں دوا دے دیتا وغیرہ وغیرہ۔ تم وسائل رکھتے تھے اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ تم اپنے وسائل کو استعمال کر کے اپنے لیے اگر کوئی بہتری تلاش کر سکتے ہو تو ضرور کرو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کل کو تمہیں کوئی ایسی بات معلوم ہو جاتی کہ تم سوچتے کہ کاش میں ڈاکٹر ہادی تک ہی محدود نہیں رہتا اور علاج کے لیے بیرونِ ملک چلا جاتا۔ اب تم نے اپنی پوری تسلی کر لی ہے اور لوٹ کر میرے پاس آ گئے ہو تو میں تمہاری تکلیف کم کرنے کے لیے جو کچھ کر سکا، ضرور کروں گا۔ تم مجھے بتاؤ کہ اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" انہوں نے نہایت سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دینے کے بعد اس کا حال دریافت کیا تو وہ انہیں بتانے لگا کہ اب اس کی کیا کیفیت ہے۔ انہوں نے اچھی طرح اس کا معائنہ کیا اور کچھ ٹیسٹ اور دوائیں تجویز کر دیں۔ اس نے ان کا تھمایا پرچہ بے دلی سے لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔

"دیکھو ینگ مین۔ آدمی کو قسمت کا لکھا قبول کرنا پڑتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ بالکل مایوس ہی ہو جائے۔ تم اپنے لیے جو کچھ اچھا کر سکتے ہو، ضرور کرو۔" اس کی بے دلی کو محسوس کر کے ڈاکٹر ہادی نے اسے ٹوکا۔

"مشورے کا شکریہ ڈاکٹر۔ اب واقعی میں وہ کچھ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو میرے لیے اچھا ہو سکتا ہے۔ میں نے یہ بات سمجھ لی ہے کہ دنیا کی اس زندگی میں میرے لیے بس اتنی گنجائش رہ گئی ہے کہ میں اپنی آخرت کے لیے کچھ بندوبست کر لوں، سو اس کے لیے منصوبہ بندی کر رہا ہوں۔ آپ کے پاس آنے کا مقصد بھی یہ ہے کہ میں خود کو جسمانی طور پر اتنا فٹ تو رکھ سکوں کہ میری کوشش کی راہ میں میری صحت کے مسائل رکاوٹ نہ بنیں۔"

"کیا تم اپنی پلاننگ سے مجھے آگاہ کرنا پسند کرو گے؟" اس کے جواب نے ڈاکٹر ہادی کو تجسس میں مبتلا کیا۔

"بالکل، ہو سکتا ہے کہ آپ اس سلسلے میں مجھے کوئی اچھا مشورہ دے سکیں۔" وہ انہیں بتانے لگا کہ اس نے جائداد میں سے اپنا حصہ لے لیا ہے اور اب اس رقم کو کسی فلاحی کام میں لگانا چاہتا ہے۔

"یہ بہت اچھی سوچ ہے اور میں اس سلسلے میں تمہاری مدد بھی کر سکتا ہوں۔ ایکچوئلی میں خود چھوٹے پیمانے پر اس طرح کے کام کر رہا ہوں کیونکہ میرے وسائل محدود ہیں۔ اگر تم ایک ہینڈسم اماؤنٹ کے ساتھ میرے شریکِ کار بن جاتے ہو تو ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" وہ یکدم ہی ایکسائیٹڈ ہو گئے۔ اصل میں اپنے بیٹے کے مشورے پر جب سے انہوں نے ایک پسماندہ علاقے میں کلینک کا آغاز کیا تھا، انہیں احساس ہونے لگا تھا کہ ایسے علاقوں میں ایسے اداروں کا قیام ضروری ہے جو نہ صرف لوگوں کو صحت کی بہتر سہولیات فراہم کرے بلکہ ان کے اندر شعور اور آگہی کو بھی ابھارے کیونکہ بہت سی بیماریاں اور مسائل تو ایسے تھے جو لاعلمی کی وجہ سے ہی جنم لیتے تھے۔ وہ آذر کو اپنے تجربات اور احساسات سے آگاہ کرنے لگے۔ دورانِ گفتگو ابرار کا ذکر بھی چھیڑا کہ کیسے ایک اچھا بھلا نوجوان حالات کی وجہ سے چند ٹکوں کے لیے نوجوان نسل کو برباد کرنے والے بے ضمیروں کے ہتھے چڑھا اور بے راہ روی کی وجہ سے قابلِ شرم مسئلے کا شکار ہو گیا۔ ابرار جیسے نوجوان جو قابلِ علاج تھے

لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے مہنگے علاج کے اخراجات برداشت کرنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ایسے کسی ادارے کی معاونت سے اپنی زندگی دوبارہ شروع کرسکتے تھے۔ ان کا قائم کردہ ادارہ خصوصی امراض کے علاوہ عمومی امراض میں مبتلا کم حیثیت افراد کا بھی علاج کرسکتا تھا۔

''میں آپ کا پروگرام بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں سر اور میری خواہش ہے کہ اس پروگرام میں اتنا اضافہ مزید کرلیا جائے کہ لوگوں کو دینی اور اخلاقی تعلیم دینے کا بھی کوئی اچھا بندوبست ہو کیونکہ دینی و اخلاقی تربیت نہ ہو پانے کے سبب بھی بہت سی برائیاں اور پھر ان برائیوں سے بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ اب آپ یہی دیکھ لیجیے کہ ہمارا مذہب صفائی کو نصف ایمان قرار دیتا ہے لیکن ہم اس بات کی اہمیت کو نہیں سمجھتے اور صرف گندگی کی وجہ سے ہمارے بچے اور بڑے طرح طرح کے بیکٹیریا اور وائرس کا شکار ہوکر بیمار ہوجاتے ہیں۔ تو میرے خیال میں گراس روٹ لیول سے کام اسی طرح شروع ہوسکتا ہے کہ پہلے لوگوں کو ایجوکیٹ کیا جائے۔ لوگ ایجوکیٹ ہوں گے تو مسائل بھی کم جنم لیں گے۔'' وہ ان کی گفتگو میں پوری دلچسپی لے رہا تھا۔ اس گفتگو کے دوران ہی ان کے درمیان یہ طے ہوگیا کہ وہ اسپتال کے بجائے ڈاکٹر ہادی کی رہائش گاہ پر ملاقات کریں گے جہاں اس منصوبے پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

☆☆☆

اس کے جسم پر جگہ جگہ دانتوں سے کاٹے جانے اور نیل کے نشان تھے۔ ایک آنکھ ذرا سی سوجی ہوئی تھی اور نچلا ہونٹ بھی زخمی تھا۔ اتنے برے حال میں وہ بستر پر بالکل چت لیٹی ہوئی تھی اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ اس کے برابر میں اس کا شوہر نشے میں دھت بے سدھ سو رہا تھا۔ اسے اس حال کو پہنچانے والا وہی تھا۔ وہ انسان سے زیادہ ایک درندہ تھا جو اپنی حیوانی فطرت کی تسکین کے لیے ایک بے آسرا لڑکی کو بیاہ لایا تھا۔ نازلی بے آسرا ہی تو تھی کیونکہ جو اس کے والی وارث تھے، انہوں نے اس کی خوشی سے زیادہ اپنی جان چھڑانے کے لیے اس کی اختر سے شادی کی تھی۔ اگر ان لوگوں کو اس کی پروا ہوتی تو وہ اس طرح آنکھیں بند کرکے اسے بیاہنے کے بجائے پوری طرح معلومات حاصل کرتے۔ شادی کی پہلی رات ہی اختر کی فطرت نازلی کے سامنے آگئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے ساتھ ہونے والے اس سلوک پر شور مچائے لیکن اسے اس کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ اختر اور اس کی بہن نے اسے اپنے گھر والوں تک رسائی ہی حاصل نہیں کرنے دی۔ پھر وہ اسے طرح طرح کی خطرناک دھمکیاں دے کر بھی زبان بندی پر مجبور کیے رہے۔ وہ جو میکے میں ذرا ذرا سی بات پر بہت شور مچاتی تھی، اتنی باہمت اور باشعور نہیں تھی کہ ان ظالموں کا مقابلہ کرسکتی۔ خوف کے زیر اثر وہ مسلسل اپنے ذہنی مریض شوہر کا تشدد سہنے پر مجبور تھی۔ گزری رات پھر وہی داستان دہرائی گئی تھی اور اب وہ بری طرح دکھتے جسم کے ساتھ بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ شاید مزید بھی پڑی رہتی لیکن بھوک کے عفریت نے اس کی آنتوں کو نوچنا شروع کیا تو مجبوراً اسے بستر چھوڑنا پڑا۔

کھڑے ہونے پر اسے زوردار چکر آئے لیکن کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھال کر وہ کمرے سے باہر نکلی اور سیدھے باورچی خانے کا رخ کیا۔ وہاں کھانے پینے کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ صرف آٹا تھا اور اس کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ آٹا گوندھ کر اپنے لیے روٹی پکا سکتی۔ وہ باورچی خانے کی مختار اپنی نند کی تلاش میں باہر نکلی۔ دو کمروں کے گھر میں اس کا کچھ اتا پتا نہیں تھی۔ شاید وہ کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ نازلی نے بیرونی دروازے کو جا کر چیک کیا۔ وہ باہر سے بند تھا۔ اس نے گلی میں جھانک کر دیکھنے کے خیال سے اوپر چھت پر جانے والے لکڑی کے زینے کا رخ کیا۔ دیوار سے جھانکنے پر اسے گلی میں کوئی نظر نہیں آیا۔ مایوسی کے عالم میں وہ واپس پلٹ رہی تھی کہ بالکل ساتھ جڑی پڑوسیوں کی چھت پر دھیان چلا گیا۔ دونوں چھتوں کے درمیان موجود دیوار زیادہ بلند نہیں تھی اور اسے آسانی سے پھلانگا جاسکتا تھا۔ آزادی کی فطری خواہش نے اس کے کم استعداد رکھنے والے ذہن کو بھی چوکنا کردیا اور وہ بے اختیار دیوار پھلانگ گئی۔ وہاں بھی چھت سے نیچے جانے کے لیے سیڑھیاں موجود تھیں۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچی تو صحن میں چارپائی پر بیٹھی ادھیڑ عمر عورت نے اسے حیرت سے دیکھا۔ نازلی نڈھال سی اس کے قریب ہی گرگئی۔

''ارے واجد ادھر آ۔ یہ دیکھ یہ کون ہے؟'' عورت زور سے چلائی۔ فوراً ہی کمرے سے ایک لڑکا برآمد ہوا۔

''یہ کون ہے اماں؟'' نیچے گری نازلی کو دیکھ کر وہ بھی حیران ہوا۔

''پتا نہیں۔ اوپر چھت سے اتر کر آئی ہے۔'' عورت نے جواب دیا۔

''اماں! یہ اختر صاحب کی بیوی تو نہیں ہے؟'' لڑکے نے اندازہ لگایا۔ اختر اور اس کی بہن چند ماہ قبل

ہی اس محلے میں کرائے پر آئے تھے۔ انہوں نے محلے والوں سے میل جول نہیں رکھا تھا۔ یہاں تک کہ شادی کے موقع پر بھی کسی کو نہیں پوچھا تھا اس لیے کوئی نازلی سے واقف نہیں تھا لیکن ایک نئے چہرے کو دیکھ کر یہ اندازہ تو لگایا ہی جا سکتا تھا کہ یوں چھت سے اتر کر آنے والی وہ عورت کون ہوسکتی ہے۔

''اے بی اٹھو۔ بولو تم کہاں سے آئی ہو اور تمہیں کس نے اس حال تک پہنچایا ہے؟'' عورت نے نازلی کا بازو جھنجوڑا۔

''مجھے میری باجی کے گھر پہنچا دو۔ یہ لوگ بہت ظالم ہیں۔ یہ مجھے جان سے مار دیں گے۔'' نازلی بڑی مشکل سے یہ چند جملے بول سکی۔

''تمہاری بہن کا کوئی فون نمبر ہے تو بتاؤ۔'' عورت نے گھبرا کر اس سے پوچھا۔ پرائے پھڈے میں ہاتھ ڈالنے کے خیال سے وہ کچھ سراسیمہ ہو رہی تھی۔

''نمبر یاد نہیں، گھر معلوم ہے۔ مجھے وہاں لے چلو۔'' نازلی نے روتے ہوئے درخواست کی۔

''اے ہے۔ یہ کیا مصیبت سر پر پڑ گئی۔ اب ہم کیا کریں؟'' عورت زور سے بڑبڑائی۔

''ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے اماں۔ آپ ان کا حال تو دیکھیں۔'' لڑکے کو اس کی حالت پر رحم آ گیا۔

''کسی کو پتا چل گیا تو۔'' عورت اب بھی تشویش کا شکار تھی۔

''نہیں چلے گا۔ آپ انہیں اپنا برقع پہنا دیں۔ میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔'' وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ چند ماہ کی بیاہتا عورت شوہر یا نند کے تشدد کا نشانہ بنی ہے اور اسے میکے والوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس کے اصرار پر اس کی ماں بھی رضامند ہوگئی اور لڑکے کے ٹیکسی لانے تک اسے اپنا برقع پہنا دیا۔ لڑکا ٹیکسی لینے جاتے وقت نازلی سے اس کے گھر کا پتا پوچھ کر گیا تھا۔ ٹیکسی سفر کرتی صبیحہ بیگم کے رہائشی علاقے میں پہنچی تو نازلی نے گھر کی نشاندہی کر دی۔ گھر کے گیٹ کے سامنے ٹیکسی رکوا کر لڑکا پہلے خود نیچے اترا اور گھنٹی بجائی لیکن پے در پے گھنٹیاں بجانے پر بھی کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ وہ پریشان ہوگیا۔ اسی وقت اوپر والے پورشن سے ایک دس گیارہ سالہ بچے نے جھانکا اور اطلاع دی۔

''صبیحہ آنٹی گھر میں نہیں ہیں۔ انزلہ باجی کو لے کر ہاسپٹل گئی ہوئی ہیں۔''

''اچھا بیٹا، آپ دروازہ کھولو۔ ان کے مہمان آئے ہیں انہیں گھر والوں کے واپس آنے تک اپنے گھر میں بٹھا لو۔'' لڑکے نے بچے سے درخواست کی۔

''سوری انکل! میرے ممی پاپا گھر پر نہیں ہیں اور دروازہ لاک کر کے گئے ہیں۔ میں کسی کو اندر نہیں بلا سکتا۔''

بچے نے جواب دیا اور سامنے سے ہٹ گیا۔ اس صورتِ حال پر لڑکا گھبرا گیا۔ اب وہ نازلی کو واپس اپنے ساتھ گھر بھی نہیں لے جا سکتا تھا۔ گھبراہٹ میں اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ کسی پڑوسی کا دروازہ بجا کر اس سے نازلی کے سلسلے میں درخواست کرے۔ وہ نازلی کے پاس واپس آیا اور کسی اور رشتے دار کے بارے میں دریافت کیا۔ نازلی کا ثروت کے گھر بہت کم آنا جانا ہوتا تھا اس لیے اسے اس کے گھر کا علم نہیں تھا۔ اب لڑکے کو یہی سوجھی کہ نازلی کو کسی دارالامان پہنچا دے۔ اس نے یہی کیا۔

''آپ یہاں چلی جائیں۔ یہاں سے بعد میں اپنے گھر چلی جایئے گا۔'' جلدی جلدی اسے یہ بات سمجھا کر وہ واپس ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ انسانی ہمدردی کے ناتے وہ بس اتنا ہی کر سکتا تھا۔ اس کے اندر اختر جیسے مشکوک آدمی سے جھگڑا مول لینے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کی ہدایت پر حیران پریشان نازلی دارالامان کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو اس کے قدم بری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ ان لڑکھڑاتے قدموں نے چند قدم سے زیادہ اس کا ساتھ نہیں دیا اور وہ بری طرح تیورا کر پختہ فرش پر گر پڑی۔ اس کے زخم زخم وجود پر فرش پر گرنے سے سر کی چوٹ کا مزید اضافہ ہوگیا۔ دارالامان میں کام کرنے والے ملازمین دوڑ کر اسے سنبھالتے، اس سے قبل ہی وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

سینئر ڈاکٹر کی راہنمائی میں فائنل ایئر کے طلبا وطالبات کا ایک گروپ خواتین کے جنرل وارڈ کا دورہ کر رہا تھا۔ ڈاکٹر باری باری ان خواتین کا چیک اپ کرتی، اپنے اسٹوڈنٹس کو ان کے امراض سے آگاہ کرنے کے علاوہ اس سلسلے میں گفت وشنید بھی کرتی جا رہی تھی۔ کہیں وہ خود چیک اپ کرنے کے بجائے طلبا میں سے کسی کو یہ ذمے داری سونپ دیتی۔ گروپ میں شامل ڈاکٹر ہادی کے بیٹے وجدان کو جس عورت کے چیک اپ کی ذمے داری سونپی گئی، وہ اس کی حالت دیکھ کر رنجیدہ ہوگیا۔ عورت کا سر پھٹا ہوا تھا اور جسم کے مختلف حصوں پر پڑے نیل کے نشانات کے علاوہ دانتوں سے کاٹے جانے کے نشانات کو دیکھ کر بلاجھجک کہا جا سکتا تھا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہونے کے بجائے کسی

انسان کے غیر انسانی تشدد کا نشانہ بنی ہے۔

''کیا ہوا ہے اس عورت کے ساتھ؟'' سینئر لیڈی ڈاکٹر بھی اس کی حالت دیکھ کر رنج و غصے میں مبتلا ہو گئی اور ساتھ موجود نرس سے دریافت کیا۔

''شوہر نے تشدد کیا ہے میڈم! بے چاری کی کچھ مہینے پہلے ہی شادی ہوئی تھی۔ شوہر ظالم نکلا اور اس کی یہ حالت کر ڈالی۔ بے چاری بڑی مشکل سے وہاں سے اپنی جان بچا کر نکلی ہے۔ یہاں دارالامان والے لے کر آئے ہیں۔'' نرس نے جھٹ پٹ مریضہ کی کیس ہسٹری بیان کر دی۔

''اس کا کوئی والی وارث نہیں ہے کیا؟'' ڈاکٹر نے دریافت کیا۔

''ابھی تک تو کوئی نہیں آیا۔ سنا ہے دارالامان پہنچنے سے پہلے یہ اپنے گھر گئی تھی لیکن وہاں تالا پڑا تھا۔ پچھلی شفٹ والوں کو اس نے یہ ساری باتیں بتائی تھیں۔ ہم سے تو زیادہ بات نہیں کی۔ بے چاری ہسٹریا کا شکار ہو رہی تھی اس لیے اسے سکون کا انجکشن دے کر سلا دیا ہے۔'' نرس بلا دریغ مریضہ کے لیے بے چاری کا لفظ استعمال کر رہی تھی۔

''اس عورت کو جسمانی ہی نہیں، ذہنی علاج کی بھی ضرورت پڑے گی لیکن مجھے امید نہیں ہے کہ اس کے بے پروا گھر والے جنہیں ابھی تک علم ہی نہیں ہے کہ ان کی لڑکی کس حال کو پہنچ چکی ہے، اس کا ذہنی علاج کروائیں گے۔ ہمارے ہاں نچلے طبقے میں یہ مسائل عام ہیں اور بیشتر افراد اپنے ذہنی امراض کے ساتھ پوری زندگی گزار دیتے ہیں۔ اس عورت کا شوہر بھی یقیناً کوئی نفسیاتی مریض ہی ہوگا جس نے اپنے وحشی جذبات کی تسکین کے لیے اس کمزور عورت کو اس حال تک پہنچا دیا۔ اینی وے، ہم اپنے کام کی بات کرتے ہیں۔''

ڈاکٹر پہلے تو جذباتی ہوئی لیکن پھر خود کو سنبھال کر اصل بات پر آگئی اور وجدان سے مریضہ کے زخموں کی نوعیت کے بارے میں سوالات کرتے ہوئے اسے دیے جانے والے ٹریٹمنٹ کے بارے میں معلومات فراہم کرنے لگی۔ راؤنڈ مکمل ہونے کے بعد بھی وہ عورت وجدان کے ذہن سے نہیں نکل سکی اور جب انہیں چائے کا وقفہ ملا تو وہ موقع پا کر وارڈ میں پہنچ گیا۔ عورت اب جاگ رہی تھی۔ اس نے اس سے اس کا نام دریافت کیا۔ اس نے اپنا نام نازلی بتایا۔ وجدان نے اس کے متعلق بہت سے دوسرے سوالات بھی کیے۔ ان سوالوں کے جواب دیتے ہوئے وہ متوحش تھی اور وجدان محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس سے کسی حد تک خوف زدہ بھی ہے تاہم اس کے دوستانہ رویے کی وجہ سے نازلی کا خوف کچھ کم ہوا اور اس نے اس کے سوالوں کے جوابات دینا شروع کر دیے۔ ان جوابات سے وجدان نے اندازہ کر لیا کہ وہ کس قسم کے حالات کا شکار تھی اور اس کی شادی ایک وحشی شخص سے کیونکر ہو گئی۔

وہ ایک ہمدرد فطرت رکھنے والا لڑکا تھا۔ یہ وہی تھا جو ڈاکٹر ہادی جیسے مہنگے ڈاکٹر کو چیریٹی کی طرف لے گیا تھا چنانچہ اس شام وہ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر صبیحہ بیگم کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا تو یہ کچھ عجیب نہیں تھا۔ ان کے گھر پر اب بھی تالا تھا تاہم کرائے دار موجود تھے جن سے علم ہوا کہ صبیحہ بیگم نواسے کی پیدائش کی وجہ سے بیٹی کے ساتھ اسپتال میں ہیں۔ اس نے کرائے دار کو اپنا کارڈ دیا اور صبیحہ بیگم کو یہ پیغام دینے کی ہدایت کی کہ وہ کارڈ پر موجود فون نمبر یا ایڈریس پر رابطہ کر کے اپنی بہن نازلی کی خیریت معلوم کر لیں۔ کرائے دار کے تجسس کے باوجود اس نے انہیں تفصیلات سے آگاہ نہیں کیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ گھر آیا تو ڈاکٹر ہادی سے بھی نازلی کا ذکر کیا۔ انہوں نے بھی اس کے لیے ہمدردی کا اظہار کیا اور وجدان کے اس فیصلے کی حمایت کی کہ نازلی کو بے آسرا چھوڑنے کے بجائے آخری حد تک اس کی مدد کی جائے۔

اپنے والد کے تعاون پر خوش وجدان نے اگلے دن اسپتال میں صبیحہ بیگم کی کال ریسیو کی۔

''یہاں آپ کی بہن برے حال میں پڑی ہے اور آپ مجھ سے اب رابطہ کر رہی ہیں؟'' ان کے تعارف کروانے پر اس نے ان پر طنز کیا۔

''میں اپنی بیٹی کے ساتھ اسپتال میں تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی گھر آئی ہوں اور پیغام ملتے ہی آپ کو فون کر رہی ہوں۔'' صبیحہ بیگم نے اس کے لہجے کا ذرا برا مانتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔

''یہاں آپ کی بیٹی جیسی بہن بھی بہت تکلیف میں ہیں۔ اگر آپ فرصت نکال سکیں تو آ کر ان کی حالت معلوم کر لیں۔'' وجدان نے انہیں اسپتال کا نام وغیرہ بتایا۔ صبیحہ بیگم نے پریشانی کی حالت میں نازلی کی نند کو فون کیا لیکن اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ انہوں نے ثروت کو فون کر کے صورت حال سے آگاہ کیا۔ دونوں بہنیں آپس میں بات کر کے آگے کا لائحہ عمل طے کرنے لگیں اور طے ہوا کہ مدثر صورت حال معلوم کرنے نازلی کے سسرال جائے گا جبکہ وہ دونوں اسپتال پہنچیں گی۔ وہ اسپتال پہنچیں تو وجدان ان کا

منتظر تھا۔ اس نے انہیں خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

''تم ہمارے ساتھ اس طرح کیوں بات کر رہے ہو؟ ہمارے ساتھ تو خود دھوکا ہوا ہے۔ معلوم نہیں وہ بد بخت کون تھا۔ ہم نے اس کے گھر سے معلومات کروائی ہیں۔ وہ لوگ نازلی کے جہیز کا سامان لے کر اس گھر سے فرار ہو چکے ہیں۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہم ایسے دھوکے باز آدمی سے بہن کی شادی کر رہے ہیں۔'' ثروت نے ذرا تیز لہجے میں اسے جواب دیا۔ اختر اور اس کی بہن کے فرار کا انہیں راستے میں آنے والے مدثر کے فون سے علم ہوا تھا۔

''آپ لوگوں کا قصور یہ ہے کہ پہلے تو آپ نے معلومات کیے بغیر بالکل انجان آدمی سے اپنی بہن کی شادی کردی پھر شادی کے بعد بھی اس کی طرف سے غافل رہے۔ کیا آپ کا فرض نہیں بنتا تھا کہ شادی کے بعد بہن کی احوال پرسی کرتے رہتے؟ آپ مانیں یا نہ مانیں، آپ کی غفلت نے انہیں اس حال کو پہنچایا ہے۔'' وجدان کب انہیں چھوڑنے والا تھا۔

''ہم بھی کیا کرتے۔ اسے ہی شادی کا اتنا شوق تھا۔ ایسی اول جلول لڑکی کو جیسا رشتہ ملا، ہم نے اسے بیاہ دیا۔'' ثروت اب بھی دبنے کو تیار نہیں تھیں۔ وجدان کو اندازہ ہو گیا کہ ان سے گفتگو کرنا بے کار ہے کیونکہ وہ بے حس لوگ ہیں۔ اسپتال میں نازلی کے پاس رکنے کی بات آئی تو صبیحہ بیگم نے تو ازلہ کے ساتھ رکنے کا عذر پیش کر کے پہلو بچالیا البتہ ثروت کو ہی طوعاً و کرہاً رکنا پڑا۔ سرکاری اسپتال کے جنرل وارڈ میں رکنا ان کے لیے بھی ایک کارِ دشوار تھا چنانچہ اپنی گھریلو مصروفیات کا بہانہ بنا کر اگلے دن آنے کا کہہ کر شام سے پہلے پہلے ہی واپس چلی گئیں۔ وجدان یہ سب دیکھ رہا تھا اور اس کے دل میں نازلی کے لیے ہمدردی بڑھتی جارہی تھی۔ نازلی جتنے دن اسپتال میں رہی، اس پر اس کے گھر والوں کے رویے مزید کھل کر سامنے آگئے۔ اس نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ اس خاتون کی کسی نہ کسی طرح مدد ضرور کرنی ہے۔

☆☆☆

''کیسے ہو جوان؟'' ڈاکٹر ہادی نے اپنے سامنے بیٹھے ابرار کو مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

''بہت بہتر...... اور یہ سب آپ کے تعاون کا نتیجہ ہے۔ آپ میری مدد نہیں کرتے تو میں اتنا مہنگا علاج افورڈ بھی نہیں کر سکتا تھا۔'' ابرار نے احسان مندی کے احساس کے ساتھ ان کے سوال کا جواب دیا۔

''تمہارے ساتھ تعاون کر کے میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ اپنے حصے کا فرض ادا کیا ہے۔ دولت والا دولت، علم والا علم اور ہنر والا اپنا ہنر معاشرے میں بانٹنے اور اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کا پابند ہوتا ہے کیونکہ اللہ نے انسانوں پر انسانوں کا حق رکھا ہے اور جو یہ حق ادا نہیں کرتا، وہ اللہ کے نزدیک مجرم ٹھہرے گا۔ میں نے اپنے ہنر سے تمہاری مدد کی اور میرے ساتھ شامل مخیر حضرات کے تعاون نے وسائل کی کمی کو پورا کر دیا۔ یہ دنیا اللہ نے بنائی ہے اور اسے چلانے کے انتظامات بھی وہ خود ہی کرتا ہے۔ تم یہ مت سمجھنا کہ دولت، علم اور ہنر پاس ہو تو آدمی مکمل طور پر خود مختار ہو جاتا ہے۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ میں نے اپنے تجربات سے سیکھا ہے کہ یہ سب ہوتے ہوئے بھی آدمی بہت بے بس ہوتا ہے۔ تمہاری ہی طرح کا ایک نوجوان میرا پیشنٹ ہے۔ اس میں اور تم میں یہ فرق ہے کہ وہ اس کلینک کے بجائے اس شہر کے سب سے بڑے اور مہنگے اسپتال میں مجھ سے علاج کروانے آیا تھا۔ اس کا باپ بہت بڑا بزنس مین اور انڈسٹریلسٹ ہے لیکن باپ کی اتنی دولت بھی اس کے لاعلاج مرض کے علاج کے لیے بے کار ہے۔ وہ بیرونِ ملک سے بھی ناکام ہو کر واپس آگیا ہے اور اب اس نے اپنی تمام دولت کو ایسے لوگوں کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے جو تعلیم اور صحت کے حصول کے لیے وسائل نہیں رکھتے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کہیں کہیں کوئی ایسا مقام آجاتا ہے کہ دولت والے کی دولت اور علم و ہنر والے کا علم و ہنر بھی بے کار ہو جاتا ہے۔ میں نے تمہارے سامنے یہ مثال اس لیے پیش کی ہے کہ تمہیں احساس ہو کہ اللہ نے تم پر کتنا بڑا احسان کیا کہ تمہاری غلط کاریوں کے باوجود تمہیں کسی ناقابلِ علاج مرض میں مبتلا نہیں کیا اور وسائل نہ ہوتے ہوئے بھی تمہارے لیے وہ اسباب پیدا کر دیے کہ تمہارا بہترین علاج ہو سکے۔ اب یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ اللہ کے اس احسان کا شکر تم کس طرح ادا کرو گے۔ تمہارا جو حق تھا، وہ اس دنیا کے کچھ لوگوں نے ادا کر دیا۔ اب تمہاری باری ہے کہ تم لوگوں کا حق ادا کرو۔''

''مگر کیسے؟ میرے پاس تو نہ دولت ہے اور نہ ہی علم و ہنر۔'' ان کی باتیں غور سے سنتا ابرار الجھ سا گیا۔ پہلی ملاقات کے مقابلے میں آج وہ بہت پُراعتماد معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا لباس پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر تھا اور چہرے پر موجود کیل مہاسے بھی ختم ہو گئے تھے جس کی وجہ سے وہ اچھا خاصا قبول صورت جوان لگ رہا تھا۔

''خود کو اتنا بے کار مت سمجھو۔ جوان آدمی ہو اور ایک طاقتور جسم کے مالک بھی۔ ایسے آدمی کے لیے تو بزرگ بولتے ہیں کہ زمین پر زور سے پیر بھی مارے تو پانی نکال ڈالتا ہے۔ تم کیسے خود کو بے کار قرار دے سکتے ہو۔'' انہوں نے فوراً اسے ٹوک دیا۔

''آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں لیکن سچ بولوں تو مجھے ایسی کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی کہ میں اپنے حصے کا فرض ادا کرسکوں۔'' اس نے قدرے شرمندگی سے اپنی بے بضاعتی کا اظہار کیا۔

''چلو جانے دو اس بات کو۔ یہ بتاؤ کہ شادی کا کیا پروگرام ہے؟'' انہوں نے جیسے موضوع بدل دیا۔

''میری دونوں بہنوں کے رشتے طے ہوگئے ہیں۔ ان کے فرض سے فارغ ہونے کے بعد اماں میرے لیے بھی کوئی رشتہ دیکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔'' اس نے شرمیلے پن سے بتایا۔

''ان کے ساتھ ساتھ ہی تمہیں کیوں فارغ نہیں کردیتیں؟'' ڈاکٹر ہادی نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

''ابھی اتنے وسائل نہیں ہیں۔ میں نے خود ہی انہیں منع کیا ہے کہ پہلے بہنوں کی شادی ہوجائے تو پھر میرے بارے میں سوچیے گا۔'' اس نے وضاحت کی۔

''چھوڑو یار! سادگی سے شادی کرلو۔ ضروری ہے کہ جہیز اور بری کے جھنجھٹ میں پڑا جائے۔ سیدھے سیدھے چار لوگوں میں بھی نکاح ہوسکتا ہے۔''

''جی ہوتو سکتا ہے لیکن ایسی لڑکی ملنا ذرا مشکل ہے۔ لڑکی والے کسی کنگال آدمی کو اپنی بیٹی دینا کہاں پسند کرتے ہیں۔'' اس نے ان کی بات کا جواب دیا۔

''ظاہر ہے، ما بہیں چراغ لے کر لڑکی ڈھونڈنے نکلیں گی تو لڑکی والوں کی بھی تو کچھ نہ کچھ ڈیمانڈ ہوگی۔ ہمارے ہاں تو شادی کو بھی ایک مسئلہ بنالیا گیا ہے۔ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ شادی ایسی بھی ہوسکتی ہے جو ایک دوسرے کے مسائل کا حل بنے۔ ابھی تم کہہ رہے تھے کہ تمہارے پاس نہ دولت ہے اور نہ علم وہنر کہ معاشرے کا حق ادا کرسکو...... تو میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا تمہارے بازوؤں میں اتنا بھی دم نہیں ہے کہ کسی بے سہارا لڑکی کو بغیر جہیز کے سادگی سے بیاہ کرلے آؤ اور اسے زندگی کی خوشیاں دو؟ اس طرح اپنے لیول پر تم اپنے حصے کا حق ادا کرسکتے ہو یا نہیں؟'' انہوں نے جیسے اسے کٹہرے میں کھینچ لیا۔

''آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ میں اماں سے اس حوالے سے بات کروں گا۔'' وہ ان کی دلیل سے قائل ہوگیا۔

''اگر ایسا ارادہ رکھتے ہو تو میرے پاس ایک ایسی لڑکی کا رشتہ بھی موجود ہے۔ وہ عمر میں تم سے چند سال بڑی ہوگی لیکن ہے تقریباً بے سہارا۔'' ان کے ذہن میں اچانک ہی وجدان کی زبانی سنا نازلی کا کیس آگیا۔ انہوں نے تفصیل سے ابرار کو اس کے حالات سے آگاہ کردیا۔ ''تم سمجھ سکتے ہو کہ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد بھی اس کے ورثا کا رویہ اس کے ساتھ کچھ مناسب نہیں ہوگا۔ انہوں نے ایک بے ڈھنگی شادی کرکے ایک طرح سے اپنی بہن کو اس بات کی سزا دی ہے کہ وہ کم ذہنی استعداد رکھتے ہوئے شادی کی خواہش مند تھی حالانکہ یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ فطری خواہشات ہر انسان کے دل و دماغ میں ہوتی ہیں لیکن ہمارے ہاں لوگ اس کا ادراک نہیں رکھتے۔ اگر ایمانداری سے دیکھا جائے تو ایک کم عقل فرد کے مقابلے میں مکمل باشعور فرد کے لیے ان خواہشات پر قابو رکھنا پھر بھی ممکن ہوتا ہے لیکن کم عقل فرد خود کو سمجھا پاتا ہے نہ اپنا دھیان بٹا سکتا ہے۔ نازلی بھی ایسی ہی ایک لڑکی ہے۔ میرے بیٹے نے تگ و دو کرکے اس کے سابقہ شوہر کو تلاش کرنے اور نازلی کو طلاق دلوانے کا کام کرلیا ہے لیکن اسے سہارے کی ضرورت ہے۔ اگر تم اپنے دل کو رضامند کرسکو تو اسے یہ سہارا دے سکتے ہو لیکن میری بات رکھنے کے لیے زبردستی نہیں۔ اپنی دلی آمادگی کی صورت میں تمہاری مرضی ہوئی تو میں تمہاری نازلی اور اس کے گھر والوں سے ملاقات کا بندوبست کرسکتا ہوں۔'' انہوں نے بہت قرینے سے نازلی کا رشتہ اس کے سامنے رکھا۔ ان دونوں کی اس گفتگو کے ٹھیک تین ماہ بعد نازلی اور ابرار کا نکاح ہورہا تھا۔ ابرار نے اسے اس کی ہر خامی سمیت اس عہد کے ساتھ قبول کرلیا تھا کہ وہ اسے اتنا اعتماد دے گا کہ وہ بھی لوگوں کو بہتر زندگی جی کر دکھائے گی اور بتائے گی کہ وہ اتنی بھی ناکارہ نہیں تھی، جتنا اسے بنا دیا گیا۔ نازلی سے رشتہ کرنے کے سلسلے میں اسے اپنی ماں کو قائل کرنے میں البتہ کچھ دقت کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن آخرکار وہ مان گئی تھی کہ ڈرتی تھی زیادہ مخالفت بیٹے کے قدموں کو پھر سے نہ بہکا دے۔ خود ابرار اس رشتے سے البتہ پوری طرح مطمئن تھا کیونکہ نازلی سے شادی کرکے وہ اس پر کوئی احسان نہیں کررہا تھا بلکہ وہ حق ادا کررہا تھا جو بطور انسان اس پر قرض تھا۔